جاسوسی ڈائجسٹ

جلد 46 • شمارہ 12 • دسمبر 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: 63-C فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

2016ء کا آخری شمارہ حاضرِ خدمت ہے۔ چند ماہ پہلے ان سطور میں نریندر مودی کے نام کی تصحیح کر کے موصوف کو نریندر موذی کا لقب دیا گیا تھا۔ اس وقت شاید بعض قارئین کو یہ لقب زیادہ پسند نہ آیا ہو لیکن بھارتی سرکار نے کشمیر کے نہتے کشمیریوں اور لائن آف کنٹرول کے قرب و جوار میں بسے معصوم پاکستانیوں پر بارود و آہن کی اندھی برسات کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی سربراہی ایک موذی کر رہا ہے۔ جو اپنے پڑوسیوں سے بربریت اور ننگی جارحیت کا سلوک کر رہا ہے۔ برہان وانی کے بہیمانہ قتل کے بعد کشمیر میں آزادی کی جو لہر اٹھی ہے، اسے دبانا اب ان قابض فوجیوں کے بس کی بات نہیں۔ عالمی رائے عامہ کی توجہ اس ظلم اور سفاکی سے ہٹانے کے لیے آئے دن کنٹرول لائن پر کوئی نہ کوئی گل کھلایا جا رہا ہے۔ سیاسی اور اعلیٰ فوجی قیادت نے اس بار بھرپور ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جو کچھ کہا ہے، وہ یقیناً ان انسانیت دشمنوں کی نیند اڑا دے گا اور اب یہ پڑوسی عجب وحشیانہ سوچ پر اتر آیا ہے۔ ہمارے پانی کی ایک ایک بوند روک کر ہمارے ملک کو صحرا بنا دینے کی بات کر رہا ہے۔ اسے بین الاقوامی معاہدوں کا پاس ہے نہ اپنی ذمے داریوں کا احساس۔ وہ بھول رہا ہے کہ عالمی معاہدوں کے برخلاف ہمارے حصے کا پانی روکا گیا تو ہم بھی کسی قاعدے قانون کی پابندی سے آزاد ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کے پانی سے کھیتیاں سیراب کرنے والا بھارتی نہری نظام ایک ہولناک آبی عفریت کی صورت میں سب کچھ خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے۔ موذی کی پاکستان دشمنی اور دیوانگی کا یہی عالم رہا تو کچھ بعید نہیں کہ آنے والے دنوں میں وہ پاکستان آنے والی ہواؤں کو بھی روک لینے کا دعویٰ کرنے لگے۔ ہم بس دعا ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس شیطان صفت قیادت کو ہدایت دے اور وہ پورے خطے کو کسی بھی قسم کی جنگ کی ہولناک آگ میں جھونکنے سے باز رہے۔ اس عہد میں جنگ کا مفہوم یکسر بدل چکا ہے۔ اس کے نتیجے میں کوئی فاتح نہیں ہوتا۔ ہر فریق اپنے حصے کے زخم جھیلتا ہے۔ اب اپنی محفل کا رخ کرتے ہیں...... جہاں کئی فریق ایک دوسرے کے مدِمقابل ہیں......

کراچی سے سجاد احمد ساحر کے مشورے ”اس بار جاسوسی کچھ لیٹ ملا۔ 14 اکتوبر کو سرورق پر نظر پڑتے ہی دل کو سکون ملا۔ ٹائٹل پر اس بار گلو بٹ ٹائپ شخص کو دیکھ کر دلی مسرت ہوئی جس کی مونچھ کی وجہ سے حسینہ کافی خوف زدہ دکھائی دی۔ اپنی محفل میں پہنچے تو انکل کو کرکٹ سے دل بہلاتے ہوئے پایا۔ بات سچ ہی کہ جب کہیں سے وطنِ عزیز میں خوشی کی خبر نہ ہو تو بندہ کھیل کو ہی تسلی سامانِ دل کر لیتا ہے۔ اس بار افتخار حسین اعوان نمایاں نظر آئے، اسرار ساقی کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ ایچ اقبال آتشِ بغاوت... کے ساتھ حاضر ہے جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ صدر حیات، کرنل چنگیزی جیسے لوگ کسی بھی ملک یا قوم کے لیے باعثِ شرم ہوتے ہیں۔ ڈکٹیٹر شپ ہی تو چل رہی ہے، جمہوریت کی آڑ میں۔ پشمینہ اور دانش ضرور کامیاب ہوں گے لیکن ابھی ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ لب بام سیریز ریاض کی اچھی رہی۔ فاکس نے دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ کاشف زبیر مرحوم گھر میں معاشرتی پسماندگی پر نشتر زنی کرتے ہوئے ملے۔ جمال دتی کا پھندا آخر اصل قاتل کے گلے میں پڑ گیا۔ مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو غلطی ضرور کرتا ہے۔ گریشیا نے ذہانت سے کیس حل کیا اور بیورلی کو اس کی جلد بازی کی سزا ملی، گڈ۔ اسفند یار مقفل لاش سے پردہ نہ اٹھا سکے کہ فلپ نے قتل کیوں کیا انجام نامکمل رہا۔ طاہر جاوید مغل نے انگارے کچھ زیادہ ہی دہکا دیے ہیں۔ اب امریکی بھی کود پڑے ہیں بن بلائے براتی بن کر۔ فسطینا کا کردار اچھا لگا مگر ابتدا کچھ خوشگوار نہیں ہوئی۔ براڈے، شاہ زیب کے لیے براڈن بن گیا۔ کندھا انجرڈ ہو گیا، یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔ سیفی بھی انڈونیشیا پہنچ رہا ہے۔ انکل سے عرض ہے کہ کھانے کا ذکر ایسے کرتے ہیں کہ بھوک چمک اٹھتی ہے۔ ہتھ ہولا رکھیں۔ تحسین رضا کی شکاری گزارے لائق تھی۔ تنویر ریاض کی شہرت کی خاطر کامیاب رہی۔ مارٹن نے اپنے بیٹے کی زندگی چھین لی۔ شہرت کی خاطر ہوگ روایتی پولیس کی طرح آخر میں پہنچا جب مارٹن دو قتل کر چکا تھا۔ ارشد بیگ کا دیوانہ بہت چالاک ثابت ہوا۔ قتل کرنے کے بعد پولیس کے سامنے اقرار کر کے بھی صاف بچ گیا۔ آوارہ گرد کو تو پر لگ گئے ہیں، ٹیپو ہر بار کی طرح تیز رہا۔ نانا شکور کو اتنی جلدی ختم کر دیا ڈاکٹر صاحب نے، کلی منجارو کی فینٹیسی بڑھتی جا رہی ہے ذرا کم کریں۔ شہزی اس بار مشکل میں دکھائی دے رہا ہے۔ کوہارا سے ٹکراؤ نقصان پہنچائے گا۔ منظر امام صاحب کے لیے جتنی تعریف... کی جائے کم ہے۔ مختصر اور جامع الفاظ ذہن کو مسخر کر لیتے ہیں، ڈرپوک آخر میں سب سے بڑا بہادر ثابت ہوا، ورثن سنگھ جیسے بھیڑیے کو مار کر۔ کشمیر کا ہر بچہ بہت ہمت اور جذبے والا ہے۔ مرحوم مختار آزاد صاحب کی شکاری محبت بہترین رہی۔ گھاؤ، سلیم انور کی گزارے لائق رہی۔“

احسان پور ضلع رحیم یار خان سے رانا بشیر احمد ایاز کی شعر گوئی ”نومبر کا شمارہ اس دفعہ تاخیر کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے 8 کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا۔ سرورق پہ خوفناک مونچھوں والے بھائی صاحب سرخ انگارا آنکھوں کے ساتھ شفقت چیمہ اسٹائل میں یقیناً بابر عباس کو گھورتے نظر آئے کہ ان کو آج کل ٹھیک سے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے کیونکہ ان کو ہمارے تبصرے بلکہ شاندار تبصرے میں بونگیاں ہی دکھائی دے رہی ہیں۔ ساتھ میں طاہرہ گلزار باجی بھی ان کو آنکھیں دکھا رہی ہیں۔ بابر عباس بھیا آپریشن کسی تجربہ کار ڈاکٹر سے کروانا چاہیے تھا کیونکہ آپ کو ہر چیز الٹ دکھائی دے رہی ہے۔ محفلِ دوستاں میں افتخار حسین اعوان موجود تھے، مبارکاں۔ اسرار ساقی کا تبصرہ جاندار تھا۔ تبصرے کو پسند کرنے کا شکریہ۔ ذہین اور ٹیلنٹڈ لوگوں کے شہر فیصل آباد سے رؤف برادران کی بوریت کے ساتھ انٹری ہوئی۔ جناب کا جاسوسی کے لیے اتنا بے قرار ہونا کوئی عجیب بات نہیں۔ یہ تو ہر قاری کے ساتھ ہوتا ہے۔ کافی جامع تبصرہ لکھا آپ نے۔ بابر عباس بھائی کی اونگیاں بونگیاں اچھی لگیں۔ اے زیڈ وسلی اپنے اچھے تبصرے کے ساتھ رونقِ محفل بنے رہے۔ سب سے پہلے کہانیوں

میں آتش بغاوت کا مطالعہ کیا۔ ایچ اقبال کافی طویل عرصے بعد آئے۔ قصر صدارت سے شروع ہونے والی سرد جنگ اب بھڑکتے شعلوں میں بدل رہی ہے۔ پشمینہ حیات باپ کی محبت سے مجبور ہو کر پہلے لگنے والے الزامات کا دفاع کرتی رہی لیکن ضمیر کی آواز پر پھر اقتدار سے علیٰحدہ ہو گئی۔ کرداروں کے اتار چڑھاؤ اور ملاپ نے کہانی میں سنسنی ڈال دی ہے۔ کاشف زبیر کی شاندار تحریر گھر پڑھی۔ انتہائی دل گرفتگی کے عالم میں کہانی کو مکمل کیا۔ انگاروں کی تپش اس دفعہ کچھ بہت زیادہ محسوس ہوئی مگر بڑھتے ہوئے سرد موسم میں یہ اچھی لگی۔ سیف عرف سیفی، شاہ زیب کے گلے پڑ گیا ہے اور چیلنج کر کے مقابلے میں شکست کھانے کے باوجود شاہ زیب نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ برونائی جاتے ہی ایکشن شروع ہو گیا۔ منظر امام صاحب اس دفعہ اپنے اسٹائل سے ہٹ کر ڈریوک کے ساتھ وارد ہوئے۔ کشمیر کے حالیہ تناظر میں لکھی گئی کہانی مکمل حالات کی عکاس نظر آئی۔ ویلڈن منظر امام۔ آوارہ گرد میں شہزی کی پھرتیاں ناقابلِ یقین رفتار سے جاری ہیں۔ چھوٹی کہانیوں میں شکاری محبت، گھاؤ، شہرت کی خاطر بس مناسب تھیں۔ پہلے رنگ میں سرور اکرام بنیاد بنا رہے تھے۔ وہی زر، زن اور زمین کے گرد گھومتے کردار اور ان کی بوالہوسی۔ کسی کا ایمان پیسا تو کسی کا عورت۔ کوئی دنیا پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے تو کوئی زبان کو جبڑا کر ناحق انسانوں کا خون بہاتا پھر رہا ہے۔ مجموعی طور پر کہانی اچھی رہی۔ دوسرے رنگ میں کبیر عباسی کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ کہانی صرف دو ہی کرداروں کے گرد گھومتی نظر آئی۔ آخر میں جاتے ہوئے سرد ٹھنڈے دسمبر کے حوالے سے دوستوں کی نذر ایک شعر۔

کہا تھا میرے ہمدم نے ملیں گے دسمبر میں
لوٹ آؤ کہ میری طرح دسمبر بھی تھوڑا رہ گیا ہے

درابن کلاں سے **مرحا گل کی گل خیزیاں** ”اس مرتبہ جاسوسی کی پُرشباب حسینہ اپنی زلفوں کا سایہ گنجے پر کیے ہوئے تھی اور گنجے کی مونچھیں خوشی سے پھڑک رہی تھیں۔ جاسوسی اس مرتبہ 5 کے بجائے 8 کو ملا۔ محفل میں افتخار حسین کو ونگ سیٹ پر دیکھ کر اچھا لگا۔ زبردست تبصرہ تھا۔ فیصل آباد سے ناروف براور زبور کر گئے۔ بھئی ہم گل ہیں تو گل ہی کھلائیں گے نا، نہ کہ بوریت۔ اوجی اب بابر عباس کے ساتھ بھی دماغ کھپانا پڑے گا۔ کبھی کاظمی صاحب کے پیچھے پڑ جاتے ہیں تو کبھی گلوں کے پیچھے۔ آپ مجھے مرحا بیٹی کے نام سے پکار سکتے ہیں پھر آپ کے ہوش نہیں کھوئیں گے اور یہ کھن نہیں مجتبیٰ ہیں ہماری۔ بے نام صاحب آپ کا لیٹر اچھا تھا ویسے آپ کو ہم سے بے نام ہی جیلسی کیوں ہے؟ نظر لگا کے ...... سجاد خان اچھوتا انداز مزہ دے گیا۔ شاعری نے لطف دوبالا کر دیا، دعاؤں کا شکریہ۔ رانا بشیر بھی رونق بڑھا رہے تھے محفل کی۔ حبیب الرحمان ومشال توال، رومی صاحب، ادریس احمد، احسان سحر ولی صاحب سب کے تبصرے سپر ڈوپر تھے۔ طاہرہ آنٹی بھی زبردست تبصرہ لے کر حاضر تھیں۔ خوب صورت محفل سے نکل کر ہم نے رنگوں کی طرف رخ کیا ار نگا رنگ ہونے کے لیے مگر طاہر انکل کی تحریر کے سحر نے بری طرح جکڑ لیا۔ انگارے بڑے سج دھج اور شان وشوکت سے ہمارے دلوں پر راج کر رہی ہے۔ مغل انکل اینڈ محمد صفدر معاویہ کو سالگرہ کی مبارک باد۔ تحفے میں دعائیں۔ آپ کی طرف سے خوب صورت رومانوی کہانی کا انتظار...... آوارہ گرد اس مرتبہ ریگ جی کے بجائے دیگ تھی پڑھ کر اور کھا کر خوب لطف آیا۔ انکل کہیں بندر موذی شہزی کو بھی نہ مروا دے۔ پہلا رنگ بہت زیادہ سنسنی خیز تھا۔ نومبر کی سرد راتیں اور جاسوسی کے رنگ ویری گڈ۔ ویلڈن سرور اکرام۔ کبیر عباسی ایک بہت دکھ بھری تحریر لائے۔ حسنات کے ساتھ ہماری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس مرتبہ جاسوسی ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا خوب دوڑایا، اڑایا، پھر میلہ لوٹ لیا، آدھا مزہ آ گیا۔ مجموعی طور پر اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ پرفیکٹ جاسوسیت کے لبادے میں ملبوس تھا۔“

محمد قدرت اللہ نیازی حکیم ٹاؤن خانیوال سے لکھتے ہیں ”محفل یاراں سے ایک طویل عرصہ غیر حاضر رہنے کے بعد بندہ حاضر خدمت ہے۔ (کیوں بھئی کہاں کی یاترا پر تھے؟) سرورق پر مونچھوں کو تاؤ دیے ”حشمت پہلوان“ حسینہ کو گھورتے نظر آئے تاہم حسینہ بھی ہوئی بالکل نظر نہ آئی۔ ابتدائی تبصرے پر افتخار حسین اعوان موجود تھے۔ کافی عرصہ بعد وہ محفل میں حاضر ہوئے لیکن ایک افسوسناک خبر کہ ان کے بڑے بھائی ایک حادثے میں انتقال فرما گئے ہیں، اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ اسرار ساقی کا اچھا تبصرہ تھا۔ احسان سحر خوب صورت اور دلنشیں تبصرہ کے ساتھ موجود تھے۔ خطوں کی نوک جھوک کو مزاح کے رنگ میں لیا کریں، دل پر نہ لیا کریں۔ زیڈ اے وصلی! سلیم فاروقی سے اتنی ناراضگی؟ ویسے بات آپ کی بھی ٹھیک ہی ہے۔ نامعلوم جگہ سے بے نام خط نے بھی لطف دیا۔ سجاد خان آف موچھ، پرانا مقولہ ہے کہ آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل۔ جو یقیناً حضرت انسان کے تجربات کا نچوڑ ہے اس لیے ناقدری کا گلہ کیسا؟ غم اور بھی ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ غم روزگار نے کئی تبصرہ نگاروں کو محفل سے دور کر دیا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ سجاد احمد ساحر کا انداز اریبہ بخاری کی یاد دلاتا رہا۔ وہ بھی ایسے ہی بے ربط جملوں سے سماں باندھ دیتی تھیں اللہ خوش رکھے جہاں بھی ہوں۔ ساگر تلوکر! اللہ پاک مرحومین کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ رانا حبیب الرحمان، بڑی سفارشیں ہو رہی ہیں؟ آپ نے پکارا اور ہم آ گئے اب خوش۔ طاہرہ گلزار! اگر الجھنے کے بجائے آپ خاموش رہیں تو بھی بولنے والے چپ ہو جاتے ہیں۔ کون کیا کر رہا ہے۔ سب کا ٹھیکا تو نہیں لیا ہوا آپ نے۔ بس اگنور کر دیا کریں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ قسطینا کا کردار کافی دلچسپ رہا۔ مغل انکل نے شاہ زیب اور قسطینا کو برا پھنسایا ہے۔ تین راتوں میں نہ کھانا نہ پانی نہ سونا دیکھیں کب جان چھوٹتی ہے؟ آوارہ گرد کا مطالعہ بہت مشکل اور الجھن بھرا رہا۔ مرکزی کرداروں کی غیر فعالیت اور کہانی کا ایک ہی انداز بوریت پیدا کر رہا ہے۔ ہر وقت مار دھاڑ اور بھاگم بھاگ نہ کوئی سسپنس، نہ رومانس، بھئی صاحب! تھوڑا تبدیل کریں انداز کو۔ سرور اکرام کا پہلا رنگ ایک استعارہ تھا عصبیت پر مبنی تحریر میں ایک سبق پوشیدہ تھا۔ دوسرا رنگ جاسوسی ڈائجسٹ کے ایک تبصرہ نگار کبیر عباسی کا تحریر کردہ تھا۔ موصوف کی یہ دوسری کاوش تھی۔ حسنات ایک تعلیم یافتہ اور سمجھ دار شخص تھا لیکن دوستی نبھانے کے چکر میں مشکل میں پھنس گیا۔ حسنات کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے فرمین کی کاوشوں کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی۔ ابتدائی صفحات پر آتشِ بغاوت کے ساتھ ایچ اقبال سیاست کو موضوع بنا کر موجود تھے۔ ایچ اقبال ہر جذبے کو انتہائی شکل میں دکھاتے ہیں۔ یہی حال پشمینہ، دانش اور حاجی

اشفاق کا تھا۔ کاشف زبیر مرحوم کی تحریر مگر بھی ان کی دیگر تحریروں کی طرح ہلکے سے اسرار میں لپٹی تھی۔ بابا کی جان کاری ڈاکٹر شایان کے لیے معتبر ثابت ہوئی۔ لب بام میں جج کینڈین نے ایک طرح سے خودکشی ہی کرلی البتہ جاتے جاتے فاکس کو مالا مال کر گیا۔ ولیم اور نینسی نہ صرف پھنسے بلکہ کمائی سے بھی محروم ہو گئے۔ فاکس نے اپنا کردار عمدگی سے نبھایا۔“

ساگر تلوکر، چشمہ بیراج میانوالی سے اختصار پسندی سے لکھتے ہیں ”جاسوسی انتظار کے اذیت ناک مراحل کے بعد ملا۔ سرورق کی زینت صنفِ نازک اس بار متاثر نہ کر پائی۔ سیدھے پہنچے محفل میں۔ سبھی دوستوں کے خطوط پڑھے، بہت اچھے لگے۔ ایچ اقبال کافی عرصہ بعد آئے، دلچسپ اور سنسنی خیز آتشِ بغاوت، چشمۂ حیات کی داستان اچھی لگی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ انگارے مغل اعظم نے بہت دہکا دیے ہیں۔ قسطینا سے شاہ زیب کا مار کھانا اور شاہ زیب کی تاجور کو شراب اور شباب سے بھلانے کی سعی بہت بری لگی۔ شاہ زیب اور قسطینا موت کی آغوش سے کیسے نکلتے ہیں۔ انتظار ہے۔ کاشف زبیر کا نام آتے ہی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اللہ پاک انہیں غریقِ رحمت فرمائے، آمین! مگر بہت پُراثر تحریر تھی۔ آوارہ گرد، شہزی پارٹی کا جزیرے کا سفر بہت پرخطر اور خوفناک لگا۔ کہیں سور کہیں کالے شیر، وحشی دشمن اور دلدل سے سب بچ نکلے۔ مگر ڈان ناشکور کو مگرمچھ لے اُڑے۔ ڈان کی اتنی جلدی موت۔ ڈان کا اتنا جلدی مرجانا کچھ عجیب سا لگا اور بالکل ان نیچرل سا لگا۔ کوریلا اور کوپارا کے درمیان پھوٹ اچھی لگی۔ بھئی صاحب سے گزارش ہے کہ شہزی کو جلد ساتھیوں سے ملا کر دی اینڈ کریں۔ ڈرپوک بہت گہری تحریر تھی۔ صفدر کو آتشیں اسلحے اور آہنی بوٹوں کی دھمک نے دلیر بنا دیا۔ وادیٔ عشق میں کامیاب ٹھہرا۔ بے غرض کبیر عباسی اچھا لکھ رہے ہیں۔ حسنات نے تو دوستی میں ہر حد پھلانگ دی مگر انور آستین کا سانپ ثابت ہوا۔ کبیر عباسی کی تحریروں میں کاشف زبیر کی تحریروں کی جھلک و رنگ اور خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ بنیاد منظر امام کی کہانی کی کاپی لگی۔ زر، زن، زمین اور زبان کے جھگڑے پر منظر صاحب پہلے ایک چھوٹی مگر پُراثر تحریر لکھ چکے ہیں۔ سرور اکرام کی کاوش بھی اچھی لگی۔“

فیصل آباد سے شعیب الرؤف کی مشترکہ عرق ریزی ”سال کا سیکنڈ لاسٹ جاسوسی ڈائجسٹ معمول سے 2 دن لیٹ پانچ نومبر کو ہتھے چڑھا۔ ٹائٹل پر پڑنے والی نظریں تعریفی تھیں۔ ہماری پسندیدگی بھانپ کر ٹائٹل والی آنٹی نے مسکراتے ہوئے شرما کر سر جھکا لیا۔ ساتھ کھڑے انکل کے کرخت چہرے پر رقابت اور حسد نے عجیب ہی بے چارگی پیدا کر رکھی تھی۔ چینی تختہ چینی میں مدیر کا دعائیہ بیان پڑھ کر دل سے ڈھیر ساری آمین برآمد ہوئی۔ صدارت پر اس بار کشمیر جنت نظیر سے ہمارے مدبر دوست افتخار اعوان نظر آئے۔ ان کے ہر لفظ میں بہتے ہوئے کرب کی جھلک تھی۔ آپ نے بہت صدمے برداشت کیے اور حال ہی میں بڑے بھائی کا ٹریفک حادثے میں انتقال ایک اور المیہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو صبر و ہمت اور آپ کے پیاروں کی آخری سفر میں منزلیں آسان فرمائے۔ اسرار ساقی کی رہائی کے لیے بہت سی دعائیں۔ بابر عباس کا تبصرہ بھی اپوزیشن کی تقریروں جیسا کافی جوشیلا تھا۔ ان کا سر جی کہنے کا انداز دیہات میں پرانے سرکاری اسکولوں کی یاد تازہ کر گیا۔ ان کا انداز بہت دھانسو ہوتا ہے۔ بابا جی جوانی میں تو یقیناً قیامت ڈھاتے ہوں گے تبصروں میں۔ احسان سحر کی حاضری بھی اچھی تھی، وصلی برادران کی آمد خوب تھی۔ نامعلوم جگہ سے بے نام کے پردے میں شفقت محمود چھپے تھے جو اٹھی پکڑے مودی کی درگت بناتے نظر آئے۔ شفقت صاحب! بس دیکھتے جائیں۔ موذی جلد ہی نشانِ عبرت بنے گا۔ سجاد خان اور رانا بشیر نے بھی متاثر کیا۔ سجاد احمد خان! آپ نے ٹھیک کہا۔ چائنا کی پسٹل دکھانے کی اور کھانے کی اور ہے۔ ساگر تلوکر صاحب! اللہ پاک آپ کو صبر اور مرحومین کو بلند درجات عطا فرمائے۔ نوال اینڈ مشال کو بھانجی کی مبارکباد۔ اللہ اس کی قسمت بہترین فرمائے۔ رانا حبیب اور عبدالجبار کے تبصرے بھی پسند آئے۔ سب سے آخر میں طاہرہ آنٹی کو جگہ ملی تو وہ وہیں دھرنا دے کر بیٹھ گئیں۔ طاہرہ آنٹی اپنا مکمل تبصرہ شائع ہونے پر جس طرح خوشی سے اچھل رہی تھیں، شاید انہیں خود بھی اپنے تبصرے کی اشاعت کا یقین نہیں تھا۔ ان کے تبصرے میں اس بار بھی عجیب و غریب باتوں کی بھرمار تھی جن پہ ہنسی ہی آسکتی تھی سو خوب آئی۔ طاہرہ آنٹی! آپ اس طرح کی باتیں نہ کیا کریں پھر آپ ہی گلہ کرتی ہیں کہ ہنس کیوں رہے ہیں سب؟ اب آجائیں کہانیوں کی طرف۔ حسبِ سابق آغاز مغل صاحب کی انگارے سے کیا۔ میرے نکھے ویر سیف عرف سیفی کا کردار خاصا دلچسپ جا رہا ہے۔ حیات کی نمک حلالی نے بہت متاثر کیا۔ اس کی موت افسردہ کر گئی۔ شاہ زیب کو قسطینا کی صورت میں ایک نیا نمونہ ’ٹکر‘ گیا ہے۔ خدشہ ہے کہ جاناں کے بعد وہی اس کی قائم مقام ثابت نہ ہو جائے۔ قسط کا اختتام خاصا سنسنی خیز ہوا۔ آوارہ گرد کی یہ قسط تیز ایکشن کے ساتھ کافی عرصہ بعد توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، امید ہے مزید بہتری کی طرف جائے گی۔ کاشف زبیر کی گھر دل پر گہرا اثر چھوڑ گئی۔ شکاری محبت اور گھر کے مطالعے نے مسلسل اداسی غالب رکھی۔ ان دونوں مصنفین کی عدم موجودگی کا احساس بہت مضطرب رکھتا ہے۔ سرورق کے پہلے رنگ کا پلاٹ اور موضوع خاصے جاندار تھے لیکن اندازِ بیان زیادہ دلچسپی پیدا نہیں کر سکا۔ کبیر عباسی کی پہلی تیز رفتار ہنگز کے بعد مزید جارحانہ اندازکی توقع تھی لیکن اس بار رن ریٹ کچھ کم رہا۔ منظر امام کی ڈرپوک سب سے منفرد رہی۔ باقی کہانیوں کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔“

اے زید وصلی، تاندلیانوالہ سے لکھتے ہیں ”بڑے بھائی صاحب کی کافی منتیں کرنے کے باوجود آٹھ تاریخ تک انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑا۔ آٹھ کو جاسوسی ہاتھ میں آیا تو دل خوشی سے کھل اٹھا۔ ٹائٹل پر اس مرتبہ چودھری نما بندے کا راج تھا۔ آدھے چہرے والی حسینہ بھی غضب ڈھا رہی تھی۔ اداریے میں ہمارے پسندیدہ کھیل کرکٹ کے بارے میں پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ ہوم ایڈوانٹیج حاصل کرنے کا حق سب ٹیموں کو ہوتا ہے۔ چینی تختہ چینی میں اس بار ہمارے پیارے دوست افتخار اعوان نمایاں تھے۔ بلاشبہ آٹھ اکتوبر کا دن ہماری تاریخ کا بدترین دن ہے۔ اسرار ساقی دعاگو ہیں کہ آپ کو جیل سے جلد چھٹکارا مل جائے۔ رؤف برادران اخبار فروش پر اتنا غصہ مت کیا کریں، کہیں وہ آپ کا رسالہ ہی نہ بند کر دے۔ بابر عباس اپنے پرانے دوستوں کی سنہری یادوں میں گم ہو کر نئے دوستوں پر طنز کیے جا رہے تھے۔ احسان سحر زندگی بہت چھوٹی ہے، اسے ہنس کر گزاریں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پر نہ لیا کریں۔ نوال آپ کو بھانجی اور مشال آپ کو بیٹی کی بہت مبارک ہو۔ بلاشبہ بیٹیاں خدا کی رحمت ہوتی ہیں۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ کہانیوں میں حسبِ معمول اپنی موسٹ فیورٹ انگارے سے آغاز کیا۔ بروتائی کا جزیرہ تو کافی مار دھاڑ والی جگہ لگی۔ قسط شاندار رہی۔

قسطینا کا کردار آگے چل کر کافی تہلکہ مچائے گا۔ ویلڈن مغل صاحب۔ آوارہ گرد میں اس مرتبہ گل منجارو کے جنگلات میں شہزی کے ایکشن نے حیران کر دیا۔ لگ رہا کہ بہت جلد شہزی کا کے کی رشتے داری ٹارزن سے نکل آنی ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ اولین صفحات پر ایچ اقبال آتشِ بغاوت کے ساتھ شاندار رہے۔ سیاست کے کھیل پر مشتمل کہانی نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ بنیاد انجائی بے بنیاد کہانی ثابت ہوئی۔ آخر تک دھڑکا لگا رہا کہ کہیں ہم بھی غائب نہ ہو جائیں۔ دوسرے رنگ نے پہلے کے کچھ اثرات زائل کیے۔ حسنات بھی ہمارے جیسا معصوم آدمی تھا۔ انور کے کردار نے آج کے دور کے لوگوں کی صحیح عکاسی کی۔ چھوٹی کہانیوں میں کاشف زبیر کی گھر تاپ پر رہی۔ شایان جیسے لوگوں نے ہی لفظ مسیحا کا مذاق بنا رکھا ہے۔ کشمیر کے پس منظر پر لکھی گئی منظر امام کی ڈرپوک شاندار تحریر تھی۔ ادارے سے درخواست ہے کہ اس طرح کی تحریریں زیادہ سے زیادہ شامل کی جائیں۔ مجموعی طور پر نومبر کا شمارہ متاثر کن تھا۔“

سیا نوالی سے احسان سحر کی باتیں ”جب دل شاد ہوتا ہے...... آرزوؤں کو آباد رکھتا ہے۔ میرا دل بھی شاد ہی تھا، تبھی تو... جاسوسی کے لیے بے تاب تھا۔ کسی کو ٹوٹ کر چاہنا گناہ ہے شاید...... تبھی محبوب کا دیدار اس وقت ہوا جب مچلتے جذبے بھی ناامیدی کی بانہوں میں جانے لگے تھے۔ اس لیٹنگ کی وجہ بھی......؟ آزاد کشمیر سے افتخار حسین اپنا دکھ لیے حاضر تھے۔ آپ کے دکھ کو اپنا دکھ جانا، اکتوبر کا زلزلہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ میں نے اپنے دوست کو کھویا تھا۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریر گھر جو ابتدا سے ہی دل و دماغ پر خوب صورتی سے آہستہ آہستہ سرکتی رہی۔ انسان سے انسانیت، آدمی سے آدمیت، بشر کی یہی تو خوبی ہے کہ وہ گناہ کر کے پچھتاتا ہے۔ سزا بھی ویسی ہی ملی جس کا وہ مستحق تھا۔ پھندا، جلدی کا کام شیطان کا، جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے گرتا وہ خود اس میں ہے۔ مقفل لاش، مروسن نے نہایت چابک دستی سے مونینگ کے قتل کا سراغ لگایا۔ کیا ذہانت تھی قاتل کی اور کیا ذہانت تھی قاتل کو ڈھونڈنے کی۔ ایک منفی عمل میں استعمال ہوئی اور ایک مثبت کام میں، خوب!! انگارے اس دفعہ بھی کافی دلچسپ رہی۔ کئی کرداروں کا اضافہ ہوا۔ امریکی ایجنسی کا شامل ہونا پے در پے ہونے والے حملے، قسطینا کا دلچسپ کردار، کافی لطف آیا پڑھنے میں۔ رنگوں کی بات کریں، دنیا بھی رنگوں کے بنا ادھوری ہے اور جاسوسی بھی، دوسرے رنگ کو پڑھتے پڑھتے ہی چھوڑ دیا۔ جاسوسی پر اب اتنا بھی برا وقت نہیں آیا کہ ایسی کہانیاں بھی اب پڑھنے کو مل رہی ہیں۔“

خواب نگر سے دشتِ دل کی التجا ”نومبر کا جاسوسی ایک اداس شام میں ملا۔ ٹائٹل اچھا رہا۔ ابتدا ہمیشہ کی طرح انگارے سے کی جو اس بار حقیقتاً انگاروں کی طرح ہی دہکتی دکھائی دی۔ قسطینا کا کردار اچھا اضافہ ہے۔ لڑائی کے مناظر بہت اچھے رہے۔ حیات کی موت نے افسردہ کیا۔ اب آقا جان کو بھی سبق ملنا چاہیے۔ ابتدائی صفحات پر نشور ہادی اور امجد رئیس کو آنے دیا کریں۔ ایچ اقبال سے خودکش جیسی کہانی لکھوائیں اور کاشف زبیر کی منتخب کہانیوں کو کتابی شکل میں لائیں۔ تبصرہ نگار بھی اچھا لکھتے ہیں۔ آج کل ہمارے دل پر تو خزاں کا راج ہے۔ دور دور تک صحراؤں کی دھول اُڑتی پھرتی ہے اور ہم گنگناتے ہوئے ایک ہی مصرعے کی تکرار کرتے پھرتے ہیں کہ اس دشت میں اِک شہر تھا اور وہ شہر تو منہدم ہو چکا، آپ سب سے التجا ہے کہ ہمارے لیے دعا کیجیے گا۔“

ناظم آباد سے ادریس احمد خان کی نیتِ شوق ”نومبر کا جاسوسی حسبِ روایت بہت خوب تھا اور سرورق بھی حسبِ حال تھا جو ذاکر صاحب کے فن کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ چینی نکتہ چینی میں وارد ہوئے۔ ناموں کی محفل میں سرِفہرست افتخار حسین نظر آرہے تھے۔ اسرار ساقی بہت شکریہ، اللہ آپ کو قید و بند کی پابندیوں سے آزادی دے آمین۔ بھائی بابر عباس خوش آمدید! بہت عرصے بعد محفل میں آمد ہوئی۔ سب جاسوسی کے دوستوں کو ہماری طرف سے بہت بہت خلوص بھرا اسلام۔ کہانیوں میں آتشِ بغاوت سے آغاز کیا، ایچ اقبال کی بہترین کاوش تھی اور دوسرا حصہ بھی یقیناً اچھا ہوگا۔ دوسری کہانی کاشف زبیر کی گھر تھی۔ ان کی ہر کہانی اپنی ایک پہچان ہے۔ جمال دستی کی پھندا بھی اپنی جگہ کامیاب رہی۔ مقفل لاش، لب بام، بھی اپنی جگہ اچھی تحریریں تھیں۔ انگارے جو طاہر جاوید مغل کی کاوش ہے، بہترین انداز میں چل رہی ہے۔ حالات و واقعات میں تسلسل اور دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم ہے۔ تحریر ختم ہوتی ہے مگر تشنگی کا احساس برقرار رہ جاتا ہے جو کسی بھی تحریر کی مقبولیت کا خاصہ ہے۔ آوارہ گرد نے بھی اپنی دلچسپی پہلے دن سے جاری رکھی ہوئی ہے۔ بہت مبارکباد ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب۔ منظر امام کی ڈرپوک بھی بہت خوب صورت کہانی تھی جو کشمیر جنت نظیر کے پس منظر میں لکھی گئی۔ شکاری محبت اور گھاؤ بھی پسند آئیں اور آخری صفحات کی دونوں کہانیاں بھی بہت خوب تھیں۔ معلومات سے پُر کترنیں بھی معلومات کا خزانہ ثابت ہوئیں۔“

پشاور سے طاہرہ گلزار کی بھرپور حاضری ”اس بار تو حد ہی ہوگئی۔ جاسوسی بہت تاخیر سے ملا۔ ٹائٹل حسینہ کو 9 نومبر کی چھٹی نہ ملنے پر اداس دیکھا۔ گرین قمیص اور اس پر سفید پھول کیا پیارا لگ رہا تھا۔ افتخار حسین اعوان بہت عرصے بعد حاضر ہوئے۔ ویلکم جناب، یہ دکھ درد اور خوشیاں تو زندگی کے ہمسفر ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ آپ کو صبرِ کامل اور ہمت عطا کرے، آمین۔ ہمیشہ کی طرح تبصرہ لاجواب، مبارکاں۔ اسرار ساقی بھی دوستوں کو دعا دیتے نظر آئے۔ بھائی دونوں ملکوں کے سیاست داں بس اپنے عوام کو لوٹ رہے ہیں۔ بے وقوف بنا رہے ہیں۔ سیف الرؤف، شعیب الرؤف جاسوسی سے محبت اپنی جگہ لیکن آپ کو اپنے دماغ کا علاج ضرور کرانا چاہیے۔ بابر عباس آگئے میدان میں اب سب کی خیر نہیں اب سب کی دھلائی ہوگی، بہت مزہ آئے گا۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ پہلی مختصر کہانی جمال دستی کی پھندا، سراغ رساں نے بہت قلیل ٹائم میں قاتل کا پتا چلا لیا۔ سچ کہتے ہیں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ دوسری مختصر تحریر اسفند یار کی مقفل لاش یہاں بھی سراغ رساں نے بہت قلیل ٹائم اور جلدی میں قاتل کو پہچان لیا۔ کاش ایسے سراغ رساں پاکستان میں بھی ہو جائیں۔ اپنے فیورٹ رائٹر مغل اعظم کی تحریر انگارے کا ایک ایک لفظ، ہر منظر اور ہر انداز دل و دماغ پر چھپ جاتا ہے اور پڑھنے میں کھو جاتے ہیں۔ دوسری پسندیدہ تحریر آوارہ گرد ہے جسے ڈاکٹر عبدالرب بھٹی ہر مہینے اپنے خوب صورت انداز میں تحریر کرتے ہیں۔ آخر شہزی ناناشکور کے ساتھ گل منجارو کی طرف اپنے دوستوں کو حاصل کرنے کے لیے روانہ، اُف شہزی کا حوصلہ دلدل سے خود کو سوشیلا اور ناناشکور کو نکالنا، جنگلات میں سفر گل منجارو کا۔ ان پر آگ والے تیر پھینکا جانا وحشیوں کے ساتھ مقابلہ سب بہت بھرپور تھا۔ کاشف زبیر کی تحریر گھر ایک ایک لفظ انسان کے دل و دماغ کو جھنجوڑ لیتا ہے۔ ایان، ہر واقعہ اور مدثر اگر

مجرم تھے بھی تو اپنے ضمیر اور اللہ کے مجرم تھے۔ شیطان صفت ڈاکٹر نے ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھایا اس ڈاکٹر کا یہی انجام ہونا تھا۔ ہر بار منظر امام انکل مزاحیہ یا طنز سے بھرپور تحریر لاتے ہیں لیکن اس بار وہ اتنے حساس موضوع پر تحریر لائے۔ ڈرپوک جو ایک کشمیری مسلمان نوجوان صفدر کے گرد گھوم رہی تھی۔ صفدر ہرگز ڈرپوک نہیں تھا۔ بس اس کو اصل پتا نہیں چل رہا تھا مقصد کی سمجھ آگئی تو ڈر بھی ختم۔ ویلڈن منظر امام..... سلیم انور کی مختصر تحریر گھاؤ سو سو مرن بہر ور اکرام کی تحریر بنیاد بہت شاندار کہانی۔ معاشرے کے ہر کردار اور سوچ کو الفاظ کے رنگ میں ڈھال کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔"

تحصیل علی پور سے محمد جاوید خان کی رائے "صنفِ نازک اور بھیڑ کی سی ست ترین چال چلتے ہوئے جاسوسی نامہ تاخیر سے ہماری آنکھوں کی زینت بنا، سر سبز پیراہن میں ملبوس کنواری ناری پھن پھیلائی ہوئی ناگن کی طرح لگی۔ فیصل آباد کی کچھوا اور خرگوش کی جوڑی کی دوڑ اوڑی نے بہت محظوظ کیا۔ ساگر تلوکر کے مرحومین اور مختار آزاد کی لحد کو اللہ پاک نور سے منور فرمائے، آمین۔ ماشاء اللہ مشال نے تو بڑی جلدی رزلٹ دیا ہے بہر حال نیک تمناؤں کے ساتھ مبارکاں۔ طاہرہ گلزار بڑی خوش نصیب ہو کہ ایک ایک لفظ شائع ہوا ہے ورنہ مشترک چچا، چاچو جی کے ہاتھ میں موجود قینچی کے دانت نہ ہونے کے باوجود مسوڑھوں سے اس قدر تیزی سے کاٹتی ہے کہ رہبہ کر باقی نام ہی رہ جاتا ہے خیر اپنا تو نام ہی کافی ہے۔ ایچ اقبال کی آتش بغاوت حب وطن کے جذبوں کو مہمیز کرتی ہوئی۔ فی الحال ادھوری کاوش تھی۔ انگارے میں ایکشن گرل قسطینا اور شاہ زیب کا گٹھ جوڑ دشمنوں کے جوڑ جوڑ کو توڑ موڑ دے گا۔ کاشف زبیر کی کاوش گھر دل سے پڑھی جانے والی تحریر تھی۔ مختار آزاد کی شکاری محبت میں ولسن کی بیوی پرتی نے متاثر کیا۔ ولسن نے محبت کا میٹھا سوڈا تو بہت ڈالا مگر افسوس کہ اس بے چارے کے عشق کی دال بالکل ہی نہیں گلی، دولت پرست جینی کو خالص محبت اور عزت راس ہی نہ آئی۔ کبیر عباسی کے رنگ بے غرض میں انور حسنات کے بھروسے کو توڑتا رہا۔ حسنات کی بے غرض دوستی نے مفہوم دوستی سے آگاہ کیا۔ سرور اکرام کا رنگ بنیاد شمارے کا تحفہ خاص تھا۔ جو پاک سرزمین کے موجودہ حالات کا غماز ہے۔ نومبر کے شمارے کی تمام رنگینہ کہانیاں تعمیری پہلوؤں سے بھرپور تھیں۔"

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی خامہ فرسائی "جاسوسی سے دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضر ہیں۔ یہ دو ماہ ہم پر بہت سخت گزرے کہ 20 ستمبر کو پیارے ابو جان جگر کے کینسر کی وجہ سے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ہمیں خون کے آنسو رونے کے لیے تنہا چھوڑ دیا۔ بہت زندہ دل انسان تھے اور اب بھی وہ ہر جاننے والے کے دل میں زندہ ہیں۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو اور گھر والوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے) ماہ نومبر کا جاسوسی 4 کو مسرور میں ملا۔ سرورق کو ایک ماڈل اور ایک مرد جو مجھے نواب انکل مرحوم کی طرح لگے سے سجایا گیا، بہر حال اچھا کمبی نیشن تھا۔ اداریہ پڑھا۔ کہیں سے تو کوئی اچھی خبر آئی۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم نے اچھا پرفارم کیا، آئندہ بھی ان سے ایسی توقعات رکھیں گے۔ گڈ پاکستانی ٹیم! اللہ پاک پاکستان کو امن کا گہوارہ بنا دے اور اندرونی اور بیرونی سازشوں سے مامون فرما دے اور حکمرانوں کو عقلِ سلیم عطا کرے آمین۔ دوستوں کی محفل میں افتخار حسین اعوان بالکل ٹھیک کہتے نظر آئے کہ 2005ء کے گیارہ سال بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں۔ دوسرے نمبر میرے پیارے دوست اور بھائی اے ار ساقی

بہترین تبصرہ کے ساتھ محفل کی جان بنے۔ آپ کی محبت کہ آپ نے میری کمی شدت سے محسوس کی بہرحال غیر حاضری کی وجہ میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ شاید یہ درد بھی اب شدت سے ہمارے ساتھ رہا کرے گا۔ سیف الرؤف اور شعیب الرؤف کا طنز و مزاح سے بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ بابر عباس کیا کہنے بہت بہترین تبصرہ نگاری کی آپ نے۔ احسان سحر اللہ پاک آپ کے تمام کاموں میں راحت اور سکھ بھر دے آمین۔ اے زیڈ وصلی مختصر تبصرے کے ساتھ بھی اچھے رہے۔ نامعلوم جگہ سے بے نام خط کی اچھی کاوش۔ سجاد خان آف موچھ کی بھی عمدہ انٹری۔ میرے دوست اللہ پاک آپ کے تمام دکھ دور کرے۔ رانا بشیر احمد ایاز کی خوب صورت تبصرہ نگاری۔ سجاد احمد ساحر بھی جاسوسی کے صفحات پر چھا گئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایچ اقبال کی آتشِ بغاوت پڑھی بہت عمدہ تحریر ہے۔ سیر بنا راغب کی لب بام میں فاکس نے کینڈن کی مدد کی پر آخر میں خود بھی مالا مال ہو گیا۔ ولیم کو دھندے سے آؤٹ کر دیا۔ پھر اپنے فیورٹ رائٹر محترم کاشف زبیر کی گھر پڑھی بہت ہی عمدہ تحریر رہی۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے پر پہنچے تو وہاں انگارے کچھ زیادہ ہی گرم تھے کہ ان کی تپش بروناہی میں نظر آنے لگی۔ شاہ زیب اور سجاول وہاں بھی کارناموں میں لگ گئے۔ کچھ کرداروں کا اضافہ بھی اچھا لگا۔ قسطینا، شاہ زیب کو پہچان گئی۔ تمکین رضا کی شکاری بھی اچھی رہی۔ تنویر ریاض کی شہرت کی خاطر کافی ہولناک تحریر تھی کہ اپنی اولاد تک کو موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ ارشد بیگ کی دیوانہ بھی اچھی اسٹوری تھی۔ آوارہ گرد، بھٹی صاحب کا قلم بھی زوروں پر ہے۔ کلی منجارو جانا ابھی تک شہزی وغیرہ کے لیے سودمند ثابت نہ ہوا کہ نانا اور اس کے ساتھی جان سے گئے۔ آخر میں سوشیلا کی آواز نے دشمنوں کو ہوشیار کر دیا۔ منظر امام ڈرپوک لے کر آئے۔ کشمیر میں پیش آنے واقعات کے تناظر میں اچھی اور بہترین تحریر لکھی ہے۔ جب بات آزادی کی ہو تو پھر کوئی ڈرپوک نہیں رہتا۔ صفدر اور جنید کی طرح کئی اور شہادتیں بھی رنگ لائیں گی اور کشمیر آزاد ہوگا انشاء اللہ۔ مختار آزاد کی شکاری محبت، وِسن نے اپنی بیوی کی موت کا کیا اچھا بدلہ لیا جو پولیس نہ کر سکی وہ اس نے چند دنوں میں کر دکھایا۔ سلیم انور کی مختصر گھاؤ بھی اچھی رہی۔ سرورق کا پہلا رنگ بنیاد اچھی تحریر تھی۔ واقعی دنیا ان تین چیزوں میں الجھی ہے زر زن زمین۔ کبیر عباسی کی بے غرض دو دوستوں کی کہانی۔ حسنات نے دوستی کی خاطر سولی پر چڑھنا گوارا کر لیا پر انور نے کوئی کسر نہ چھوڑی تو انجام بھی دیکھ لیا، فرحین کی محنت قابلِ داد تھی اور محبت بھی۔“

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی خوش امیدی ”نومبر کا شمارہ کافی انتظار کروانے کے بعد 8 نومبر کو آخر کار مل گیا۔ سرورق ذاکر انکل ہمیشہ محنت سے سجاتے ہیں۔ ٹائٹل ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ چیخی نکتہ چینی کی محفل میں قدم بڑھائے جہاں افتخار حسین اعوان اپنی بکھری یادیں سمیٹے نظر آئے۔ کبھی کبھی انسان بے بس ہو جاتا ہے۔ افتخار بھائی، زندگی اسی کا نام ہے بس جینا پڑتا ہے۔ پے در پے صدمات انسان کو کمزور کر دیتے ہیں۔ چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد محفل میں داخل ہونے کی جسارت کی۔ غائب اس لیے رہا کہ ابو کے بعد ایک ایسی ہستی نے بھی شہرِ خموشاں میں سکونت اختیار کر لی جو مستقبل میں ہم سفر تھی۔ ڈسٹرکٹ جیل سے اپنے اسرار ساقی کافی چہکتے نظر آئے۔ جیل سے خط لکھنا آپ کی جاسوسی سے محبت کی علامت ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ لو جی، ہم نے کیا کیا اندازے لگائے اور تصویر نکلی مختیار کی۔ سیف بڑا جی دار بندہ لگتا ہے۔ جاناں اور شاہ زیب کے میل جول خطرے کی علامت ہیں۔ آوارہ گرد اس دفعہ کافی سنسنی خیز رہی۔ ناشکور کی موت کا افسوس ہوا۔ کہانی کی مین ہیروئن عابدہ اور زہرہ بیگم کا تذکرہ قسط میں نہ ہو تو مزہ نہیں آتا۔ جنگلوں کے راز مجھے ویسے بڑے اچھے لگتے ہیں۔ آوارہ گرد ٹریک پر آنے لگی ہے۔ ابتدائی صفحات پر آتشِ بغاوت نے کچھ خاص متاثر نہیں کیا ویسے مجموعی طور پر اچھی کہانی تھی۔ رنگ جاسوسی کی جان ہوتے ہیں۔ سرور اکرام بنیاد لے کر اچھے رہے۔ ہر کردار کی زبردست منظر نگاری تھی۔ زندگی کے کئی پہلوؤں کو سمجھاتی تحریر دل میں اتر گئی۔ دوسرا رنگ بے غرض بہت اچھا رہا۔ کبیر عباسی جاسوسی کے لکھاریوں میں اچھا اضافہ ہیں۔ ان کی پچھلی تحریر بے داغ منصوبہ بہت زبردست تحریر تھی مگر بے غرض مجھے اس سے بھی دلچسپ لگی۔ منظر امام نے کشمیر کے موضوع پر کہانی لکھ کر کشمیری بھائیوں کا درد بیان کیا۔ بزدل لوگ بھی کبھی کبھی ایسا کام کر جاتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جائے۔ صفدر کی جرأت نے متاثر کیا۔ اپنے محبوب قلم کار کاشف زبیر کی کہانی گھر اعلیٰ کہانی تھی۔ انسانی دنیا سے بیزار انسان کی کہانی بہت زبردست تھی۔ گھاؤ، شکاری اور لب بام اچھی لگیں۔ زندگی کے چراغ نے روشنی برقرار رکھی تو جاسوسی سے رشتہ برقرار رہے گا انشاء اللہ۔

مسقط، عمان سے شاہد امین کا استفسار ”سرورق پر نظر بابے پر جا کے رکی جو لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لگتا ہے لڑکی جان بوجھ کر اگنور کر رہی ہے۔ چیخی نکتہ چینی میں سب سے اوپر ایک بڑا سا ڈائمنڈ دیکھا جس کی روشنی سے ہمارا دل روشن ہو گیا اور نیچے موتیوں جیسے احباب کے تبصرے، قیدیوں کے دو تبصرے بھی شامل تھے۔ ایچ اقبال نے ہمیشہ کی طرح کمال کیا۔ لیکن ہمیں لگتا ہے کہ اس کہانی کا اختتام ہمیں رُلا دے گا۔ بے غرض کبیر عباسی کی سنسنی اور تھرل سے بھرپور کہانی کا مزہ آ گیا۔ مزاح کا بس ذکر ہی ہوا اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کاشف زبیر کے گھر نے بے گھر افراد کے مسائل اور بڑے محلات میں رہنے والوں کی لامحدود خواہشات کا پول کھولا۔ ایسا محسوس ہوا اس جنگل میں بابا کے ساتھ چل پھر رہا ہوں۔ جمال دستی ایک چھوٹے سے پھندے کے ساتھ تشریف لائے، ابھی کہانی پر ارتکاز ہوا ہی تھا کہ کہانی کو پھندا لگ گیا۔ دستی صاحب سے کسی بڑے پھندے کی پُرزور فرمائش ہے۔ مقفل لاش اسفند یار لے کر آئے۔ کہانی کے تعارف نے پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ اچھی سراغ رسانی تھی۔ انگارے اس بار خوب دہکے اور گرما گرمی میں پوری قسط گزر گئی۔ دو دن سے زیادہ ہو گئے اب شاہ زیب کو پانی پلا دیں۔ بارش بھی نہیں ہو رہی۔ آوارہ گردی کو آج دل نہیں مانا۔ شکاری، شہرت کی خاطر، دیوانہ سے آنکھیں دو چار کیے بیٹھے ہیں، ابھی یہاں تک ہی پڑھ پائے ہیں۔ شمارے پر تبصرے کے بعد ایک سوال ہے وہ کون سی وجہ ہے جو جاسوسی کو ای بک کی شکل میں شائع نہیں ہونے دے رہی۔ میری رائے میں یہ قدم وقت کی ضرورت اور ادارے کی ترقی کا موجب بنے گا۔ اب تو یونیورسٹی کی کتب بھی ای بک کی شکل میں میسر ہیں۔“ (جی جدیدیت کے رجحان کو روکا نہیں جا سکتا...... دیکھتے ہیں اعلیٰ حکام کب اس طرف اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں)

راجن پور سے ماہ تاب گل کا مکمل تجزیہ ”جاسوسی اس مرتبہ ناقابلِ یقین حد تک جلدی مل گیا۔ چٹکی کاٹنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ ایک جیتی جاگتی چٹکی (زینب) ہر وقت ساتھ موجود ہوتی ہے بیدار رکھنے کے لیے۔ سرورق سے آگے بڑھے۔ فہرست کی ترتیب اس بار بھی زبردست رہی۔ پھر اگلا پڑاؤ خوشبو سے مہکتی اپنی محفل میں۔ ماننا پڑے گا بھئی آپ کی ترتیب و تزئین کو۔ انکل جی کا ابتدائیہ ہمیشہ کی طرح حقائق کی تلخی اور چند خوشنما باتوں پر مبنی

تھا۔ ابتدائی تبصرے پر براجمان تھے اپنے افتخار حسین۔ ان کا تبصرہ زندگی کے تمام رنگ لیے ہوئے تھا کہیں غم، کہیں بے بسی، کہیں غصہ تو کہیں خوشی۔ پچھلے کچھ عرصے پے درپے ہونے والے حادثات سے بمشکل خود کو سنبھال پائے تھے کہ اب ان کے بڑے بھائی ابدی نیند سو گئے، بہت مشکل ہوتا ہے اپنوں کے بغیر جینا لیکن یہی قانونِ قدرت ہے اللہ پاک مرحوم کے درجات بلند فرمائے آمین۔ دوسرے نمبر پر براجمان اسرار ساقی صاحب، طاہرہ آنٹی سے راہنمائی مانگتے نظر آئے۔ بہت اچھے بھئی بہت اچھے بزرگوں کی رہنمائی لینا اچھی بات ہے۔ سیف الرؤف اور شعیب الرؤف خوش کیتا اے۔ کھاریاں سے بابر عباس آپ کے تبصرے میں ایک بات بہت اچھی لگی اور وہ تھا میرا نام۔ احسان سحر کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جاندار رہا۔ ارے واہ ہمارے پڑوس یعنی رحیم یار خان سے ایک اور رانا موجود، رانا بشیر گڈ۔ نوال اینڈ مشال ایک اچھی خبر کے ساتھ موجود تھیں۔ بیٹی اللہ کی رحمت ہے، بہت بہت مبارک ہو مشال آپ کو۔ طاہرہ آنٹی کی آمد بھی اچھی رہی۔ اب بات ہو جائے کچھ کہانیوں پر۔ ابتدا کی کبیر عباسی کی تحریر بے غرض سے جو کچھ زیادہ ہی بے غرض محسوس ہوئی۔ اس مرتبہ تو کبیر آپ نے جیٹ جہاز کی طرح کہانی کو دوڑا بلکہ اڑا دیا۔ کاشف زبیر صاحب کا نام دیکھ کے خوشی ہوئی۔ مگر ان کی سب تحریروں کی طرح بہترین تھی۔ ڈاکٹر شایان کا انجام اس کے اعمال کا نتیجہ۔ آوارہ گرد لاجواب قسط۔ بھئی سر بہت اچھے سے کہانی کو لے کر چل رہے ہیں اور اب گل منجارو کی فینٹیسی۔ زبردست۔ نانا شکور کو کچھ جلدی ہی مار دیا اور آخر میں پھر سنسنی خیز سچویشن کری ایٹ کر کے ہمیں ایک ماہ انتظار کی سولی پر لٹکا دیا۔ سوشیلا کو کچھ ہوا نا پھر اچھا نہیں ہوگا۔ انگارے یکسانیت کا شکار۔ مغل انکل کہانی میں ٹوئسٹ لائیں پلیز۔ منظر امام کی ڈرپوک، کشمیر کے تناظر میں لکھی گئی لاجواب تحریر۔ شکاری محبت، محبت کرنے والے شوہر کا شکار مزہ آیا پڑھ کے۔ سرورق کا پہلا رنگ بنیاد، بہترین کاوش، آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی تحریر۔ لسانی بنیادوں پر ہونے والے جھگڑے۔ ایک تلخ حقیقت۔ کترنیں بھی اس مرتبہ کافی بہتر تھیں۔"

لاہور سے تانیہ مہر کا مطالعہ "طویل انتظار کے بعد جاسوسی 7 نومبر کی دھند میں لپٹی شام کو گھر تشریف لایا، اسے دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ لیکن اسے ہاتھ لگانا تو دور کوئی دیکھنے بھی نہیں دیتا کیونکہ گھر میں آخری نمبر پر ہوں اور جاسوسی بھی آخر میں نصیب ہوتا ہے۔ اس بار بے چینی زیادہ تھی تو کچھ منت و سماجت کے بعد مل ہی گیا۔ شمارہ ہاتھ میں آتے ہی ٹائٹل پر نظر پڑی، گرداب کے چوہدری افتخار مجھے پتا نہیں کیوں غصے سے دیکھ رہے تھے۔ پیاری حسینہ اپنے بال چوہدری کے سر پر رکھے کسی تیسرے کو دیکھ رہی تھی۔ افتخار اعوان کا تبصرہ پڑھ کر آٹھ اکتوبر کی صبح یاد آ گئی۔ جب سیکڑوں گھر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے تھے اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی آفتوں سے بچائے، آمین۔ سیف الرؤف، شعیب الرؤف کا تبصرہ بہت شاندار تھا۔ بے نام کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ آخر میں طاہرہ گلزار حسبِ معمول چہک مہک رہی تھیں۔ پہلی اسٹوری ایچ اقبال کی ہمارے معاشرے کی سیاسی حقیقتوں کو بیان کر رہی تھی۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ انگارے میں سیف والا سسپنس بھی ختم ہوا۔ شاید سیف تاجور کا منگیتر نکل آئے۔ مغل صاحب بڑے بہترین انداز میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ کاشف زبیر کی گھر بہترین اسٹوری تھی مگر معذرت کے ساتھ انداز کاشف زبیر کا نہیں تھا۔ (اچھا پھر یہ انداز کس کا تھا؟) اسفند یار کی اسٹوری مقفل لاش میں کیس کچھ جلدی حل ہو گیا تھا۔ کبیر عباسی کی اسٹوری بے غرض شاندار لگی۔ انور کی خود غرضی ہمارے معاشرے کا حقیقی روپ ہے، ہیرو کچھ زیادہ ہی معصوم تھا۔ اللہ کبیر عباسی کو مزید کامیاب کرے، آمین۔ منظر امام کی کہانی ڈرپوک کے اینڈ نے تو رُلا ہی دیا۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

بھکر سے آصف بشیر ساگر کی داستان "جاسوسی کے نام میرا پہلا محبت نامہ۔ (خوش آمدید) سات نومبر کی دوپہر کو جاسوسی ملا تو فوراً ہی دل کو قرار سا مل گیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل پر نگاہ ڈالی، معصوم سی صورت والی حسینہ نے دل موہ لیا۔ جبکہ مرد اس بار کچھ الجھن کا شکار ہے۔ ماتھے پر بل ڈالے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا۔ مدیرِ اعلیٰ نے اداریے میں قومی ٹیم کو شاباشی دی، اچھا لگا۔ محفلِ یاراں میں پہنچا تو افتخار حسین اعوان کو تخت ہیں شوخ فقط ہم تو زمانے، تم پابندِ سلاسل رنجور ہیں ہم بھی نشین پایا۔ افتخار صاحب مبارکاں، خوب لکھتے ہیں۔ سجاد خان صاحب کے نام طاہرہ گلزار صاحبہ اس بار کافی غصے میں تھیں، میم بہن بھائیوں میں تو نوک جھوک چلتی ہی رہتی ہے، پلیز غصہ تھوک دیں۔ انگارے سب سے پہلے پڑھتا ہوں مگر اس بار آتشِ بغاوت شروع کی تو پھر ایک ہی نشست میں ختم کی، واہ کہانی کے پلاٹ سے لے کر ہر کردار اور ہر ڈائیلاگ کے ساتھ یوں انصاف برتا گیا تھا کہ حقیقت کا گمان ہونے لگا۔ کہانی کار نے سسپنس بھی عروج پر پہنچا دیا ہے۔ وطنِ عزیز میں بھی کچھ نام نہاد آمریت کے حامی اسی قسم کے حالات چاہتے ہیں۔ اس کہانی نے واقعی پہلے صفحات کا حق ادا کیا، دوسری قسط کا انتظار ہے۔ اس کے بعد گھر پہنچا، کاشف زبیر کے لیے اور کیا کہوں اللہ پاک ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ کیا خوب لکھاری تھے ایک الگ ہی انداز تھا کہانی کو آگے بڑھانے کا۔ لبِ بام سے سیکھا جیسے کو تیسا۔ کینڈن کے مکالمات سے میں کافی جذباتی ہو گیا۔ آگے جمال دتی صاحب پھندا لگائے بیٹھے تھے۔ اچھی تحریر تھی۔ اسفند یار کی کہانی میں سراغ رساں اولسن کی ذہانت نے مجرم کو بے نقاب کیا۔ باقی چھوٹی کہانیوں میں شکاری بھی بہت پسند آئی۔ اس کے بعد انگارے پر پہنچا، اب تک کی سب سے سنسنی خیز اور بہترین قسط تھی۔ قسطینا کا کردار بہت ہی پسند آیا، مغل صاحب کی یہ خوبی بھی کمال ہے کہ کردار کو عین موقع پر انٹری دیتے ہیں، سیف بھی بہت اچھا کردار ثابت ہوگا۔ سجاول کی آج تک سمجھ نہ آسکی کہ گلتاولن ہے پر کام ہیرو والے۔ انیق کا نٹ کھٹ انداز دل کو چھو لیتا ہے۔ کافی دنوں سے سجاول کی ماں، بہن کا کوئی ذکر نہیں کیا جا رہا؟ مجموعی طور پر یہ قسط سب سے زیادہ پسند آئی۔ رنگوں نے بھی اس بار آخری صفحوں کو کافی رنگین کیا۔ کبیر عباسی بہت بہت مبارک باد، پتا نہیں کیوں مگر آپ کا انداز مجھے کاشف زبیر سا لگتا ہے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں، اللہ آپ کو مزید آگے آنے کا موقع دے۔ کہانی کا ٹیمپو، کردار اور پلاٹ لاجواب۔ آل دا بیسٹ۔ پہلا رنگ بنیاد بھی بہت اچھا لگا، سرور اکرام صاحب نے اپنا تعارف وقت کے نام سے کروایا۔ سچ ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان ہی کسی نہ کسی چکر میں ہے۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ اسرار ساقی، اٹک۔ بابر عباس، حسنین عباس، کمیل عباس، کھاریاں۔ منصور حبیب پلیبو، گھاروٹھٹھہ۔ پرویز لانگا، جدہ سعودی عرب۔ نصیر احمد چوہدری، گجرات۔ شفقت محمود، کھیوڑہ۔

آتشِ بغاوت

ایچ اقبال

ہر طرف رواں دواں ظلمتوں کے کارواں
حادثے قدم قدم راستے دھواں دھواں
مشعلیں بجھا گئیں روز و شب کی آندھیاں
پھر بھی اے مسافرو تم رہو رواں دواں

صلاحیت بالکل آگ کی طرح ہوتی ہے... آگ اگر بے وقوفوں کے ہاتھ لگ جائے تو اردگرد کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کرسکتی ہے... یہ ذہانت ہی ہے جو اسے قابو میں رکھتی ہے... اور آگ ہی کیوں... ذہانت تو حسن کو بھی اس طرح گرفت میں کرلیتی ہے جس طرح کوئی ہوشیار شہسوار تندخو گھوڑے پر غالب آجاتا ہے... کارزارِ سیاست میں بھڑکتی آگ کے شعلوں کا احوال جو ہر دم ہر نفس کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے تیار تھے... اقتدار کے ایوانوں میں چلتی پھرتی کہانی کے اسرار ورموز... جہاں سازشوں کے ساتھ ساتھ محبتوں کے کھلاڑی اپنی بازی دل و جاں سے کھیل رہے تھے... انجام سے بے خبر ایک کھلی جنگ کی تباہ کاریاں...

آتشِ بغاوت میں گھری ایک نازک اندام حسینہ کے آہنی ارادوں کی داستانِ حیات

شاہ صاحب ایک بہت بڑے اسکالر تھے۔ ان کی سات کتابیں شائع ہو چکی تھیں جن میں ”مذاہب عالم کا تقابل“ نے بہت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل کی تھی۔ اسی میں کچھ ایسی باتیں بھی تھیں جن پر روایات کے پرستار مولوی ان کے خلاف ہو گئے تھے۔ ان کی مخالفت کا جواب شاہ صاحب ٹی وی چینلز کے پروگراموں میں دیا کرتے تھے جس کے باعث انتہا پسند سوچ کے حامل افراد نے انہیں دو مرتبہ قتل کرانے کی کوشش کی تھی اور ہر مرتبہ وہ بال بال بچے تھے۔ ملک میں ان کے معتقدین کی تعداد کئی لاکھ تھی اور دیگر ممالک میں بھی ان کی تعداد ایک اندازے کے مطابق پچاس ہزار سے زائد تھی۔

شاہ صاحب کے والد ایک بہت بڑے بزنس مین تھے۔ انہوں نے ورثے میں بہت دولت اور کئی کاروباری ادارے چھوڑے تھے جو شاہ صاحب کے حصے میں آئے تھے مگر ان کی دنیا علم و فکر کے دائرے میں مقید تھی۔ کاروبار سے رغبت انہیں برائے نام بھی نہیں تھی اس لیے انہوں نے تمام ادارے فروخت کردیے تھے۔ انسانیت کی خدمت بھی ان کی فطرت میں شامل تھی چنانچہ انہوں نے ایک بہت بڑا اسپتال، ایک یونیورسٹی اور ایک فلاحی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔

اسپتال کے تمام معاملات انہوں نے اپنے بیٹے ڈاکٹر نبیل کو سونپ دیے تھے۔ فلاحی ادارہ ان کی بیٹی اقصیٰ احمد چلاتی تھی جس میں اس کا مددگار اس کا شوہر احمد باختر ایک ایرانی نژاد تھا۔

مذہبی انتہاپسندوں کی وجہ سے شاہ صاحب نے اپنے معتقدین کے بے حد اصرار پر وطن کو خیرآباد کہا تھا۔ پانچ سال سے وہ پرتگال میں تھے اور وہیں سے انہوں نے اپنی تصانیف وتالیفات کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔

اس خودساختہ جلاوطنی کے لیے انہوں نے پرتگال کا انتخاب دووجوہ سے کیا تھا۔ وہاں انہیں قیام کے لیے اپنے چھوٹے چچازاد بھائی کا گھر میسر تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پرتگال ایک پُرامن ملک ہے۔ ایک چھوٹا سا ملک جس کی آبادی بھی ایک کروڑ سے زیادہ نہیں۔ وہاں بھی انہوں نے ایک فلاحی ادارہ قائم کیا تھا جو مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر کام کرتا تھا۔

انہوں نے ''مذاہبِ عالم کا تقابل'' نامی کتاب لکھی تو تھی لیکن کسی بھی مذہب کے خلاف ایک جملہ بھی نہیں لکھا تھا۔ اسی وجہ سے انہیں عیسائی دنیا میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کی کتابوں کے انگریزی تراجم شائع ہو چکے تھے۔ کئی بڑے ملکوں نے انہیں شہریت دینے کی پیشکش کی تھی مگر انہوں نے پرتگال سے کہیں اور منتقل ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ان پانچ سالوں میں وہ پرتگال سے باہر نکلے تھے تو صرف اسپین کی حد تک جس کی سرحد پرتگال سے ملی ہوئی ہے اور جہاں سے مسلمانوں کے ماضی کی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ وہاں شاہ صاحب کا زیادہ وقت مسجدِ قرطبہ میں گزرتا تھا۔

ان کی واپسی کی خبر نے سارے ملک میں ہلچل مچا دی۔

ایسی ہی ہلچل ری پبلکن فورم کے اجلاس میں بھی ہوئی۔

''ان کے استقبال کے لیے ایک بہت بڑی تعداد ائرپورٹ پہنچے گی۔'' صدر اسعد گیلانی نے کہا۔ ''حکومت ان حالات میں ان کی آمد گوارا نہیں کر سکتی۔ لوگوں کو ائرپورٹ جانے سے روکنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔''

''ان کے معتقد دیوانے ہیں۔ وہ ہر صورت میں ائرپورٹ جانے کی کوشش کریں گے۔'' کسی نے کہا۔

''تو پھر ان پر گولیاں ضرور چلیں گی۔'' کوئی اور بولا۔

پشمینہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے ان باتوں میں دلچسپی ظاہر نہیں کی لیکن اس کی سوچ یقیناً اسی بارے میں ہوگی۔

دس منٹ تک بھی جب ان باتوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تو وہ بول پڑی۔ ''اجلاس شروع کیا جائے۔'' یہ اس نے دوسری مرتبہ کہا تھا۔

چیئرپرسن کے یہ الفاظ حکم کا درجہ رکھتے تھے۔ اجلاس میں اس پر برائے نام گفتگو ہوئی کہ ریلی نکالی جائے یا نہ نکالی جائے کیونکہ پشمینہ فیصلہ سنا چکی تھی کہ ریلی نہیں نکالی جائے گی۔ اس پر زیادہ بات ہوئی کہ پشمینہ کو نئی صورتِ حال (شاہ صاحب کی آمد) میں امریکا جانا چاہیے یا نہیں، یا یہ اقدام موخر کر دیا جائے۔

یہ اجلاس ایک گھنٹے سے زیادہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں طے پایا گیا کہ پشمینہ کی امریکا روانگی کا فیصلہ شاہ صاحب کی آمد کے بعد کے حالات کی روشنی میں کیا جائے گا، نیز ریلی نہ نکالنے کے فیصلے پر بھی اس کے بعد ہی نظرثانی کی جائے گی۔

اجلاس کے دوران میں ٹی وی بند کر دیا گیا تھا ورنہ یکسوئی سے گفتگو ممکن ہی نہیں تھی، البتہ ڈیبرا اور پشمینہ کی پریس سیکریٹری رضوانہ کو ایک اور کمرے میں بھیج دیا گیا تھا تاکہ اگر کوئی بہت غیر معمولی خبر آئے تو اجلاس کے دوران میں ہی پشمینہ کو اس سے آگاہ کیا جائے ورنہ اس ایک گھنٹے کی خبروں کی رپورٹ اجلاس کے بعد دی جائے۔

اجلاس کے بعد سب لوگوں کو رخصت کر دیا جانا چاہیے تھا لیکن پشمینہ نے انہیں روکا۔ ''پہلے آپ سب لوگ ایک گھنٹے کی خبریں سن لیں۔ شاید کوئی ایسی خبر ہو جس پر گفتگو کرنا ضروری ہو۔''

ڈیبرا اور رضوانہ کو واپس بلایا گیا۔

رضوانہ نے ایک رپورٹ تو یہ دی کہ تمام سیاسی جماعتوں کے ایک ہنگامی اجلاس کے ساتھ ساتھ مذہبی سیاسی جماعتوں کا مشترکہ اجلاس بھی شروع ہو چکا تھا اور غیر مصدقہ ذرائع کے مطابق ''دو اتحاد'' بن سکتے تھے۔ ایک سیاسی جماعتوں کا، دوسرا مذہبی سیاسی جماعتوں کا کیونکہ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ حکومت اپنے جارحانہ اقدامات سے اس احتجاج پر قابو پالے گی جو اس وقت ہو رہا تھا اور پھر جب انتخابات ہوں گے تو سیاسی جماعتوں کا اتحاد نہ ہونے کی صورت میں ری پبلکن فورم کامیاب ہو جائے گا۔

لفظ ''انتخابات'' پر پشمینہ کی ہلکی سی ہنسی میں طنز تھا۔

ٹی وی چینلز پر ان سیاسی جماعتوں کے ترجمان کہہ چکے تھے کہ اگر ری پبلکن فورم نے ریلی نکالی بھی تو ان کی جماعت اس ریلی میں شمولیت نہیں کرے گی۔

''مجھے اس کا اندازہ شروع ہی سے تھا۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے کسی سیاسی پارٹی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور ان لوگوں کو تو مجھ سے رابطہ کرنا ہی نہیں تھا۔''

رضوانہ بولی۔ ''سب سے اہم بات میں بعد میں بتا رہی ہوں کہ تاجروں، صنعت کاروں، مزدوروں اور نہ جانے کس کس کے نمائندے ٹی وی چینلز پر آکر کہہ رہے ہیں کہ ری پبلکن فورم کو ریلی ضرور نکالنا چاہیے اور کل ہی نکالنا چاہیے کیونکہ اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل جانے دیا گیا تو مستقبل میں حکومت کی جارحیت اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ اس کے مقابل نکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔''

اجلاس کے تمام شرکا کی نظریں فوراً پشمینہ کی طرف اٹھ گئیں۔

''ڈیبرا!'' پشمینہ بولی۔ ''ٹی وی کھولو۔''

ٹی وی کھولا گیا جو چینل کھلا، وہی یہ خبر نشر کر رہا تھا کہ ریلی کے سلسلے میں اس کے نمائندوں نے گھر گھر جا کر سروے کیا تھا۔ اسی فیصد لوگوں کی خواہش تھی کہ ریلی ضرور نکالی جائے جس میں وہ بہر صورت شرکت کریں گے اور اگر ریلی نہ نکالی گئی تو کئی سیاسی جماعتوں کی اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ ری پبلکن فورم کا قیام محض ایک ڈراما ہے جو صدر حیات نے خود رچایا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ پشمینہ حیات کی کامیابی سے حکومت اسی کے گھر میں رہے گی، نیز یہ کہ پشمینہ دراصل صدر حیات کے اشاروں پر چل رہی ہے۔

''بہت خوب!'' پشمینہ کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔ ''یہ پروپیگنڈا ابھی شروع کر دیا گیا۔''

''یہ ابھی اسی ایک گھنٹے میں شروع کیا گیا ہے۔'' رضوانہ نے کہا۔ ''میں اب آپ کو اسی کے بارے میں بتانے والی تھی کہ آپ نے ٹی وی کھلوا لیا۔''

پشمینہ نے ایک طویل سانس لی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ریلی نکالنی ہی پڑے گی۔'' اس نے سوالیہ نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں میڈم!'' صدر اسد گیلانی نے کہا۔ ''اگر ریلی نہ نکالی گئی تو ہماری پارٹی کی یکایک بڑھنے والی مقبولیت یقیناً متاثر ہوگی۔''

''تقریباً ختم بھی ہو سکتی ہے۔'' دانش یزدانی بھی بول پڑا۔ ''لوگ یہ بات بھی، میرا خیال ہے کہ ٹھیک کہہ رہے ہیں کہ اگر حکومت کی جارحیت کو ابھی سے لگام دینے کی کوشش نہ کی گئی تو مستقبل میں ایسا کوئی اقدام کرنے کی صورت میں بہت زیادہ قربانیاں دینی پڑیں گی۔''

ان باتوں سے اجلاس گویا پھر شروع ہو گیا۔ فیصلہ تو یہی ہوا کہ ریلی نکالی جائے گی لیکن لائحہ عمل میں یہ تبدیلی کی گئی کہ ریلی کا رخ فوری طور پر قصرِ صدارت کی طرف نہیں بلکہ ائرپورٹ کی طرف ہوگا کہ شاہ صاحب کا استقبال کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے۔ اس کے بعد ریلی کا رخ قصرِ صدارت کی طرف کیا جائے گا تو شاہ صاحب کے معتقدین بھی اس میں شامل ہوں گے اور ریلی زیادہ طاقتور ہو جائے گی۔

آخر ٹی وی چینلز کے لیے یہ پیغام جاری کر دیا گیا کہ ریلی کل ہی نکلے گی اور اس کا آغاز صبح آٹھ بجے اس لیے ہوگا کہ تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے دس بجے تک یقینی طور پر ائرپورٹ پہنچا جا سکے...... نیز یہ کہ ریلی کی قیادت خود پشمینہ حیات کرے گی۔

اس کے بعد دس منٹ کی میٹنگ اور ہوئی جس میں چند افراد کی وہ کمیٹی تشکیل دی گئی جسے ریلی کے سلسلے میں لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

دس بجنے والے تھے جب اجلاس کے شرکا اس بنگلے سے رخصت ہوئے جسے اب پشمینہ ہی کا بنگلا کہا جا سکتا تھا۔

دانش یزدانی نے یہ بنگلا اپنی پوری فیملی کے لیے بنوایا تھا اس لیے خاصا بڑا تھا جس میں اب صرف پشمینہ اور ڈیبرا کو رہنا تھا۔ ملازمین کے لیے دو سرونٹ کوارٹر تھے۔ پشمینہ اور ڈیبرا کے لیے میٹنگ کا ہال، ایک ڈرائنگ روم، دو بیڈ روم اور ایک کچن ہی کافی تھا۔ باقی کمرے خالی تھے اور جو منزل اوپر بنائی گئی تھی، وہ تو یکسر خالی تھی۔

اتنے بڑے بنگلے کو محفوظ بنانے کے لیے بیس پرائیویٹ گارڈز کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ پشمینہ نے یہ ذمّے داری ڈیبرا کو سونپی تھی کہ گارڈز کو کہاں کہاں متعین کیا جانا چاہیے۔ ڈیبرا نے سوچ سمجھ کر دن کے لیے صرف چھ گارڈز کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ باقی چودہ گارڈز کو دن میں آرام کر کے رات بھر جاگنا تھا۔ ان میں سے دو گارڈز کو رات کے وقت اوپری منزل کے ٹیرس پر ڈیوٹی دینی تھی۔ باقی بارہ گارڈز میں سے چھ بنگلے کے بیرونی اور چھ اندرونی حصے میں ڈیوٹی دیتے۔

دن بھر حالات ایسے رہے تھے کہ پشمینہ اور ڈیبرا کو دوپہر کے کھانے کا خیال آیا بھی تھا تو کھانے کو ان کا جی نہیں

چاہا تھا۔ دن بھر چائے، کافی اور بسکٹ وغیرہ ہی چلتے رہے تھے۔

اجلاس ختم ہونے کے بعد ان دونوں نے کھانا کھایا۔ اس کے بعد ان کے تھکے ہوئے جسموں کو آرام ہی کی ضرورت تھی۔ ان دونوں کی خواب گاہیں ایسے کمروں میں تھیں جن کی درمیانی دیوار میں بھی ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کا مقصد یہ تھا کہ ایک کمرے میں دانش یزدانی کی خواب گاہ اور دوسرے میں لائبریری ہوتی۔ اسی دوسرے کمرے کو ڈیبرا نے خواب گاہ کے طور پر اسی دن دوپہر تک ڈیکوریٹ کروا لیا تھا۔

ڈیبرا فوری طور پر اپنی خواب گاہ میں جانے کے بجائے پشمینہ ہی کی خواب گاہ میں اس کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔ سامنے ٹی وی کھلا ہوا تھا۔ سبھی چینلز پر اسی دن کے حوالے سے خبریں یا ٹاک شوز آرہے تھے۔

ڈیبرا بولی۔ ''دن میں کئی جگہ اجلاس ہوتے رہے ہیں لیکن صدارتی محل میں کسی اجلاس کے ہونے کی خبر نہیں آئی۔''

''ڈکٹیٹر کو مشاورت کے لیے اجلاس کی ضرورت نہیں ہوتی۔'' پشمینہ نے گہری سنجیدگی سے جواباً کہا۔ ''ڈکٹیٹر خود سوچتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے۔''

اور اس کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہی کہ ریلی کی قیادت پشمینہ خود کرے گی، صدر حیات نے لیفٹیننٹ جنرل چنگیزی کو طلب کر کے اس سے کہا تھا۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں سمجھا نہیں جناب صدر!''

''ریلی کی قیادت پشمینہ ہرگز نہ کر سکے۔'' صدر حیات نے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں میں صرف پندرہ منٹ گفتگو ہوئی تھی۔

☆☆☆

اسی گفتگو کا نتیجہ تھا کہ رات جب اپنے تیسرے پہر میں داخل ہو رہی تھی، سی ایس کے اہلکاروں سے بھرے ہوئے چار ٹرکوں نے پشمینہ کے بنگلے کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ اس قطار میں کیونکہ چھ بنگلے اور تھے، اس لیے وہ بھی اس حصار میں آ گئے تھے۔

پھر چند ہی لمحوں بعد فضا میں دو ہیلی کاپٹر اس طرف آتے دکھائی دیے جن میں سی ایس کے کمانڈوز تھے۔

ان ہیلی کاپٹروں کی مدھم سی آواز سوتی ہوئی ڈیبرا کے کانوں میں بھی پہنچی اور وہ جاگ گئی۔ اس کی نیند ایسی ہی تھی۔ مدھم سی آواز بھی اس کی نیند میں خلل ڈال دیتی تھی۔

کوئی جہاز گزر رہا ہے، اس کے غنودہ ذہن میں آیا اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر وہ نہ صرف جاگ کر اٹھ بیٹھی بلکہ ننگے پیر ہی دوڑتی ہوئی پشمینہ کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔

گولیاں چلنے کی آوازوں نے پشمینہ کو بھی جگا دیا تھا۔ جیسے ہی ڈیبرا اس کے کمرے میں داخل ہوئی، کسی گارڈ نے دروازے پر دستک دے کر تیز آواز میں کہا۔

''ہوشیار میڈم! دو ہیلی کاپٹر ٹیرس پر اترے ہیں۔ اوپر ہمارے دونوں ساتھی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔''

پھر گولیوں کی تڑتڑاہٹ قریب ہی سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی دروازے کے باہر کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ غالباً اطلاع دینے والا گارڈ ہی کسی کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔

اس کے فوری بعد سارا بنگلا بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ باہر ڈیوٹی دینے والے گارڈز بھی اندر گھس آئے تھے اور غالباً وہ گارڈز بھی جو دن میں ڈیوٹی دے کر سو چکے تھے۔

''یہ مجھے ہی مارنے آئے ہوں گے۔'' پشمینہ نے بیڈ کی دراز سے اپنا ریوالور نکالتے ہوئے کہا، پھر دانت پیستے ہوئے بولی۔ ''میری ماں کی بات بھی نظر انداز کر دی گئی ہے۔''

ڈیبرا نے اس کے دوسرے فقرے کا آخری آدھا حصہ شاید سنا ہی نہ ہو۔ وہ دوڑتی ہوئی واپس اپنی خواب گاہ میں گئی تھی۔

بے تحاشا گولیاں چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ فائرنگ کسی نشانے پر نہیں بلکہ اندھا دھند کی جا رہی تھی۔

ڈیبرا جب واپس لوٹی تو بھی ننگے پیر ہی تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ میں بریٹا کا پی فور پسٹل تھا جس میں دو چھوٹی چھوٹی بیرل تھیں اور دائیں ہاتھ میں فور بیرل پسٹل جس کی لمبائی اتنی تھی کہ اسے جیب میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ یہ اسلحہ اسی دن حاصل کیا گیا تھا۔

پشمینہ بڑی عجلت میں ساڑی باندھ چکی تھی اور ڈیبرا کو پکارنے ہی والی تھی۔

''باہر نکل کر مقابلہ تو کرنا ہوگا ان کتوں کا۔'' پشمینہ نے پھر دانت پیسے۔

اس کا ایک قدم دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ڈیبرا اس کے سامنے آ گئی۔

''کیا حماقت کر رہی ہو تم! اندھا دھند گولیاں چل رہی

ہیں۔ ہم اپنے ہی کسی گارڈ کی گولی کا نشانہ بھی بن سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے ڈیبرا نے دو بیرل کا چھوٹا ریوالور اپنی چست پتلون کی بیلٹ میں ٹھونس لیا۔ پھر اسی ہاتھ سے پشمینہ کا بازو پکڑ کر اسے تقریباً کھینچتی ہوئی بولی۔ ''ادھر آؤ۔''

''نہیں۔'' پشمینہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں بزدلوں کی طرح باتھ روم میں نہیں گھسوں گی۔''

''تم آؤ تو سہی! ہمیں چھپنا نہیں ہے۔'' ڈیبرا نے اسے پھر گھسیٹا۔ ''ہم ادھر سے بھی باہر نکل سکتے ہیں۔''

''ادھر سے!'' پشمینہ کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے لیکن پھر اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ ڈیبرا کے ساتھ باتھ روم میں داخل ہوئی۔

''وہ جو وارڈ روب ہے۔'' ڈیبرا نے بتایا۔ ''وہیں سے دوسری طرف نکلا جاسکتا ہے۔''

پشمینہ کے دماغ میں کئی سوال کلبلانے لگے تھے جو اس نے اس وقت زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سوالات بعد میں کیے جاسکتے تھے۔

''باتھ روم کو اندر سے لاک کر لینا چاہیے۔'' وہ بولی۔

''ہرگز نہیں۔'' ڈیبرا نے کہا۔

نہایت کشادہ باتھ روم میں وہ دونوں وارڈ روب تک پہنچ گئی تھیں۔ ڈیبرا نے اسے کھولتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ''وہ لوگ یقیناً زیادہ تعداد میں ہوں گے۔ ہمارے بھی گارڈز شاید مارے جائیں۔ وہ تمہاری تلاش میں تمہارے کمرے میں بھی داخل ہوں گے اور باتھ روم بھی کھول کر دیکھیں گے۔ دروازہ اندر سے بند ملا تو وہ اسے توڑ ڈالیں گے۔'' ان باتوں کے دوران میں ڈیبرا نے الماری کے اندر ہاتھ ڈال کر عقب میں لگا ہوا چوبی تختہ ایک طرف سرکا دیا تھا۔ اسے سرکانے کے لیے یقیناً کسی قسم کا میکنزم ہوگا۔ تختہ ایک طرف سرکتے ہی دوسری طرف روشنی دکھائی دی تھی۔

وارڈ روب میں لٹکے ہوئے کپڑوں کے بیچ سے ڈیبرا نے پشمینہ کو دوسری طرف نکالا۔ وہ خود وارڈ روب میں رک کر اس کے پٹ بند کرنے لگی تھی۔ اس کے بعد وہ بھی پشمینہ کے قریب پہنچ گئی۔

وہاں چھ فٹ اور چار فٹ کی لمبائی چوڑائی تھی۔ ایک جانب سنگی زینے تھے۔ ڈیبرا، پشمینہ کو لیے ہوئے دبے قدموں انہی زینوں پر چڑھنے لگی جو چھت تک چلے گئے تھے۔ فرش سے چھت تک کا فاصلہ چودہ فٹ کے قریب معلوم ہوتا تھا۔ آٹھ فٹ کے بعد سنگی زینے ختم ہوگئے۔ اب وہ دونوں ایک چوڑی جگہ پر تھیں۔ ڈیبرا نے اپنا فور بیرل ریوالور ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھ چھت کی طرف بڑھائے جہاں ایک لیور لگا ہوا تھا۔

''تمہیں یہ خفیہ راستے کیسے معلوم ہوئے؟'' پشمینہ سے رہا نہ گیا۔

''شش! بہت آہستہ بولو!'' ڈیبرا نے سرگوشی کی اور چھت میں لگے ہوئے لیور کو جنبش دی۔ فوراً ہی چھت میں ایک اتنا بڑا چوکور خلا پیدا ہوگیا جس سے دو آدمی اوپر جاسکتے تھے۔ اس طرف مکمل تاریکی تھی۔

خلا پیدا ہوتے ہی ڈیبرا نے اپنا فور بیرل ریوالور اٹھا کر اس طرح اوپر کر دیا جیسے کسی کو نشانہ بنانا چاہتی ہو۔

''احتیاط ضروری ہے۔'' پشمینہ نے سرگوشی کی۔ ''ممکن ہے، کوئی اوپر بھی ہو۔''

ایک منٹ گزر گیا۔ کسی قسم کی آہٹ سنائی نہیں دی۔

''یہاں کھڑی ہو جاؤ۔'' ڈیبرا نے کہا۔ خلا کے بالکل نیچے بڑے بڑے چار سفید ٹائل لگے ہوئے تھے۔ وہ خود انہی ٹائلز پر کھڑی تھی۔

پشمینہ کو اس وقت اسی کے اشاروں پر چلنا تھا۔ اس نے ڈیبرا کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس وقت ڈیبرا نے کسی میکنزم کو حرکت دی۔ اور چاروں ٹائلز دھیرے دھیرے اوپر اٹھنے لگے۔

سر اس خلا سے نکلنے سے پہلے ڈیبرا کے دونوں ہاتھ اوپر نکلے تھے جس میں وہ فور بیرل ریوالور تھامے ہوئے تھی۔ اس کے بعد ان دونوں ہی کے سر اوپر نکلے۔ وہاں مکمل تاریکی تھی۔

ڈیبرا نے سرگوشی کی۔ ''اوپری منزل کے اس کمرے کو گھر کی خراب ہوجانے والی چیزوں کے لیے گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا لیکن فی الحال یہ بالکل خالی پڑا ہے۔''

چوکور ٹائل جیسے ہی اس کمرے کے فرش کے برابر ہوئے، ان کی حرکت رک گئی۔

''آؤ۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ کر ایک جانب قدم بڑھایا۔

پشمینہ کے اندازے کے مطابق ڈیبرا جانتی تھی کہ اسے کس طرف بڑھنا چاہیے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور آگے بڑھا ہوا تھا۔ سات آٹھ قدم چلنے کے بعد ہلکا سا کھٹکا ہوا، جیسے ریوالور کسی سخت چیز سے ٹکرایا ہو۔

''اب ٹٹول کر ہی دروازہ تلاش کرنا ہے۔'' ڈیبرا نے کہا، پھر فوراً ہی بولی۔ ''وہ مل گیا۔''

اس نے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف بھی اندھیرا

تھا۔ اس طرف چھوٹی سی راہداری تھی جس کے اختتام پر دروازے کے قریب پہنچ کر ڈیبرا نے دروازے سے کان لگا دیے۔

''دوسری طرف کوئی ہے۔'' اس نے پشمینہ کے کان کے قریب منہ لا کر اتنی دھیمی آواز میں کہا جو چھ انچ کے فاصلے سے سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ ''اس طرف ٹیرس ہے۔ ہیلی کاپٹر یہیں اتارے گئے ہیں۔''

گولیاں چلنے کی آوازیں اب بھی آ رہی تھیں مگر ان کی شدت میں کمی آنے کا مطلب یہی تھا کہ گولیاں چلانے والوں کی تعداد کم ہو چکی تھی۔ کم ہونے والے یا تو شدید زخمی ہو گئے یا مر چکے ہوں گے۔

''اب یہ خطرہ تو مول لینا ہی پڑے گا۔'' ڈیبرا نے پہلے ہی کی طرح کہا۔

پشمینہ کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیبرا کی شاید یہ کیفیت نہ ہو۔ وہ اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی تربیت لے چکی تھی۔

دروازہ بہت ذرا سا کھولنے میں ڈیبرا نے اتنی احتیاط سے کام لیا تھا کہ سوئی کے گرنے جیسے آواز بھی نہ ہو۔ اس جھری سے اس نے باہر جھانکا۔

''یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مطلع ابر آلود ہے۔ تارے بھی نظر نہیں آ رہے۔ گھٹا ٹوپ تاریکی ہے۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کو بتایا۔

''پوزیشن کیا ہے؟''

''ایک ہیلی کاپٹر سائے کی طرح نظر آیا ہے۔ دروازہ تھوڑا سا اور کھولنا پڑے گا۔''

قدموں کی آہٹ ان دونوں ہی کو سنائی دے رہی تھی۔ وہاں کوئی شخص ٹہل رہا تھا۔

ڈیبرا نے دروازے کو دھیرے دھیرے کھولنا شروع کیا۔ اسے توقع تھی کہ وہاں جو بھی تھا، اسے کھلتا ہوا دروازہ اندھیرے کی وجہ سے شاید دکھائی نہ دے اور اگر دکھائی دے بھی جاتا تو ڈیبرا کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ فوری طور پر اس کے سینے میں گولیاں اتار دے۔ اگر اس سے ایک ثانیے کی بھی چوک ہوتی تو وہی شخص گولیوں کی بوچھار کر دیتا۔ وہ اب ڈیبرا کو دکھائی بھی دے گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی مشین گن تھی۔

دوسرا ہیلی کاپٹر بھی ہیولے کی طرح نظر آ گیا تھا۔ اس نے پشمینہ کو بتا دیا پھر کہا۔ ''تم یہیں رکو۔''

''کیا کرنے جا رہی ہو؟'' پشمینہ مضطرب ہوئی۔

''بس یہیں سے جھانک کر دیکھتی رہو۔'' ڈیبرا نے کہا اور دروازہ اتنا کھول لیا کہ باہر نکل سکے۔ وہ فرش پر لیٹ کر سانپ کی طرح رینگتی ہوئی ٹیرس پر پہنچ گئی۔

پشمینہ نے دروازہ اس حد تک بند کر لیا کہ بس جھانکنے کی گنجائش باقی رہی۔ اس نے ڈیبرا کو دیکھنا چاہا لیکن وہ نظر نہیں آئی۔ صرف ہیلی کاپٹرز اور وہاں ٹہلتے یا پہرا دیتے ہوئے شخص کے ہیولے نظر آ رہے تھے۔

پشمینہ کی سوچ کے مطابق ڈیبرا اس وقت ٹیرس پر جہاں بھی تھی، بہت احتیاط سے متحرک تھی۔

نیچے ہونے والی فائرنگ میں اب اور کمی آ چکی تھی۔ مرنے والوں کی تعداد میں یقیناً اضافہ ہوا تھا۔ یہ بات ممکن نہیں تھی کہ حملہ آوروں کی ہلاکتیں نہ ہوئی ہوں۔ گارڈز نے انہیں بھی معاف تو نہیں کیا ہوگا۔

یکا یک پشمینہ نے پہرا دینے والے شخص کے عقب میں ایک سایہ ابھرتے دیکھا۔ وہ یقیناً ڈیبرا تھی جو جست لگا کر اس شخص پر جا گری۔ دونوں ہی ٹیرس پر گرے تھے۔ اس کے بعد صرف ایک سایہ اٹھا جو ڈیبرا کا تھا۔ پہرا دینے والا نہیں اٹھ سکا۔ وہ یا تو بے ہوش ہو چکا تھا یا ڈیبرا نے اسے گولی چلائے بغیر ہی کسی طرح ہلاک کر دیا تھا۔

پشمینہ نے ڈیبرا کا اشارہ دیکھا۔ وہ اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔ پشمینہ دروازہ کھول کر تیزی سے چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

ڈیبرا نے اس کا ایک ہاتھ پکڑ لیا۔ ''آؤ۔'' وہ ایک ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھی۔

''کیا...... کیا؟'' پشمینہ کے منہ سے نکلا۔

''یہی سوچا تھا مجھے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''اسی کے ہیلی کاپٹر میں ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ مدد کے لیے پولیس یا کسی بھی سرکاری ادارے کو فون کرنا تو حماقت ہی ہوتی۔''

''تم ہیلی کاپٹر......''

''ہاں میں اڑا سکتی ہوں۔ سیکھ چکی ہوں۔'' ڈیبرا نے کہا۔

اب نیچے ہونے والی فائرنگ بند ہو چکی تھی۔

''ہمارے سب گارڈز مارے جا چکے۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کو ہیلی کاپٹر میں سوار کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہیلی کاپٹر اتنے بڑے ہیں کہ ہر ایک میں بیس پچیس تو آئے ہوں گے۔ ہمارے باڈی گارڈ چالیس پچاس کو ختم نہیں کر سکتے۔''

پشمینہ کو ہیلی کاپٹر میں سوار کرانے کے بعد ڈیبرا بھی چڑھ گئی۔ اس نے پائلٹ کی سیٹ سنبھالی تھی۔

''اب وہ ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا۔

''بہت جدید ہیلی کاپٹر ہیں۔'' ڈیبرا بڑبڑائی۔

جب ہیلی کاپٹر نے اٹھنا شروع کیا تو پشمینہ بولی۔ ''ہم جائیں گے کہاں؟''

''سوچا ہے کچھ میں نے۔'' ڈیبرا نے جواب دیتے ہوئے اپنا فور بیرل ریوالور سنبھال کر ہیلی کاپٹر سے باہر نکالا۔

ٹیرس سے فاصلہ کتنا بڑھ چکا تھا، اس بارے میں پشمینہ کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔

ڈیبرا کے ریوالور نے ٹیرس پر کھڑے دوسرے ہیلی کاپٹر پر گولیاں برسا دیں اور پھر ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے فضا میں اڑے تھے۔ ڈیبرا نے یہ اقدام اتنے فاصلے سے کیا تھا کہ فضا میں اڑنے والے ٹکڑے اس ہیلی کاپٹر کو نقصان نہ پہنچا سکیں جس میں وہ دونوں تھیں۔

''شاباش۔'' پشمینہ نے ڈیبرا کو داد دی۔ ''اب کم از کم اس ہیلی کاپٹر سے وہ لوگ ہمارے تعاقب میں نہیں آسکتے۔''

''لیکن وہ اس کی اطلاع تو کسی کو دے دیں گے۔ کوئی اور ہیلی کاپٹر آسکتا ہے۔ ضروری ہے کہ ہم جلد از جلد اس ہیلی کاپٹر سے کہیں اُتر جائیں۔ میں اندازے سے ایک سمت بڑھ رہی ہوں۔ اگر میرا اندازہ غلط نکلا تو پھر پریشانی لاحق ہو سکتی ہے۔''

ہیلی کاپٹر فضا کی تاریکی چیرتا ہوا تیزی سے ایک جانب بڑھ رہا تھا۔ ڈیبرا نے اس کی رفتار اتنی ہی تیز رکھی تھی جتنی تیزی سے اسے اڑانا ممکن تھا۔

''وہ لوگ فوری طور پر اندازہ نہیں لگا سکیں گے کہ ہم کس طرف جا رہے ہیں۔ پہلے میں نے ہیلی کاپٹر کا رخ دوسری طرف رکھا تھا۔ کچھ دور نکل آنے کے بعد رخ بالکل تبدیل کر دیا ہے۔ جو ہیلی کاپٹر بھی آئے گا، وہ کچھ دیر تک بھٹکتا ہی رہے گا بلکہ کئی ہیلی کاپٹر بھیجے جائیں گے۔''

''کسی نے دیکھا ہی کیسے ہو گا کہ شروع میں ہیلی کاپٹر کا رخ کس طرف تھا؟''

''جب ہم وہاں سے اُڑے تھے تو تم نے نیچے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں میں نے بنگلوں کی قطاروں کی تین جانب تو ٹرک دیکھے تھے۔ چوتھی جانب بھی کوئی ٹرک ضرور ہو گا۔ خاصی تعداد میں آدمی بھی تھے جنہوں نے بنگلوں کی قطار اپنے گھیرے میں لے لی تھی۔ وہ ہمیں کسی طرف سے بھی بچ نکلنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے اور یہ تو فوری طور پر ان کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس ہیلی کاپٹر میں ہم ہیں۔ انہیں اس وقت اطلاع ملی ہو گی جب ہم دور نکل چکے ہوں گے۔''

''وہاں سے نکل آنے کے بعد بھی میں پریشان ہوں۔'' پشمینہ کے لہجے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔

''جب تک میری سانس باقی ہے، تم پر حرف نہیں آنے دوں گی میری جان!'' اس مرتبہ ڈیبرا کا لہجہ خاصا جذباتی تھا۔

پشمینہ نے بھی جذباتی ہو کر ڈیبرا کا شانہ زور سے دبایا۔

''اس وقت تاریکی بھی ہماری مددگار ہے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کی کوئی لائٹ آن نہیں کی تھی۔

آخر اس نے ایک جگہ ہیلی کاپٹر کو نیچے اتارنا شروع کیا۔

''ابھی ہم ایک سڑک کے اوپر سے گزرے تھے۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''کچھ گاڑیوں کی روشنیاں متحرک نظر آئی تھیں۔''

''وہ ہائی وے ہے۔'' ڈیبرا نے کہا۔ ''میں نے ادھر ہی آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اندازہ درست نکلا۔ ہم ہائی وے کی ایک جانب ویران علاقے میں اُتر رہے ہیں۔ ریتیلی زمین ہے۔ ایسی جگہ ہیلی کاپٹر نہیں اتارا جاتا مگر یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ ممکن ہے ہیلی کاپٹر ریت میں کئی فٹ دھنس جائے۔ ٹیڑھا بھی ہو سکتا ہے۔ خود کو بہت سنبھال کر رکھنا۔ یہ میں ایک بڑا امتحان دینے جا رہی ہوں۔''

اور وہ اس امتحان میں بڑی حد تک کامیاب رہی، لیکن اسے جو اندیشہ تھا، وہ بہرحال صحیح ثابت ہوا۔ ہیلی کاپٹر ریت میں دھنسا بھی تھا اور ایک جانب خاصا جھک بھی گیا تھا۔

ڈیبرا نے فوراً انجن بند کرتے ہوئے کہا۔ ''بس اب اترو جلدی۔ ممکن ہے کہ ہیلی کاپٹر اور ٹیڑھا ہو جائے۔''

وہ دونوں بہت عجلت میں اُتریں۔

''بس دوڑ پڑو۔'' ڈیبرا نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''ہمارا رخ ہائی وے کی طرف ہے۔ ہمیں جلد از جلد وہاں پہنچ کر کوئی کار روکنا ہو گی۔ میں تو بہت تیز بھاگ سکتی ہوں لیکن تم جس حد تک بھی تیز دوڑ سکو۔''

پھر ڈیبرا کو یقیناً تعجب ہوا ہو گا کیونکہ پشمینہ اس کی توقع سے زیادہ تیز دوڑ رہی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ پشمینہ اسکول کے زمانے میں دوڑ کے کئی مقابلوں میں حصہ لے چکی تھی اور ایک دوڑ میں انعام بھی حاصل کیا تھا۔

"مجھے توقع ...... نہیں تھی ...... کہ میں ...... میں اب ...... بھی اچھا خاصا ...... دوڑ ...... سکتی ہوں۔" دوڑنے ہی کی وجہ سے پشمینہ ایک جملہ بھی بمشکل بول سکی تھی۔

صورتِ حال ایسی ہی تھی۔ انہیں جلد از جلد نہ صرف ہیلی کاپٹر سے دور ہونا تھا بلکہ ہائی وے پر پہنچنا بھی ضروری تھی۔

لگ بھگ چھ فرلانگ کے فاصلے تک پشمینہ یکساں رفتار سے دوڑ سکی تھی لیکن پھر اس کی رفتار کچھ کم ہوئی۔ ڈیبرا بھی ہانپنے لگی تھی لیکن پشمینہ زیادہ ہانپ گئی تھی۔ اس نے بہرحال ایک بہت آسودہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔

فضا میں دو ہیلی کاپٹر گڑگڑائے تو وہ دونوں چونکیں۔ ان کی نظریں اوپر اٹھیں۔ وہ رک بھی گئی تھیں۔

"ہیلی کاپٹر کی تلاش ...... شروع ہو چکی ہے۔" ڈیبرا بولی۔ "مگر انہیں یہ خیال ...... نہیں آئے گا ...... وہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ ...... ہم نے ...... یہاں ہیلی کاپٹر اتارا ہوگا۔"

دونوں ہیلی کاپٹر انہیں کافی فاصلے پر دکھائی دیے تھے۔ اسی فاصلے سے وہ گزر بھی گئے۔

"وہ قریبی شہر کی طرف جا رہے ہیں۔" ڈیبرا نے کہا۔ "شاید انہیں ...... یہ خیال ہے کہ ہم نے ادھر کا رخ کیا ہوگا ...... شاید آٹھ دس ہیلی کاپٹر ...... مختلف سمتوں میں ...... تلاش کر رہے ہوں ...... ہمیں۔" ڈیبرا پھر بولی۔ اس نے پشمینہ کا ہاتھ پکڑ کر پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

موسم کسی حد تک سرد تھا لیکن جب وہ دونوں ہائی وے تک پہنچیں تو پسینے میں شرابور تھیں۔ سینے دھونکنی کی طرح پھول پچک رہے تھے۔

ڈیبرا ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں رکی تھی جہاں سے ہائی وے پر نظر رکھی جا سکتی۔

"دو ٹرک گزر رہے ہیں۔" ڈیبرا نے کہا۔ "ہمیں ...... کسی کار کا ...... انتظار کرنا ہوگا۔"

پشمینہ کچھ نہیں بولی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے باعث اب اس کے لیے فوری طور پر کچھ بولنا مشکل ہو گیا تھا۔

دو منٹ بعد دو کاریں اور ایک ٹرک بھی دکھائی دیا۔

"ہمیں صرف ایک کار دکھائی دے، تبھی بات بنے گی۔" ڈیبرا بولی۔ "ہم زیادہ لوگوں کی نظروں میں آئے تو بات نہیں بنے گی۔ اوہ ...... ادھر سے ایک گاڑی اور کار ہی معلوم ہوتی ہے، آؤ۔" ڈیبرا نے ریوالور جینز میں اڑس کر بنیان اس کے اوپر کر لی۔ فور بیرل ریوالور اپنی پشت پر چھپا لیا۔ ان دونوں نے بہت تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا تھا۔

"یہ ٹھیک کیا تم نے۔" پشمینہ بولی۔ "وہ جو کوئی بھی ہے، اسلحہ دیکھ کر تو گھبرا کر کار اور تیزی سے دوڑا دے گا۔"

وہ دونوں سڑک پر بالکل صحیح وقت پر پہنچیں۔ کار کی ہیڈ لائٹ ان پر پڑی۔ وہ دونوں بیچ سڑک پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ کار کی رفتار کم ہونے لگی۔ وہ ان دونوں کے بالکل قریب آ کر رکی۔ وہ دونوں تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ کے قریب پہنچیں۔ ڈرائیونگ کرنے والا پینتالیس پچاس سالہ شخص تھا۔

"کیا آپ ہمیں شہر تک پہنچا دیں گے؟" ڈیبرا نے فوری طور پر اسلحے سے دھمکانا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

ڈرائیونگ کرنے والے کی نظریں پشمینہ کے چہرے پر تھیں۔ "آپ ...... آپ ...... پشمینہ ...... پشمینہ حیات صاحبہ ہیں نا؟" وہ کچھ حیران اور کچھ پریشان سا ہوا تھا۔

"جی ہاں۔" پشمینہ نے کہا۔ "جلدی بتایئے! آپ ہمیں ......"

"بیٹھیے، بیٹھیے!" وہ جلدی سے بولا اور اس نے خود ہی کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔

"تم پیچھے بیٹھو۔" ڈیبرا نے پشمینہ سے کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا دروازہ کھولنے لگی۔

"بس فوراً چل پڑیے۔" ڈیبرا نے بیٹھتے ہی کہا۔

وہ کار حرکت میں لے آیا۔ "آپ پشمینہ صاحبہ کی ......"

"میں پشمینہ کی دوست ہوں اور باڈی گارڈ بھی۔" ڈیبرا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "صبح کی ہلکی سی روشنی پھیلنے سے پہلے ہمیں شہر پہنچ جانا چاہیے۔"

"ہم قریب ہی ہیں۔ پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جائیں گے، لیکن ...... خبریں تو یہ ہیں کہ آپ دونوں کو کسی نامعلوم طاقت نے اغوا کر لیا ہے۔"

"یہ خبر آپ نے کہاں سنی؟" پشمینہ بول پڑی۔

"ٹی وی پر۔"

"ٹی وی؟" ڈیبرا نے تعجب کا اظہار کیا۔ "آپ جس شہر سے آ رہے ہیں، وہاں سے یہاں تک کا فاصلہ آپ نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا ہوگا۔ خبر آپ نے ٹی وی پر کیسے سن لی؟"

"میرے پاس بڑی اسکرین کا بہترین موبائل ہے۔ ابھی بند کیا تھا میں نے۔"

"اوہ!" ڈیبرا کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔

وہ اور پشمینہ ایسے حالات سے گزری تھیں کہ انہیں موبائل پر خبریں سننے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔

"اس وقت عموماً پرانی خبریں سنائی جا رہی ہوتی ہیں

مگر اچانک ہنگامی طور پر لائیو پروگرام شروع ہو گئے۔ حکومت کے ترجمان کے مطابق انہیں کچھ خبریں ملی تھیں کہ کوئی نامعلوم طاقت آپ دونوں کو اغوا کرنے کی کوشش کر سکتی ہے اس لیے آپ کی حفاظت کے لیے ٹرکوں پر سوار پولیس اور سی ایس کے اہلکار آپ کے گھر پہنچے تھے اور گھر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا تھا لیکن آپ کے اغوا کنندگان ہیلی کاپٹرز پر آئے اور آپ دونوں کو اغوا کر کے لے گئے۔ وہ دو ہیلی کاپٹروں میں آئے تھے جن میں سے ایک ہیلی کاپٹر تباہ بھی ہو گیا۔"

پشمینہ اور ڈیبرا نے جلدی سے اپنے موبائل نکالے۔

"ہمیں ان سے لڑتے ہوئے بھاگ نکلنے میں آسانی ہو گئی تھی۔" ڈیبرا نے کہا۔ اس وقت اس کا فور بیرل ریوالور اس کی گود میں رکھا تھا جس سے وہ شخص پریشان نہیں ہوا۔ وہ ان دونوں کو پہچان گیا تھا لہٰذا ڈیبرا کیونکہ باڈی گارڈ تھی اس لیے اسلحہ اس کے پاس ہونا ہی چاہیے تھا۔

پشمینہ نے موبائل پر ایک ٹی وی چینل لگایا۔ یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اس وقت ٹی وی اینکر حکومت کے ایک ترجمان سے فون پر بات کر رہا تھا۔

"کیا وہ ہیلی کاپٹر کسی بیرونی قوت کے تھے؟" اینکر نے سوال کیا تھا۔

"یقیناً وہ کسی بیرونی قوت کے ہوں گے کیونکہ ہمارے ریڈارز کو بھی ان کے بارے میں علم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اسی قسم کے ہیلی کاپٹرز ہوں گے جن کے ذریعے اسامہ بن لادن کو مارنے کے لیے آپریشن ہوا تھا۔"

"وہی ہو سکتے ہیں۔ بلیک ہاک اسٹیلتھ جو ریڈار کی زد پر نہیں آتے۔"

"کیا امریکا......"

"ضروری نہیں ہے۔" ترجمان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ ٹیکنالوجی چین کے پاس تو فوراً پہنچ گئی تھی لیکن اب یہ شبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ چند اور ملکوں کے پاس بھی پہنچ گئی ہے۔ ہم نے تحقیقات شروع کر دی ہیں کہ یہ کس نے کیا ہے۔"

"کسی ملک کو پشمینہ حیات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"کسی بیرونی طاقت ہی نے سازش کر کے بیٹی کو باپ کے خلاف کھڑا کیا ہے۔ کیونکہ آج کے ہنگامے میں پشمینہ حیات کو کسی قسم کا نقصان پہنچ سکتا تھا اور حقیقتاً وہ آج کی ریلی کی قیادت بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن اگر خود پیچھے ہٹتیں تو ان کی سیاسی ساکھ کو نقصان پہنچتا اس لیے اغوا کا ڈراما کیا گیا۔ یہ ہنگامی صورت حال ختم ہوتے ہی وہ پھر سامنے آ جائیں گی۔"

"الو کا پٹھا۔" پشمینہ نے غصے میں کہتے ہوئے موبائل بند کر دیا۔

"دوسری سیاسی جماعتیں کہہ رہی ہیں۔" وہ شخص بول پڑا۔ "کہ یہ باپ بیٹی کا ڈراما ہے۔ آج کے خطرات سے بچنے کے لیے یہ باپ بیٹی کا مشترکہ ڈراما ہے۔"

پشمینہ کا موبائل بند ہوتے ہی کار والے نے کہا۔ "حکومت کے ترجمان سے یہ سوال کیا جا چکا ہے کہ بلیک ہاک اسٹیلتھ جو چھت پر تباہ ہو گیا ہے، اس تک میڈیا کو جانے سے کیوں روکا جا رہا ہے۔ اس پر کہنا یہ ہے کہ جب تک تحقیقات مکمل نہ ہو جائیں، کسی کو وہاں نہیں جانے دیا جائے گا۔"

ڈیبرا کو اچانک ایک خیال آیا۔ "پشمینہ حیات کے بارے میں آپ کا خیال کیا ہے؟"

"میں پہلے تو ان کے بہت خلاف تھا لیکن جب یہ حکومت سے الگ ہوئیں تو میں ان کے بیانات سے متاثر ہوا تھا۔ پھر ڈیموکریٹک فورم کے قیام کے بعد سے تو میں ان کی سیاسی شخصیت کا پرستار ہو گیا ہوں۔ مجھے کسی پروپیگنڈے پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ حکومت ہی نے اغوا کروانے یا شاید مار ڈالنے کی سازش کی ہو گی لیکن آپ دونوں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئیں۔ البتہ یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ دونوں یہاں، اس ویران مقام تک کیسے پہنچ گئیں؟"

"اگر آپ ان کے پرستار ہیں تو کیا آپ ہماری ایک اور مدد بھی کر سکتے ہیں؟"

"میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"ہمیں چند گھنٹے کے لیے کہیں روپوش ہونا ہے لیکن یہ بات آپ کے علم میں بھی نہیں آنا چاہیے کہ ہمیں اس وقت کہاں جانا ہے۔"

"تو کیا آپ یہ گوارا کریں گے کہ آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا جائے۔ ڈرائیونگ میں کروں گی۔ بعد میں آپ کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

"آپ کی احتیاط میں سمجھ سکتا ہوں۔ مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ میں پشمینہ حیات صاحبہ کی بہتری کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ان کے خلاف کیے جانے والے کسی پروپیگنڈے پر بھی یقین نہیں مجھے۔"

ڈیبرا کی باتیں پشمینہ کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہی تھیں لیکن وہ خاموش ہی رہی۔

ڈیبرا کے منصوبے کے مطابق عمل ہوا۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے ہی کار روک کر اس شخص کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ ڈیبرا نے سنبھالی۔ پشمینہ کو ڈیبرا نے پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھا رہنا دیا اور اشارے سے کہہ دیا کہ وہ اس شخص پر نظر رکھے۔ وہ اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ذرا بھی نہ سرکا سکے۔

"مجھے فخر ہے کہ میں آپ کے برابر میں بیٹھا ہوں۔" وہ بولا۔

"میں تو آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ اس وقت میرے کام آئے۔"

ڈیبرا پھر بولی۔ "اس بارے میں آپ کسی کو بتائیں گے بھی نہیں۔ کم از کم اس وقت تک نہیں جب تک یہ روپوشی ختم کر کے سامنے نہ آجائیں۔ بس چند گھنٹے کی بات ہے۔"

"میں اس کے بعد بھی کسی کو نہیں بتا سکتا۔ سی ایس والے مجھے اس کے لیے معاف نہیں کر سکتے کہ میں نے پشمینہ حیات صاحبہ کی مدد کی تھی۔"

پشمینہ سوچ میں ڈوبی رہی۔ وہ ڈیبرا کی پلاننگ سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ ڈیبرا جو کچھ کر رہی ہے، وہ ٹھیک ہی ہوگا۔

صبح کی ہلکی ہلکی سی ہی روشنی پھیلی تھی کہ ڈیبرا نے کار ایک جگہ روکی۔ پشمینہ نے حیرت سے دیکھا کہ کار جس عمارت کے سامنے رکی تھی، وہ شاہ صاحب کے قائم کردہ فلاحی ادارے کی تھی جسے ان کی بیٹی اقصیٰ احمد اور اس کا شوہر احمد چلاتے تھے۔

"آپ ابھی پیچھے ہی بیٹھے رہیں گے۔" ڈیبرا نے کار والے سے کہا۔ "پشمینہ بھی یہیں رکیں گی۔ تھوڑی دیر میں، بلکہ جلد ہی ایک آدمی آئے گا جو ڈرائیونگ سنبھالے گا۔ پشمینہ اس کے بعد کار سے اتر جائیں گی۔ وہ آدمی کار لے جا کر میل دو میل کے بعد آپ کی کار سے اُتر جائے گا۔ پانچ منٹ بعد آپ اپنی آنکھوں سے پٹی ہٹائیں گے تو آپ کی کار میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد آپ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔"

"یہ تاریخی واقعہ میں کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔" کار والے نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ڈیبرا نے اس سے کچھ نہیں کہا، بس پشمینہ کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور کار سے اُتر کر تیزی سے عمارت کی طرف بڑھی۔ ابھی وہاں بالکل سناٹا تھا۔

اقصیٰ اور اس کا شوہر اپنے بچوں کے ساتھ اسی عمارت کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ شاہ صاحب کی وجہ سے وہ دونوں ڈیبرا سے واقف بھی تھے۔ ڈیبرا وہاں پہلے بھی دو ایک بار آچکی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ دونوں اس سے مکمل تعاون کریں گے۔

ڈیبرا نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے مطابق سب کچھ ہو گیا۔ اقصیٰ کا ایک آدمی اس شخص کی کار لے کر چلا گیا۔

پشمینہ سے اقصیٰ پہلی مرتبہ ملی تھی اور بہت خوش نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ حیران بھی تھی۔ اس کی حیرانی اس وقت ختم ہوئی جب ڈیبرا نے اسے سارا ماجرا سنایا۔

اس کے بعد اس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی کہ اب پشمینہ کو کیا کچھ کرنا ہے۔

☆☆☆

وہ صبح سارے ملک کے لیے سنسنی خیز تھی۔ جن لوگوں نے رات کے آخری حصے کی خبریں نہیں سنی تھیں، صبح وہ بھی سارے حالات سے آگاہ ہو گئے۔ سارے ملک کا ماحول غم و غصے میں ڈوب گیا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے اس بات پر یقین کیا تھا کہ یہ سب صدر حیات اور پشمینہ کا مشترکہ ڈراما ہے۔

ایک ٹی وی چینل سے دانش یزدانی کا انٹرویو صبح سات بجے نشر ہو رہا تھا۔

"ری پبلکن فورم کے تمام لوگوں نے اتفاقِ رائے سے مجھے پشمینہ حیات صاحبہ کا نائب چن لیا ہے۔" دانش یزدانی نے کسی سوال کے جواب میں کہا تھا۔ "ہمارے خیال کے مطابق پشمینہ حیات صاحبہ کو ہلاک نہیں کیا گیا ہوگا۔ انہیں اغوا کر کے نظربند کرنا حکومت نے اس لیے ضروری سمجھا کہ وہ ریلی کی قیادت نہ کر سکیں۔ انہیں ہلاک کرنا صدر حیات کے لیے گھریلو طور پر مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔"

انٹرویو میں دانش یزدانی نے اپنا بیان جاری رکھا۔ "ریلی کی قیادت کرتے ہوئے پشمینہ حیات صاحبہ کو نقصان پہنچ سکتا تھا، بس اسی لیے انہیں اغوا کیا گیا ہے۔ اب وہ ریلی کے شرکاء کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی سے گریز نہیں کریں گے لیکن کل کے بیالیس آدمیوں کی ہلاکت نے لوگوں کو بہت زیادہ پُرجوش کر دیا ہے۔ مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق لوگوں نے ابھی سے بڑے گراؤنڈ میں جمع ہونا شروع کر دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے اسکرین کے نصف حصے میں میرا یہ انٹرویو دکھایا جا رہا ہے اور دوسرے حصے میں

پولیس اور سی ایس کے اہلکار لوگوں کو بڑے گراؤنڈ میں پہنچنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کہیں واٹر کینن کا استعمال ہو رہا ہے اور کہیں آنسو گیس سے کام لیا جا رہا ہے مگر لوگ کسی نہ کسی طرح گراؤنڈ میں جمع ہو رہے ہیں اور اس وقت ان کی تعداد آٹھ دس ہزار ہو چکی ہے۔ ہماری ریلی کو وہیں سے قصرِ صدارت کی طرف روانہ ہونا ہے۔ دوسری طرف شاہ صاحب کے استقبال کے لیے ان کے پیروکار ائرپورٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور انہیں بھی اسی طرح روکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ پہلے ہمارا ابھی یہی منصوبہ تھا کہ ری پبلکن کی ریلی پہلے ائرپورٹ ہی جائے گی لیکن پشمینہ حیات صاحبہ کے اغوا کی وجہ سے ہم نے آج صبح ساڑھے پانچ بجے ایک ہنگامی اجلاس میں اپنا پروگرام تبدیل کیا ہے۔ ہم کل ہلاک کیے جانے والے افراد کی لاشیں لے کر قصرِ صدارت کی طرف جائیں گے۔ زیادہ تر لاشیں اس وقت گراؤنڈ میں پہنچائی جا چکی ہیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ اس انٹرویو کو مختصر کریں۔ اب چونکہ پشمینہ حیات صاحبہ موجود نہیں ہیں اس لیے ان کے نائب کی حیثیت سے ریلی کی قیادت میں ہی کروں گا۔"

"بس آخری دو سوال۔" اینکر پرسن نے کہا۔ "اگر لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بڑے گراؤنڈ پہنچ جائیں تو ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ گراؤنڈ میں اس سے زیادہ لوگوں کی گنجائش ہی نہیں ہے لیکن آپ پروگرام کے شروع میں بتا چکے ہیں کہ ریلی میں دو ڈھائی لاکھ سے زیادہ لوگوں کی شرکت متوقع ہے۔"

"جی ہاں۔" دانش یزدانی نے جواب دیا۔ "لوگوں کے چھوٹے بڑے جلوس قصرِ صدارت کے راستے میں جمع ہو رہے ہیں۔ وہ ہماری ریلی میں شریک ہوتے چلے جائیں گے۔"

"آخری سوال یہ کہ حکومت سے ریلی کو کس حد تک نقصان پہنچ سکتا ہے؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن اندیشہ ہے کہ آج قوم کو بہت زیادہ قربانیاں دینی پڑیں گی۔ بس اب مجھے اجازت دیجیے۔"

"بس آخری ایک سوال اور۔" اینکر پرسن جلدی سے بولا۔

"وہ بھی پوچھیے، جلدی۔" دانش یزدانی نے تحمل سے کہا۔

"آپ ریلی کی قیادت کے لیے گراؤنڈ کیسے پہنچیں گے؟"

"یہ میں ابھی آپ کو نہیں بتا سکتا۔ حکومت مجھے بھی روکنے کے لیے ہر قسم کا قدم اٹھا سکتی ہے۔ ہمارے کئی افراد گرفتار بھی کیے جا چکے ہیں۔ میں اپنا لائحہ عمل خفیہ رکھنا چاہتا ہوں۔"

یہاں دانش یزدانی کا انٹرویو ختم ہو گیا۔ یہ انٹرویو اس کے گھر پر ہی لیا گیا تھا۔

اسی وقت ٹی وی چینلز سے یہ بریکنگ نیوز چلی کہ پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں نے دانش یزدانی کے گھر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ان لوگوں کو حکم مل چکا تھا کہ دانش یزدانی کو گھر سے نہ نکلنے دیا جائے۔

پھر دوسری خبر یہ چلی کہ میگا فون سے سی ایس کے کسی آفیسر نے اعلان کیا تھا کہ دانش یزدانی دس منٹ کے اندر اندر باہر آ کر خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے ورنہ قانون کے محافظوں کو اس کے گھر میں زبردستی گھسنا پڑے گا۔"

اور پھر یہی ہوا، دانش یزدانی باہر نہیں نکلا اور گیارھویں منٹ پر سی ایس اور پولیس کے اہلکار گھر کے دروازے کھڑکیاں توڑتے ہوئے اندر داخل ہو گئے مگر انہیں دانش یزدانی نہیں ملا۔ سب حیران تھے کہ اسے زمین کھا گئی یا آسمان کیونکہ پندرہ منٹ پہلے وہ اسی گھر میں بیٹھا ٹی وی کو انٹرویو دے رہا تھا۔

غالباً اس نے اپنے گھر میں بھی کچھ اس قسم کا انتظام کر لیا تھا جیسا انتظام اس بنگلے میں کیا گیا تھا جو اس نے پشمینہ حیات کو تحفے میں دے دیا تھا۔

اس کے نہ ملنے پر اس کے ماں باپ، بہن اور دوسرے کئی رشتے داروں کو گرفتار کر کے نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ جب انہیں گرفتار کر کے باہر لایا گیا تھا، اس وقت کسی چینل کے کیمرے کو قریب نہیں آنے دیا گیا تھا۔

سارے شہر کی دکانیں اس وقت بند تھیں اور جگہ جگہ سیاہ پرچم لہرا رہے تھے۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کے ہجوم پر گیس کے شیل اور واٹر کینن کا استعمال کیا جا رہا تھا جس سے لوگوں کا غصہ اور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس ہجوم نے اس دن بھی ایک پولیس اسٹیشن اور دو سرکاری عمارتوں میں آگ لگا دی تھی جسے بجھانے کے لیے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں متحرک تھیں۔

جب انتالیسواں جنازہ بڑے گراؤنڈ پہنچا تو اس کے ساتھ چار ہزار افراد تھے۔ جہاں جنازے رکھے جا رہے تھے وہیں ایک کرین بھی تھی۔

جنازہ لانے والوں نے یکا یک دانش یزدانی اور پشمینہ حیات کے نام لے کر زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کردیے۔ اس وقت تابوت کے اوپر کا حصہ ایک جھٹکے سے ایک طرف گر گیا۔ اس میں کوئی لاش نہیں، دانش یزدانی تھا۔ جن لوگوں نے بھی اسے دیکھا، وہ پہلے سے زیادہ پُرجوش ہو گئے۔ دانش یزدانی کرین کے اس حصے پر کھڑا ہوا جسے کرین اوپر لے جا سکتی تھی۔ کسی پہلے سے لگائے گئے میکنزم کے ذریعے شیشوں کا ایک چوکور خول اوپر اس طرح اٹھا کہ دانش اس کے اندر ہو گیا۔ کرین اسے اوپر اٹھاتی چلی گئی اور ستر ہزار کے مجمع نے اسے دیکھ لیا۔

شیشے بلٹ پروف تھے اور اس باکس میں کئی مائک بھی لگے ہوئے تھے۔

گراؤنڈ میں کئی جگہ لگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر پر دانش یزدانی کی آواز گونجی۔ ”بہادرو! آپ کا خادم دانش یزدانی حاضر ہو گیا ہے۔ ہمارا یہ سیلاب اب قصرِ صدارت کی طرف بڑھے گا۔ ہم دیکھیں گے کہ اس حکومت کے پاس کتنی گولیاں ہیں اور ہمارے پاس سینے کتنے ہیں۔“

اس بات پر اتنے نعرے لگے کہ سارا گراؤنڈ ایک ”شور“ بن گیا جس میں دانش یزدانی کی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

جب یہ شور کچھ کم ہوا تو دانش یزدانی کی آواز پھر گونجی۔ ”ہم ہر قیمت پر آزادی کی شہزادی پشمینہ کو آزاد کرائیں گے اور......“

اس کی آواز پھر دب گئی۔ ”شہزادی پشمینہ، زندہ باد“ کے نعروں سے سارا گراؤنڈ گونج اٹھا۔

ٹی وی چینلز یہ سب کچھ براہِ راست دکھا رہے تھے۔ ہر چینل کے نیوز ریڈر تقریباً چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ سارے شہر میں قیامت کا سماں ہے۔

بہت سے چینلز پر تین تین، چار چار تجزیہ کار موجود تھے۔ دانش یزدانی کی تعریفیں ہو رہی تھیں کہ وہ نہ جانے کیسے گرفتار بھی نہیں ہوا تھا اور سی ایس کے اہلکاروں تک کو چکما دے کر بڑے گراؤنڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

یہ خبر بھی نشر ہو رہی تھی کہ گراؤنڈ کو سی ایس اور پولیس کے بیس ہزار مسلح اہلکاروں نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ وہ گراؤنڈ میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والوں پر لاٹھی چارج کر رہے تھے، آنسو گیس اور واٹر کین کا استعمال بھی ہو رہا تھا لیکن کچھ نہ کچھ لوگ گراؤنڈ میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ سوا نو بجے تک گراؤنڈ میں جمع ہونے والوں کی تعداد اسی ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔

رپورٹرز اپنے اپنے چینلز کو خبریں دے رہے تھے۔ ایک خبر کے مطابق ایک ہزار سے زائد لوگ زخمی ہو کر اسپتال پہنچ چکے تھے اور پچاس سے زیادہ افراد کے ہلاک ہونے کی اطلاع تھی۔

دوسری خبر کے مطابق ایک لاکھ افراد شاہ صاحب کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پہنچ چکے تھے۔ اگر راستے بند کرنے کے لیے کنٹینرز نہ لگائے جاتے اور دوسرے ظالمانہ اقدامات نہ کیے جاتے تو وہ تعداد ڈیڑھ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہوتی یا شاید دو لاکھ ہو جاتی۔

ایک خبر یہ بھی تھی کہ صدرِ مملکت نے چیف آف آرمی اسٹاف کو قصرِ صدارت طلب کیا تھا اور نصف گھنٹے تک میٹنگ جاری رہی تھی۔ اس میٹنگ کے بارے میں حکومت یا فوج کی طرف سے کوئی پریس ریلیز جاری نہیں کی گئی تھی۔

ایک ذریعے کے مطابق کہا جا رہا تھا کہ ہجوم کے سامنے سی ایس اور پولیس کے اہلکاروں کی ناکامی کی وجہ سے صدرِ مملکت نے فوج کو حرکت میں لانا چاہا تھا مگر یہ خواہش رنگ نہیں لا سکی تھی۔ چیف آف آرمی اسٹاف نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ ایک چوتھائی سے زائد کور کمانڈرز کی ہمدردی اس وقت عوام کے ساتھ تھی لہٰذا اگر باقی کمانڈرز ایکشن لینے پر تیار ہو جاتے تو فوج میں ہی خونریزی ہو جاتی۔ اس صورتِ حال کو سمجھنے کے باعث چیف آف آرمی اسٹاف صدرِ مملکت کی خواہش کا احترام کرنے سے قاصر تھا۔

ٹی وی مبصرین کے خیال کے مطابق اس وقت تک کئی ہزار افراد کو ہلاک کیا جا چکا ہوتا اگر صدر حیات پر غیر ملکی ذرائع ابلاغ کا دباؤ نہ پڑ جاتا۔ یہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے صدر حیات کے خلاف کسی قدر سخت الفاظ کہے تھے اور کئی بڑے ملکوں کے سربراہوں نے بھی صدر حیات کے اقدامات پر ناخوش ہونے کا اظہار کیا تھا اور ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ اس سلسلے میں یونائٹڈ نیشن کا ہنگامی اجلاس طلب کیا جائے۔ اسی قسم کی بات عالمی ہیومن رائٹس کمیشن کی طرف سے بھی کی گئی تھی۔

انہی سب باتوں کے دباؤ کی وجہ سے صدر حیات نے جنرل چنگیزی کو ہدایت کی تھی کہ ہاتھ ذرا ”ہلکا“ رکھا جائے۔

”ہلکا ہاتھ“ ہونے ہی کی وجہ سے ہلاکتیں اب بڑھ نہیں رہی تھیں۔

پشمینہ حیات کے سلسلے میں حکومت کا یہ موقف بار بار

سامنے آرہا تھا کہ حکومت نے اغوا نہیں کیا۔ لیکن دانش یزدانی اور عوام یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

انہی حالات میں ٹی وی ہی کے ذریعے حکومت کی یہ پیشکش سامنے آئی کہ عوام جو کچھ چاہتے ہیں، اس سلسلے میں مذاکرات کیے جا سکتے ہیں۔ عوام اپنا نمائندہ وفد قصرِ صدارت بھیجیں لیکن یہ مذاکرات اسی شرط پر ہو سکتے ہیں کہ لوگ اب بڑے گراؤنڈ کی طرف نہ بڑھیں۔ پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں کو بھی ہر قسم کے اقدامات سے روک دیا جائے گا۔

''عوام'' سے حکومت کی مراد دانش یزدانی ہی سے ہو سکتی تھی۔

ٹی وی چینلز پر تبصرے شروع ہو گئے۔ یہ سوال کیا گیا کہ کیا حکومت عوام کے خلاف کوئی خطرناک قدم اٹھانا چاہتی ہے جس کے لیے ضروری ہے کہ کچھ وقت گزارا جائے؟ اس وقت میں وہ خطرناک اقدام کی تیاریاں کر لیتی۔

لوگوں کی ہلاکتوں کی وجہ سے دانش بہت دکھی ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی سوچنا پڑا کہ اس وقت پارٹی کے دوسرے لوگوں کے خیالات کیا ہوں گے۔ اس نے اس موقع پر مشاورت ضروری سمجھی۔ اس نے اشارہ کیا کہ کرین نیچے کی جائے۔ ساتھ ہی اس نے اپنا موبائل نکالا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس وقت ٹی وی چینلز سے کیا خبریں نشر ہو رہی تھیں۔

کرین جب نیچے پہنچی تو دانش نے موبائل بند کر دیا۔ وہاں پارٹی کے سرکردہ افراد موجود تھے جن میں صدر اسد گیلانی بھی تھا۔

''پہنچ گئے آپ بھی۔'' دانش اسے دیکھ کر خوش ہوا۔

''ضروری تھا کہ مشاورت میں آپ بھی ہوں۔''

ٹی وی چینلز سے مشاورت کی خبر بھی نشر ہو گئی۔

اس مشاورت میں ایک گھنٹے سے زیادہ گزر گیا۔ جس کی وجہ مختلف تجاویز تھیں۔ دانش کوشش کر رہا تھا کہ سب ایک بات پر متفق ہو جائیں۔

اسی وقت ہجوم میں سے ایک نوجوان شخص نے دانش وغیرہ کے قریب جانا چاہا لیکن گارڈز نے اسے روک لیا۔

''میں صرف یہ پیغام دانش صاحب تک پہنچانا چاہتا ہوں۔'' اس شخص نے ایک لفافہ دکھایا۔ دانش وغیرہ سب اس کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

''لفافہ لے لیں اس سے۔'' دانش نے کہا۔

ایک گارڈ نے لفافہ لے لیا اور قریب آ کر دانش کو دیا۔ دانش نے لفافہ چاک کر کے اس میں سے کاغذ نکالا۔ کاغذ پر ہاتھ کی جو تحریر تھی، وہ دانش کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ چونک گیا۔ پھر بھی اس نے سب سے پہلے نیچے لکھا ہوا نام دیکھا۔ وہ نام ''پشمینہ'' تھا۔

خط میں لکھا تھا۔ ''دانش ڈیئر! مجھے اغوا کرنے والے ناکام ہوئے تھے۔ میں اور ڈیبرا انہی کے ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر فرار ہو سکے۔ اب ہم دونوں ایک محفوظ جگہ پر ہیں۔ ایسا بندوبست بھی ہو گیا ہے کہ میں فوراً تم تک پہنچ سکتی ہوں لیکن مجھے خاصا تیز بخار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر نے بڑے یقین سے کہا ہے کہ رات تک بخار ٹوٹ جائے گا۔ میں بخار میں بھی تم تک پہنچ جاتی لیکن ضروری ہے کہ ریلی میں لوگوں کی تعداد اور بڑھ جائے۔ شاہ صاحب کے معتقدین بھی شامل ہو جائیں مگر ابھی میری شاہ صاحب سے فون پر بات ہوئی ہے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک کسی ٹی وی نے بھی یہ خبر نشر نہیں کی۔ شاہ صاحب کا طیارہ کسی بڑی ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے پڑوس کے ایک ملک میں اترنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خرابی دور ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔ اسی وجہ سے ابھی شاہ صاحب کے معتقدین ریلی میں نہیں آ سکیں گے۔ انہیں شاہ صاحب کا انتظار رہے گا اور وہ ایئرپورٹ پر ہی رکیں گے۔ یہ ایک اچھا موقع ہے کہ حکومت کی پیشکش منظور کر لی جائے۔ صدرِ حیات کو اگر کسی وجہ سے کچھ وقت گزارنا ہے تو اب ہمیں بھی اس کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ممکن ہے شاہ صاحب کل صبح تک آ سکیں۔ میں بھی بخار اترنے کے بعد کل آ سکوں گی۔ بخار نہ بھی اترا تو آؤں گی۔ فی الحال اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔ ہمیں بھی کل تک کی مہلت مل جائے تو اچھا ہے۔ ویسے سب سے مشورہ بھی کر لو، جو تم کر ہی رہے ہو۔ پشمینہ۔''

دانش کو محسوس ہوا کہ اس کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ پشمینہ کے بارے میں سوچ اس کے دماغ پر بہت دباؤ ڈالے ہوئے تھی۔

اس نے خط لفافے میں رکھ کر جیب میں ڈال لیا۔ اس نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ پشمینہ کے بارے میں کسی کو بتائے۔ اس کے خیال میں پشمینہ یہ بات لکھنا بھول گئی تھی کہ یہ بات پوشیدہ رکھ کر حکومت پر یہ دباؤ باقی رکھا جائے کہ اسے حکومت نے اغوا کیا ہے۔

☆☆☆

اسی وقت ٹی وی چینلز سے یہ بریکنگ نیوز چلی کہ شاہ

صاحب کا طیارہ کسی ٹیکنیکل خرابی کے باعث وقت پر نہیں آسکے گا۔ چینلز سے اس ملک کا نام بھی نشر کر دیا گیا جہاں شاہ صاحب کے طیارے نے مجبوراً لینڈ کیا تھا۔

اس خبر نے ان لوگوں کو مضطرب کر دیا جو شاہ صاحب کے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر جمع ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے طور پر ٹی وی کی اس خبر کی تصدیق کر لی۔ وہاں فیصلہ یہ کیا گیا کہ جب تک شاہ صاحب کا طیارہ نہیں آجاتا، وہ لوگ ائرپورٹ پر ہی رکیں گے۔

کچھ ہی دیر بعد ٹی وی چینلز سے یہ خبر بھی نشر ہوئی کہ دانش یزدانی نے حکومت کی پیشکش قبول کر لی ہے اور جلد ہی تین آدمیوں کا ایک وفد پارٹی کے صدر اسد گیلانی کی سربراہی میں قصرِ صدارت جائے گا۔

نتیجے میں سی ایس اور پولیس کے جارحانہ اقدامات رک گئے۔ بڑے گراؤنڈ تک پہنچنے کی کوشش کرنے والے بھی راستے میں رک گئے۔ انہوں نے بھی یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ جہاں تک پہنچ گئے ہیں، وہیں رکیں گے، اپنے گھروں کی طرف نہیں لوٹیں گے۔ پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں نے جارحانہ اقدامات تو روک دیے تھے لیکن جہاں بھی ہجوم تھا، وہ اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑے رہے تھے۔

ٹی وی پر اب یہ تبصرہ شروع ہوا کہ حکومت دانش یزدانی کے وفد کو یرغمال بنا سکتی ہے لیکن زیادہ تر تجزیہ کاروں کے خیال میں حکومت ان حالات کو اس طرح مزید خراب نہیں کرے گی۔

طے پایا تھا کہ مذاکرات قصرِ صدارت میں نہیں بلکہ وزیراعظم ہاؤس میں ہوں گے۔ حکومت کی ترجمانی وزیراعظم، وزیرِ داخلہ اور صدر حیات کے دو مشیر کریں گے۔

مذاکرات کا آغاز دوپہر دو بجے ہوا۔ ری پبلکن فورم کا وفد اسی وقت وزیراعظم ہاؤس پہنچا تھا۔

حکومت اور عوام میں ایک اعتبار سے ''سیز فائر'' بھی ہو گیا تھا لیکن شہر بند ہی رہا۔ جگہ جگہ ہجوم نے پڑاؤ ڈال دیے تھے۔ عام لوگوں نے ان کے لیے دریوں اور شامیانوں کا بندوبست کر دیا تھا لیکن ہجوم اتنا تھا کہ سب لوگوں کے لیے یہ بندوبست نہیں ہو سکا تھا۔ بہت سے لوگوں کو اپنے گھروں سے دریاں منگوانی پڑیں۔ دھوپ میں ہی سہی لیکن اس طرح وہ لیٹ بیٹھ تو سکتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ مذاکرات کے کئی دور ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی ملاقات میں سب کچھ طے نہیں ہو جاتا۔

ٹی وی چینلز پر تبصرے جاری رہے۔ خیال کیا جا رہا تھا کہ صدر حیات کو اتنے شدید ردِعمل کی توقع نہیں تھی اور اسی لیے اس نے مصالحت کا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی یا وہ کسی بہت سخت کارروائی کرنے سے پہلے اس کی تیاری کے لیے کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔

مذاکرات کے بارے میں سُن گُن لینے کے لیے ٹی وی چینلز اور اخبارات کے نمائندے نہ صرف یہ کہ وزیراعظم ہاؤس کے پاس جمع تھے بلکہ سرتوڑ کوششیں کر رہے تھے کہ انہیں مذاکرات کے بارے میں کوئی خبر مل جائے کہ وہ کس نہج پر چل رہے تھے۔

مذاکرات دو گھنٹے تک جاری رہے۔ اسد گیلانی اور ان کے ساتھ جانے والے دونوں افراد بڑے گراؤنڈ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ حکومت کی طرف سے یہ نہیں بتایا گیا کہ مذاکرات کن بنیادوں پر ہوئے تھے، بس یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مذاکرات کا دوسرا دور پانچ بجے سے ہوگا۔

یہ بات ری پبلکن فورم کی طرف سے سامنے آئی کہ ان کے مطالبات یہ تھے کہ صدر مملکت استعفا دیں، عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے، ملک میں صدارتی نظام کے بجائے حقیقی معنوں میں پارلیمانی نظام قائم ہونا چاہیے، یہ نام نہاد پارلیمانی نظام نہیں جس میں سارے اختیارات پس پردہ سہی لیکن صدر مملکت کے ہاتھ میں تھے۔ نیز عبوری حکومت کو عام انتخابات کے لیے صرف ایک ماہ کی مہلت دی جائے گی اور پشمینہ حیات کو آزاد کیا جائے۔

ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ کسی ٹی وی چینل کو یہ انتظام کرنے دیا جائے کہ وہ ایک کرین کے ذریعے اپنا کیمرا اوپر لے جاسکے اور دانش یزدانی کو قریب سے دکھایا جاسکے۔

آخری مطالبہ فوراً مان لیا گیا۔ باقی معاملات پر بحث جاری رہی۔ آخر میں طے پایا تھا کہ حکومتی وفد کو یہ مینڈیٹ حاصل نہیں کہ وہ صدر کے استعفے کا مطالبہ تسلیم کر لے۔ حکومت کا یہ موقف بدستور تھا کہ پشمینہ حیات کو اس نے اغوا نہیں کروایا اس لیے آزاد بھی کیسے کر سکتی ہے۔

ری پبلکن فورم کی جانب سے کہا گیا کہ وہ اپنے کسی بھی مطالبے سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

شاہ صاحب نے ایک وڈیو پیغام بھجوایا تھا جو ٹی وی چینلز نے نشر کیا۔ اس میں شاہ صاحب نے کہا تھا کہ جب تک حکومت مطالبات تسلیم نہ کرے، لوگ اپنی اپنی جگہ پر جمے رہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ یہیں کی حکومت کے طیارے سے آرہے تھے جس کی ٹیکنیکل خرابی ابھی تک دور

نہیں ہو سکی تھی۔ انہیں شبہ تھا کہ ٹیکنیکل خرابی نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے صدر حیات کے حکم سے راستے ہی میں رکوا دیا گیا ہے۔ انہوں نے مقامی حکومت سے طیارہ چارٹرڈ کروانا چاہا تھا مگر ان لوگوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی ہے کہ ان کے ملک کے ائرپورٹ پر لوگوں کا جو ہجوم ہے، وہ کسی وقت بھی کچھ کر سکتا ہے اس لیے وہ اپنا کوئی طیارہ خطرات میں نہیں جھونک سکتے۔ نیز یہ کہ یہاں کی حکومت نے بھی انہیں لینے کے لیے دوسرا طیارہ بھیجنے سے معذرت کرتے ہوئے مختلف بہانے تراشے تھے اس لیے اب وہ کسی تیسرے ملک سے طیارہ چارٹرڈ کرانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ری پبلکن فورم اور حکومت کے مذاکرات کا دوسرا دور پانچ بجے شروع ہوا جس میں یہ مطالبہ بھی شامل کیا گیا کہ حکومت شاہ صاحب کو لانے کے لیے دوسرا طیارہ بھیجے۔

حکومتی وفد نے ان مذاکرات میں کہا تھا کہ صدر استعفا تو نہیں دیں گے لیکن وزیراعظم کو تمام اختیارات سونپ دیں گے اور اسی کے ذریعے عبوری حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو ایک ماہ کے اندر انتخابات کرانے کی پابند ہوگی۔ پشمینہ حیات کے سلسلے میں کہا گیا تھا کہ وہ بہت جلد اس کا ثبوت فراہم کر دے گی کہ اس اغوا میں اس کا ہاتھ نہیں تھا۔

اس طرح دوسرا دور بھی ناکام رہا لیکن یہ طے پایا کہ معاملات سلجھنے کے امکانات ہیں اس لیے تیسرا دور رات کو دس بجے کیا جائے گا۔

ٹی وی چینلز پر تبصرے شروع ہو گئے۔ اس بات پر یقین کیا جانے لگا کہ حکومت کسی وجہ سے وقت گزارنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ قطعی طے ہے کہ صدر کے استعفے کا مطالبہ کسی صورت میں نہیں مانا جائے گا۔

یہ تبصرے غلط نہیں تھے۔ قصر صدارت میں وزیراعظم سے کہا جا رہا تھا۔ ”بس ان باتوں میں کسی طرح آج کی رات گزار دو۔ کل صبح حالات پر قابو پانے کے لیے فیصلہ کن اقدام کیا جائے گا۔“

”پریسیڈنٹ سر!“ وزیراعظم نے کہا۔ ”ابھی ابھی یہ تشویش کی خبر سننے میں آئی ہے کہ یونائیٹڈ نیشن نے کل رات ہی ہنگامی اجلاس طلب کر لیا ہے۔“

”کل رات ابھی دور ہے۔“ صدر حیات نے غصے سے کہا۔ ”میں صرف آج رات کی مہلت چاہتا ہوں۔ کیوں چنگیزی؟“

”جی ہاں سر!“ چنگیزی نے جواب دیا۔ ”آج رات معاملات سنبھالنے کی تیاری مکمل کر لی جائے گی۔“

وزیراعظم نے صدر حیات کو یقین دلایا کہ وہ مذاکرات کے تیسرے دور کا اختتام اس بات پر کرے گا کہ آخری اور فیصلہ کن مذاکرات کل صبح سات بجے ہوں گے۔

چنانچہ تیسرے دور میں اسد گیلانی کے وفد سے ڈھائی گھنٹے کی بحث کے بعد کہا گیا کہ اگر وہ لوگ اپنے کسی مطالبے سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تو ملک کے حالات درست کرنے کے لیے وزیراعظم خود صدر کو مجبور کرے گا کہ وہ استعفا دے دیں اور پشمینہ کے سلسلے میں کہا گیا کہ اس بارے میں ثبوت حاصل کرنا خاصا دشوار طلب ہو رہا ہے تاہم کل صبح تک وہ ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس کے بعد آدھی رات کو دانش یزدانی اور اس کے ساتھیوں سے مشاورت شروع ہوئی۔

”صدر حیات کسی وجہ سے صرف وقت گزارنا چاہتا ہے۔“ دانش یزدانی نے کہا۔ ”اور ہمیں بھی اسی کی ضرورت ہے۔ مجھے ایک خاص ذریعے سے فون پر اطلاع ملی ہے کہ شاہ صاحب کچھ بندوبست کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ صبح چھ بجے تک انہیں کوئی طیارہ مل جائے گا جس سے وہ ساڑھے چھ بجے تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد وہ سارا ہجوم بھی ہمارے ساتھ ہوگا۔“

وہ رات لوگ ائرپورٹ اور شہر کی سڑکوں پر گزار رہے تھے۔ انہیں کل صبح کے آخری مذاکرات کا انتظار تھا۔ یہ اطلاع انہیں بھی مل چکی تھی کہ شاہ صاحب صبح ساڑھے چھ بجے پہنچ جائیں گے۔

اس رات ملک کے بچوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا جو سو سکا ہو۔ سب کی آنکھیں ٹی وی چینلز پر جمی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے کہ کل کیا ہوگا؟

سیاسی جماعتوں کے ہنگامی اجلاس مسلسل جاری تھے۔ اب وہ لوگ ”اتحاد“ بنانے سے زیادہ اس پر غور کر رہے تھے کہ اس احتجاج میں ری پبلکن فورم کے ساتھ شامل ہو جائیں کیونکہ اس کی جیت یقینی معلوم ہونے لگی ہے۔ ساتھ دینے کی صورت میں اس کا امکان تھا کہ آئندہ جو حکومت بنے، اس میں انہیں بھی کچھ حصہ مل جائے۔

صدر حیات اور جنرل چنگیزی کے علاوہ کسی کو اس کا علم نہیں تھا کہ اس رات کیا ہونے والا تھا۔

☆☆☆

رات کے تین بجے تھے جب سی ایس کے کمانڈوز کا

ایک گروپ جنرل آفتاب کے گھر کا گھیراؤ کر چکا تھا۔

جنرل آفتاب ان کور کمانڈرز میں سرفہرست تھا جن کی ہمدردیاں احتجاج کرنے والے عوام کے ساتھ تھیں اور جن کی وجہ سے چیف آف آرمی اسٹاف فوج کو عوام کے خلاف لانے سے گریزاں تھا۔

سی ایس کے کمانڈوز بے تحاشا فائرنگ کرتے، فوجی محافظوں کو ہلاک کرتے، دروازے کھڑکیاں توڑتے ہوئے گھر میں داخل ہوگئے۔

گھر کے دیگر افراد کے علاوہ میجر جنرل آفتاب بھی فائرنگ کی آوازوں سے جاگ گیا تھا اور اس کی بیوی بھی۔ جنرل آفتاب نے ایک ہاتھ سے ریوالور نکالا اور دوسرے ہاتھ سے موبائل فون۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ حملہ آور سی ایس کے لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوسکتا۔ موبائل پر اس نے اپنے ہمنوا لیفٹیننٹ جنرل آغا سے رابطہ کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا تھا۔

اس وقت سی ایس کے کمانڈوز اس کی خواب گاہ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جنرل آفتاب کی بیوی کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔

"میرے...... میرے بچے......" اس کی کپکپاتی روہانسی آواز جنرل آفتاب نے سنی لیکن نظرانداز کر دی۔ وہ موبائل کان سے لگائے ہوئے تھا لیکن دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں کی جارہی تھی۔ اس سے جنرل آفتاب نے یہی سمجھا کہ جنرل آغا اپنا فون بند کر کے سویا تھا یا حکومت نے سیلولر کمپنیوں کے ذریعے کوئی خرابی کروادی تھی۔

دوسری مرتبہ جنرل آفتاب نے میجر جنرل حیدر سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اسی وقت کمرے کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔

جنرل آفتاب نے اپنی یقینی موت کا چہرہ دیکھ لیا چنانچہ اس کے ریوالور نے بھی اندر آنے والوں پر اپنا ریوالور خالی کر دینا چاہا لیکن وہ دو کے بعد تیسری گولی نہ چلا سکا۔ ان گنت گولیوں نے اس کا سارا جسم چھلنی کر دیا تھا۔ حملہ آوروں نے یہی سلوک اس کی بیوی کے ساتھ بھی کیا۔ خون میں لت پت ان دونوں کے جسم ایک دوسرے پر گرے۔

گھر کے دوسرے لوگوں کو پہلے ہی ختم کیا جا چکا تھا جن میں جنرل آفتاب کے آٹھ سالہ بیٹے کو بھی زندہ نہیں چھوڑا گیا تھا۔

اسی قسم کے واقعات جنرل آفتاب کے تمام ساتھی کور کمانڈرز کے ساتھ بھی پیش آئے۔ ان میں سے دو کو اغوا کر

کے بھی لے جایا گیا۔ انہیں روح کو لرزا دینے والا تشدد کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔

ساڑھے پانچ بجے تک سی ایس کا یہ آپریشن مکمل ہو چکا تھا جس کی خبر کسی ٹی وی چینل کو نہیں مل سکی تھی اور اگر مل بھی جاتی تو وہ اسے نشر نہ کر پاتے کیونکہ ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ رات کے دو بجے کوئی آرڈی نینس جاری کیا گیا تھا۔

میڈیا آرڈی نینس جس کے باعث کوئی ٹی وی چینل ملکی حالات کی خبریں دے سکتا تھا، نہ کسی چینل پر حکومت کے خلاف کوئی بات بھی جاسکتی تھی۔

تمام چینلز ملک کا ایک ادارہ چلا رہا تھا اس لیے جب چند چینلز نے اس آرڈی نینس کی ذرا بھی خلاف ورزی کی، ان کی نشریات بند کردی گئیں۔ صبح ہوتے پر ان کے لائسنس بھی منسوخ کر دیے جاتے۔ ان کے مالکان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی ہوتی۔

اس عمل سے ری پبلکن فورم کے ذمے داران میں بھی ہلچل مچ گئی۔

''صدر حیات کوئی بہت خطرناک قدم اٹھانے والا ہے۔'' دانش یزدانی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

پارٹی کے صدر اسد گیلانی نے موبائل پر وزیر داخلہ سے رابطہ کیا اور اس سے کہا۔ ''یہ آرڈی نینس مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔'' وزیر داخلہ کا جواب تھا۔ ''ان ٹی وی چینلز پر جو تبصرے اور تجزیے ہو رہے تھے، ان سے عام لوگ ذہنی انتشار میں مبتلا ہو رہے ہوں گے۔ یہ آرڈی نینس ان لوگوں کو ذہنی انتشار سے بچانے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ ہمارے مذاکرات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔''

ری پبلکن فورم کے لوگوں کے لیے یہ شافی جواب نہیں تھا۔

''جھوٹ بول رہا ہے وہ!'' اسد گیلانی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اگر صبح کے اخباروں میں حکومت کی خواہش کے خلاف کوئی بات ہوئی تو وہ اخبار پریس سے ہی نہیں نکلنے دیا جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کسی نہ کسی بات کو جواز بنا کر سارے ہی چینل بند کر دیے جائیں۔''

''عوام کو اس کے لیے تیار کیا جانا چاہیے۔'' کسی نے کہا۔ ''غیر ملکی چینلز سننے کے لیے ڈش استعمال کی جائے۔''

یہ بات عوام خود سوچ چکے تھے اور جن کے گھروں پر ڈش بیکار پڑی ہوئی تھیں، انہیں دوبارہ ٹی وی سے مربوط کرنے کی تیاریاں شروع کردی گئیں۔

پانچ بجے ایک غیر ملکی چینل سے یہ خبر نشر ہوگئی کہ تھوڑی دیر قبل شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تھی کہ طیارے کی ٹیکنیکل خرابی دور ہو چکی ہے لیکن شاہ صاحب نے اسی طیارے سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو انہوں نے چارٹر کیا تھا۔ پانچ بج کر پانچ منٹ پر وہ اس طیارے سے پرواز بھی کر چکے تھے۔ پرواز سے قبل ان سے ایک غیر ملکی نمائندے نے سوال کیا تھا کہ وہ اپنے ہی ملک کے طیارے سے کیوں نہیں جاتے۔

شاہ صاحب کا جواب تھا۔ ''ایک تو یہ کہ وہ طیارہ آچکا ہے جو میں نے چارٹر کیا ہے۔ دوسرے مجھے یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں نے اپنے ملک کے طیارے میں سفر کیا تو ممکن ہے، اس کا پائلٹ حکومت کے حکم سے کسی دوسرے چھوٹے موٹے ائرپورٹ پر لے جا کر اتار دے۔ جو لوگ وہاں میرے استقبال کے لیے ائرپورٹ پر جمع ہو چکے ہیں، وہ کیا کریں گے۔''

غرضیکہ ائرپورٹ پر آرام کرتے ہوئے لوگ فوراً اٹھ بیٹھے اور پُرجوش نعرہ بازی شروع ہوگئی۔

شاہ صاحب کو پانچ بج کر پینتیس منٹ پر وہاں پہنچنا تھا لیکن ذرا دیر بعد ہی لوگوں نے یہ خبر سنی کہ طیارہ جیسے ہی اپنے ملک کی حدود میں داخل ہوا تھا کہ کسی جانب سے چلائے جانے والے راکٹ نے طیارے کو فضا ہی میں دھماکے سے اُڑا دیا۔

شاہ صاحب کی یقینی موت!

''یہ سی ایس کی کارروائی ہے۔'' کسی چینل نے دانش یزدانی کی آواز لوگوں تک پہنچادی۔

اس نے مزید بہت کچھ کہا ہوگا لیکن فوراً ہی نہ صرف اس چینل کی بلکہ تمام چینلز کی نشریات بند کردی گئیں۔

شاہ صاحب کے معتقدین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور ان کی بڑی تعداد نعرے لگاتی ہوئی بڑے گراؤنڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس وقت فوری طور پر سی ایس یا پولیس نے کوئی ایکشن نہیں لیا کیونکہ انہیں قصرِ صدارت سے اس کا حکم نہیں ملا تھا۔ حکم نہ ملنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت چیف آف آرمی اسٹاف نے صدر کا حکم ملنے پر ایک ہیلی کاپٹر میں قصرِ صدارت کا رخ ابھی کیا ہی تھا۔ ان دونوں کی ملاقات ابھی نہیں ہوئی تھی۔

جو طیارہ تباہ ہوا، وہ ایک بڑے مغربی ملک کا تھا۔ اس کے وزیر خارجہ نے پانچ منٹ بعد ہی اعلان کردیا کہ ہم

اس واقعے کو اعلانِ جنگ سمجھ رہے ہیں۔

"یہ بہت خطرناک بات ہوئی ہے پریسیڈنٹ سر!" آرمی چیف نے ملاقات ہونے پر صدر حیات سے پہلی بات یہی کی۔ "اس طیارے کو تباہ کروا کے آپ نے ایک اور مصیبت مول لے لی ہے۔"

"یہ میں نے نہیں کروایا۔" صدر حیات نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ خودری پبلکن فورم والوں نے کروایا ہوگا تاکہ اس شخص کی موت سے لوگوں کا اشتعال اور بڑھ سکے۔"

آرمی چیف نے اس جواب کو جھوٹ سمجھا ہو یا نہ ہو، مگر عوام کو یقین تھا کہ یہ سی ایس والوں کی حرکت تھی۔ ان کا غم و غصہ اب جیسے آسمان کو چھو رہا تھا۔ شہر میں پھر ایک طوفان آگیا۔ صدر حیات کے دو تین مجسمے پہلے ہی گرائے جا چکے تھے، اب باقی مجسمے بھی گرائے جانے لگے۔ سرکاری عمارتوں اور پولیس اسٹیشنوں کو آگ لگائی جانے لگی۔

چھ بج کر کچھ منٹ پر سی ایس اور پولیس کے اہلکار بھی جوابی کارروائی شروع کر چکے تھے۔ سارے شہر میں آنسو گیس، واٹر کین کے علاوہ گولیاں بھی برسائی جانے لگیں۔

شاہ صاحب کی ہلاکت کی خبر سن کر پشمینہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئی تھیں۔ ڈیبرا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ وہ مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی شاہ صاحب کی انتہائی معتقد تھی۔

پشمینہ نے جذبات میں ڈوبی بھرائی ہوئی آواز میں موبائل فون پر دانش یزدانی سے کہا۔ "میں ایک گھنٹے کے اندر اندر تم تک پہنچ جاؤں گی۔ اس وقت تک شاہ صاحب کے معتقدین بھی بڑی تعداد میں بڑے گراؤنڈ تک پہنچ چکے ہوں گے۔"

"مگر کیسے؟" دانش یزدانی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ان حالات میں پشمینہ اس تک کیسے پہنچ سکے گی۔ ہر طرف تو قیامت برپا ہو چکی تھی۔

لیکن پشمینہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ رابطہ منقطع کر کے اس نے شاہ صاحب کی بیٹی اقصیٰ سے رابطہ کیا جس نے روتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"ہمت کرو اقصیٰ!" پشمینہ نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "اب تمہیں ہی شاہ صاحب کی جگہ قیادت سنبھالنی ہوگی۔ بڑے گراؤنڈ کی طرف بڑھو، آج ہی صدر حیات کا روزِ حساب ہے۔"

"ہم اب بڑے گراؤنڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔" اقصیٰ نے روتے ہوئے جواب دیا۔

شاید وہ بھی اسی الجھن کا شکار ہوتی جو دانش کو لاحق ہوئی تھی مگر اس وقت اس کے دل و دماغ کو باپ کی موت کے صدمے نے گھیر رکھا تھا۔

غیر ملکی ذرائع نے ایک اور خبر بھی نشر کر دی جو ان تک نہ جانے کس نے پہنچائی ہوگی۔ انہوں نے بتا دیا کہ صدر حیات کی نئی قائم کردہ ایجنسی سی ایس نے فوج کے متعدد کور کمانڈرز کو ہلاک کر دیا ہے، جن کی تعداد ابھی نہیں معلوم ہو سکی اور نہ یہ معلوم ہوا ہے کہ انہیں کیوں ہلاک کیا گیا ہے۔

لیکن دانش یزدانی جانتا تھا کہ انہیں ہی ہلاک کرنے کے لیے صدر حیات نے مذاکرات کی آڑ میں وقت گزارا تھا۔

پشمینہ سے دانش کو یہ بات بھی معلوم ہو چکی تھی کہ کچھ کور کمانڈرز کی ہمدردیاں عوام کے ساتھ تھیں اس لیے فوج کو عوام کے خلاف کھڑا کرنا صدر حیات کے لیے مشکل تھا۔ ان کور کمانڈرز کو ختم کروا کے صدر حیات نے اپنے لیے راہ ہموار کر لی تھی۔

لیکن دانش کو ابھی تک کہیں سے اطلاع نہیں ملی تھی کہ فوج عوام کے سامنے آئی ہو۔ اس کی وجہ اس کے سامنے آ بھی نہیں سکتی تھی۔

شاہ صاحب کے طیارے کی تباہی کے آدھے گھنٹے بعد ہی آرمی چیف صدر حیات کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا۔

"پریسیڈنٹ سر! اب اگر فوج کو عوام کے خلاف کھڑا کیا گیا تو صورتِ حال بہت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اس طیارے کی تباہی نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس ملک کے وزیر خارجہ نے یہ اعلان کر ہی دیا تھا کہ اس واقعے کو اعلانِ جنگ سمجھا جائے گا لیکن ابھی جب میں آپ کے پاس آ رہا تھا تو اس ملک کے آرمی چیف نے مجھے فون کیا تھا۔ اس کا لہجہ بہت سخت تھا۔ اس نے کہا کہ اب اگر فوج نے عوام کو کچلنا چاہا تو اس میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ جائے گا کہ طیارے کو تباہ کرنے کی سازش میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک تھا۔ اس صورت میں وہ جلد ہی اپنی فوج بھی یہاں اتار دے گا اور اس اقدام میں اسے یو این او کی حمایت حاصل ہوگی۔ اس کے طیارے ہمارے فوجی اڈوں پر بمباری بھی شروع کر دیں گے اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ آج کے یو این او کے ہنگامی اجلاس میں یہ قرارداد بھی منظور کر لی جائے گی کہ یہاں کے عوام کی مدد کے لیے یو این او کی فوج بھی یہاں بھیج دی جائے۔ اب آپ جو حکم دیں، میں وہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ بس اس کے لیے تیار

رہے گا کہ پھر ہمیں ایک بڑی طاقت سے جنگ کے لیے بھی تیار ہونا پڑے گا لیکن کیا ہم اس سے ٹکر لے سکیں گے؟"

صدر حیات نے اس کی آدھی سے زیادہ باتیں غصے میں ٹہلتے ہوئے سنی تھیں۔ آرمی چیف کے خاموش ہوتے ہی وہ گرج کر بولا۔ "یہ میرا حکم ہے کہ عوامی بغاوت کو سختی سے کچل دو۔ یہ میرا ملک ہے۔ میں یہاں جو چاہوں، کروں۔ ساری دنیا بھی میری مخالف ہوجائے گی تو میں لڑوں گا۔"

صدر حیات کی عقل اس وقت غصے کی آگ کا ایندھن بن چکی تھی۔

اس کے حکم سے آرمی چیف کے چہرے کے عضلات تن گئے۔ تاہم اس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "پریسیڈنٹ سر! میں نے جو بھی یہ کہا تھا کہ آپ جو حکم دیں، وہ کرنے کے لیے تیار ہوں، لیکن یہ میں نے آپ کے احترام میں کہا تھا۔ میں جو حلف اٹھا چکا ہوں، اس سے انحراف نہیں کرسکتا۔ میں نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی بقا کے لیے حلف اٹھایا تھا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے ہی کسی اقدام کی وجہ سے یہ ملک تباہ ہوجائے۔ اور اس ملک کی عوام بے موت مارے جائیں۔"

"جنرل!" صدر حیات بہت زور سے گرجا تھا۔ "تم بھول رہے ہو کہ تم پر میرے کتنے احسانات ہیں۔"

"انہی کے بوجھ سے تو دبا ہوا ہوں سر!" جنرل نے اب بھی تحمل سے جواب دیا۔ "میں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے سے معذور ہوں تو آپ مجھے معطل کردیجیے! میری جگہ کسی اور کو لے آئیے! اگر آپ مجھے معطل نہیں کرنا چاہیں گے تو میں خود اسی وقت استعفا دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس وقت ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ صدر حیات اس سے فوراً استعفا مانگ لیتا لیکن غصے کی شدت اتنی ہوچکی تھی کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ بھی نہیں کرسکا جو شاید اس کے حق میں جاتا۔ اس نے غصے سے گرج کر حکم صادر کیا۔ "تم جاسکتے ہو!"

آرمی چیف مزید کچھ کہے بغیر اٹھا اور سلام کرکے کمرے سے چلا گیا۔

یہی وجہ تھی کہ ابھی تک عوام کو فوج کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، صرف سی ایس اور پولیس کے اہلکاروں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کے باوجود غیر ملکی ذرائع یہ خبر نشر کررہے تھے کہ حکومت کے خلاف اٹھنے والے طوفان میں ہزاروں افراد ہلاک ہوچکے ہیں۔

جن لوگوں کے گھروں پر ڈش تھی، وہ ذرائع ابلاغ کی خبریں سن رہے تھے اور فون کے ذریعے دوسرے لوگوں کو اطلاع دے رہے تھے۔ اس طرح دو خبریں ہر طرف پھیل رہی تھیں۔

دانش یزدانی نے یہ خبر بھی سنی کہ صدر حیات اور آرمی چیف کی ملاقات ہوئی تھی جس کے بعد اب آرمی چیف کی صدارت میں کور کمانڈرز کا ہنگامی اجلاس ہورہا تھا۔

"ہم اب فوج سے بھی ٹکر لیں گے۔" یزدانی نے جوش میں اعلان کیا۔ اسے حقیقت کا علم بہرحال نہیں تھا۔ "ہمیں خون کے آخری قطرے تک اپنی آزادی اور جمہوریت کی بقا کی جنگ لڑنی ہے۔ فوج نے اگر مارشل لا لگایا تو ہم اس کے سامنے سینہ سپر ہوں گے۔"

اسی وقت ہجوم نے دیکھا کہ فضا میں ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا تھا۔ وہ تیزی سے کرین کے اس بلند پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں دانش یزدانی کھڑا ہوا تھا۔

ہر طرف بے چینی پھیل گئی۔ لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ حکومت نے دانش یزدانی کو ختم کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجا ہے۔

خاصے لوگوں کے پاس کلاشنکوف اور اس قسم کا دیگر اسلحہ بھی تھا جو اٹھالیا گیا تاکہ ہیلی کاپٹر پر گولیاں برسا سکیں۔

اس وقت ضروری تھا کہ کرین، دانش یزدانی کو نیچے لے آتی۔ کرین کو اوپر لے جانے یا نیچے لانے کا میکنزم نیچے ہی تھا لیکن اس کے ذمے دار اس وقت تک کچھ نہیں کرسکتے تھے جب تک انہیں دانش یزدانی کا حکم نہ ملے۔ اسی لیے پارٹی کے صدر اسد گیلانی نے موبائل پر دانش سے رابطہ کرنا چاہا لیکن لائن انگیج تھی۔ اسد گیلانی نے جب نمبر ملانے کے بعد اوپر دیکھا تھا تو دانش موبائل نکال کر اپنے کان سے لگا چکا تھا۔

"یہ میں ہوں دانش، ہیلی کاپٹر میں۔" دانش کو پشمینہ کی آواز سنائی دی تھی۔ "میں اور ڈیرا آرہے ہیں۔ کسی وجہ سے کچھ دیر ہوگئی۔ کہیں تم ہیلی کاپٹر پر فائرنگ نہ شروع کر دینا۔"

دانش حیران رہ گیا کہ پشمینہ کو ہیلی کاپٹر کہاں سے مل گیا، لیکن اسے اس پر غور کرنے کی مہلت حاصل نہیں تھی۔ اس نے لوگوں کو اسلحہ سنبھالتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے فوراً اعلان کیا۔

"کوئی فائرنگ نہ کرے۔ کوئی فائر نہ کرے۔ ہیلی کاپٹر میں پشمینہ حیات آرہی ہیں۔ وہ حکومت کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی ہیں۔"

اسے یہ ڈراما جاری رکھنا تھا کہ پشمینہ کو حکومت ہی نے

اغوا کروا یا تھا۔

پشمینہ حیات کا نام سنتے ہی اسلحہ نیچے کرلیا گیا اور سارا گراؤنڈ پشمینہ حیات "زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگا۔

☆☆☆

پشمینہ نے رات ہی کو سمجھ لیا تھا کہ شہر میں جو حالات تھے، وہ صبح تک مزید خراب ہوجاتے۔ بڑے گراؤنڈ تک پہنچنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا۔

وہ بخار میں مبتلا ہوئی تھی تو اقصیٰ کے فلاحی ادارے کے ایک ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کر کے اسے دوا دی تھی۔

اس مسئلے پر مشاورت ہوئی کہ پشمینہ بڑے گراؤنڈ تک کس طرح پہنچ سکتی ہے۔ اس وقت اقصیٰ وہیں تھی اور مشاورت میں شامل تھی۔ اسی نے ایک ائروکلب سے رابطہ کر کے پشمینہ کے لیے ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا تھا۔

ائروکلب والے اس کے لیے فوراً تیار ہوگئے تھے۔

اس وقت سارے ملک کی یہی حالت تھی۔ سبھی صدر حیات کے خلاف ہوچکے تھے اور ان کی آخری امید پشمینہ ہی سے وابستہ تھی۔ صرف صدر کا مراعات یافتہ طبقہ ہی اس وقت عوام کے خلاف تھا۔

اقصیٰ کو ائرپورٹ جانے والی ریلی کی قیادت کے لیے جانا تھا اس لیے پشمینہ اور ڈیبرا کو لینے کے لیے اسی وقت ہیلی کاپٹر منگوا لیا گیا تھا۔ ڈیبرا اور پشمینہ اسی وقت ائروکلب منتقل ہوگئی تھیں۔ پشمینہ اسی وقت منتقل ہونا چاہتی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر اس کا بخار جلد اتر گیا تو وہ فوراً ہی بڑے گراؤنڈ کی طرف روانہ ہوجائے گی لیکن صبح تک بھی اس کا بخار پوری طرح نہیں اترا تھا۔ اسے حرارت باقی رہی تھی جب اس نے شاہ صاحب کے طیارے کی تباہی کی خبر سننے کے بعد اسی حالت میں بڑے گراؤنڈ پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جس وقت اس کا ہیلی کاپٹر دانش یزدانی کی کرین کی طرف بڑھ رہا تھا، اس وقت تک ایک ہجوم نے حکومت کے اس ادارے پر قبضہ کرلیا تھا جہاں سے ٹی وی چینلز کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے تمام ٹی وی چینلز کی نشریات بحال کردی تھیں اور انہوں نے میڈیا آرڈی نینس کی پروا کیے بغیر اپنا کام شروع کردیا تھا۔ صورتِ حال ایسی بن چکی تھی کہ بہت بڑی اکثریت اپنی زندگی قربان کرنے کے لیے تیار ہوچکی تھی۔

ٹی وی چینلز نے پشمینہ اور ڈیبرا کو ہیلی کاپٹر سے کرین پر اترتے ہوئے بھی دکھایا۔ انہیں اتار کر ہیلی کاپٹر واپس چلا گیا تھا۔

اب دانش کے بجائے پشمینہ کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجنے لگی۔ اس وقت تک شاہ صاحب کے معتقدین کی بڑی تعداد بھی بڑے گراؤنڈ میں پہنچ چکی تھی۔ وہ گراؤنڈ جو ایک لاکھ آدمیوں کے لیے تھا، وہاں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ جمع ہوچکے تھے اور سڑکوں پر تو مار دھاڑ کا سلسلہ جاری ہی تھا۔

اب ایک خبر یہ بھی چل رہی تھی کہ گھروں میں بیٹھے ہوئے لوگ جن کے پاس اسلحے کا لائسنس تھا، وہ بھی اسلحہ لے کر میدان میں آگئے تھے اور جن نوجوانوں کے پاس لائسنس نہیں تھا، وہ بھی اپنے بڑوں کا اسلحہ لے کر گھروں سے نکل پڑے تھے۔ نتیجے میں اب پولیس اور سی ایس کے اہلکاروں پر بھی گولیاں چل رہی تھیں۔ اس وقت تک کی اطلاع کے مطابق سی ایس کے پانچ اور پولیس کے تین اہلکار مارے جاچکے تھے جن میں سی ایس کے دو افسران بھی شامل تھے اور صدر سے اس صورتِ حال کے بارے میں بات کرنے کے لیے جنرل چنگیزی قصرِ صدارت پہنچ گیا تھا۔

"اب کوئی بہت سخت قدم اٹھانا پڑے گا پریذیڈنٹ سر!" اس نے صدر حیات سے کہا تھا جس کی آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ رات سے اب تک نہیں سویا تھا اور غصے میں بھی تھا۔

اس سے پہلے کہ صدر حیات جواب میں کچھ کہتا، اس کے ملٹری سیکریٹری نے اطلاع دی کہ آرمی چیف قصرِ صدارت آنے کی اجازت چاہتا ہے۔

"آنے دو!" صدر حیات نے اس سے کہا۔

ملٹری سیکریٹری کمرے سے رخصت ہوا تو صدر نے کہا۔ "کور کمانڈرز کا اجلاس ہوا تھا۔ اب سارے کور کمانڈرز ہماری حمایت میں ہیں۔ جنرل صاحب پر دباؤ پڑ گیا ہوگا۔" غصے کے باوجود صدر حیات کے ہونٹوں پر ہلکی سی فاتحانہ مسکراہٹ آگئی۔ "اب وہ یہ اجازت لینے آرہا ہوگا کہ سڑکوں پر کس حد تک لاشیں بچھائی جاسکتی ہیں۔"

جنرل چنگیزی نے سر ہلایا۔ وہ بھی کچھ خوش دکھائی دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "میرے لیے اب کیا حکم ہے؟"

"تم ابھی باہر بیٹھو۔ انتظار کرو۔ پہلے میں اس سے ملاقات کرلوں۔ امکان ہے کہ اب سی ایس کو کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔"

"حالات کے بارے میں آپ کو تفصیلی رپورٹ دینا ہے مجھے۔ ابھی معلوم ہوا ہے کہ......"

"سب معلوم ہے مجھے۔" صدر حیات نے جھنجلا کر

اس کی بات کاٹ دی۔ حالانکہ اسے حالات کا صحیح طور پر علم نہیں تھا۔ جب سے ملک کے چینلز نے نشریات شروع کی تھیں، اس نے طیش میں آکر ٹی وی ہی بند کر دیا تھا۔

جنرل چنگیزی سر ہلا کر کمرے سے نکل گیا۔

آرمی چیف کا ہیلی کاپٹر پچیس منٹ میں قصرِ صدارت پہنچ گیا اور پانچ منٹ گزرنے سے پہلے وہ صدر حیات کے سامنے تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، صدر حیات بول پڑا۔ ''کسی بات کی اجازت لینے کے لیے تمہیں میرے پاس آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھ سے پوچھے بغیر تم ہر قدم اٹھا سکتے ہو۔ یہ بغاوت ہر صورت میں کچلنا ہے۔''

''میں یہ عرض کرنے آیا تھا سر، کہ اب فوج بھی کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی لہٰذا......''

''کیا؟'' صدر حیات یک بہ یک بول اٹھا۔ یقیناً اس کے دماغ کو اچھا خاصا جھٹکا لگا ہوگا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ اب کیا رکاوٹ ہے؟ ان کور کمانڈرز کو ختم کیا جا چکا ہے جو تمہارے راستے کی رکاوٹ تھے۔''

''لیکن اب پانی سر سے گزر چکا ہے۔ شاید ہی کوئی شہر بچا ہو جہاں لوگ سڑکوں پر نہ آگئے ہوں۔ کور کمانڈرز اپنی بے بسی کا اظہار کر چکے ہیں۔ طوفان بہت شدت اختیار کر چکا ہے۔ ہزاروں لاشیں بچھا دی جائیں، تب بھی طوفان اب نہیں رکے گا۔''

''تو لاکھوں لاشیں بچھا دو۔'' صدر حیات شاید پاگل ہوا جا رہا تھا۔

''میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ اب کور کمانڈرز میرا یہ حکم نہیں مانیں گے۔''

''تو پھر کیوں آئے تھے؟'' صدر حیات کا اشتعال اور بڑھا۔

''میں بس آپ کے احسانات کا کچھ لحاظ کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کا انتظام کر دوں گا کہ اب آپ اپنی فیملی کے ساتھ ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ کئی......''

''تم جا سکتے ہو۔'' صدر حیات ہتھے سے اکھڑ گیا۔

اس کے باوجود آرمی چیف نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ ''کئی ملک ایسے ہیں جہاں آپ کو سیاسی پناہ مل سکتی ہے۔''

''میں نے کہا تھا، تم جا سکتے ہو۔'' صدر حیات نے گرج کر کہا۔

اپنی اتنی اہانت کے باعث آرمی چیف کا چہرہ سرخ ہو گیا، تاہم اس نے اب بھی تحمل کا ثبوت دیا اور اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''چنگیزی!'' صدر حیات چیخا۔

جنرل چنگیزی فوراً حاضر ہو گیا۔

''وہ احسان فراموش اپنی بے بسی کا اظہار کر کے گیا ہے۔'' صدر حیات نے اس سے کہا۔ ''لیکن مجھے امید ہے کہ تم احسان فراموشی کا مظاہرہ نہیں کرو گے۔''

''حکم دیجیے سر۔'' کرنل چنگیزی نے سعادت مندی سے کہا۔

''جو اس بغاوت کا مرکز بن گیا ہے اسے تباہ کر دو۔'' صدر حیات نے کہا۔ ''تمہارے پاس ہیلی کاپٹر تو ہیں۔ بڑے گراؤنڈ پر دستی بموں کی بارش کر دو۔ وہاں جتنے ہیں سب کو ختم کر دو۔''

''میں آپ کو مکمل حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا سر! آپ نے میری بات ہی نہیں سنی۔ پشمینہ صاحبہ بھی گراؤنڈ پہنچ چکی ہیں۔''

''کیا؟'' صدر حیات چونک پڑا۔ ''یہ کیسے؟''

''یہ تو ابھی میرے علم میں نہیں آسکا۔ ابھی آپ ٹی وی ... کھولیں تو دیکھیں گے کہ دانش یزدانی کے ساتھ پشمینہ صاحبہ بھی پہنچ چکی ہیں۔''

''مت کہو اسے صاحبہ!......صرف پشمینہ کہو۔ وہ اب بس ایک غدار ہے۔''

''اگر دستی بم برسائے گئے تو وہ بھی......''

''مر جانے دو اسے بھی۔'' صدر حیات نے اس کی بات کاٹی۔

اسی وقت صدر کی بیوی روبینہ حیات اندر آئی حالانکہ اسے قصرِ صدارت کے اس حصے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔

''کیا تم مجھے گولی مارنے آئی ہو؟'' صدر حیات نے تیزی سے کہا۔

جنرل چنگیزی دم بخود رہ گیا تھا۔

''میں اپنے ہاتھوں سے اپنا سہاگ نہیں اجاڑ سکتی۔'' روبینہ حیات نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''جب سے حالات بگڑنا شروع ہوئے ہیں، میں نے یہ ریوالور اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا تھا۔ پشمینہ کے بارے میں کوئی بری خبر سنتے ہی میں خود کو ہلاک کر دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ آج جب سے آپ جنون کی حالت میں آئے ہیں، میں یہاں ہونے والی باتوں سے بے خبر نہیں رہی ہوں۔ ابھی آپ نے جنرل چنگیزی کو حکم دیا ہے کہ وہ پشمینہ کی ہلاکت کی بھی پروا نہ کرے کیونکہ وہ اب آپ کی بیٹی نہیں

رہی، صرف غدار ہے۔''

''ہاں ہاں، وہ غدار ہے۔''

''لیکن میری بیٹی وہ اب بھی ہے۔ آپ نے ابھی جنرل کو جو حکم دیا ہے، اسے واپس لیجیے...... اگر آپ وہ حکم واپس نہیں لیں گے تو میں اسی وقت خود کو گولی مار لوں گی۔ میں اپنی بچی کی ہلاکت کی خبر سننے کے لیے زندہ نہیں رہوں گی۔'' روبینہ حیات کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک گئے۔

صدر حیات نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر ہم نے کوئی سخت قدم نہ اٹھایا تو یہ کتے ہمارے محل میں آگ لگا دیں گے۔''

''آپ اپنے عوام کو کتے کہہ رہے ہیں؟''

''اور کیا کہوں؟ یہ سارے ملک کو بھنبھوڑنے پر تُل گئے ہیں۔ یہ ہمارے محل کو بھی آگ لگا دیں گے۔'' صدر حیات نے دہرایا۔

''تو میں کسی ہندو عورت کی طرح آپ کے ساتھ ستی ہو جاؤں گی۔'' روبینہ حیات نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو، آخر کیا کروں میں؟''

''کچھ بھی کریں۔ میری بچی پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔''

صدر حیات نے جھٹکے سے سر گھما کر جنرل چنگیزی کی طرف دیکھا۔ ''تم جاؤ جنرل۔''

''پہلے آپ جنرل سے اپنا حکم واپس لیں۔'' روبینہ حیات نے ریوالور کی نال اپنی کنپٹی پر رکھ لی۔

صدر حیات دانت پیسنے لگا۔ جنرل چنگیزی کے چہرے پر بے بسی تھی۔ صدر حیات غصے کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ روبینہ حیات ریوالور کی نال بدستور اپنی کنپٹی سے لگائے ہوئے تھی۔

آخر صدر حیات نے چنگیزی کی طرف دیکھ کر روبینہ حیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر یہ آگ میں جھلس گئیں، تب ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ تم جاؤ۔ بس اس باغی لڑکی کو چھوڑ کر جو بھی ممکن ہو، وہ کرو۔ وہ باغی ان کی بیٹی ہے۔'' صدر حیات نے ایک جھٹکے سے روبینہ حیات کی طرف انگلی اٹھائی۔

گویا اس نے اپنا پہلا حکم واپس لے لیا تھا جس کا صریح مطلب یہ تھا کہ ابھی اس کے پاگل ہو جانے میں کوئی کسر رہ گئی تھی۔

چنگیزی جلدی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ خود اس کا بھی یہی خیال تھا کہ ان بگڑے ہوئے حالات میں پشمینہ کو کچھ ہوا تو وہ جلتی پر تیل کا کام کرے گا، لیکن یہ اب اس کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ اس کے لیے کیا کرنا ممکن ہے۔ ابتدا میں اسے خود پر بڑا اعتماد تھا کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا لیکن اب اس کا وہ اعتماد چکنا چور ہو چکا تھا۔ اپنے ہیڈ کوارٹر پہنچ کر اس نے حکم جاری کیا کہ قصرِ صدارت اور سی ایس کے ہیڈ کوارٹر کے گرد مشین گنیں اس طرح لگا دی جائیں کہ دو مشین گنوں کے درمیان پچاس فٹ سے زیادہ فاصلہ نہ ہو اور جب ہجوم وہاں پہنچ جائے تو مشین گنوں کے دہانے ان پر کھول دیے جائیں۔

لیکن یہ حکم جاری کرنے کے بعد بھی وہ مطمئن نہیں تھا۔ اس نے ایک ہیلی کاپٹر بھی اپنے گھر بھیج دیا کہ وہ اس کے بیوی بچوں کو سی ایس کے ہیڈ کوارٹر لے آئے۔ وہ خود بھی ہیلی کاپٹر سے قصرِ صدارت گیا اور آیا تھا۔ شہر کی سڑکوں پر کار کا استعمال ممکن ہی نہیں رہا تھا۔

دوسری طرف کور کمانڈر کا ہنگامی اجلاس پھر شروع ہو چکا تھا۔ چند کور کمانڈرز نے خیال ظاہر کیا کہ صدر حیات کو سبکدوش کر کے مارشل لا لگا دیا جائے۔

''نہیں۔'' چیف آف آرمی اسٹاف نے اختلاف کیا۔ ''جمہوریت ختم نہیں ہونا چاہیے۔ صدر حیات کو اب عوام کا ریلا ہی بہا لے جائے گا۔ ہمیں اب دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں کچھ اور لائحہ عمل بنانا ہوگا۔ کچھ نکات میرے دماغ میں آئے ہیں۔'' اس نے یہ بھی بتایا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر فضائیہ اور بحریہ کے چیف بھی اس میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے آرہے ہیں۔

اسی وقت آرمی چیف کے لیے ایک اہم کال آئی۔ وہ اس ملک کے ڈیفنس منسٹر کی تھی جس کے طیارے کی تباہی کے سبب شاہ صاحب کی ہلاکت ہوئی تھی۔

کال ریسیو کرتے وقت آرمی چیف کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ اس نے وہ کال کور کمانڈرز کے سامنے ہی ریسیو کی تھی۔

☆☆☆

قصرِ صدارت کی طرف جانے والی ریلی کو صبح دس بجے بڑے گراؤنڈ سے روانہ ہونا تھا لیکن اس کی روانگی دو بجے سے پہلے نہ ہو سکی بلکہ دو بج کر دس منٹ ہو چکے تھے جب وہ کرین حرکت میں آئی جس کے اوپر بنے ہوئے پلیٹ فارم پر پشمینہ، ڈیبرا اور دانش کے ساتھ اسد گیلانی بھی تھا۔ اس سے زیادہ افراد اس چھوٹے سے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو بھی نہیں سکتے تھے۔

روانگی سے قبل پشمینہ نے اعلان کر دیا تھا کہ پہلے کرین، گراؤنڈ سے نکلے گی، اس کے بعد وہاں جمع ہونے والے۔ لوگوں نے اس کی بات مان لی تھی۔ پشمینہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ریلی کی قیادت وہی کرے گی لیکن گراؤنڈ کے باہر جمع ہونے والوں اور اِدھر اُدھر سے آنے والے ہزاروں افراد کی وجہ سے کرین ان کے بیچ میں آگئی۔

ایک ٹی وی چینل کی کرین اس کرین کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کرین پر موجود ٹی وی چینل کا کیمرا ہجوم کے علاوہ پشمینہ کے شیشے کا کیبن بھی قریب سے دکھا رہا تھا۔ لوگوں کے خیال کے مطابق اب وہی ان کی نجات دہندہ تھی۔

اس وقت تک شاہ صاحب کے معتقدین بھی ریلی میں شامل ہو چکے تھے اور دیگر سیاسی جماعتوں کے کارکنان بھی اس ریلی کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ غالباً ایک تاریخ ساز ریلی تھی۔ اس سے پہلے اتنی بڑی ریلی نہیں نکلی تھی۔

جو ٹی وی چینلز اپنی ''تجزیاتی نشریات'' بھی جاری رکھے ہوئے تھے، ان میں سے بعض کا کہنا تھا کہ ریلی میں دس لاکھ سے زیادہ لوگ تھے اور بعض لوگ پندرہ لاکھ سے زیادہ بتا رہے تھے۔ صحیح اندازہ لگانا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔

اس وقت سارے ملک میں ہی لوگوں کا طوفان آیا ہوا تھا اور ہر جگہ سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی جا رہی تھی۔ فائرنگ سے سی ایس اور پولیس کے چالیس سے زیادہ اہلکار ہلاک ہو چکے تھے۔ عوام میں سے مرنے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔

خبر کے مطابق صدر حیات کے بیٹے آفتاب کی ملک بھر میں پھیلی ہوئی تمام انڈسٹریز ایک ایک کر کے بھی نذرِ آتش کی جا چکی تھیں۔

''لیکن......'' پشمینہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''جن سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی جا رہی ہے وہ تو ہمارے ملک ہی کا نقصان ہے۔'' اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

''جب ہجوم مشتعل ہوتا ہے تو اسے ان باتوں کا خیال نہیں رہتا۔'' دانش یزدانی نے جواب میں کہا۔

اسی وقت فضا میں چار ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے۔ پشمینہ اعلان کر چکی تھی کہ ان ہیلی کاپٹرز پر کوئی گولی نہ چلائے کیونکہ ان ہیلی کاپٹرز میں عوام کے لیے اسلحہ آ رہا ہے۔

یہ اسلحہ کہاں سے آ رہا تھا؟ یہ پشمینہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہیلی کاپٹرز پر کسی ملک کا نشان نہیں تھا۔

شہر کے چار مختلف حصوں میں ان ہیلی کاپٹرز نے پیرا شوٹ کی مدد سے بڑے بڑے تھیلے اتار دیے۔ اگر پیرا شوٹ استعمال نہ کیے جاتے تو وہ وزنی تھیلے ہجوم کے کچھ لوگوں کی ہلاکت اور زخمی ہونے کا سبب بنتے۔

ان تھیلوں میں جدید ترین اسلحہ تھا جس میں ہلکی مشین گنیں بھی شامل تھیں۔

ٹی وی چینلز انہیں ''پُراسرار ہیلی کاپٹر'' قرار دے رہے تھے۔ ان ہیلی کاپٹرز کی آمد سے خاصی دیر پہلے پشمینہ نے آرمی چیف کی کال ریسیو کی تھی۔

''محترمہ پشمینہ صاحبہ!'' اس نے کہا تھا۔ ''طیارے کی تباہی کو ہمارے ملک کی طرف سے اعلانِ جنگ قرار دیا گیا تھا۔ ابھی وہاں کے ڈیفنس منسٹر نے مجھ سے بات کی تھی۔ وہاں میٹنگ میں فیصلہ ہوا ہے کہ یو این او کے کسی فیصلے سے پہلے وہ ملک کوئی قدم نہ اٹھائے لیکن اس ملک نے یہ فیصلہ ضرور کیا ہے کہ عوام کو ہتھیار فراہم کیے جائیں۔ وہ ملک ہیلی کاپٹر میں اسلحہ بھیج رہا ہے۔ پڑوس کے ایک ملک نے اپنا ایک چھوٹا ہوائی اڈا اسے دے دیا ہے۔ ہیلی کاپٹر وہاں سے پرواز کر کے آئیں گے۔ ان پر کوئی فائر نہ کرے۔ وہ چاروں ہیلی کاپٹرز اسلحہ اتار کر جائیں گے اور مزید اسلحہ لے کر آئیں گے۔ یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ طیارے کی تباہی کے ذمے دار صرف صدر حیات ہیں اور ان کی حکومت کا خاتمہ عوام ہی کر دیں گے لہٰذا جس حد تک بھی ممکن ہو، انہیں ہر قسم کی امداد پہنچائی جائے۔''

لیکن وہ اسلحہ فوری طور پر عوام کے کام نہ آ سکا۔ ٹی وی کی خبروں کے مطابق سی ایس اور پولیس شہر سے غائب ہو گئی تھی لیکن سی ایس کے ہیڈ کوارٹر اور قصرِ صدارت کے گرد بھاری مشین گنیں نصب کی جا رہی تھیں۔ اسی لیے یہ اندیشہ تھا کہ اگر لوگوں نے ان دونوں مقامات پر حملہ کرنا چاہا تو ہزاروں افراد مارے جا سکتے ہیں۔

''سفاکی کی انتہا ہوئی ہے۔'' دانش نے دانت پیسے۔

''مگر لوگوں کا انداز بتا رہا ہے کہ وہ اب کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔'' پارٹی کے صدر اسد گیلانی نے کہا۔ ''وہ مشین گنیں بھی اس عوامی ریلے کو ہرگز نہیں روک سکیں گی۔ خون خواہ کتنا بھی بہہ جائے۔''

ڈیبرا نے پشمینہ کی طرف دیکھا جو کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور کچھ پریشان بھی معلوم ہو رہی تھی۔

''ہجوم کی وجہ سے کرین کی رفتار بہت سست ہے۔''

دانش بولا۔ ہم کل صبح سے پہلے قصرِ صدارت نہیں پہنچ سکتے البتہ ہجوم پہلے پہنچ جائے گا۔"

"قصرِ صدارت کی آتشزدگی یقینی ہے۔" اسد گیلانی نے کہا۔

یہی بات پشمینہ کے دماغ میں بھی چکرا رہی تھی۔

"وہاں میری ماں اور بھائی بھی ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "یہ تو میں برداشت نہیں کرسکوں گی کہ وہ بھی اس آگ میں جھلس جائیں۔"

"لیکن اب اس ہجوم کو روکا نہیں جاسکتا۔" دانش نے خیال ظاہر کیا۔

"قصرِ صدارت میں اس وقت صرف یہی دو افراد میری حمایت میں ہیں۔" پشمینہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی۔ "میں اگر ان دونوں کو نہیں تو کم از کم اپنی ماں کو تو ضرور بچانا چاہوں گی۔"

"مگر کیسے میڈم!" اسد گیلانی بولا۔

"بس یہی پریشانی تو لاحق ہے مجھے اس وقت۔"

دانش اور اسد گیلانی فکرمندی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ ڈیبرا کا چہرہ اس وقت سپاٹ نظر آرہا تھا لیکن اس کے وجود میں ہیجان برپا تھا۔ وہ پشمینہ کے جذبات تو سمجھ ہی رہی تھی لیکن اسے خود بھی روبینہ حیات سے بہت لگاؤ تھا۔

"کرین نیچے کراؤ دانش۔" پشمینہ نے کہا۔ "اگر میں نے کچھ دیر آرام نہیں کیا تو طبیعت اور خراب ہوجائے گی۔ دوا بھی کھانا ہے۔"

دانش نے فوراً کرین نیچے کروائی۔ پلیٹ فارم سے نیچے اترنے کے بعد پشمینہ نے کہا۔ "بس اب کرین اوپر لے جاؤ! ضروری ہے کہ ہجوم کو تم لوگ نظر آتے رہو۔"

تھرمامیٹر ہے نا تمہارے پاس؟" دانش نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"مجھے فون پر بتادینا کہ اب کتنا ٹمپریچر ہے۔"

پشمینہ نے سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ڈیبرا بھی کرین کے پلیٹ فارم سے اتر آئی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ پشمینہ کو اکیلا چھوڑ دیتی۔

کرین کی گاڑی پر ایک بستر لگا کر اس کے آگے پردہ لگا دیا گیا تھا اور پشمینہ کے لیے یہ بندوبست دانش ہی نے کروایا تھا۔

ہجوم نے پشمینہ کو نیچے دیکھ کر زور زور سے نعرے لگانا شروع کردیے۔ پشمینہ ان سب کی طرف دیکھتی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی پردے کے پیچھے جاکر بستر پر لیٹ گئی۔ ڈیبرا نے فوراً دوا نکال کر اسے دی۔

پشمینہ نے دوا کھا کر اپنا موبائل نکالا اور روبینہ حیات سے رابطہ کیا۔

"کیسی طبیعت ہے پشمینہ؟" روبینہ حیات نے بےتابی سے پوچھا۔

"ابھی حرارت تو ہے ممی، لیکن ٹھیک ہو جاؤں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ سے ملنے کو بہت جی چاہ رہا ہے۔"

"تو آجاؤ کسی طرح۔" روبینہ حیات نے جلدی سے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے یہاں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

"پریسیڈنٹ صاحب کہاں ہیں؟"

"ہاں۔" روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اب تمہارا دل ہی نہیں چاہتا ہوگا کہ انہیں ڈیڈی کہو۔ وہ ملاقات کررہے ہیں۔ کسی ملک کا سفیر آیا ہے۔"

"میں محل کے اندر آپ سے نہیں مل سکتی ممی! وہاں کوئی نہ کوئی ایسا بندوبست کردیا جائے گا کہ ہماری باتیں سنی جاسکیں۔ میں آپ سے کچھ خاص باتیں کرنی چاہتی ہوں۔"

"لیکن میں تو نہیں آسکتی بیٹی۔" روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"محل کی عمارت سے باہر احاطے میں بھی نہیں آسکتیں؟"

"ہاں وہاں تو آسکتی ہوں۔ پریسیڈنٹ صاحب نے مجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔" روبینہ حیات کے لہجے میں تلخی آگئی۔ اس وقت اس نے اپنے شوہر کا نام بھی زبان پر لانے سے گریز کیا تھا۔

"میرا وہاں آنا آسان نہیں ہوگا ممی! سڑکوں پر اس وقت کار تو چل ہی نہیں سکتی۔ میں ہیلی کاپٹر پر آسکوں گی۔"

"میں دیکھ چکی ہوں۔ تم نے ایسا کوئی بندوبست کرلیا ہے۔ ہیلی کاپٹر ہی میں تم بڑے گراؤنڈ بھی پہنچی تھیں۔"

"جی۔" پشمینہ نے کہا۔ "آپ کو ہیلی پیڈ پر آنا ہوگا۔"

قصرِ صدارت کے گرد زمین کا بہت بڑا قطعہ تھا جسے ایک نہایت بلند چاردیواری گھیرے ہوئے تھی۔ سامنے کے حصے میں باغ تھا جس کے سرے پر صدر حیات نے اپنا ہیلی پیڈ بنوایا تھا۔ وہاں اس کا ہیلی کاپٹر کھڑا رہتا تھا۔ محل کے عقب میں خاصا بڑا میدان تھا جس پر بنا ہوا ائرپورٹ اس کے ذاتی جہاز کے لیے تھا۔

"ہاں، ہاں۔" روبینہ حیات نے کہا۔ "ٹہلتی ہوئی اس طرف بھی نکل آؤں گی۔"

"لیکن میں دن میں نہیں، رات کے اندھیرے میں آؤں گی۔" پشمینہ نے کہا۔ "ہیلی کاپٹر کی پرواز بھی خاصی نیچی ہوگی۔ میں کوشش کروں گی کہ مجھے کوئی دیکھ نہ سکے۔"

"لیکن ہیلی پیڈ پر چار محافظ تو ہوتے ہی ہیں۔ وہ تو تمہیں دیکھ لیں گے۔"

"وہ دیکھ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ اپنے آقا کو براہِ راست تو اس کی اطلاع دے نہیں سکتے۔ وہ اپنے انچارج کو اطلاع دیں گے۔ پھر وہ ملٹری سیکریٹری کو اطلاع دے گا۔ اس کے بعد وہ اطلاع شہنشاہ معظم تک پہنچے گی۔ اتنی دیر میں آپ سے مل کر میں وہاں سے واپسی کے لیے روانہ ہو چکی ہوں گی۔"

"اتنی جلدی واپس چلی جاؤ گی۔" روبینہ حیات کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"مجبوری ہے ممی! ...... زیادہ رکنا میرے لیے مناسب نہیں ہوگا۔ اطلاع ملنے کے بعد آپ کے ساتھ بھی ان کا نہ جانے کیا رویہ ہو۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ ریوالور اب ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ میں جب چاہوں گی، اپنی زندگی ہی ختم کرلوں گی۔"

"خدا نہ کرے۔" پشمینہ نے جلدی سے کہا۔ "بس آپ آج رات میرا انتظار کیجیے گا۔ زیادہ رات کو باہر نکلنا آپ کے لیے مشکل تو نہیں ہوگا؟"

"وہ شراب تو پیتے ہی ہیں، تم جانتی ہو...... آج کل زیادہ پینے لگے ہیں اور آج رات تو شاید بہت زیادہ پی جائے۔"

"کیوں؟"

"میں محسوس کر رہی ہوں کہ اب وہ خاصے مایوس ہو چکے ہیں لیکن ملک سے فرار ہو کر بھی نہیں جانا چاہتے۔ میں نے آج ہی سنا تھا۔ انہوں نے بڑے غصے سے چیخ کر شاید اپنے ملٹری سیکریٹری سے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس بھی اس ملک کے حکمراں کی حیثیت سے لینا چاہتے ہیں۔" خاموش ہو کر روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ تو اب ہوگا۔ کل صبح تک ریلی قصرِ صدارت پہنچ جائے گی۔ مشین گنیں بھی انہیں قصرِ صدارت میں داخل ہونے سے نہیں روک سکیں گی۔ اب تو میں بھی انہیں نہیں روک سکوں گی۔ اگرچہ عوام مجھے شدت سے چاہنے لگے ہیں لیکن میں انہیں اگر روکوں گی بھی تو وہ نہیں رکیں گے بلکہ اس پروپیگنڈے پر یقین کرلیں گے جو مخالف سیاسی جماعتوں نے ریلی میں شامل ہونے سے پہلے کیا تھا۔"

"مجھے بھی علم ہے اس پروپیگنڈے کا۔"

"اسی لیے میں آپ سے آج ہی مل لینا چاہتی ہوں۔ کل تو نہ جانے کیا ہو۔"

"ہاں۔" روبینہ حیات نے ٹھنڈی سانس لی۔ "قسمت میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں ان کے ساتھ ہی اپنی جان دوں۔"

"ملاقات ہونے پر میں آپ کو ایک ایسی ہی تدبیر بتانا چاہتی ہوں کہ آپ خود کو بچا سکیں۔"

"لیکن میں بچنا نہیں چاہتی۔" روبینہ حیات نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے اب ان سے محبت تو نہیں رہی لیکن میں مشرقی عورت کی یہ روایت زندہ رکھوں گی کہ آخری سانس بھی شوہر کے ساتھ لوں۔"

"خیر! ابھی میں اس بحث کو طویل نہیں کرنا چاہتی۔ ملاقات پر بات ہوگی۔ اور ہاں، کیا بھابی اب بھی میری حمایت میں ہیں؟"

"ہاں، آج اس کی ایسی ہی کسی بات پر آفتاب نے اس کے منہ پر تھپڑ بھی مار دیا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں آج بات چیت بند ہے۔"

"کیا آپ بھابی کو بھی اپنے ساتھ ہیلی پیڈ پر لاسکیں گی؟ ان سے بھی مل لوں۔"

"اس کا میں وعدہ نہیں کرسکتی پشمینہ! بس کوشش کرسکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ میری دوسری کال کا انتظار کیجیے گا۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ آپ ہیلی پیڈ پر کس وقت پہنچیں۔"

"میں انتظار کروں گی۔"

پشمینہ نے فون بند کیا۔ ڈیبرا بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔ "کیا ارادہ ہے پشمینہ؟"

پشمینہ نے اسے جواب نہیں دیا اور موبائل پر اقصیٰ سے رابطہ کیا۔ پہلے بھی ہیلی کاپٹر کا بندوبست اسی کے ذریعے سے ہوا تھا۔

"جی، کہیے!" اقصیٰ کی آواز اس وقت بھی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی سی لگی تھی۔ کوئی بھی اتنی جلدی اپنے باپ کی موت فراموش نہیں کرسکتا۔

"اقصیٰ ڈیئر! تم نے ابھی تک خود کو پوری طرح نہیں سنبھالا ہے، لیکن اس حالت میں بھی تم اپنے لوگوں کی قیادت کرتے ہوئے ریلی میں شامل ہو۔ میں تمھیں خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں لیکن اس وقت میں نے تمھیں اپنی ہی ایک غرض سے فون کیا ہے۔"

"آپ کے لیے کوئی بھی کام کرنا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔"

"مجھے کہیں جانا ہے تھوڑی دیر کے لیے۔ ہیلی کاپٹر کی ضرورت پڑے گی۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ ائرو کلب تو کیا، اس وقت ملک کے سارے ادارے، سارے لوگ آپ کی آنکھ کے ایک اشارے پر جان دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ہیلی کاپٹر کس وقت چاہتی ہیں؟"

"رات کو۔" پشمینہ نے جواب دیا۔ "ٹھیک تین بجے ہیلی کاپٹر کرین کے قریب پہنچ جائے اور مجھے، ڈیبرا کے ساتھ اٹھالے جائے۔"

"میں ائرو کلب سے بات کیے بغیر آپ سے وعدہ کر سکتی ہوں کہ یہ ہو جائے گا۔"

"تمھارے اس یقین کے باوجود میں تمھاری کال کا انتظار کروں گی۔"

"میں ابھی دس منٹ کے اندر فون کرتی ہوں آپ کو۔"

☆☆☆

شام ہونے سے پہلے پہلے شہر پر عوام کا قبضہ تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ سرکاری ٹی وی کے کارکنان تک عوام کے ساتھ ہو گئے تھے اور اب وہ بھی اسی قسم کے پروگرام چلا رہے تھے جیسے دوسرے چینلز پر چل رہے تھے۔ اسی طرح بجلی کے محکمے کے ارکان نے بھی بغاوت کا پرچم لہرا دیا تھا۔ انہوں نے مزید برقی روشنیوں کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ مختلف لوگوں نے مناسب فاصلوں سے لاؤڈ اسپیکر بھی اس طرح لگا دیے تھے کہ کرین کے پلیٹ فارم پر موجود ری پبلکن فورم کے لیڈرز کی تقریریں بھی ہر شخص تک آسانی سے پہنچ رہی تھیں۔

پشمینہ کی آواز گونج رہی تھی۔ "میں عوام کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ حکومت در اصل ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف ضد ہے، وہ بھی چند گھنٹوں کی مہمان۔"

"پشمینہ حیات، زندہ باد" کے نعرے اتنے زیادہ لگے کہ پشمینہ کو خاموش ہونا پڑا۔ جب شور خاصا کم ہوا تو وہ پھر بولی۔ "یہ میری جیت نہیں، یہ ان شہیدوں کی جیت ہے جن کی لاشیں اسپتال پہنچ چکی ہیں۔"

اس وقت تک ایک سو بائیس افراد گولیوں کا شکار بن چکے تھے جس کے بعد نہ کہیں پولیس کا پتا تھا، نہ سی ایس کے اہلکاروں کا۔

ٹی وی چینلز مختلف خبریں پہنچا رہے تھے۔ اس دن تین ملکوں کے سفیروں نے صدر حیات سے ملاقات کی تھی لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ان ملاقاتوں میں کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اسی لیے قیاس آرائیاں کی جا رہی تھیں۔

دس بجے کے قریب کرین نیچے کی گئی تاکہ جو افراد اس کے پلیٹ فارم پر تھے، کھانا کھا لیں۔

ریلی میں شریک زیادہ تر افراد اپنے گھروں سے کھانے پینے کا سامان لے کر نکلے تھے۔ جن کے ساتھ اس قسم کا سامان نہیں تھا، انہیں دوسروں نے اپنے ساتھ کھانا کھلایا تھا۔ صورتِ حال کچھ ایسی بن گئی تھی جیسے ان سب کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہو۔

کھانے کے دوران میں پشمینہ نے افسردگی سے کہا۔ "جو لوگ ہلاک ہو چکے ہیں، ہم ان حالات میں ان کے گھر جا کر ان کو تسلی بھی نہیں دے سکتے، تعزیت بھی نہیں کر سکتے۔"

"مجبوری ہے پشمینہ؟" دانش نے کہا۔ "اگر کوئی راستہ بن بھی جائے تو باقی رات میں ان سب کے گھر جانا ممکن بھی نہیں ہے۔ اب تو یہ سب کچھ اسی وقت ہو سکے گا جب ہمارا یہ مشن مکمل ہو جائے گا۔"

پشمینہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

باقی لیڈرز بھی افسردہ دکھائی دے رہے تھے لیکن ڈیبرا کا چہرہ ہر وقت سپاٹ ہی دکھائی دیتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے وجود میں مسلسل ایک طوفان برپا تھا۔

کھانے کے بعد پشمینہ نے کہا۔ "مجھے یہ افسوس تو ساری زندگی رہے گا کہ میں اس ملک کے صدر کی بیٹی......"

"مت کرو یہ بات۔" دانش نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم نے حق کے لیے ایک فیصلہ تو کر لیا لیکن یہ غیر فطری امر ہوگا کہ تمھارے دل میں اپنے باپ کے لیے ذرا بھی درد نہ ہو۔"

اس وقت پشمینہ کی آنکھیں جھلملا گئیں جس سے ظاہر ہو گیا کہ دانش کی بات غلط نہیں تھی۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر کر اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کیں۔

"اب ڈھائی بج رہے ہیں دانش! تین بجے ہیلی کاپٹر آجائے گا۔"

وہ دانش یزدانی اور اسد گیلانی، دونوں ہی کو بتا چکی تھی کہ وہ اپنی ماں سے آخری مرتبہ ملنے جارہی ہے۔

اس وقت اسد گیلانی نے تیسری مرتبہ کہا۔ ”آپ کا قصرِ صدارت جانا مناسب نہیں ہے۔ آپ بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہیں میڈم۔“

”اپنی ماں کی خاطر میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں۔ سب کچھ بہت رازداری سے ہوگا۔ میں اپنی ماں کو وقت دے چکی ہوں اور ملاقات کی جگہ کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ اگر پھر بھی وہاں کوئی گڑبڑ ہوگئی تو میری زندگی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ گرفتار کریں گے۔ میری ماں میری زندگی کی ضامن بن چکی ہیں۔ میں آپ لوگوں کو بتا چکی ہوں کہ صدر صاحب اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے ہیں اور میری ماں......“

”وہ سب آپ ہمیں بتا چکی ہیں۔“ اسد گیلانی بول پڑا۔

”لیکن یہ نہیں بتایا کہ جب دو ہیلی کاپٹر میرے گھر آئے تھے، تو ان کا ارادہ مجھے مارنے کا نہیں، صرف اغوا کرنے کا تھا۔ وہ مجھے اغوا کر کے صرف نظر بند کرنا چاہتے تھے۔“

”اور یہ وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔“ دانش بول پڑا۔

”بالفرض ایسا ہوا تو میرے نائب کی حیثیت سے ریلی کی قیادت تم ہی کو کرنا ہے۔ اس کا اعلان ابھی سے کردو، بلکہ میں خود کرتی ہوں۔“

اس نے مائک کھولا۔ لاؤڈ اسپیکر پر پشمینہ کی آواز گونجنے لگی۔ ”میرے پُرعزم ساتھیو! آپ لوگ فتح یاب تو ہو چکے ہیں۔ اب صرف ایک رسمی کارروائی باقی ہے۔ مجھے ابھی ایک بہت ضروری کام سے کہیں جانا پڑ رہا ہے۔ دانش یزدانی کا خیال ہے کہ میں خطرہ مول لے رہی ہوں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی اور اگر بالفرض محال کوئی گڑبڑ ہوگئی تو دانش یزدانی میرے نائب کی حیثیت سے آپ کے ساتھ ہیں۔“

مجمع سے شور اٹھا کہ وہ نہ جائے۔ جب وہ شور کچھ تھما تو پشمینہ نے کہا۔ ”میں جس کام سے جارہی ہوں، وہ بہتری کے لیے ہے۔ آپ لوگ مجھے جانے کی اجازت دیں۔ میں آپ کی شکرگزار ہوں گی۔“ پھر پشمینہ نے مائک بند کردیا۔

دوبارہ شور اٹھا لیکن وہ پہلے شور سے زیادہ نہیں تھا۔ پھر وہ بھی دب گیا۔ یقیناً کچھ لوگوں نے کچھ لوگوں کو سمجھایا ہو گا کہ پشمینہ حیات اگر کہیں جارہی ہیں تو ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ وہ ہمیں دھوکا دے کر فرار ہرگز نہیں ہو رہی ہیں۔ یقیناً ان کے کہیں جانے میں کوئی بہتری ہوگی۔

جلد ہی فضا میں ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوا۔

پشمینہ نے ایک بار پھر مائک کھولا اور کہا۔ ”کوئی اس ہیلی کاپٹر پر فائر نہ کرے۔ اسی ہیلی کاپٹر نے مجھے اور ڈیبرا کو یہاں پہنچایا تھا اور اب مجھے لینے بھی وہی ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔“ اس نے مائک پھر بند کردیا۔

ہیلی کاپٹر کرین کے اوپر آکر پلیٹ فارم سے کچھ اوپر معلق ہوگیا۔

پشمینہ نے ساتھیوں سے خدا حافظ کہا اور ڈیبرا کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئی۔

نہ جانے کیوں دانش کو اس کا ”خدا حافظ“ کہنا کم از کم اس وقت اچھا نہیں لگا تھا۔

”تم صحیح جگہ پہنچ سکو گے نا؟“ پشمینہ نے ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے کہا۔

”آپ بالکل بے فکر رہیے۔“ پائلٹ نے جواب دیا۔

”وقت کا بھی خیال رکھنا ہے۔“

”مجھے سب کچھ سمجھا دیا گیا ہے۔“ پائلٹ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ پھر ہیلی کاپٹر روانہ ہوگیا۔

اس کے بعد پشمینہ نے اس سے کچھ نہیں کہا۔

ڈیبرا خاموشی سے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھر جب ہیلی کاپٹر نے نیچے ہونا شروع کیا تو پشمینہ بول پڑی۔ ”کیا ہم پہنچ گئے؟“

”بس پہنچنے والے ہیں۔ یہاں سے ہمیں کم بلندی پر اڑنا ہے۔“

”وہ تو بہتر ہے۔ وہاں جو مشین گنیں لگی ہوئی ہیں، ان سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہیلی کاپٹر میں جو کوئی بھی ہے، اسے صدر نے طلب کیا ہوگا۔ انہیں بس یہ الجھن ہوگی کہ انہیں اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی اور جب تک وہ کسی کو فون کر کے اس بارے میں پوچھیں گے، ہمارا ہیلی کاپٹر ان سے آگے نکل چکا ہوگا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔ میں تو یہ سوچ کر چلا ہوں کہ آپ کی خاطر میری زندگی ختم ہوجائے تو یہ میرے لیے کوئی مہنگا سودا نہیں ہوگا۔“

”متاثر کن ہے تمہاری یہ بات لیکن فکر نہ کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ پشمینہ نے کہا۔

اور اس نے جو کچھ کہا تھا، ٹھیک ہی کہا تھا۔ ہیلی کاپٹر

صحیح وقت پر صحیح جگہ اُتر گیا۔ قریب ہی صدر حیات کا ہیلی کاپٹر کھڑا تھا۔ چار محافظ وہاں پہرا دے رہے تھے۔ انہوں نے چونک کر دیکھا کہ روبینہ حیات اور آفتاب حیات کی بیوی قدسیہ حیات کسی طرف سے نکل کر تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھی تھیں۔ وہ چاروں ہیلی کاپٹر کے لینڈ کرنے پر بھی الجھن کا شکار ہوئے ہوں گے اور اب ان دونوں خواتین کو دیکھ کر بھی ان کی الجھن میں اضافہ ہوا ہوگا لیکن وہ یہ ہمت نہیں کر سکتے تھے کہ صدر کی بیوی کو روک کر پوچھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔

ڈیبرا اور پشمینہ تیزی کے ساتھ ہیلی کاپٹر سے اُتری تھیں۔ جیسے ہی دونوں خواتین قریب پہنچیں، پشمینہ نے ماں کو گلے لگا لیا۔

''بس!'' پشمینہ نے سرگوشی کی۔ ''اب آپ دونوں یہاں سے نکل چلیے۔''

''کیا؟'' روبینہ حیات چونکی۔

''میں آپ سے ملنے نہیں، آپ کو لینے آئی ہوں۔''

''ہرگز نہیں پشمینہ، ہرگز نہیں۔'' روبینہ حیات اس سے الگ ہوگئی۔ ''مجھے اپنے شوہر کے ساتھ مرنا ہے۔''

پشمینہ نے جھٹکے سے سر گھما کر ڈیبرا کی طرف دیکھا۔ یہ ایک طے شدہ اشارہ تھا۔ ڈیبرا کے ہاتھ میں فوراً ریوالور نظر آیا اور پھر اتنی تیزی سے، یکے بعد دیگرے چار گولیاں چلیں کہ چاروں ہی محافظ زمین پر گرے اور ہمیشہ کے لیے بے حس و حرکت ہو گئے۔ پشمینہ جانتی تھی کہ تیزی سے فائرنگ کرتے ہوئے بھی کوئی نشانہ خطا نہیں کرتی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' روبینہ حیات چیخی۔

''اس جہنم سے نکل چلیے ممی۔'' قدسیہ حیات تیزی سے بولی۔ ''پشمینہ نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔''

''نہیں۔'' روبینہ حیات پھر چیخی۔

''آپ چڑھیے ہیلی کاپٹر میں بھابی۔'' پشمینہ نے کہا۔ اس نے اور ڈیبرا نے روبینہ حیات کو جکڑ لیا تھا۔

''نہیں پشمینہ!'' روبینہ حیات چیختی جا رہی تھی۔ وہ بہت ہلکی پھلکی تو نہیں لیکن زیادہ صحت مند بھی نہیں تھیں۔ ڈیبرا اور پشمینہ نے اسے زمین سے اٹھایا۔

''ان کے ہاتھ پکڑیے بھابی۔'' پشمینہ نے کہا۔

پشمینہ اور ڈیبرا، روبینہ حیات کو ہیلی کاپٹر پر چڑھانے میں کامیاب ہوگئیں۔ ہیلی کاپٹر میں ان دونوں نے روبینہ حیات کو کس کر پکڑ بھی لیا تھا۔

''میں تمہیں زندگی بھر معاف نہیں کروں گی پشمینہ!'' روبینہ حیات روہانسی ہوگئی تھی۔

''میں آپ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں، خواہ آپ مجھ سے کبھی بات نہ کریں۔''

''ہرگز نہیں کروں گی۔''

یہ روبینہ حیات کا آخری جملہ تھا جو پشمینہ سن سکی۔ وہ جیسے ہی ہیلی کاپٹر میں سوار ہوئی تھی، کسی جانب سے چلائی جانے والی ایک گولی اس کے سر پر لگی تھی۔ گولی چلنے سے پہلے ایک دھماکا بھی ہوا تھا اور گولی چلنے کی آواز اس میں دب گئی تھی۔

اس کے بعد پے در پے دھماکے اور پھر ایک بہت بڑا دھماکا لیکن پشمینہ وہ سب کچھ نہ سن سکی۔ وہ اندھیرے میں ڈوب چکی تھی۔

☆☆☆

ان دھماکوں کی آوازیں بہت دور تک سنی گئی تھیں۔ کرین پر دانش یزدانی اور اسد گیلانی نے بھی سنی تھیں۔

دانش یزدانی تو کسی خیال سے چکرا کر گر بھی پڑتا اگر اسد گیلانی نے اسے سنبھال نہ لیا ہوتا۔

''ختم ہو گیا، سب کچھ ختم ہو گیا، میری زندگی ختم ہو گئی۔'' دانش کی آواز بمشکل نکل سکی تھی۔

''ہمیں چاہیے تھا کہ میڈم کو ہر قیمت پر روکتے۔'' اسد گیلانی نے کہا۔

دانش یزدانی کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔

ان دھماکوں نے ہر طرف ہلچل مچا دی تھی۔ ٹی وی چینلز چیخ رہے تھے۔

کرین جہاں تک پہنچی تھی، وہاں سے قصرِ صدارت دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہاں جو آگ بھڑکی تھی، اس کی روشنی وہاں سے بھی دیکھی جا سکتی تھی۔

جو کچھ اسد گیلانی اور دانش یزدانی نے سمجھا تھا، وہ عام لوگ نہیں جانتے تھے۔ ان میں تو یہ بات سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی جا رہی تھی کہ پشمینہ حیات جس کام سے گئی تھی، وہ کام یہی تھا کہ قصرِ صدارت کو تباہ کر دے تا کہ جب ریلی وہاں پہنچے تو وہ لوگ مشین گنوں کی گولیوں سے محفوظ رہیں۔

دانش کی حالت اتنی خراب ہوئی تھی کہ اسد گیلانی کی ہدایت پر کرین فوراً نیچے کی گئی۔ ہجوم میں سے کئی ڈاکٹر نکل کر دانش کو دیکھنے آ گئے۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' دانش نے جسے زبردستی بستر پر لٹا دیا گیا تھا، اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے دہرایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس کے باوجود ڈاکٹروں نے اس کا معائنہ کیا۔ وہ طبی سامان لے کر اس ریلی میں شامل ہوئے تھے مگر انہیں یہ گمان ہرگز نہ ہوگا کہ انہیں دانش یزدانی کو بھی دیکھنا پڑے گا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔'' ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر اعلان کیا۔ ''کوئی خطرے کی بات نہیں...... وقتی طور پر جھٹکا لگا ہے دماغ کو۔''

تاہم کسی قسم کی دو گولیاں اسے پانی سے کھلا دی گئیں۔

''کرین اوپر لے چلیے۔'' دانش نے اسد گیلانی سے کہا۔

ریلی کے جو لوگ سب سے آگے تھے اور جنہیں قصرِ صدارت دکھائی دے رہا تھا، ان کے ذریعے سے یہ بات بھی بڑی تیزی سے پھیلی کہ قصرِ صدارت کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ دھماکے قصرِ صدارت کے عقب میں ہوئے ہیں۔

یہ بات ٹی وی چینلز سے بھی نشر ہوگئی۔

تو پھر یہ دھماکے کیسے تھے؟ آگ کہاں لگی تھی؟ یہ سوال لوگوں کی زبان پر بھی تھا اور ٹی وی چینلز پر بھی اس بارے میں باتیں ہونے لگی تھیں۔

''پشمینہ تو ہیلی پیڈ پر اتری ہوگی۔'' دانش کی آواز میں خوشی کی کپکپاہٹ تھی۔ ''اور ہیلی پیڈ قصرِ صدارت کے عقب میں نہیں، سامنے کے حصے میں ہے۔''

ایم این اے کی حیثیت سے وہ دو تین مرتبہ قصرِ صدارت جا چکا تھا۔

مگر لوگوں کے لیے جو معاملہ ایک معما بنا ہوا تھا، وہ صدر حیات کے لیے معما نہیں تھا۔ وہ غصے میں ٹہلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''ہجوم کے کچھ لوگ غالباً شمال کی جانب سے آئے ہوں گے۔ ان کے پاس عام اسلحہ ہی نہیں راکٹ بھی آ چکے ہیں جو وہاں برسائے گئے۔ ائرپورٹ تباہ ہوگیا اور میرا جہاز آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے۔ فائر بریگیڈ اسٹیشن سے کوئی نہیں آیا۔ جہاز خاک ہو جائے گا۔''

آفتاب متفکر انداز میں خاموش کھڑا تھا۔ اسی وقت دو خوف زدہ محافظ وہاں پہنچے۔

''کسے گولی ماری ہے تم نے؟'' صدر حیات نے گرج کر ان میں سے ایک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

محافظ خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہم نے ہیلی کاپٹر اس طرف اترتے دیکھ لیا تھا اس لیے بھاگتے ہوئے اُدھر گئے تھے۔ بیگم صاحبہ اور چھوٹی بیگم کو اس ہیلی کاپٹر میں اغوا کیا جا رہا تھا۔''

''میں نے پوچھا ہے تم نے گولی کسے ماری ہے؟'' صدر حیات پھر گرجا۔

''میں نے ہیلی کاپٹر پر گولی چلائی تھی۔'' محافظ مری مری سی آواز میں بولا۔ ''اسی وقت ہونے والے دھماکے کی آواز سے میرا ہاتھ بہک گیا۔''

''تمہارے ساتھی نے بتایا ہے کہ وہ گولی پشمینہ کے لگی ہے۔''

''لیکن میں نے تو......''

محافظ کا جملہ پورا نہیں ہو سکا۔ صدر حیات کی جیب سے نکلنے والے ریوالور کی پے در پے تین گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوگئی تھیں اور وہ فرش پر گر کر تڑپنے لگا تھا۔

دوسرے محافظ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اسے یقین ہوگا کہ اب اس کی باری ہے۔

صدر حیات نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا اور دوسرے محافظ سے بولا۔ ''اس بدبخت کی لاش ہٹواؤ یہاں سے اور جو خون پھیل گیا ہے، اس کی صفائی کرواؤ۔''

دوسرا محافظ بہت تیزی سے باہر نکل گیا۔

''سب ساتھ چھوڑ گئے۔'' صدر حیات ٹہلتا ہوا بڑبڑانے لگا۔ ''تمہاری بیوی بھی چلی گئی اور وہ بھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ تم بھی چلے جاؤ کہیں۔'' صدر حیات نے آفتاب کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''لیکن میں بھی اکیلا نہیں مروں گا۔ ہزاروں کو مرنا ہوگا میرے ساتھ۔''

آفتاب خاموش کھڑا رہا۔ صدر حیات کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہوگی۔

''موت بچھا رہا ہوں میں محل میں۔'' صدر حیات کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔ ''میں اندازہ لگا چکا ہوں کہ میری حکومت ختم ہو چکی ہے۔ فوج، بحریہ، فضائیہ سب احسان فراموش نکلے۔ بس ایک احسان ہے ان کا مجھ پر۔'' صدر حیات کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ ''انہوں نے ابھی میرے خلاف خود کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ دوسرے تمام ادارے بھی خودمختار ہو چکے ہیں۔ ہاں اگر پشمینہ زندہ رہ جاتی تو وہ اس کے اشاروں پر ضرور ناچتے۔''

''آپ بیٹی کی موت کا ذکر اتنی سفاکی سے کر رہے ہیں ڈیڈی۔'' آفتاب کی آواز بھرا گئی۔

''بیٹی نہیں رہی تھی وہ میری۔'' حیات بیٹے پر بگڑ گیا۔ ''باغی تھی میری، اور ہو سکتا ہے وہ مری نہ ہو۔ بس گولی چلی ہے اس پر۔ ضروری نہیں کہ وہ مر ہی گئی ہو۔''

"آپ دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ڈیڈی!......آپ پشمینہ کی زندگی کے بھی خواہش مند نظر آرہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔"

"میں اس کا مخالف ہو گیا تھا لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں ہی غلطی پر تھا۔ آپ نے میرے نام سے جو کچھ کیا، اچھا نہیں کیا۔ امی کی مخالف تھی میری بہن۔" آفتاب کی آواز بھرّا گئی۔

صدر حیات اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا، پھر بولا۔ "تم بھی ساتھ چھوڑ رہے ہو میرا...... ضرور چھوڑو...... کوئی بھی اب میرا نہیں رہنا چاہیے۔ یہاں سے چلے جاؤ، کسی طرح اپنی جان بچاؤ۔ میں تو نہیں جاؤں گا لیکن میرے ساتھ ان ہزاروں یا سیکڑوں باغیوں کی بھی موت ہوگی۔ سب مریں گے۔" صدر حیات نے ہذیانی قہقہہ لگایا۔

آفتاب نے محسوس کیا کہ اس کا باپ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے یا کھوتا جا رہا ہے۔

"ڈائنامائٹ بچھوا رہا ہوں میں سارے محل میں۔" صدر حیات نے قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔

آفتاب چونک گیا۔

"ہاں۔" اس مرتبہ صدر حیات کا انداز فاتحانہ سا ہو گیا۔ کچھ وفادار باقی ہیں ابھی محل میں۔ وہی کر رہے ہیں یہ کام۔ ان سے کہہ دیا ہے میں نے کہ یہ کام کر کے وہ کسی طرح محل سے نکل جائیں، اپنی جان بچانے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے وہ باغیوں سے ہی جا ملیں۔ ملٹری سیکریٹری پہلے ہی چپکے سے نکل چکا ہے یہاں سے۔ میں سب سے کہوں گا کہ وہ یہاں سے نکل جائیں۔ چلو تم سے بھی ایک بار پھر کہتا ہوں کہ نکل جاؤ یہاں سے، چلے جاؤ کہیں۔ یہاں موت بچھانے کا کام چھ بجے تک مکمل ہو جائے گا۔ یہ لیور دیکھ رہے ہو؟" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "بس اسے دباؤں گا میں اور سارے ڈائنامائٹ پھٹ جائیں گے۔ محل کے پرخچے فضا میں بکھر جائیں گے اور یہ کام میں اس وقت کروں گا جب باغی مشین گنوں کی گولیوں سے بھنتے ہوئے محل میں چاروں طرف سے گھسیں گے۔ ان کی تعداد سیکڑوں میں تو ضرور ہوگی۔" صدر حیات نے پھر قہقہہ لگایا۔ "ان سب کو بھی مرنا ہوگا میرے ساتھ۔ ان کی گولیوں سے نہیں مروں گا میں۔"

آفتاب کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی اور اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ اس کا باپ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔

☆☆☆

چار بجنے والے تھے جب دانش یزدانی نے کسی کی کال ریسیو کی۔

"کیا!" وہ کچھ سن کر چیخ پڑا تھا۔

اسد گیلانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ دانش کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ بھی صاف ظاہر ہو رہی تھی جس سے وہ موبائل پکڑے ہوئے تھا۔

"کیا ہوا؟" اسد گیلانی نے جلدی سے پوچھا۔

دانش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے دوسری طرف سے آنے والی آواز سنتا رہا، پھر یک لخت اس نے سر گھما کر ایک جانب دیکھا۔ "ہاں۔" اس کی آواز میں اب بھی کپکپاہٹ تھی۔ "میں دیکھ رہا ہوں۔ ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔"

اسد گیلانی نے بھی دیکھ لیا کہ اس جانب سے ایک ہیلی کاپٹر آرہا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں فوراً آرہا ہوں۔" دانش نے کہا اور موبائل بند کر دیا۔

"کیا ہوا، کچھ تو معلوم ہونا چاہیے مجھے۔" اسد گیلانی پھر بولا۔ "یہ ہیلی کاپٹر......"

"مجھے لینے آرہا ہے۔" دانش نے اس کی بات کاٹ دی۔ "ڈیبرا نے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ محل سے واپسی پر پشمینہ نے ہیلی کاپٹر اپنے گھر کے ٹیرس پر اتروایا تھا۔ وہ اپنی والدہ کو یہاں نہیں لانا چاہتی تھی۔ لیکن وہیں اسے اچانک سردی لگ کر بہت تیز بخار ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ ہیلی کاپٹر بھیجا ہے میرے لیے۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو دانش۔" اسد گیلانی نے تیزی سے کہا۔ "صرف تیز بخار کی اطلاع پر تم اتنے بدحواس نہیں ہو سکتے۔ سچ بتاؤ، کیا بات ہے؟"

اس وقت ہیلی کاپٹر ان کے سر پر آچکا تھا۔

"آپ اعلان کر دیجیے گا۔" دانش نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "ضروری ہے یہ اعلان کرنا کہ پشمینہ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اس لیے میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔"

ہیلی کاپٹر اب اتنا نیچے آچکا تھا کہ دانش یزدانی اس پر سوار ہو سکتا تھا۔ اسد گیلانی کو اپنی بات کا جواب نہیں ملا اور دانش چلا گیا۔

اب مجبوری تھی۔ اسد گیلانی کو وہ اعلان کرنا ہی پڑا جو دانش یزدانی چاہتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ریلی کے شرکاء میں بے چینی پھیل گئی۔ بہت سے لوگ ٹی وی چینلز کو فون کرنے لگے۔ ہر ایک کا سوال یہی تھا کہ پشمینہ حیات کو بخار ہو گیا ہے یا کوئی

خطرناک بات ہوئی ہے جو چھپائی جا رہی ہے۔ لوگوں کو بھی وہی شبہ ہوا تھا جو اسد گیلانی کو ہوا تھا۔ لوگ صحیح بات معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گئے تھے لیکن ٹیلی ویژن والے بھی کسی کو کیا جواب دیتے؟ وہ خود بے خبر تھے۔ وہ صرف اتنا کہہ سکے کہ انہوں نے اپنے رپورٹرز کو کسی نہ کسی طرح پشمینہ حیات کے گھر بھیجا ہے اور ان کی رپورٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔

ریلی بہرحال آگے بڑھتی رہی۔ یہ تو ہوا کہ ریلی میں شریک خاصے لوگ ان اسپتالوں کی طرف چلے گئے جہاں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اور زخمیوں کو پہنچایا گیا تھا۔ اس کے باوجود ریلی میں ایسی کمی نہیں آئی تھی جسے محسوس کیا جا سکتا۔

پانچ بجے تک اسد گیلانی خاصا پریشان ہو چکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ پشمینہ اور دانش یزدانی سے فون پر رابطہ کرنا چاہا تھا لیکن اسے دونوں ہی کے فون بند ملے تھے۔ حتیٰ کے ڈیبرا نے بھی اپنا فون بند کر رکھا تھا۔

پانچ بج کر پانچ منٹ پر اسد گیلانی کو دانش یزدانی کا فون موصول ہوا۔

”شکر ہے کہ تم نے رابطہ کیا۔ مجھے تم تینوں ہی کے موبائل بند مل رہے تھے۔“

”مجبوری تھی۔“ دانش نے جواب دیا۔ ”پے در پے گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ ٹی وی چینلز والوں نے غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے یا نہ جانے کیا ہوا ہے کہ عام لوگوں کو بھی ہمارے فون نمبر معلوم ہو گئے ہیں۔ پشمینہ کے بارے میں جاننے کے لیے لوگ بے تحاشا فون کر رہے ہیں۔“ پشمینہ کا نام لیتے ہوئے دانش کی آواز بھرا گئی تھی۔

”کیسی ہیں اب میڈم؟“ اسد گیلانی نے جلدی سے پوچھا۔

”اچھا اب سن ہی لیجیے آپ، لیکن ہمت نہ ہار جایئے گا۔ میں پشمینہ کے بارے میں جو کچھ بھی بتاؤں گا، وہ آپ کے سوا کسی کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ ابھی تفصیل تو میں آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے انہیں؟“ اسد گیلانی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

”میں نے کہا نا کہ میں ابھی زیادہ کچھ آپ کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ ابھی میں نے آپ کو فون اس لیے کیا ہے کہ اب پانچ بج چکے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ریلی قصرِ صدارت تک پہنچ جائے گی۔ کوشش کیجیے کہ کسی طرح کرین ہجوم کے آگے پہنچ سکے۔ لوگوں کو قابو میں کر سکیں گے آپ؟ میرا خیال ہے کر لیں گے۔“

”کوشش کرتا ہوں لیکن......“

”میں اب یہاں سے روانہ ہو کر آپ کے پاس ہی آ رہا ہوں۔ کرین کسی طرح بھی آگے نکالنے کی کوشش کیجیے...... ریلی جب وہاں پہنچے تو مجھے بھی کرین پر ہونا چاہیے۔ میں پشمینہ کی یہ بات نظرانداز نہیں کر سکتا کہ قیادت مجھے ہی کرنا ہے۔ بس اب میں بند کر رہا ہوں۔“

اسد گیلانی نے محسوس کیا کہ دانش یزدانی بولنے میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ بار بار ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کی آواز رندھنے لگتی تھی اور وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا رہا تھا۔

اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اسد گیلانی کے دل میں آیا کہ اب وہ دانش سے رابطہ قائم کرے لیکن اسے امید نہیں تھی کہ دانش اسے حقیقت سے آگاہ کرے گا۔ دوسرا امکان یہ بھی تھا کہ دانش یزدانی نے اپنا موبائل پھر بند کر دیا ہو گا۔

اسد گیلانی نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان شروع کیا کہ لوگ کرین کے سامنے سے ہٹنے کی کوشش کریں تاکہ گاڑی آگے بڑھ سکے۔ یہ پشمینہ حیات صاحبہ ہی کی خواہش ہے کہ جب ریلی قصرِ صدارت کے قریب پہنچے تو کرین سب سے آگے ہو۔ وہ بخار میں ضرور مبتلا ہو گئی ہیں لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ان کا بخار نہ اترا تو بھی اس وقت کرین پر آ جائیں گی حالانکہ ڈاکٹر انہیں روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ آپ لوگوں سے ان کی محبت ہے کہ وہ ہر حال میں آپ لوگوں کے قریب رہنا چاہتی ہیں۔“ اسد گیلانی مستقل جھوٹ بولتا چلا گیا تاکہ عوام کو کسی حد تک تو مطمئن کر سکے۔

عوام مطمئن ہوئے یا نہیں، اسد گیلانی کو اس کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا مگر لوگوں نے یہ کوشش ضرور کی کہ کرین کے سامنے سے ہٹنے کے لیے کوشاں ہوئے۔ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی، پھر بھی کچھ تو ہوا اور کرین کی گاڑی کے ڈرائیور کو رفتار میں کچھ اضافہ کرنے کا موقع مل گیا۔

پونے چھ بجے تھے جب دانش یزدانی ہیلی کاپٹر کے ذریعے واپس آیا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

”شاید پشمینہ حیات کا نام سن کر ہی لوگوں نے ہمارے آگے بڑھنے کے لیے راستہ چھوڑنا شروع کیا ہے۔“ اسد گیلانی نے کہا۔ ”لوگ انہیں پروانہ وار چاہنے لگے ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی بری خبر سننا ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گا۔“

دانش یزدانی نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے

موبائل پر ٹی وی چینل سے رابطہ کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ گھروں پر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اس کی باتیں سن لیں۔ چینل کے اینکر پرسن نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی لیکن دانش یزدانی نے تقریباً اسی قسم کی باتیں کیں جو اسد گیلانی سے کر چکا تھا۔ بیچ میں اسد گیلانی نے اس سے موبائل چھین کر یہ ضرور کہا کہ قصر صدارت تک پہنچنے سے پہلے میڈم ہمارے ساتھ ہوں گی۔"

دانش یزدانی نے موبائل چھینے جانے کا برا نہیں مانا تھا۔ اس کے خیال میں یہ بات کہنی ضروری تھی کہ پشمینہ حیات جلد ہی ان کے درمیان ہوں گی۔

"وہ ٹھیک ہیں نا؟" اسد گیلانی نے اس سے پوچھا۔

دانش نے اس مرتبہ بھی جواب دینے کے بجائے کہا۔

"کرین کی گاڑی کی رفتار اچھی خاصی بڑھ گئی ہے۔ ہم ساڑھے چھ بجے تک آگے پہنچ جائیں گے۔"

دانش یزدانی کا خیال درست ثابت ہوا کہ ساڑھے چھ بجے تک کرین سارے ہجوم سے آگے پہنچ چکی تھی۔

اس وقت عام لوگوں نے چینلز کو فون کرنا شروع کر دیا کہ اب پشمینہ حیات ہرگز نہ آئیں۔ انہیں مشین گنوں کی زد پر نہیں آنا چاہیے۔ قربانیاں دینے کے لیے عوام تیار تھے۔

اب قصرِ صدارت دکھائی دینے لگا تھا۔

اس وقت ایک ایسا واقعہ ہوا کہ نہ صرف کرین کی گاڑی روک دینا پڑی بلکہ ہجوم بھی رکنے لگا۔

کسی جانب سے دو طیارے گرجتے ہوئے قصرِ صدارت کے قریب پہنچے تھے اور مشین گنوں پر گولیاں اور راکٹ برساتے ہوئے گزر گئے تھے۔ وہاں کوئی ائر کرافٹ گن نہیں تھی جس سے ان طیاروں کو گرانے کی کوشش کی جا سکتی تاہم مشین گنوں سے گولیاں ضرور برسائی گئی تھیں جن سے کسی بھی طیارے کو نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن مشین گنوں پر مامور لوگوں کی اکثریت اپنے ہی خون میں تڑپ رہی تھی اور خاصی مشین گنیں بھی یا تو تباہ ہو گئی تھیں یا اِدھر اُدھر لڑھکی پڑی تھیں۔

طیارے ایک چھوٹا سا چکر لگا کر پھر لوٹے۔ اس مرتبہ بقیہ مشین گنوں پر مامور لوگوں نے جان بچانے کے لیے بھاگنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی لیکن دوسرے چکر میں ان طیاروں نے باقی مشین گنوں کو بھی تباہ کر دیا اور پھر اسی طرف جانے لگے جدھر سے آئے تھے۔

"لوگوں کا جوش و خروش بہت بڑھ گیا ہے۔"

"اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔ کوئی خطرہ نہیں رہا۔" اس قسم کے فقرے ہر شخص بول رہا تھا۔

"ان طیاروں پر کسی ملک کا نشان نہیں تھا۔" اسد گیلانی نے کہا جو دوربین سے سارا منظر دیکھتا رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ اسی ملک کے طیارے ہوں گے جس کا طیارہ صدر حیات نے تباہ کروایا ہے۔ ائرپورٹ اور صدر کا طیارہ تباہ کرنے میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔" دانش یزدانی نے کہا۔ "یو این او کے اجلاس میں تو ابھی کوئی اہم فیصلہ نہیں ہو سکا۔ ان کا دوسرا اجلاس کل ہوگا۔"

"ان لوگوں کو ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے۔" اسد گیلانی نے تلخی سے کہا۔ "جب انہیں کسی ملک کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے، تبھی وہ جلدی حرکت میں آتے ہیں۔"

ریلی اب تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ٹی وی چینلز سے لوگوں کا یہ مطالبہ اب ختم ہو چکا تھا کہ پشمینہ نہ آئے کیونکہ مشین گنوں کا خطرہ ختم ہونے کے بعد اب قصرِ صدارت میں گھسنا ذرا بھی مشکل نہیں رہا تھا۔

لیکن دانش یزدانی نے اعلان کیا تھا کہ ڈاکٹروں نے پشمینہ حیات کو بستر سے اٹھنے کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔

☆☆☆

صدر حیات اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی نظریں اردگرد موجود کئی ٹی وی سیٹ کی نگرانی کر رہی تھیں۔ وہ سب ٹی وی ان کلوز سرکٹ کیمروں سے منسلک تھے جو محل کے ان حصوں میں لگائے گئے تھے جہاں سے لوگوں کا داخلہ ممکن تھا۔

سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب اسکرینوں پر لوگ شور مچاتے اور اسلحہ سنبھالے محل میں داخل ہوتے دکھائی دیے۔ ان راستوں کے علاوہ کھڑکیاں توڑ کر بھی لوگوں کا داخلہ شروع ہو چکا تھا۔

"آؤ......آؤ......مرنے آؤ" صدر حیات بڑبڑاتا ہوا کرسی سے اٹھا اور تیزی سے برابر کے اس کمرے میں پہنچا جہاں لیور دبانے سے ڈائنامائٹ اڑائے جا سکتے تھے۔ وہ لیور کے قریب رک گیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

اسی وقت کمرے کا وہ دروازہ پیٹا گیا جہاں سے اندر داخل ہوا جا سکتا تھا۔

"دروازہ کھولیے ڈیڈی! میں مرتے وقت آپ کے ساتھ ہونا چاہتا ہوں۔ لوگ تو محل میں گھستے چلے آ رہے ہیں۔"

صدر حیات نے فوراً لیور نہیں دبایا تھا۔ اس کا وہ کمرا ایسی جگہ تھا جہاں پہنچنے میں لوگوں کو کچھ وقت لگتا۔ حیات چاہتا تھا کہ اتنی دیر میں زیادہ سے زیادہ لوگ محل میں داخل ہو چکے

ہوں۔

"دروازہ کھولیے، پلیز۔" آفتاب کی آواز پھر سنائی دی۔

کچھ سوچتا ہوا حیات دروازے کی طرف گیا۔ دروازہ کھول کر اس نے آفتاب کو اندر آنے دیا۔ پھر خود ہی دروازہ بند کر کے مڑا تو اس نے دیکھا کہ آفتاب اس کے اور لیور کے درمیان حائل تھا۔

"میں آپ کو یہ لیور نہیں دبانے دوں گا۔" آفتاب نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "موت تو میری بھی یقینی ہے ان لوگوں کے ہاتھوں لیکن میں اب اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ بس ان بے قصور لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو مرنے نہیں دوں گا۔"

"ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔" حیات غراتا ہوا آگے بڑھا۔

"ہرگز نہیں۔ میں یہ نہیں کرنے دوں گا آپ کو۔"

حیات نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ یہ اس کا وہ مخصوص ریوالور تھا جس پر سونے کی پتر چڑھی ہوئی تھی یا وہ سونے اور کسی دھات کو ملا کر بنایا گیا تھا۔ آفتاب کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

"ہٹ جاؤ۔" حیات پھر غرایا۔ "ورنہ میں تمہیں گولی ماردوں گا۔"

"اگر آپ اپنے بیٹے کو گولی ماریں گے تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ آپ یقینی طور پر اپنا دماغی توازن کھو چکے ہیں اور جو پاگل ہو چکا ہو، گولی اسے ماردینا چاہیے۔" آفتاب نے خود کو تیزی سے گرا کر اس گولی سے بچایا جو حیات کے ریوالور سے نکل چکی تھی۔ وہ بال بال بچا اور ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور بھی نکال لیا مگر اس سے پہلے کہ وہ باپ پر گولی چلاتا، حیات نے زیادہ تیزی سے اپنا ریوالور نیچے کرتے ہوئے گولیاں داغ دیں۔ آفتاب کیونکہ لیٹ گیا تھا اور اس کا سر حیات کی طرف تھا اس لیے دونوں گولیاں اس کے سر پر لگیں اور وہ فرش پر بے حس و حرکت ہو گیا۔

"بے وقوف!" حیات دانت پیستا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے آفتاب کی لاش کو ٹھوکر ماری اور لیور کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ لیور اس نے اب بھی نہیں دبایا۔ وہ محل میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا داخلہ چاہتا تھا۔

محل بہت بڑا تھا۔ آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ پھر بھاگتے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔

"یہ کمرا رہ گیا ہے۔" حیات نے دانش یزدانی کی آواز پہچانی۔ "کھولو دروازہ، نہ کھلے تو توڑ دو۔"

دروازہ تھوڑا سا لرزا۔ اسے کھولنے کی کوشش کی گئی تھی۔

"توڑ ڈالو" دانش یزدانی ہی کی آواز تھی۔

"توڑو" اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" حیات نے دانت پیسے۔ اس کا ہاتھ لیور پر پہنچ چکا تھا۔

دروازے پر غالباً رائفلوں کے دستے مارے جارہے تھے۔

"رخصت۔" حیات نے کہا اور لیور دبا دیا۔

لیور دبایا اور سکتے میں کھڑا رہ گیا۔ کوئی ڈائنامائٹ نہیں پھٹا تھا، کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔

غصے میں حیات کے منہ سے کچھ عجیب سی آواز نکلی۔ وہ سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے بھی اسے دھوکا دیا تھا جن کو اس نے ڈائنامائٹ لگانے کی ہدایت کی تھی۔

"وہ بھی دھوکا دے گئے۔" وہ دانت پیستا ہوا تیزی سے اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں سے اس نے ہلکی مشین گن اٹھائی۔

"تم مجھے زندہ نہیں پکڑ سکتے کتو!" وہ غراتا ہوا واپس اسی کمرے میں آیا جہاں دروازہ توڑنے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن اس کا ٹوٹنا آسان نہیں تھا۔ وہ خاصی مضبوطی سے بنایا گیا تھا۔

لیکن آخرکار ٹوٹے گا۔ حیات کو یقین تھا اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اندر جتنے بھی لوگ آئیں گے، وہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔

پھر وہی ہوا۔ دروازہ ٹوٹ گیا۔ لوگ تیزی سے اندر آئے اور حیات نے مشین گن سے گولیوں کی برسات کر دی۔ حیات کئی افراد کو ختم کرنے میں کامیاب بھی رہا لیکن جواب میں چلائی جانے والی گولیوں نے اس کا سارا جسم چھلنی کر ڈالا۔ وہ فرش پر گرا اور اپنے ہی خون میں لت پت بے حس و حرکت ہو گیا۔

کسی نے چیخ کر کہا کہ دانش صاحب کو فوراً اسپتال پہنچاؤ۔

کوئی دوسرا چیخا۔ "ہم اس درندے کی لاش کو سڑکوں پر گھسیٹیں گے۔"

دانش یزدانی ان لوگوں کو ہدایت کر چکا تھا کہ محل میں آگ ہرگز نہ لگائی جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا تھا۔

سائرن بجاتی ہوئی کئی ایمبولینس محل کے باہر پہنچ چکی تھیں۔ مرنے والوں کی لاشیں اور زخمی ہونے والوں کو فوراً ان

میں پہنچایا گیا۔

"دانش صاحب کی حالت نازک معلوم ہو رہی ہے۔"

کسی نے رو دینے والے انداز میں کہا تھا۔

بہت سے لوگوں نے اس کی آواز ہی نہیں سنی۔ وہ غیظ و غضب کے عالم میں تھے اور حیات کی لاش کو گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے جا رہے تھے۔ زخمیوں اور لاشوں کو بڑی پھرتی سے اٹھا کر باہر لے جایا جا چکا تھا۔

لوگ حیات کی لاش کو گھسیٹتے ہوئے نہ صرف کمرے سے نکلے بلکہ اسے محل سے بھی نکال لائے۔

ٹی وی کیمرے یہ منظر اپنے اپنے چینلز کو پہنچا رہے تھے۔ وہ مناظر ساری دنیا میں دیکھے گئے کہ حیات کی لاش سڑکوں پر گھسیٹی جا رہی تھی۔ لوگ لاش سے بھی اپنی شدید نفرت کا اظہار کر رہے تھے۔ اس پر جوتے برسائے جا رہے تھے، تھوکا جا رہا تھا، لوگ طرح طرح سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے تھے۔

☆☆☆

پشمینہ کی آنکھیں کھلیں تو وہ ایک بڑے اسپتال کے کمرے میں تھی۔ آنکھیں کھلنے پر اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ اسے کچھ چہرے دکھائی دیے لیکن فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کون تھے اور وہ خود کون تھی۔ اس نے بھنبھناہٹ سی سنی۔ وہ دراصل کئی افراد کے بہ یک وقت بولنے کی آوازیں تھیں۔

پھر اس کے دماغ میں مختلف مناظر کے جھماکے ہونے لگے۔ ریلی، ٹی وی چینلز کا شور، پشمینہ حیات زندہ باد، ہیلی کاپٹر، صدر حیات کا چہرہ، ماں باپ کے چہرے، بھائی اور بھاوج کے چہرے، ہلاک اور زخمی ہونے والوں کو اسپتال لے جائے جانے کے مناظر، گولیاں چلنے کی تڑتڑ، پرواز کرتا ہوا ایک ہیلی کاپٹر، گولی چلنے کی آواز، پھر چند لمحے کی مکمل تاریکی اور پھر فوراً روشنی جس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اس نے بے اختیار اٹھنے کی کوشش کی تو دائیں بائیں سے دو ہاتھوں نے اس کے شانوں پر دباؤ ڈالا۔

"تیزی سے مت اٹھیے!" اس کے لیے اجنبی آواز ایک نرس کی تھی۔

پشمینہ نے اپنے آس پاس موجود افراد کو پہچان لیا۔ اس کی بھاوج قدسیہ، پارٹی کا صدر اسد گیلانی، ڈیبرا، دانش یزدانی، دو ڈاکٹر، دو نرسیں۔

"شکر ہے کہ آج کے بعد تم ہوش میں ہی رہو گی۔" دانش یزدانی مسکراتا ہوا بولا۔ "ڈاکٹر صاحب نے یہی بتایا ہے۔"

پشمینہ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس نے کچھ بوجھ محسوس کیا تھا۔ اس کے ہاتھوں نے اس ڈریسنگ کا لمس محسوس کیا جو اس کے سر پر کی گئی تھی۔ یہ اسے یاد آ چکا تھا کہ اس نے ایک گولی چلنے اور ایک دھماکے کی آواز سنی تھی اور پھر اس کی آنکھوں کے آگے گہری تاریکی چھا گئی تھی۔

"تمہارے سر میں گولی لگی تھی۔" دانش پھر بولا۔ "خدا کا شکر ہے کہ آپریشن طویل تو تھا لیکن بہت کامیاب رہا۔"

"ممی کہاں ہیں؟" پشمینہ نے پوچھا اور خود محسوس کیا کہ اس کی آواز میں خاصی نقاہت تھی۔

"ابھی کسی کام سے گئی ہیں، آ جائیں گی۔" قدسیہ بول پڑی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔

یکایک پشمینہ چونکی۔ "مگر تم سب یہاں کیوں ہو؟ ریلی کی قیادت......"

"سب کچھ ہو چکا ہے۔ ہم کامیاب ہو چکے ہیں۔ تم ایک مہینا دس دن کے بعد مکمل ہوش میں آئی ہو۔"

"کیا؟" پشمینہ حیران رہ گئی۔

"نرس! انجکشن۔" ایک ڈاکٹر بولا۔

نرس پہلے ہی انجکشن تیار کر چکی تھی جو اس نے فوراً پشمینہ کے بازو میں لگا دیا۔

"اب آپ خود کو بالکل ٹھیک سمجھیے پشمینہ صاحبہ!" ڈاکٹر بولا۔

دوسرا ڈاکٹر خاموش رہا تھا۔ غالباً وہ اسسٹنٹ ڈاکٹر تھا۔

"بس چند دن آرام کی ضرورت ہے۔" پہلے ڈاکٹر نے مزید کہا۔ "برطانوی ڈاکٹروں نے تو معجزہ کر دکھایا ورنہ زخم اتنی جلدی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔"

"برطانوی...... ڈاکٹر......" پشمینہ رک رک کر بولی۔

"جی ہاں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "آپریشن کی کامیابی کے باوجود چار دن بعد آپ کی حالت یکایک زیادہ خراب ہو گئی تھی اور ہنگامی طور پر برطانیہ سے دو بہت بڑے ڈاکٹروں کو بلایا گیا تھا۔ وہ دس گھنٹے بعد ہی یہاں پہنچ گئے تھے۔ وہ کل ہی اس یقین کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوئے ہیں کہ اب ان کی ضرورت نہیں۔ وہ یہ پیش گوئی بھی کر گئے تھے کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مکمل طور سے ہوش میں آ جائیں گی۔"

"کیا ہو چکا ہے اس عرصے میں؟" پشمینہ نے بے چین ہو کر دانش اور اسد گیلانی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں آ گئے ہیں؟"

"خوشی کے آنسو ہیں۔" قدسیہ نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا لیکن حقیقتاً وہ دکھی تھی۔ جو کچھ ہو چکا تھا، وہ اس کی زندگی میں ہمیشہ کے لیے درد گھول گیا تھا۔ شوہر سے مخالفت کے باوجود وہ آفتاب سے محبت کرتی تھی۔

"تم لوگ میری بات کا جواب کیوں نہیں دے رہے ہو؟" پشمینہ پھر دانش یزدانی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"نرس!" ڈاکٹر پھر بول پڑا۔ "بس تم یہاں رکو...... ہماری اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

یہ اس نے صرف ایک نرس سے کہا۔ دوسری نرس دونوں ڈاکٹروں کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔

دانش بولا۔ "سر میں گولی لگنے کے بعد تم بے ہوش ہو کر ڈیبرا کی گود میں گر پڑی تھیں۔ اس وقت پائلٹ نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر فوراً اسپتال لے آیا تھا۔ وہاں سب تیار بھی تھے کیونکہ ڈیبرا نے انہیں موبائل پر اطلاع دے دی تھی۔ تمہارا آپریشن خاصا طویل تھا لیکن کامیاب رہا تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ تم اب سے پہلے تین مرتبہ ہوش میں آچکی ہو اور دو مرتبہ تو ہم سے دو ایک منٹ بات چیت بھی کر چکی ہو۔"

"نہیں۔" پشمینہ نے کہا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔" وہ عجیب سی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے ڈیبرا نے اس حادثے کے بعد فوراً اطلاع دی تھی۔ مجھے لینے کے لیے ہیلی کاپٹر بھجوا دیا تھا۔ ایرو کلب والوں نے ہم سے مکمل تعاون کیا۔ میں یہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ ڈیبرا کو پریشان اور روتے ہوئے دیکھا۔ تم اس وقت آپریشن تھیٹر میں تھیں، لیکن وہاں سے کوئی نہ کوئی کسی وجہ سے باہر نکلتا تھا تو ہمیں یہ تسلی ضرور دیتا تھا کہ آپریشن اطمینان بخش طور پر جاری ہے۔ میری حالت بہت غیر ہو گئی تھی پشمینہ! ایک طرف تمہاری فکر، دوسری طرف تمہارے مشن کی۔ تم نے قیادت کی ذمے داری مجھے سونپی تھی۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور قیادت کے لیے واپس گیا۔ ڈیبرا سے کہہ دیا تھا کہ مجھے صورتِ حال سے آگاہ رکھے۔ واپس جا کر میں نے تمہارے بارے میں حقیقت کسی کو نہیں بتائی۔"

"مجھے بھی نہیں۔" اسد گیلانی ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"خبر چھپانا ضروری تھا۔"

"آخر میں ہوا کیا؟ وہ بتاؤ!" پشمینہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"تفصیل سے پھر کسی وقت بتاؤں گا۔" دانش نے کہا، پھر ہچکچاتا ہوا بولا۔ "صدر حیات...... مارے گئے۔"

پشمینہ یک لخت نہ صرف چپ ہوئی بلکہ اس نے اپنی آنکھیں بھی بند کر لیں۔ تمام تر مخالفتوں کے باوجود وہ صدر حیات کی بیٹی تو تھی۔

اس وقت قدسیہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

پشمینہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت خود اس کی آنکھیں بھی قدرے بھیگی بھیگی سی تھیں۔

"آفتاب بھی زندہ نہیں رہے۔" دانش نے دھیمی آواز میں کہا۔ "انہیں پہلے ہی گولیاں ماری جا چکی تھیں۔ بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دو گولیاں صدر حیات کے ریوالور سے چلائی گئی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آسکا کہ ایسا کیوں ہوا۔"

قدسیہ، پشمینہ پر جھکی اور اس کے شانے سے سر لگا کر سسکیاں لینے لگی۔ سسکیاں لیتے ہوئے اس نے کہا کہ جب اچانک پشمینہ نے اسے ہیلی کاپٹر میں بٹھایا تھا، اسی وقت وہ ساری بات سمجھ گئی تھی اور اسے یہ خیال بھی آگیا تھا کہ شاید وہ دوبارہ اپنے شوہر کو زندہ نہ دیکھ سکے۔

پشمینہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ سب تو ہونا ہی تھا۔" پشمینہ کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "مجھے شروع ہی سے اندازہ تھا۔ پھر بھی یہ خبر سن کر جھٹکا تو میرے ذہن کو بھی لگا ہے۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

"ممی کہاں گئی ہیں؟" اس کی آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔

"ایک مہینا دس دن وہ یہیں رہی ہیں۔ بس چپ رہتی تھیں۔ صدر حیات کے بارے میں انہیں بھی علم ہو گیا تھا۔ وہ صرف تمہارے لیے یہاں رکی ہوئی تھیں لیکن یہ بھی کہتی رہی تھیں کہ وہ تم سے ناراض ہیں۔ ابھی جب تمہیں ہوش آیا تھا تو تم فوری طور پر ہم میں سے کسی کو نہیں پہچان سکی تھیں۔ اس وقت وہ بھی یہیں تھیں۔ تمہیں ہوش میں آتا دیکھ کر فوراً یہاں سے چلی گئیں۔"

"کہاں؟"

"میں نے تو چاہا تھا کہ وہ تمہارے گھر جائیں لیکن انہوں نے کچھ دن پہلے ہی ایک ہوٹل میں کمرا بک کروا لیا تھا۔ وہ وہیں گئی ہیں۔ وہ تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی زندگی ان کے شوہر کے ساتھ ہی ختم ہو۔"

پشمینہ چپ رہ گئی۔

"ملکی صورتِ حال اب بالکل ٹھیک ہو چکی ہے۔"

دانش یزدانی نے پشمینہ کا دھیان بٹانے کے لیے دوسری باتیں چھیڑ دیں۔ ''آرمی چیف کو غالباً یقین تھا کہ کیا ہوگا۔ اسی لیے انہوں نے کچھ تیاریاں کر لی تھیں۔ حکومت کے خاتمے کے بعد انہوں نے اسی دن ایک فوجی کونسل قائم کردی تاکہ ملک کا نظم و نسق کسی حد تک تو سنبھالا جا سکے اور پھر تین دن بعد ہی ٹیکنو کریٹس کی حکومت بنوا دی تھی۔ عبوری وزیراعظم کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد انتخاب کروائے۔ تمہیں چند دن پہلے ہوش آیا تھا تو برطانوی ڈاکٹروں نے تمہاری بے ہوشی کے بعد کہا تھا کہ اب تم ہوش میں آؤ گی تو ہوش میں ہی رہو گی۔ آرمی چیف برابر یہاں اسپتال کے ڈاکٹروں سے رابطے میں رہ کر تمہاری خیریت دریافت کرتے رہے۔ کئی مرتبہ مجھ سے بھی ملک کی سیاسی صورتِ حال پر گفتگو کی۔ کل انہی کے ایما پر عبوری وزیراعظم نے آئندہ پندرہ دن میں انتخابات کے انعقاد کا اعلان کردیا ہے۔ میں پارٹی کے کاموں سے غافل نہیں رہا تھا۔ ری پبلکن فورم نے ہر شہر سے لوگوں کو انتخاب کے لیے کھڑا کیا ہے۔ حالات بتا رہے ہیں کہ ہماری پارٹی بھاری اکثریت سے جیتے گی جو سیاسی پارٹیاں ہمارے ساتھ بعد میں شامل ہوئی تھیں، ان سے انتخابات کے معاملے میں اتحاد کرنے سے میں نے صاف انکار کردیا تھا۔''

''تم نے بھی کاغذات داخل کردیے ہیں؟'' پشمینہ نے پوچھا۔

''ہاں، اور تمہارے بھی۔''

''میرے؟'' پشمینہ حیران ہوئی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''عبوری حکومت آرمی چیف کے اشارے پر کام کررہی ہے۔ کاغذات پہلے ہی چھپوا لیے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ جب بھی تم کچھ ہوش میں آؤ، تم سے دستخط کروا لیے جائیں۔ چند دن پہلے جب تم ہوش میں آئی تھیں، اس وقت کی کوئی بات تمہیں یاد نہیں۔ میں نے اسی وقت تم سے دستخط کروا لیے تھے۔''

''اوہ!'' پشمینہ کے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ اس کے چہرے سے ظاہر نہیں ہوا کہ اسے خوشی ہوئی تھی۔

اس دوران میں قدسیہ نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

''کسی طرح ممی کو لاؤ دانش!'' پشمینہ کچھ توقف سے بولی۔

''نہیں آئیں گی وہ۔'' دانش نے جواب دیا۔ ''تم اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد خود ہی انہیں منانا۔''

''ہوں۔'' پشمینہ چند لمحے چپ رہی، پھر اس نے قدسیہ سے کہا۔ ''آپ اتنے دن تک کہاں رہیں؟''

''میں بھی ممی کے ساتھ یہیں رہی ہوں۔ اب میں چاہتی تھی کہ تم سے اجازت لوں۔''

''ممی کے پاس ہوٹل ہی جائیں۔ جب تک میں اسپتال میں ہوں، ان کی خبر گیری آپ ہی کو کرنی ہوگی۔''

''میں پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکی تھی پشمینہ۔''

''تو جائیے...... ان کا دھیان رکھیے۔'' پشمینہ اداس نظر آئی۔

قدسیہ کے جانے کے بعد پشمینہ نے اسد گیلانی سے کہا۔ ''آپ بالکل چپ ہیں۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ سے کیا بات کروں۔ اگرچہ آتشِ بغاوت آپ ہی کی وجہ سے بھڑکی تھی۔ جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ بھی آپ کو پہلے سے تھا۔ اس کے باوجود آپ...... میرا مطلب ہے...... نتائج سننے کے بعد آپ کا دل بوجھل تو ہو گیا ہوگا۔''

پشمینہ نے جواب دینے کے بجائے آنکھیں بند کرلیں۔

''اب تمہاری طرف سے تو اطمینان ہوگیا ہے۔'' دانش بولا۔ ''یہاں کی ہر نرس دل و جان سے تمہارا خیال رکھنا چاہتی ہے اس لیے اب مجھے اور انہیں بھی اجازت دو۔'' اس نے اسد گیلانی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں انتخابات کی بھرپور سرگرمیاں جاری رکھنی ہوں گی۔''

''ہاں۔'' پشمینہ نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ ''جب تک میں ٹھیک نہیں ہو جاتی، تمہیں شب و روز کام کرنا ہوگا۔ ہاں ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گئی۔ عوام اب تو جان گئے ہوں گے کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔''

''اس بارے میں تو فوراً ہی بتا دیا گیا تھا۔ اس وقت ہر شہر، بلکہ ہر کوچے میں تمہاری صحت یابی کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔ سارا ملک تم سے والہانہ محبت کرنے لگا ہے۔ تم ابھی ٹی وی کھلوا لینا۔ تمہارے بارے میں پروگرام اب بھی جاری ہیں۔ اور ہاں!'' دانش نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ''تمہارا موبائل میرے پاس ہے۔'' اس نے موبائل نکال کر پشمینہ کو دیا۔ ''یہ بند رکھا تھا میں نے۔''

''اچھا کیا تھا۔'' پشمینہ نے کہا۔ ''اب جائیے آپ دونوں۔'' اس نے اسد گیلانی کی طرف دیکھا۔ ''میری عدم موجودگی میں آپ دونوں پر بھاری ذمے داریاں ہیں پارٹی کی۔''

''پارٹی کے بھی لوگ جوش و خروش سے کام کررہے ہیں۔ فون پر آپ کی خیریت بھی معلوم کرتے رہتے ہیں۔''

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

پشمینہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ان دونوں کو رخصت کرنے کے بعد پشمینہ نے اپنا موبائل کھولا اور روبینہ حیات سے رابطہ کیا۔ دوسری طرف گھنٹی تو بجتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔

''کب تک ناراض رہیں گی ممی!'' اس نے زیرِلب بڑبڑا کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا ٹی وی کھول دوں میڈم؟'' نرس نے پوچھا۔

پشمینہ نے اشارے سے اجازت دی۔ نرس نے ٹی وی کھولا اور ریموٹ پشمینہ کو دے دیا۔

دن کا وقت تھا اس لیے گزشتہ رات کے پروگرام ریپیٹ کیے جا رہے تھے۔ جو چینل اس وقت لگا تھا، وہ کوئی مزاحیہ پروگرام دے رہا تھا۔ پشمینہ نے چینل بدلا۔ پھر دوسرا، تیسرا، چوتھے چینل پر وہ رک گئی۔ اس پر ٹاک شو ہو رہا تھا۔ بات ری پبلکن فورم ہی کی ہو رہی تھی۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ انتخابات میں ری پبلکن پارٹی سوئپ کرے گی، اسے صرف مذہبی جماعتوں کے ووٹ نہیں ملیں گے۔

پھر یکایک پروگرام رکا اور ''بریکنگ نیوز'' کا سلائڈ آیا۔

بریکنگ نیوز یہ تھی کہ پشمینہ حیات اب مکمل ہوش میں ہیں اور چند ہی دن میں اسپتال سے ڈسچارج کر دی جائیں گی۔

پھر اس خبر پر دیگر تجزیہ کاروں کی رائے لی جانے لگی۔ وہ بھی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

پشمینہ نے ٹی وی بند کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا تھا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے پھر ٹی وی کھولا۔ اب تقریباً ہر چینل پر اسی کے بارے میں لائیو پروگرام چل رہے تھے۔ مختلف شہروں کی صورتِ حال بتائی جا رہی تھی جہاں پشمینہ حیات کی صحت یابی کی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔

ایک چینل پر اس کا نمائندہ کسی بازار میں کھڑا لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ اب وہ کیا محسوس کر رہے ہیں۔

وہاں بھی لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا اور ایک صاحب نے تو جواب دینے کے بجائے ''پشمینہ حیات، وزیراعظم، زندہ باد'' کا نعرہ لگا دیا۔

نرس نے فوراً پشمینہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ اس وقت بھی سپاٹ تھا۔ وہ چینل بدلتی رہی۔ ہر جگہ یہی ہو رہا تھا۔ پھر یکایک وہ ایک چینل پر رکی، اس پر صدر حیات کا انجام دکھایا جا رہا تھا۔ اس کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش سڑکوں پر گھسیٹی جا رہی تھی۔

''تو......!'' پشمینہ چیخ پڑی اور پھر آنکھیں بند کر کے سسکیاں لینے لگی۔

نرس نے جلدی سے ٹی وی بند کر دیا۔

انسان کتنا بھی اصول پسند اور اصول پرست کیوں نہ ہو، خون کا اثر تو اپنا رنگ دکھا ہی دیتا ہے۔

پانچ دن بعد پشمینہ کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ اس دوران میں وہ ٹی وی کے ذریعے سیاسی ہنگاموں سے باخبر ہوتی رہی تھی۔ دانش اور پارٹی کے دیگر سرکردہ افراد بھی آ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتے رہے تھے۔ دو مرتبہ اقصیٰ بھی اس سے ملنے آئی تھی۔ اس نے بہت سے لوگوں کے اصرار کے باوجود انتخابات میں کھڑے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں اپنا صرف وہی مشن جاری رکھنا چاہتی ہوں جس کی ذمے داری میرے والد نے مجھے سونپی تھی۔'' اس کا مستحکم جواب تھا۔

جب پشمینہ پارٹی کے سرکردہ افراد کے ساتھ باہر نکلی تو بے شمار لوگ وہاں جمع تھے اور پشمینہ حیات کے نعرے لگا رہے تھے۔

چند فوجی سپاہی بمشکل اسے اس کی کار تک پہنچا سکے۔ پشمینہ ان کی موجودگی پر حیران تھی۔ پھر اس وقت اس کی حیرت میں اضافہ ہوا جب اس کی کار کے آگے پیچھے بھی فوجی گاڑیاں تھیں۔

''یہ سب کیا ہے دانش؟'' وہ بول پڑی۔

کار میں اس کے ساتھ دانش بیٹھا تھا۔ ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر ڈیبرا تھی۔

''یہ آرمی چیف کا فیصلہ ہے کہ تمہیں سیکیورٹی فوج ہی کی طرف سے دی جائے گی۔''

''مگر کیوں؟ مجھے کسی سے کیا خطرہ ہے؟''

''خطرہ ہو یا نہ ہو، مستقبل میں اس ملک کی وزیراعظم تو تم ہی ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' پشمینہ نے سختی سے کہا۔ ''میں وزیراعظم نہیں بننا چاہتی۔''

''تمہارے چاہنے یا نہ چاہنے سے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' دانش مسکرایا۔ ''تم سیاسی کمپین میں حصہ لو یا نہ لو، ووٹ تمہیں ہی ملیں گے۔ تمہارے مقابل صرف ایک مذہبی جماعت کا آدمی کھڑا ہوا ہے۔ اسے شاید دو چار ہزار ووٹ مل جائیں۔ کامیاب تو تم ہی ہو گی۔ اسمبلی میں تم پہنچو گی اور جب

لیڈر آف دی ہاؤس کا انتخاب ہوگا تو بھی سارے ووٹ تمہیں ہی ملیں گے۔"

"یہ میں نہیں ہونے دوں گی۔ میں تو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے کاغذات ہی جمع نہیں کراتی۔ میں اسمبلی سے مستعفی ہو جاؤں گی۔ لیڈر آف دی ہاؤس تم ہو گے۔ میں پارٹی کی چیئر پرسن ہی رہنا چاہتی ہوں۔ پارٹی کے منتخب ارکان میری بات ٹال نہیں سکتے۔ وہ تمہارے ہی حق میں ووٹ دیں گے۔ لیڈر آف دی ہاؤس، اس ملک کے وزیراعظم تم ہی بنو گے دانش۔"

"تم دیکھنا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہوگا۔ بے پناہ لوگ سڑکوں پر آجائیں گے اور ان کے مطالبے پر تمہیں اپنا استعفا واپس لینا ہی پڑے گا۔ تم تو آج نکلی ہو باہر۔ میں تو اتنے دن سے حالات کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ لوگ صرف تمہیں وزیراعظم دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔"

پشمینہ کوئی جواب دینے کے بجائے چونکی۔ "ہم کدھر جارہے ہیں؟"

"تم اب اپنے گھر ہی جاؤ گی نا...... میرس پر تباہ ہونے والے ہیلی کاپٹر کا ملبا صاف کر دیا گیا ہے۔"

"نہیں۔" پشمینہ نے کہا۔ "میں پہلے ممی کے پاس جاؤں گی۔"

"او، ہاں! مجھے خیال ہی نہیں رہا تھا۔"

دانش نے جیب سے موبائل نکال کر غالباً سیکیورٹی ہی کے کسی شخص سے بات کی، پھر موبائل بند کر کے جیب میں ڈال لیا اور ڈرائیور سے کہا۔ "آگے جو سیکیورٹی کی دو گاڑیاں چل رہی ہیں، وہ اب اپنا رخ بدلیں گی۔ انہی کے پیچھے چلنا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔

اس کے بعد دانش نے پشمینہ سے پھر وزیراعظم کی بات چھیڑی لیکن پشمینہ سختی سے اپنے موقف پر قائم رہی۔

"لوگوں کا ہجوم تم سے فیصلہ بدلوالے گا۔" دانش نے اس وقت کہا جب کار ہوٹل پہنچ کر رکی۔

روبینہ حیات کا کمرا پہلی ہی منزل پر تھا۔ وہاں بھی دو سیکیورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ اس پر پشمینہ کو تعجب نہیں ہوا۔ ملک کے سابق صدر کی بیوہ کو سیکیورٹی ملنی ہی چاہیے تھی۔

قدسیہ نے انہیں بتایا کہ روبینہ حیات زیادہ وقت کمرے میں بند رہ کر گزارتی ہیں۔

"کمرا ان کا آپ ہی کھلوائیے۔" پشمینہ نے کہا۔ "میری آواز سن کر شاید وہ دروازہ نہ کھولیں۔ جب ملوں گی تو انہیں منا ہی لوں گی۔ اگر انہیں مجھ سے نفرت ہو جاتی تو وہ ایک مہینا دس دن تک اسپتال میں نہ رکتیں۔"

قدسیہ نے سر ہلا دیا۔

"تم یہیں رکو دانش۔" پشمینہ نے کہا۔ "تم بھی ڈیبرا۔"

وہ دونوں وہیں رک گئے۔ قدسیہ اور پشمینہ کمرے کے دروازے پر گئیں۔ قدسیہ نے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟ قدسیہ؟" اندر سے روبینہ حیات کی آواز آئی جو غم زدہ تھی۔

"جی ممی! ایک بات بتانا ہے آپ کو۔"

دوسری طرف قدموں کی آہٹ ہوئی جو دروازے کے قریب آکر رکی، پھر دروازہ کھلا۔ پشمینہ کو دیکھ کر روبینہ حیات چونک گئیں۔

"ممی!" پشمینہ کی آواز میں لرزش تھی۔ "آپ کی بیٹی زندہ بچ گئی ہے سر میں گولی کھا کر بھی، اور آپ سے ملنے آئی ہے۔"

روبینہ حیات کچھ کہے بغیر مڑ کر اپنے بستر پر جا بیٹھی۔ پشمینہ اور قدسیہ اندر داخل ہوئیں۔ پشمینہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماں کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

"میں تمہیں معاف نہیں کر سکتی۔" روبینہ حیات نے لرزتے ہونٹوں سے کہا۔ "تم نے مجھے دھوکا دیا۔ تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے ملنے آرہی ہو لیکن تم مجھے ہی وہاں سے لے آئیں۔"

"تو کیا آپ کو بھی کھو دیتی؟"

"ہاں۔"

"ممی!" پشمینہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "باپ کے بعد میں آپ کو نہیں کھونا چاہتی لیکن آپ اپنی بیٹی کو ضرور کھو دیں گی۔"

روبینہ حیات اس کا مطلب ہی نہیں سمجھی ہوگی۔

پشمینہ پھر بولی۔ "اگر آپ نے مجھے گلے نہ لگایا تو...... ابھی تو میرے پاس ریوالور نہیں ہے لیکن گھر پر ہے، چلی جاتی ہوں میں یہاں سے...... گھنٹے بھر کے اندر آپ کو اطلاع مل جائے گی کہ آپ کی بیٹی نے خودکشی کر لی۔"

جواب سنے بغیر پشمینہ تیزی سے مڑی۔ اس کی آنکھوں سے اب آنسو بہہ رہے تھے۔

"پشمینہ!" روبینہ حیات چیخ کر اٹھی۔

پشمینہ ماں کی طرف مڑی لیکن اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھی۔ خود روبینہ حیات نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پشمینہ کی آنکھوں سے بھی آنسو تیزی سے بہنے لگے۔

قدرے فاصلے پر کھڑی قدسیہ کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

کچھ لوگ پیدائشی فنکار ہوتے ہیں... سادہ فطرت... تربیت یافتہ اور تراشیدہ ہنر مندی ان کی ذات میں پوشیدہ ہوتی ہے... جو کبھی ظاہر ہو جاتی ہے... اور کبھی دنیا کی نگاہوں سے ہمیشہ مخفی گوہرِ نایاب کی صورت زمین میں دفن رہتی ہے... آرزوئوں اور خواہشوں سے لبریز دل کے مالک فنکار کی ہنر سازیاں... وہ شہرت اور قابلیت کی اونچائی پر پہنچنا چاہتا تھا... جو تمنائیں ناقابلِ تکمیل مراحل سے دوچار تھیں... ان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اس کے ذہن کی گرہیں مسلسل بر سرِ پیکار تھیں...

تمنا کے گرداب میں پھنسی ایک دہرے کردار کے جیون کی دیکھی ان دیکھی جھلکیاں

دہرا جیون

مختار آزاد

میں ایک کہانی لکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے صرف کاغذ قلم کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک میز کرسی بھی ہے، لکھنے کے لیے جتنے وقت کی ضرورت ہوگی، اس سے زیادہ فرصت مجھے میسر ہے لیکن شاید ہمت نہیں۔ پچیس برس گزر گئے۔ زندگی بہت بدل چکی۔ بہت کچھ لکھ چکا مگر یہ کہانی...... لکھی ہی نہیں جاتی۔

اب تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن جب بچپن میں پڑھنا شروع کیا، تبھی سے مجھے کہانیاں لکھنے کی خواہش تھی۔

بہت کم عمری میں ہائی اسکول پاس کیا، تب تک میرے پاس بہت ساری کتابیں جمع ہو چکی تھیں لیکن یہ کسی خاص موضوع تک محدود نہ تھیں۔ اُس وقت بھی میرے پاس ہر قسم کی کتابیں تھیں: نچلے درجے کا فکشن، کامیابی کے نسخے اور بہتر ازدواجی زندگی سے لے کر دست شناسی تک، ہر موضوع کی کتابیں میرے کمرے میں جمع تھیں۔ مجھے پڑھنے سے غرض سے تھی۔ جو کتاب پسند آئی خرید لی، پڑھ لی۔ مجھے کتابوں کے لمس اور ان کے مطالعے سے لطف آتا تھا۔

کالج میں پہنچنے تک فیصلہ کرلیا تھا کہ مصنف بننا ہے۔ پہلے دو سمسٹر تک میں کئی بڑے ادیبوں کو پڑھ چکا تھا۔ تب خیال آیا کہ مصنف بننے کے لیے لکھنا ضروری ہے لیکن یہ پتے کی بات اُس وقت ہی پلے پڑ گئی تھی کہ کامیاب مصنف بننے کے لیے بڑے ادیبوں کی تخلیقات پڑھنا زیادہ ضروری نہیں، بس کسی بڑے نقاد کی آشیرباد لازم ہے۔ کالج کے دوران میں ہی یہ دیکھ چکا تھا کہ عمر رسیدہ اور زندگی سے بیزار پروفیسر اور سنکی نقاد، کسی بھی نوآموز قلمکار کو بہ آسانی اچھا مصنف تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ تاہم منزل تک پہنچنے کے لیے میں سب کچھ کر گزرنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔

کالج کے بعد یونیورسٹی اور پھر چند سالوں میں ہی میں نے تدریس کی سند حاصل کرلی تھی۔ خوش قسمتی سے ان برسوں کے دوران میں پروفیسر میتول ریمز انسالڈ کی قربت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اگر یہ دوستی نہ بھی کہلائے تب بھی ہم میں خوش گوار باہمی تعلقات استوار ہو چکے تھے۔ میرے نزدیک پروفیسر ایسی شخصیت تھی، جسے ذہین و فطین کہنے میں کم از کم آج مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں۔ اس ایک شخص میں کئی خوبیاں سمائی ہوئی تھیں۔ بعض دنیا والے جانتے تھے لیکن چند ایسی خوبیاں تھیں جو صرف میں نے ہی دیکھی تھیں۔

پروفیسر میتول کئی قدیم زبانوں کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ رومن، لاطینی، ہسپانوی اور عبرانی زبان سے انگریزی میں درست ترین بامحاورہ ترجمے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا۔ وہ ان زبانوں کو بہترین تلفظ اور لب و لہجے کے ساتھ بولنے پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ قدیم زبانوں کے کلاسکی ادب پر مہارت رکھنے کے سبب وہ متعدد تعلیمی اداروں میں کئی اعزازی عہدوں پر بھی فائز تھا اور اکثر یورپ اور ایشیا کے دوروں پر بھی جاتا رہتا تھا۔ سال کے صرف چند مہینے ہی وہ یونیورسٹی میں رہتا تھا۔ وہ بھی دسمبر سے فروری تک ورنہ تو اس کے دورے چلتے ہی رہتے تھے۔

میں ارجنٹائن کے شاعر ہرنینڈیز کی مشہور ترین نظم مارٹن فیررو کو سمجھنے کے لیے پروفیسر سے پہلی بار ملا تھا۔ یہ ملاقات بعد میں کئی ملاقاتوں کا سبب بنی، سب میں نظم ہی زیر بحث رہی تھی لیکن ان ملاقاتوں کے سبب ہمارے تعلقات بڑھتے چلے گئے۔

میں ادب کی بیانیہ صنف میں لکھنا چاہتا تھا۔ کہانی کو کرداروں کے بجائے خود کہنا زیادہ پسند تھا۔ دو بار کوشش کی اور اپنے تئیں نہایت عمدہ کہانی لکھ کر پروفیسر کی رائے جاننے کے لیے پہنچا۔ اگرچہ دونوں بار اس کا ردعمل منصفانہ تھا لیکن میرے حق میں وہ ہرگز ہمدردانہ نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ مجھ میں لکھنے کی صلاحیت تو ہے لیکن اظہار میں کئی کمزوریاں اور خامیاں تھیں، جنہیں دور کیے بنا آگے بڑھنا مشکل تھا۔

وہ عالم شباب تھا۔ اُس دور میں جوانی کے ساتھ جسم ہی نہیں ذہن بھی مضبوط اور باغی ہوتا ہے۔ میں بھی ایسا ہی تھا۔ منہ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں پروفیسر کی رائے کو رد کرتے ہوئے اپنے مقدمے کو خود ہی سُن کر اپنے حق میں فیصلہ دے دیا: 'مجھے لکھنا آتا ہے البتہ پروفیسر میں سمجھنے کا فقدان ہے۔'

یہ تو مانتا ہوں کہ کہانی کی بُنت میں پختگی کے لیے زندگی کے جن متنوع تجربات کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی میرے پاس خاصی کمی تھی۔ بیانیہ انداز میں کہانی سنانے یا لکھنے کے لیے جن جزئیات کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں لکھنا میرے لیے مشکل تھا۔ یہ درست ہے کہ جزئیات کی تفصیل بیان کیے بغیر کہانی میں پھیکا پن آجاتا ہے۔ یہ قارئین کو کہانی سے بیزار کرنے لگتی ہے۔ ویسے یہ بات بھی پروفیسر نے ہی سمجھائی تھی۔ مجھے اُس سے سو فیصد اتفاق تھا۔

میں نے پروفیسر کی تنقید کو سعادت مند طالب علم کی طرح سنا، خود کو بجا قرار دینے کے لیے کوئی دلیل نہیں دی تاہم دل میں طے کر چکا تھا آئندہ پروفیسر یا اس جیسے کسی لسانی ماہر یا ادبی نقاد کے سامنے اپنی کہانی دکھانے کے لیے نہیں لے جاؤں گا۔

اگرچہ پروفیسر کی عالمانہ حیثیت کو ماننے والوں کی کمی نہ تھی لیکن وہ کمال انکساری سے خود کو ایک عام آدمی قرار دیتا تھا لیکن اس کے برعکس وہ ایک عام آدمی کی طرح روزمرہ کی زندگی کے معاملات پر بات کرنے سے گریز کرتا تھا۔ مجھے پہلے دن سے ہی یہ لگا تھا کہ وہ خود کو گھونگے کی طرح سخت خول کے اندر بند کرنے کا حامی ہے۔ مثال کے طور پر وہ ارجنٹائن کی فٹ بال کو بے حد پسند کرتا تھا لیکن یہ بتانے سے

گریزاں تھا کہ وہ کس ٹیم کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ درست نہ ہو، بہرحال اس کی ذات سے متعلق یہ میرا خیال ہے۔

پروفیسر کی آمدنی اپنے تمام ساتھیوں کی نسبت کہیں زیادہ تھی، اتنی زیادہ کہ دوسرے تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مجھے ایک دو بار پروفیسر کے ایک کمرے پر مشتمل اپارٹمنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا اور نہایت سادہ زندگی بسر کررہا تھا۔ چاہتا تو بی ایم ڈبلیو خرید سکتا تھا لیکن وہ بس، ٹرام اور میٹرو ٹرین سے سفر کیا کرتا تھا۔

اگرچہ دراز قد پروفیسر کی عمر ساٹھ سال کے قریب ضرور ہوگی لیکن اس کے باوجود وہ نوجوانوں کی طرح بالکل سیدھی کمر کے ساتھ تیز تیز چلتا تھا۔ عمر بڑھنے کے باوجود اس کے بالوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا تھا۔ بھورے مائل بال نوجوانوں کی طرح تھے البتہ کنپٹی پر کہیں کہیں سے سفیدی ضرور جھانکنے لگی تھی۔ اس کا نرم خو بیضوی چہرہ جھریوں سے پاک تھا، کھلتی رنگت، نیلی آنکھیں اور ہمیشہ دلکش مسکراہٹ کے پیچھے سے جھانکتے سفید دانت......

یونیورسٹی میں پروفیسر کے حوالے سے کئی رومانوی قصے عام تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کی فیکلٹی کی کئی خواتین ارکان ہی نہیں، کئی ایسی اسٹوڈنٹس لڑکیاں بھی تھیں جو پروفیسر پر بری طرح مرمٹی تھیں لیکن اس نے بھی کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ میری نظر میں اس کی شخصیت ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ کئی دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی پروفیسر کو پسند کرتا تھا۔

یہ دسمبر کی ایک سرد دوپہر کا ذکر ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں اُسی یونیورسٹی میں بطور جونیئر لیکچرار پڑھانے لگا تھا۔ اب میرا شعبہ تھا۔ اُس دن میری کلاسز کب کی ختم ہو چکی تھیں۔ کیمپس بھی لگ بھگ خالی پڑا تھا۔ میں گھر جانے کے لیے نکلا تو کوریڈور میں سامنے سے آتا ہوا پروفیسر مل گیا۔ وہ نک سک سے سنورا، سیاہ چرمی بریف کیس لیے میری سمت ہی آرہا تھا۔ ''ہیلو مسٹر لوئے......'' وہ رک کر مسکرایا۔

میں بھی مسکرایا۔ پہلے وہ مجھے نام لے کر پکارتا تھا۔ جب سے میں نے ملازمت شروع کی، تب سے یہ ہماری پہلی ملاقات ہورہی تھی۔ مجھے اس کا 'مسٹر' کہنا ناگوار گزرا۔ سمجھ گیا کہ وہ اب پرانے تعلقات میں ایک حدِ فاصل رکھنا چاہتا ہے۔

''اب تو ہم دونوں پڑھانے والے بن چکے ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

مجھے یہ مسکراہٹ اپنی ذات پر چھوٹا سا طنز محسوس ہوا لیکن کچھ کہنے سے گریز کیا اور مسکرانے پر ہی اکتفا کرلیا۔

''اگر آپ کے پاس وقت ہو تو......'' یہ کہہ کر پروفیسر نے کچھ توقف کیا۔ ''کیا خیال ہے، اب جبکہ ہم فیکلٹی کے ساتھی بن چکے ہیں تو اس خوبصورت دوپہر میں کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں، دلچسپی کے موضوعات پر کچھ باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خوش دلی سے پیشکش کی۔

''چلیے، چلتے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ میری خوش قسمتی ہے۔''

''کہیں تمہارے کام کا حرج تو نہیں ہوگا نا۔'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''بالکل بھی نہیں، میں تو خود گھر جارہا تھا۔ سوچا تھا جانے سے پہلے کہیں رک کر کافی پیوں گا۔ نصیب دیکھیے کہ......'' مسکرا کر بات ادھوری رہنے دی۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں کیمپس سے باہر نکل رہے تھے۔ قریب میں دو کیفے تھے لیکن وہاں رش بہت تھا۔ ہم دو بلاک آگے کیفے گرانڈ البرٹو کی طرف بڑھنے لگے۔ اتفاق سے وہاں اِکّا دُکّا ہی لوگ بیٹھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہم دونوں سکون سے بیٹھ کر گفتگو کرسکیں گے۔ ویسے مجھے پروفیسر کی پیشکش پر بہت حیرت تھی۔ یہ بالکل اُلٹ ہورہا تھا۔ کہاں وہ مانا ہوا عالم فاضل اور کہاں میں جونیئر لیکچرار۔ میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات تھی۔

پروفیسر نے اپنے لیے چائے اور میں نے کافی منگوائی۔

''عمدہ ہے ہمیشہ کی طرح۔'' پروفیسر نے ایک گھونٹ بھر کر کہا۔ ''یہاں کی چائے عمدہ ہوتی ہے لیکن ذرا دور ہے اس لیے کبھی کبھار ہی آنا ہوتا ہے۔''

''جی ہاں......'' میں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''مجھے یہاں کی ایکسپریسو کافی بہت پسند ہے۔''

''اچھا...... خیر چھوڑو یہ فضول باتیں۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روکا۔ ''یہ بتاؤ گفتگو کے لیے تمہارے ذہن میں کوئی موضوع ہے۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ''جانتے ہو......'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

میں خالی آنکھوں سے اسے دیکھے جارہا تھا۔

''اچھے نقاد کے لیے سب سے پہلا قدم موضوع کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔'' پروفیسر نے کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''آج کل میں ماریو اسپنلے کا گہرائی سے تجزیاتی

مطالعہ کررہا ہوں، جسے نام نہاد اکیڈمی نے ادب کے زمرے میں شامل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔"

"ماریو......" پروفیسر نے بھویں چڑھاتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

مجھے اس کا لہجہ بہت برا لگا لیکن احترام کے سبب خاموش رہا۔ پروفیسر کا ردِعمل دیکھ کر ماریو کے حوالے سے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا تو ماریو میری نظر میں ہسپانوی زبان میں سراغرسانی پر مبنی ادب کا سب سے بڑا فکشن رائٹر تھا۔ اس کے پندرہ ناول اور مختصر کہانیوں کے چار مجموعے میری پسندیدہ کتابوں میں سے تھے۔ میں ہائی اسکول کے زمانے سے ہی اسے پڑھ رہا تھا۔ مجھے وہ لڑکپن سے ہی پسند تھا لیکن یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہی میرے مستقبل کی راہ بھی متعین کرنے والا ہے۔

"میری نظر میں ماریو خالص ادیب نہیں بلکہ تکنیک باز ہے۔ اس کا پلاٹ عمدہ ہوتا ہے، کہانی کی بُنت دلچسپ ہوتی ہے لیکن......" مجھے خاموش دیکھ کر پروفیسر نے بات شروع کی لیکن فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو.... چند لمحوں کے بعد اس نے مجھ پر نظر ڈالی۔ "وہ ادیب کے بجائے صرف کمرشل فکشن رائٹر ہے۔ اس کی کتابیں 'بیسٹ سیلر' ضرور ہوتی ہیں لیکن ان کا وہ معیار نہیں جو خالص ادب کا ہوتا ہے۔ اس کے قارئین کا حلقہ بہت بڑا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ مکمل اور بڑا مصنف بھی ہے۔ اس کے قارئین بھی نچلی سطح کی ذہنیت رکھنے والے ہیں اور اس کے ناولوں کی زبان بھی کچھ کچھ عامیانہ نہیں ہوتی۔" یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

اپنے پسندیدہ مصنف کے بارے میں پروفیسر کا تحقیر آمیز رویہ فطری طور پر مجھے سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ "معاف کیجیے گا۔" میں نے پروفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ادب کو درجات میں بانٹ سکتے ہیں: بڑا، چھوٹا درمیانہ لیکن کسی تحریر کو ادب کے زمرے سے خارج کرنا نقاد کا کام نہیں۔ ادب، ادب ہے، چاہے اچھا ہو یا بُرا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

پروفیسر مسکرایا۔ "بالکل درست کہا تم نے۔ مجھے اسی جواب کی توقع تھی۔"

"لیکن ابھی آپ تو......" اسے پلٹا کھاتے دیکھ کر میں حیران تھا۔

"میں تمہیں اُکسانا چاہتا تھا تاکہ تم خاموش رہنے کے بجائے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ "تمہاری رائے بالکل درست ہے اور میں اس سے پورا اتفاق کرتا ہوں۔"

میں یہ سن کر مسکرا دیا۔ "شکریہ پروفیسر۔"

"مجھے لگتا ہے کہ ماریو تمہارا پسندیدہ مصنف ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "لڑکپن سے اسے پڑھ رہا ہوں۔ اس کی ہر کتاب میرے پاس موجود ہے۔"

"بہت خوب......" اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔ "تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ...."

"کیا......" میں نے تیزی سے بات کاٹی۔

"ماریو کے کام پر تحقیق کا پروپوزل کمیٹی کو دو۔ فیصلہ تو بہرحال کمیٹی کرے گی لیکن میرا ووٹ تمہارے حق میں ہوگا۔" پروفیسر نے پیشکش کی۔ "تم میں جوش اور جنون دونوں ہے اور تحقیق میں یہ دونوں چیزیں بہت معاون ہوتی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے میرے تاثرات بھانپنے کی کوشش کی۔ "ویسے بھی تمہیں ماریو پسند ہے اور اس پر تحقیقی کتاب سے تمہارا ادبی قد بھی بڑھے گا۔"

یہ میرے لیے بہت بڑی بات تھی۔ "میرے بارے میں اتنی عمدہ رائے رکھنے کا شکریہ۔" اپنے پسندیدہ ادیب پر تحقیقی کتاب لکھنا واقعی میرے لیے قابلِ فخر بات ہوتی۔

اس کے بعد ہم تقریباً گھنٹا بھر تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ پروفیسر تحقیق کی باریکیوں، جزئیات اور اسے تحریر کرنے سے متعلق مجھے بہت کچھ سمجھاتا رہا۔ اس کی باتیں میرے لیے نہایت حوصلہ افزا تھیں۔

کیفے سے نکلے تو میں بہت خوش تھا۔ پروفیسر نے ٹرام پکڑی اور میں پیڈرو گوینا ایوینیو پر پیدل چلتا ہوا گھر کی طرف چل پڑا۔ یہ سڑک میری پسندیدہ تھی لیکن دسمبر کی اُس سرد دوپہر کی ہلکی دھوپ میں فٹ پاتھ پر چلتے رہنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

کچھ ہی عرصے میں پروپوزل تیار کر کے تحقیقی کمیٹی کے حوالے کر دیا اور صرف دو ہفتوں میں ہی اسے منظور کر لیا گیا تھا۔ منظوری کے پیچھے پروفیسر کا بڑا ہاتھ تھا۔ موضوع کی منظوری کا ایک سبب ماریو کی شخصیت بھی تھی۔ وہ انسانی حقوق یا سیاسی تنظیموں سے وابستہ نہ تھا۔ اس نے صرف فکشن لکھا اور کتابوں کی فروخت سے ڈھیروں روپیہ کمایا۔ ادبی حلقے چاہے اس کے کام کو کسی بھی زمرے میں رکھیں لیکن ایک عام قاری اسے پسند کرتا تھا جن کی تعداد لاکھوں میں

تھی۔

میری تحقیق بھرپور توجہ کا تقاضا نہیں کرتی تھی۔ اس کے باوجود یونیورسٹی نے اس کام کے لیے مجھے چار ماہ کی چھٹی مع تنخواہ اور اخراجات کے لیے اتنی رقم دی تھی کہ کام کی تکمیل پر بہت کچھ بچ بھی جاتا۔

میں تحقیق کے لیے ملی ان چھٹیوں کے دوران کچھ اضافی پیسہ کمانے کے لیے کوئی دوسرا کام کرنے کا بھی سوچ رہا تھا۔ میں نے غربت میں آنکھیں کھولی تھیں اور پیسہ کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے دینا میرے لیے کفرانِ نعمت کے مترادف تھا۔

اسی دوران پروفیسر نے ایک بار پھر مجھے یہ کہہ کر اعزاز بخشا کہ ''میرا ایک کام تم کرادو۔''

ہوا یہ کہ یونیورسٹی میں ایک سیمینار تھا۔ میں بھی شریک تھا۔ تقریب شروع ہونے سے قبل پروفیسر میرے پاس آیا۔ ''تم تو جانتے ہی ہو کہ ہمارا نظام کچھ ایسا ہے کہ آپ جسمانی لحاظ سے خواہ کتنے ہی اہل کیوں نہ ہوں مگر عمر کی ایک حد پر ریٹائر ہونا ہی پڑتا ہے......'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ ''میں بھی ریٹائرمنٹ کی تیاریاں کررہا ہوں۔ مجھے ملازمت سے فراغت کے بعد ایک کالج سے پیشکش ہوئی ہے۔ عصری اور کلاسیکی ادب پر مشتمل ایک کورس مرتب کرنا ہے۔''

''اچھا......'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''اس کے ابتدائیہ کے طور پر ناول نگار کارونیٹ پر ایک سیمینار کے لیے مقالہ لکھنا ہے۔ سیمینار دراصل کورس کے آغاز کی ہی ایک کڑی ہے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میں نے لقمہ دیا۔

''وقت تھوڑا ہے، تم کارونیٹ پر مقالہ مرتب کرنے میں کچھ مدد کردو گے۔'' اس کے لہجے سے انکساری جھلک رہی تھی۔

''یہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔''

پروفیسر مسکرایا۔ ''ایک ماہ بعد سیمینار ہوگا۔ میں تمہارا نام بھی دے رہا ہوں۔ مقالہ لکھنا، وہ پڑھا جائے گا اور شائع بھی ہوگا۔'' اس نے احسان کی قیمت بھی فوراً چکائی۔ ''وہ بھی تمہارے نام سے۔''

میں نے خوشی خوشی اقرار کرلیا۔ ہر پڑھانے والا جانتا ہے کہ لیکچرار سے آگے بڑھنے کے لیے مقالات کی اشاعت کتنی ضروری ہے۔ یونیورسٹی میں ترقی کا دارومدار اسی پر ہوتا ہے۔

''کچھ سوچ رہے ہو؟'' مجھے خاموش دیکھ کر پروفیسر نے پوچھا۔

میں اپنے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماریو پر تحقیق کے لیے چھٹیاں ملی تھیں۔ اس دوران میں نے ایک کتاب کا ترجمہ اور ایڈیٹنگ کا کام لے لیا تھا۔ جسے جلد از جلد مکمل کرکے پبلشر کو دینا تھا۔ اگرچہ یہ کام مجھے نہ تو ڈاکٹریٹ میں مدد دینے والا تھا اور نہ ہی اس سے ترقی کی کچھ امید تھی، البتہ پیسہ فوراً مل جاتا لیکن مقالہ لکھنے بیٹھتا تو یہ کام ہاتھ سے نکل جاتا۔ یہی سوچ کر میں نے کہنا شروع کیا۔ ''لیکن ایک بات ہے۔''

''وہ کیا......'' پروفیسر چونکا۔

''کارونیٹ کے بارے میں فی الحال میری نظر سے ایسا کچھ نہیں گزرا جو نیا ہو۔'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا۔ ''سمجھ نہیں آتا کہ اس پر مقالے میں کیا نئی بات پیش کروں گا۔'' سچ تو یہ ہے کہ میں فی الحال اس ذمے داری سے اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔ ''اسی لیے یہ کام مجھے کچھ مشکل لگ رہا ہے۔'' میں نے نہ لکھنے کا جواز بیان کیا۔

''تو کس نے کہا ہے کہ کچھ نیا ڈھونڈو۔'' پروفیسر نے کہنا شروع کیا۔ ''جو کچھ پہلے کہا جاچکا ہے، اسے جمع کرکے ایک نئی شکل دے دو۔ حوالہ جات بہت سارے لکھو...... مقالہ تیار۔''

''لیکن......'' میں نے عذر تراشی کی ایک اور کوشش کی۔

''یہ نوجوان طالب علموں کا سیمینار رہے۔ سارے ینگ گریجویٹس ہوں گے۔ اُن کے لیے تو نقادوں کا پرانا کہا ہوا بھی نیا ہوگا۔''

پروفیسر کا استدلال سن کر میں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ مجھے یقین تھا جان چھوٹنے والی نہیں۔

اگرچہ ایک طرف ماریو پر تحقیق کی تیاریاں جاری تھیں تو دوسری طرف مقالہ بھی لکھنا تھا۔ مجھے دونوں ہی کام نمٹانے تھے۔

سیمینار میں میرا مقالہ بہت پسند کیا گیا۔ کچھ دنوں بعد مجھے پروفیسر سے ہی یہ خوش خبری ملی کہ کمیٹی نے مقالے کو پروپوزل اور ایم فل مقالے کا ابتدائیہ گردانتے ہوئے، اس پر ایم فل مقالے کے لیے مجھے منتخب کرلیا ہے۔ میری ذات پر یہ اُس کا بہت بڑا احسان تھا۔

تمام کاموں سے فراغت حاصل کرکے میں نے پوری توجہ ماریو پر مرکوز کردی تھی۔ میں ایم فل سے پہلے ماریو پر

اپنا تحقیقی کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔ ماریو کی کتابوں کے پسِ ورق پر شائع شدہ تعارف کے مطابق وہ نیپلز کے نواح میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ بیس سال کی عمر میں وہ ارجنٹائن آ گیا اور دور دراز واقع ایک چھوٹے سے ساحلی قصبے میں رہائش اختیار کرلی۔ تب سے اب تک وہ وہیں مقیم تھا۔

ماریو سے ملنا بہت ضروری تھا۔ اس کے بغیر تحقیق مکمل نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے انٹرنیٹ سے اس کا فون نمبر حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہ بن سکی۔ اس کا قصبہ اتنا چھوٹا تھا کہ گوگل پر اس کا کوئی نام ونشان ہی نہ تھا۔ انٹرنیٹ پر ماریو سے متعلق دستیاب معلومات سے مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ وہ بھیڑ بھاڑ سے دور رہنے اور سماجی میل ملاپ سے کترانے والی شخصیت تھی۔ ایسے لوگوں تک پہنچنا آسان کام نہ تھا۔

میں نے بڑی کوششوں کے بعد اس کے پبلشر سے فون نمبر تو لے لیا تھا مگر یہ کام نہ آسکا۔ جب فون کرتا، نسوانی آواز میں ایک ہی جواب سننے کو ملتا ''فی الحال وہ گھر پر نہیں ہیں، کب تک آئیں گے، اس بارے میں بھی کچھ کہنا مشکل ہے۔'' ٹیلی فون ڈائریکٹری کے مطابق یہ نمبر کسی کیرولینا فیری کے نام پر رجسٹرڈ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فون پر سنائی دینے والی آواز یقیناً اسی عورت کی ہوگی۔

کئی ماہ کی کوششوں کے بعد آخر میرا اس سے رابطہ ہو ہی گیا۔ سچ کہوں تو اس سے بات کرتے وقت میں خاصا گڑبڑا گیا تھا۔ یقیناً کئی احمقانہ باتیں بھی کردی تھیں لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ اس نے خوشی خوشی مجھے اپنے قصبے میں آنے کی دعوت دے دی۔ وہ تحقیق میں میری ہر ممکن مدد پر بھی تیار ہوگیا تھا۔ وہ لڑکپن سے اب تک میرا پسندیدہ مصنف تھا۔ اس سے زندگی میں پہلی بار بات کرنا بھی میری زندگی کے ناقابلِ فراموش لمحات میں سے تھا۔

ماریو سے رابطہ بہت تھکا دینے والی صبر آزما جدوجہد تھی لیکن اس کے قصبے تک پہنچنے کا راستہ بھی کم تھکا دینے والا نہ تھا۔ اس کا گھر سینٹا اسٹیلو ماریس نامی اتنے چھوٹے سے قصبے میں تھا کہ گوگل نے بھی اسے اپنے سیٹلائٹ نقشے پر جگہ دینا ضروری خیال نہ کیا۔ یہ قصبہ بیونس آئرس سے دو سو کلومیٹر دور، ساحلِ سمندر کے کنارے واقع چھوٹی پہاڑیوں کے دامن میں واقع تھا۔

وہ مارچ کی خوش گوار صبح اور سنیچر کا دن تھا۔ صبح کے چھ بجے ریٹائرو ٹرمینل سے بس میں سوار ہوا اور ڈھلتی سہ پہر میں ماریو کے قصبے میں پہنچ گیا۔ قصبے کا واحد یوکلپٹس ہوٹل میرا پہلا ٹھکانا تھا۔

سامان کمرے میں رکھ کر منہ ہاتھ دھویا اور ڈائننگ ہال میں آکر کافی پی تو کچھ تھکن دور ہوئی۔ ماریو کا پتا تو میرے پاس تھا لیکن یہ علم نہ تھا کہ گھر کہاں ہے۔ استقبالیے پر سولہ سترہ سال کا لڑکا بیٹھا تھا۔ وہ اس ہوٹل کے مالک کا بیٹا تھا۔ جب کیون کو پتا چلا کہ میں ماریو کے گھر کا پوچھ رہا ہوں تو وہ فوراً ضرورت سے زیادہ مہذب ہوگیا۔

''پروفیسر......'' مجھے احترام سے مخاطب کرتے کیون نے اس کے گھر تک پہنچنے کا راستہ سمجھا دیا۔

ماریو کا گھر ہوٹل سے دو بلاک کی دوری پر ساحل کنارے واقع تھا۔ چاہتا تو فون کرکے آنے کی اطلاع کردیتا لیکن انجانے خوف سے ایسا نہ کیا۔ اگر وہ گھر پر نہ ملتا اور نسوانی آواز بھی رٹا رٹایا جواب دیتی تو...... اب مزید وقت ضائع کرنے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ اس لیے براہِ راست دستک دینے کا سوچا۔

ساحل کنارے ڈھلتی سہ پہر میں موسم بہت خوشگوار تھا۔ میں موسم کا لطف لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نظارہ دلکش تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ سانٹا اسٹیلا مارس کا نقشہ کچھ غیر معمولی تھا۔ وہاں سنہری ریت والی دو تنگ سی ساحلی پٹیاں تھیں۔ قصبے کا نصف حصہ سطحِ سمندر سے پچاس میٹر اوپر پہاڑی کی ہموار سطح پر واقع تھا۔ سمندر کی اونچی لہروں کی پھوار کنارے کے ساتھ ساتھ گزرنے والے ہائی وے پر بھی پڑ رہی تھیں۔

کچھ ہی دیر میں ماریو کا گھر میرے سامنے تھا۔ یہ نوآبادیاتی دور کے طرزِ تعمیر کا سا انداز لیے ہوئے تھا۔ گھر کا داخلی دروازہ لوہے کے ایک بڑے بھاری سے گیٹ پر مشتمل تھا۔ چار دیواری سے اوپر نظر آنے والی گھر کی دوسری منزل کی کھڑکیوں میں بھی لوہے کا استعمال واضح تھا۔ میں نے اطراف پر نظر ڈالی۔ ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ دور دور تک کوئی آدم نہ آدم زاد والا معاملہ نظر آرہا تھا۔

بڑے سے گیٹ کے ایک کنارے پر چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں نے ڈوربیل کی تلاش میں نظر دوڑائی مگر وہاں اس کا کوئی تکلف نہ تھا۔ آگے بڑھ کر دروازے کو آہستہ سے دھکیلا تو وہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ اندر داخل ہوکر چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ دائیں ہاتھ پر لان تھا لیکن اس کی حالت بتا رہی تھی کہ مکینوں کو اس کی دیکھ بھال سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

پورچ میں نئے ماڈل کی مرسڈیز اور سن ساٹھ کے عشرے کی امپالا کھڑی تھی۔ اسی دوران پورچ کی طرف کا دروازہ کھلا۔ سامنے تیس برس کے لگ بھگ عمر کی سیاہ بالوں والی لمبی اور خوبصورت خاتون کھڑی تھی۔ اس کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔ ''میں لوئے ہوں اور......''

''اوہ......'' نام سنتے ہی اس نے بات کاٹ دی۔ ''آپ کے آنے کی امید تھی لیکن بنا اطلاع۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ''مسٹر ماریو نے آپ کا غائبانہ تعارف کرادیا تھا۔'' وہ آگے بڑھی۔ ''بہرحال...... اچانک ہی ملاقات سہی مگر آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کا لہجہ بہت دوستانہ تھا۔ ''میں کیرولینا ہوں، مسٹر ماریو کی سیکریٹری۔''

میں فوراً پہچان گیا۔ یہ آواز درجنوں بار فون پر سن چکا تھا۔ ''آپ سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی طرف قدم بڑھایا۔ ''تو کیا میں مسٹر ماریو سے ملنے جارہا ہوں۔'' لہجہ سوالیہ تھا۔

''بالکل...... خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہیں۔'' کیرولینا میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

چند لمحوں کے بعد میں اپنے پسندیدہ مصنف کے سامنے تھا۔

اگرچہ اس کی کتابوں پر شائع شدہ تعارف کے مطابق ماریو کی عمر ساٹھ سال سے کچھ کم ہی تھی لیکن اسے دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا۔ جسمانی طور پر ماریو مجھے کم از کم ستر اسی برس کی عمر کا بوڑھا نظر آرہا تھا۔ وہ کافی نحیف ونزار تھا۔ سہارے کے لیے اس نے چھڑی تھام رکھی تھی۔ اس کی ٹانگیں آہستہ آہستہ لرز رہی تھیں۔ محسوس ہورہا تھا کہ وہ ضرور لڑکھڑاتا ہوا چلتا ہوگا۔ مارچ کا خوشگوار موسم تھا لیکن اس نے فر سے بنا گاؤن پہن رکھا تھا۔ لگ رہا تھا کہ جیسے شدید بیمار ہو۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کسی تھکن زدہ شخص کی سی تھی۔

یہ تو کہنا شاید غلط ہوگا کہ اس سے مل کر مجھے مایوسی ہوئی، اس سے ملنے کا خواب لڑکپن سے دیکھتا تھا لیکن سراغ رساں کہانیوں میں کرداروں کو نہایت جان دار انداز سے پیش کرنے والے کی اپنی حالت ایسی ہوگی، اس سے مجھے صدمہ پہنچا تھا۔

ماریو کی آواز نہایت باریک اور کمزور تھی۔ وہ کسی بھی بات کا مختصر سا جواب دیتا، وہ بھی ہچکچاتے ہوئے۔ اسی دوران مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ اسے گفتگو کرنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہر بات کا مختصر جواب۔ اس بات نے کئی بار مجھے زچ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ گھر میں بنا ضرورت تمام لائٹیں بند رکھتا تھا۔ جب وہ کچھ پڑھتا تو کاغذ کو تقریباً اپنے چہرے سے چپکا لیا کرتا تھا۔ دبیز فوٹو گلاسز والی نظر کی عینک سے مجھے شک ہوا کہ اس کی صرف نظر کمزور نہیں، شاید اسے سورج کی روشنی سے بھی الرجی کی شکایت لاحق ہے ورنہ عام طور پر نظر کا چشمہ لگانے والے فوٹو گلاسز استعمال نہیں کرتے ہیں، خاص کر جب وہ گھر کے اندر رہتے ہوئے زیادہ وقت گزارتے ہوں۔

میں نے اس کی رائٹنگ ٹیبل دیکھی۔ وہاں ایک کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ ٹائپ رائٹر بھی رکھا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ماریو جدت قبول تو کرتا ہے لیکن ماضی کو نظرانداز یا پیچھے چھوڑے بغیر۔ وہ مجھے دونوں انتہاؤں سے جڑا رہنے والا شخص لگا تھا۔

رہی گفتگو کے دوران میں ہی ایک بار پھر یہاں آنے کا مقصد بیان کرچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے کام پر تفصیلی تحقیق کا سن کر اسے کچھ خاص دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ تم جو کرنا چاہتے ہو، وہ کھل کر بیان کرو۔'' اس نے بلاتکلف کہا۔ انداز دوستانہ تھا۔ ''تاکہ میں کچھ سمجھ سکوں۔''

''گزشتہ چھ ماہ کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب میں نے تمہیں تلاش نہ کیا ہو یا تمہارے بارے میں سوچا نہ ہو۔'' میں نے جواب میں کہنا شروع کیا۔ ''ایک مصنف سے سوال کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن پھر بھی......'' یہ کہہ کر مسکرایا اور اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری بات پورے دھیان سے سن رہا تھا۔

''کچھ سوالات مرتب کیے ہیں، ان کے جوابات چاہئیں، آپ کے غیر مطبوعہ کاموں کے بارے میں جاننا ہے، مختلف حوالوں سے آپ کی رائے جاننی ہے۔'' یہ کہہ کر کچھ توقف کیا۔ ''اب آپ سے زیادہ کیا کہوں، میں تو خود آپ کا لڑکپن سے پرستار ہوں اور رہی تحقیق تو اس بارے میں آپ مجھ سے کہیں بہتر ہی جانتے ہیں۔ میں تو ابھی طفل مکتب ہوں۔'' میرے لہجے میں جہاں بھر کی عاجزی اُمڈ آئی تھی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ اس کے سامنے میری ہمت نہیں ہورہی تھی کہ کچھ اور بھی کہہ سکوں۔

میری طویل وضاحت ختم ہونے کے بعد وہ کچھ دیر

بے دھیانی سے پائپ کے کش لے کر دھوئیں کے مرغولے اُڑاتا رہا اور پھر پہلو بدل کر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''میری کتابوں کے بارے میں تو تم بہت اچھی طرح جانتے ہو۔'' اس نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ ''یہ میرا لکھنے پڑھنے کا کمرا ہے۔'' اس نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے ادبی کام میں مدد کے لیے دلچسپ پیشکش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بجھا پائپ دوبارہ سلگانے کی کوشش کی۔

میں پوری توجہ سے اس کی باتوں پر دھیان دیے ہوئے تھے۔ ماریو کی باتوں سے مجھے کافی حوصلہ ملا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کیا پیشکش کرنے جا رہا ہے۔

''تو بات یہ ہے......'' ماریو نے کش لے کر دھوئیں کے مرغولے اُڑائے۔ ''یہاں میری تمام چیزیں موجود ہیں۔ مسودات، ادھوری کہانیاں، ناولوں کا پہلا ڈرافٹ، نئی کہانیوں کے مرکزی خیالات لکھنے والی نوٹ بک، بک شیلف، میری کتابوں کے شائع شدہ ایڈیشن اور وہ سب کچھ جو شائع ہو چکا، ہونے والا ہے، لکھا جا چکا یا لکھا جانے والا ہے۔''

میں خاموشی سے بیٹھا اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

کچھ دیر ٹھہر کر اس نے پھر کش لیا اور بولا۔ ''میں دوسرے مصنفین کی طرح اپنا لکھا ہوا کوئی کاغذ ضائع نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر میری طرف جھکا۔ ''حیرت انگیز طور پر کئی مرتبہ مجھے نئی کہانیوں اور ناولوں کا مرکزی خیال انہی پرانے مسودات سے ملا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے انگلی سے بک شیلف کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اُس طرف دیکھا۔ ہر شے قرینے سے رکھی تھی۔

''میں تمہیں پیشکش کرتا ہوں کہ اپنا جو کام کرنا ہے وہ یہیں بیٹھ کر کرو۔ جس شے کی ضرورت ہو، اسے استعمال کر سکتے ہو، تمام کاغذات دیکھ سکتے ہو......بس ایک بات کا دھیان رہے۔''

میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''جو چیز جس جگہ سے اٹھاؤ، واپس وہیں رکھ دینا۔ مجھے پتا ہے کون سی چیز کہاں پر رکھی ہے۔ اگر چیزوں کو اِدھر اُدھر رکھ دو گے تو مجھے بعد میں بہت پریشانی ہو سکتی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے میری طرف بغور دیکھا۔

''بالکل...... جیسا آپ نے کہا، ویسا ہی ہوگا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

ماریو کی پیشکش نے تو میری مشکل ہی آسان کر دی تھی۔ اندھا کیا چاہے ایک آنکھ، یہاں تو مجھے دونوں آنکھیں مل رہی تھیں۔ میں نے تہ دل سے اُس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تمام تر شرائط سمیت یہ پیشکش قبول کر لی۔

میرا قیام ہوٹل میں ہی تھا۔ میں پیر سے جمعے تک روزانہ صبح نو بجے ماریو کے گھر پہنچ جاتا۔ میری موجودگی میں وہ اپنا کام کرتا رہتا اور میں اپنا۔ بیچ میں جب مجھے اس سے کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش آتی، وہ اپنا کام چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوتا۔

جب ماریو لکھتا پڑھتا نہیں تھا تو پائپ سے دھوئیں کے مرغولے اُڑاتا ایک سے دوسرے کمرے میں پھرتا رہتا تھا۔ وہ دھاتی چھڑی کے سہارے چلتا پھرتا تھا۔ یہ کہنا مناسب تو نہیں لیکن پھر بھی فرش پر اس کی چھڑی کی ٹھک ٹھک مجھے کافی پریشان کر دیتی تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے یہ آواز میرے کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہی ہو۔

اسی دوران میں یہ بات بھی علم میں آئی کہ وہ سنیچر اور اتوار کو لکھتا پڑھتا نہیں تھا۔ یہ بات کیرولینا نے مجھے بتائی تھی۔ مجھے وہاں تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ویک اینڈ پر اس کے گھر جانے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس لیے مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ جب ویک اینڈ پر لکھتا پڑھتا نہیں تو یہ دن کیسے گزارتا تھا۔

دو ہفتوں تک تو یہی رہا لیکن اس دوران میں ہماری بے تکلفی کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ گھر اور اس کے مکین، ماریو اور کیرولینا بھی مجھ سے خاصے مانوس ہو چکے تھے۔ قصبے میں ویک اینڈ گزارنے کے لیے کچھ خاص نہ تھا۔ اس لیے تیسرے ہفتے، سنیچر کی صبح میں خلافِ معمول اس کے گھر چلا گیا۔ کیرولینا گھر پر تنہا تھی۔ اس نے مجھے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا۔

کیرولینا سے ہی پتا چلا کہ ماریو ویک اینڈ پر جمعے کی شام سے اتوار کی دوپہر تک گھر پر نہیں ہوتا، وہ کہاں جاتا ہے، یہ پوچھنا چاہتا تھا لیکن کسی کی ذاتی زندگی میں مداخلت کا سوچ کر خاموش رہا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ اس کے بعد سے میں اپنی تحقیق جلد از جلد نمٹانے کے لیے اتوار کو بھی اس کے گھر جانے لگا تھا۔

ماریو کی غیر موجودگی میں کیرولینا میرے آرام کا خاص دھیان رکھتی تھی۔ اس دوران ہمارے درمیان اکثر رسمی اور کسی حد تک بے تکلف انداز میں اِدھر اُدھر کی بے مصرف گفتگو بھی ہونے لگی تھی۔

کیرولینا خوبصورت ہی نہیں، بہت اچھے اخلاق کی عورت تھی۔ میرے پہنچتے ہی وہ کافی اور بسکٹ لے آتی تھی۔ جب بھی مجھے کافی کی طلب محسوس ہوتی، اسے کہہ دیتا۔ تین ہفتوں کے بعد مجھے ماریو کا گھر کچھ کچھ اپنا سا لگنے لگا تھا۔ کیرولینا سے کافی بے تکلفی ہو چکی تھی البتہ ماریو سے تعلقات کے درمیان ایک حدِ فاصل برقرار تھی۔ ایک بات میں نے محسوس کی تھی کہ ماریو کی غیر موجودگی میں مجھے کافی آزادی محسوس ہوتی تھی اور کیرولینا بھی زیادہ بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ تک اس کے گھر روز آنے جانے سے یہ بات اچھی طرح جان چکا تھا کہ کیرولینا اس کی سیکریٹری نہیں، جیسا کہ مجھے پہلے شبہ ہوا تھا۔ وہ اس گھر میں اُس کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ بیک وقت گھر کی نگراں باورچی اور ماریو کی سیکریٹری بھی تھی۔

میرے لیے یہ کچھ عجیب بات تھی کہ تیس سال کی خوبرو عورت جسے کوئی بھی اچھا شوہر مل سکتا ہو، وہ اپنی عمر سے دُگنے اور بیمار شخص کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ یہ بات درست ہے کہ ماریو کی شخصیت کا گلیمر شہرت اور کتابوں سے کمائی گئی دولت تھی، اس کے سوا اس کی ذات میں کم از کم مجھے تو کوئی ایسی کشش نظر نہیں آئی کہ کیرولینا جیسی عورت اُس پر مرمٹے۔

ایک دن شیلف میں کاغذات دیکھتے ہوئے مجھے ایک فائل ملی، جس میں میڈیکل رپورٹس اور ڈاکٹرز کے متعدد نسخے تھے، جن کے مطابق ماریو کو جوڑوں کے درد، گھٹنوں کی سوزش، کمر کے مہروں میں فرق جیسے کئی سنگین طبی مسائل لاحق تھے۔

چند ہفتوں کے دوران میں اُس چھوٹے سے قصبے کی خواتین کا رہن سہن اور روزمرہ کے لباس کا جائزہ لے چکا تھا لیکن کیرولینا اس معاملے میں سب سے مختلف اور منفرد لباس زیب تن کیا کرتی تھی۔ اس کے لباس سے لگتا تھا کہ اسے کسی قسم کی مالی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ وہ ہر روز نہایت عمدہ لباس زیب تن کرتی بالکل کسی ٹیلی وژن میزبان کی طرح۔ اس کے جسم سے اُٹھتی پرفیوم کی مہک مہنگا ہونے کا اعلان کرتی تھی۔ پورچ میں کھڑی نئے ماڈل کی سفید مرسڈیز وہی چلاتی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ ماریو اپنی کثیر آمدنی کو کھلے دل سے اُس پر خرچ کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہوگی کہ وہ بیمار اور نیم معذور ماریو کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہی تھی۔

وہ سنیچر کا دن تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو حسبِ توقع سفید مرسڈیز پورچ میں نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ ماریو ویک اینڈ منانے جا چکا۔ میں اسٹڈی میں کام کر رہا تھا کہ کیرولینا ایک ٹرے میں کافی کے دو مگ اور بسکٹ لے کر چلی آئی۔ اُس دن وہ مجھے پہلے سے زیادہ حسین محسوس ہو رہی تھی۔ سرخ لباس سے اٹھتے پرفیوم کی لپٹیں میرا سر چکرانے لگیں۔

کیرولینا ماریو کی غیر موجودگی میں گھنٹوں میرے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی تھی۔ میں بھی نوجوان تھا، دلکش عورت کی رفاقت میرے جذبات پر بھی خوشگوار اثر ڈال رہی تھی۔ ویسے بھی کیرولینا تنہا ہو تو کام کرنے کے بجائے صرف اس کا ساتھ اچھا لگتا تھا۔

”ویک اینڈ پر ماریو کہاں چلا جاتا ہے۔“ کافی پیتے ہوئے میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں پوچھ لیا۔ ”ویسے اُسے دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ وہ باہر آتا جاتا بھی ہوگا۔“

”ارے ایسی بات نہیں......“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”گھومنے پھرنے کا شوقین ہے لیکن بے مقصد نہیں۔ وہ اپنے کام کا وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہے۔“

”اچھا...... اسے دیکھ کر لگتا تو نہیں۔“

”ایسا نہیں ہے۔“ وہ سال میں دو مرتبہ اٹلی ضرور جاتا ہے۔“ کیرولینا بے تکلفی سے ماریو کی ذاتی زندگی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ”وہاں اس کے بہت سارے رشتے دار رہتے ہیں۔ گرمیوں میں ایک بار وہ یورپ کے دورے پر بھی جاتا ہے۔ اسے فرانس بہت پسند ہے۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے وہ کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے۔“

”لیکن ویک اینڈ پر کہاں غائب ہو جاتا ہے۔“

”ہر جمعرات کی رات وہ شہر جاتا ہے۔ وہاں اس کی ایک بہن رہتی ہے۔“ کیرولینا نے بتانا شروع کیا۔ ”وہ کئی سالوں سے بیمار ہے، زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتی۔ اتوار کی دوپہر تک وہ واپس آتا ہے۔“

”تم بھی کبھی اس کے ساتھ ویک اینڈ پر گئی ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے کوئی شوق نہیں اس کی بیمار بہن کی تیمارداری کا۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔

”تو تم سنیچر کے دن گھر میں تنہا رہتی ہو۔“ میں نے پیار سے اس کی نگاہوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”صرف سنیچر کے دن ہی نہیں۔“ وہ دلربا مسکراہٹ لبوں پہ سجا کر بولی۔ ”جمعے کی رات سے لے کر اتوار کی دوپہر تک۔“ یہ کہہ کر اس نے انگڑائی لی۔ ”بس...... بور ہوتی رہتی ہوں۔“

''یہ بوریت مٹ بھی سکتی ہے۔''

وہ ہنس کر بولی ''مگر اس قصبے میں ایسا کچھ نہیں۔''

''ہوسکتا ہے تم نے اردگرد دیکھنے کی کوشش ہی نہ کی ہو۔'' میں رومینٹک ہورہا تھا۔

''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔''

''تو چلو......'' میں نے اپنا لیپ ٹاپ بند کرکے کاغذات سمیٹنا شروع کیے۔ ''مل کر تلاش کرتے ہیں تمہاری بوریت دور کرنے کا سامان۔ ہوسکتا ہے میری بھی تنہائی دور ہوجائے۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

اس دن میں نہ تو لنچ کے لیے ہوٹل گیا اور نہ ہی شب بسری کے لیے۔ وہ ویک اینڈ ہم نے اکٹھے گزارا۔ اتوار کی صبح ناشتے کے بعد ہوٹل پہنچا تو میری زندگی میں واضح فرق آچکا تھا۔ میرے اور کیرولینا کے بیچ اب کوئی پردہ حائل نہ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے اُس کے حُسن میں گرفتار ہوچکا ہوں۔

میری تحقیق کا وقت بڑھتا چلا جارہا تھا، تقریباً دو ماہ ہونے کو آرہے تھے لیکن نوٹس اب تک مکمل نہیں ہورہے تھے۔ ماریو کا وہی معمول تھا لیکن میرا معمول بدل چکا تھا۔ اب جیسے ہی جمعے کی شام ماریو سفید مرسڈیز لے کر شہر جانے کے لیے نکلتا، کیرولینا مجھے فون کردیتی اور پھر ہم اتوار کی صبح تک اکٹھے رہتے اور موج مستی کرتے تھے۔ کیرولینا بھی بہت خوش تھی اور میری خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس چھوٹے سے قصبے میں میرا بوریت بھرا ویک اینڈ دلچسپ اور رنگین ہوچکا تھا۔

وہ بدھ کا دن تھا۔ صبح کے پانچ بج رہے ہوں گے جب فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ دوسری طرف کیرولینا تھی۔ وہ سخت گھبرائی لگ رہی تھی۔ وہ اس طرح بول رہی تھی جیسے گھگیا رہی ہو۔ ایک تو میں نیند میں تھا، اوپر سے اس کی آواز...... کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ آخر اس نے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''قصبے میں کار ایکسیڈنٹ کے باعث ماریو کی موت ہوگئی ہے۔''

''کیا......'' میں چلّایا۔ ''تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''یہ سچ ہے۔'' اس نے بھرائی آواز میں کہا۔

''اوکے...... میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' لباس تبدیل کرتے ہوئے میں یہ سوچ رہا تھا کہ قصبے میں اِکا دُکا ہی کاریں ہیں اور لوگ بھی نہ ہونے کے برابر تو ایسے میں کار ایکسیڈنٹ کیسے ہوگیا۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیسے ہوگیا۔

چند گھنٹوں بعد میں واپس ہوٹل لوٹا۔ دن چڑھ چکا تھا۔ جیسے ہی اندر داخل ہوا استقبالیے پر بیٹھا کیون اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''پروفیسر......'' اس نے مخاطب کیا۔ ''رائٹر ماریو کی موت ہوگئی ہے۔''

''جانتا ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ اسی لیے واپس آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر کمرے میں گیا اور پندرہ منٹ بعد ہوٹل کے واجبات ادا کرکے باہر نکل رہا تھا۔ میرا رخ ماریو کے گھر کی طرف تھا، جہاں کیرولینا میری منتظر تھی۔

کیرولینا نے مجھے بتایا تھا کہ گزشتہ رات وہ نہایت عجیب طرح کی باتیں کررہا تھا۔ ماریو اسے کئی گھنٹے سامنے بٹھا کر نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ اس کی باتوں سے کبھی غصہ جھلکتا، کبھی افسردگی۔ کیرولینا کا کہنا تھا کہ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہم دونوں کے تعلقات کے بارے میں جان چکا ہے۔ وہ کافی دیر تک پیتا رہا اور آدھی رات کا وقت تھا کہ اپنی پرانی امپالا لے کر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کی باتوں سے سخت دباؤ میں تھی، جاکر سوگئی۔ نیند میں تھی جب پولیس کا فون آیا اور اس حادثے کا پتا چلا۔

صبح کاذب کے وقت اس کی گاڑی ساحل کنارے سے گزرنے والے قصبے کے ایک شخص کو نظر آئی، اس نے پولیس کو اطلاع دی۔ کار کے تین دروازے کھلے ہوئے تھے اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بری طرح پچکا ہوا تھا۔ گاڑی ہائی وے کی چند میٹر اونچائی سے اس طرح نیچے گری تھی کہ بونٹ والا حصہ پانی میں تھا اور پچھلا حصہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔

کیرولینا کے بیان کی روشنی میں پولیس کا خیال تھا کہ نشے کی زیادتی کے سبب وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور یہ حادثہ ہوا۔ پولیس کا یہ بھی خیال تھا کار پرانی تھی اور ہوسکتا ہے کہ دروازے لاک نہ ہوں اس لیے پلٹتے ہوئے دروازے کھل گئے ہوں۔ ویسے بھی وہ سن ساٹھ کی پرانی کار تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ماریو کو اس کی دیکھ بھال میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

سب سے بری خبر یہ تھی کہ کہ کی لاش نہیں ملی۔ جس رات یہ حادثہ ہوا، اس دن سمندر میں طوفانی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ پولیس کا اندازہ تھا کہ دروازہ کھلنے کے باعث وہ پانی میں گرا ہوگا۔ نشے میں ہونے کے باعث وہ اٹھ نہ سکا اور تیز لہریں جسم کو بہا لے گئی ہوں گی۔ سمندر میں طوفانی کیفیت کے باوجود لاش کی تلاش کے لیے کوششیں جاری تھیں تاہم جب میں ماریو کے گھر پہنچا تب تک کوئی پتا نہیں چل سکا تھا۔

کیرولینا شدید صدمے میں تھی۔ ''اندازہ تک نہ تھا کہ وہ اس طرح دنیا چھوڑ جائے گا اچانک......'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ آنکھیں بھی سرخ تھیں۔

میں اس کے قریب بیٹھا دل جوئی کی کوشش کر رہا تھا۔ شام تک اس کی کیفیت تھوڑی سنبھلی۔ میں نے پولیس اسٹیشن فون کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب تک تو لاش ملی نہیں لیکن کوششیں جاری ہیں۔

صورت حال ایسا رخ اختیار کر چکی تھی کہ وہاں مزید ٹھہرنا بے سود تھا۔ میرا خیال تھا کہ کیرولینا جس شدید صدمے سے دوچار ہے، فی الحال اسے تنہا چھوڑ دینا ہی مناسب رہے گا۔ یہی سوچ کر اُسی شام میں بیونس آئرس کے لیے روانہ ہو گیا۔

صرف ایک ہفتے بعد جمعے کی ایک شام میں واپس ماریو کے گھر جا رہا تھا۔ اس دوران میں کیرولینا نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔ وہ صدمے سے نکل آئی تھی۔ اس نے گرمجوشی سے مجھے خوش آمدید کہا اور ایک بار پھر ہم نے ویک اینڈ پورے جوش کے ساتھ منایا۔ البتہ دل میں ایک ڈر ضرور موجود تھا۔ ماریو کی لاش اب تک نہیں ملی تھی۔ اگرچہ سب اسے مردہ قرار دے رہے تھے لیکن پولیس کے مطابق وہ صرف لاپتا تھا۔

ماریو کی موت یا گمشدگی، جو بھی کہہ لیں، اسے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا۔ اس دوران میں میرا معمول تھا کہ ہر ویک اینڈ وہاں جاتا، کیرولینا میری منتظر ہوتی۔ اتوار کی صبح تک ہم ساتھ رہتے، ناشتے کے بعد بیونس آئرس کے لیے واپس نکل جاتا تھا۔

ماریو ملک کا ایک مشہور مصنف تھا۔ وہ جاسوسی ادب تخلیق کرتا تھا لیکن جس انداز میں اس کی پُراسرار موت ہوئی، اُس نے اس کے چاہنے والوں کو چونکا دیا تھا۔ پولیس اب تک اسے لاپتا کہہ رہی تھی۔ ملک کے اخباروں میں روزانہ اس کے حوالے سے کوئی نہ کوئی خبر ضرور شائع ہوتی تھی۔ حکومت نے ماریو کی سمندر میں تلاش کے لیے بحریہ کی بھی مدد فراہم کی مگر نتیجہ بے سود رہا۔

وہ ویک اینڈ تھا۔ میں شام ڈھلے بیونس آئرس سے قصبے میں پہنچا تھا۔ حسب معمول پورا قصبہ سناٹے کی چھتری میں چھپا بیٹھا تھا۔ رات کی تاریکی میں چلتا ہوا گھر پہنچا تو وہ میری ہی منتظر تھی۔ کچھ دیر بعد میں کافی پی رہا تھا۔ بنی ٹھنی کیرولینا صوفے پر مجھ سے لگی بیٹھی تھی۔

''کہیں ایسا نہ ہو کہ......'' باتوں باتوں میں یہ کہتے ہوئے وہ مجھ سے چمٹ گئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ میں نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔

''مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ زندہ ہو۔''

''ممکن نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''ایسا ہوتا تو پولیس کو کوئی نہ کوئی سراغ مل چکا ہوتا۔''

اتفاق دیکھیے کہ اسی رات پولیس چیف نے سرکاری سطح پر ماریو کی موت کا اعلان کر دیا۔

اس وقت ہم ڈنر کر رہے تھے اور سامنے ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔ ماریو کے حوالے سے خبر کا سن کر ہم دونوں چونک گئے۔

''ایک ماہ سے زائد عرصے تک تلاش جاری تھی لیکن کچھ پتا نہ چلا۔'' ٹی وی پر پولیس چیف کا بیان دکھایا جا رہا تھا۔ ''اس لیے قانون کے مطابق اب تلاش کا کام ختم کر کے ماریو کو سرکاری طور پر مردہ قرار دیا جاتا ہے۔''

یہ سن کر ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کیرولینا بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ میرے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ ماریو کے بعد، وہ پہلی رات تھی جو ہم نے کسی خوف یا خدشے کے بغیر ایک دوسرے میں گم ہو کر بسر کی تھی۔

اگلی صبح کئی ہفتوں کے بعد ہم خود کو آزاد فضاؤں میں سانس لیتا محسوس کر رہے تھے۔ کیرولینا کے چہرے سے بھی اندر کی خوشی عیاں تھی۔ اس نے حادثے کے ایک ہفتے بعد مجھ سے خود کہا تھا ''تم سے ملنے کے بعد ماریو کے ساتھ رہنا مشکل لگنے لگا تھا۔''

اس ویک اینڈ پر میں زیادہ دن رہنے کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ کچھ جان پہچان کے اخبار والوں کی مدد سے یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ ماریو کی زندگی پر تجزیاتی مطالعہ جاری ہے۔ اس خبر سے مجھے کافی شہرت ملی۔ تحقیق تقریباً مکمل تھی۔ سوچا تھا کہ ماریو کے گھر پر ہفتہ دس دن رہ کر اسے مکمل کرلوں گا۔ ماریو کی موت اور اس کی کتابوں کے چرچے اخبارات میں جاری تھے۔ ایسے میں اُس کی زندگی اور کام پر شائع ہونے والی کتاب ہاتھوں ہاتھ بکتی۔ مجھے بھی اچھی رقم اور شہرت ملتی۔ میں کیرولینا کی پُررنگ رفاقت میں اپنا کام مکمل جلد از جلد کرنا چاہتا تھا۔

میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ میں تحقیق کو کتابی شکل دینے میں مصروف تھا۔ اب وہاں جانے کا جواز کچھ اور نہیں صرف کیرولینا تھی۔ یونیورسٹی سے ملنے والی چھٹیاں ہفتہ پہلے ختم

ہو چکی تھیں لیکن وہاں جانا ضروری تھا۔

جمعے کی دوپہر یونیورسٹی سے سیدھا بس ٹرمینل پہنچا۔ راستے بھر موسم ابر آلود تھا۔ بارش بھی ہوتی رہی۔ ویسے تو سرِ شام پہنچ جاتا لیکن راستے میں بس خراب ہونے سے دو گھنٹے ضائع ہو گئے۔ جب گھٹا ٹوپ تاریکی اور سناٹے میں کسی بھوت کی طرح چلتا ہوا گھر میں داخل ہوا تو کیرولینا پورچ میں کھڑی میری ہی منتظر تھی۔

وہ اتوار کی رات تھی اور اگلی صبح مجھے واپس روانہ ہونا تھا۔ شاید صبح ہونے والی ہوگی، جب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر تاریکی تھی۔ ماریو کے بیڈ پر میرے برابر کیرولینا گہری نیند سو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔ دماغ نیند میں تھا کہ اچانک مجھے ہلکی سی ٹھک ٹھک محسوس ہوئی۔ آواز مانوس تھی۔ میں نے آنکھیں ملیں اور سننے کی کوشش کی کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔ بنا کوئی آواز کیے بیڈ پر سے اترا اور ننگے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹھک ٹھک کی آواز تھم گئی تھی لیکن مجھے انجانے خوف نے گھیر لیا تھا۔

پہچان گیا، آواز ماریو کی دھاتی چھڑی کی سی تھی۔ مجھے لگا کہ کوئی چھڑی کے سہارے ٹائلز کے فرش پر کھٹ کھٹ کرتا اسٹڈی کی طرف گیا ہے۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ ”کیا وہ ماریو ہے۔“ میرے دماغ میں آیا۔ ”لیکن وہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے اپنے من کا خوف دور کرنے کے لیے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

میں بیڈروم کے بند دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اچانک ایک بار پھر کھٹ کھٹ سنائی دینے لگی۔ اس بار ایسا لگا کہ کوئی بیڈروم کی طرف آرہا ہے۔ ہر لمحہ یہ آواز اور زیادہ قریب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔

اچانک میں مڑا اور تیزی سے بیڈ کی طرف گیا۔ ”اٹھو، اٹھو...... کیرولینا اٹھو۔“ میں اسے ہلا رہا تھا مگر وہ گہری نیند میں تھی۔ ”اٹھو...... ماریو واپس آگیا ہے۔“ میں دبی دبی آواز میں اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن لگتا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔

”کیا ہوا......“ آخر کیرولینا جاگ گئی اور نیند سے بھرائی آواز میں پوچھا۔

اسی دوران بند دروازے کے پیچھے سے اطالوی لب و لہجے میں مانوس آواز سنائی دی۔ ”کیرولینا، لوئے...... کیا تم

دونوں میرے بیڈ پر سو رہے ہو۔"

یہ سنتے ہی کیرولینا چونک گئی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں، چہرہ فق پڑ گیا۔ میرا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم سے خون کی بوند بھی نہ نکلے۔ ہم دونوں کی زبانیں گنگ پڑ گئی تھیں۔

"افسوس کہ میں تمہاری پرسکون نیند میں خلل ڈال رہا ہوں۔" اب کوئی شبہ نہیں کہ دروازے کے پار ماریو ہی کھڑا تھا۔

ایک دو بار پھر وہی ٹھک ٹھک سنائی دی اور دروازہ آہستہ سے کھلنے لگا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آن کر دیا اور گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بیڈ پر ہونقوں کی طرح بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو......

دروازہ کھلا اور جب میری نظر اس پر پڑی تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ یہ کیا...... میرے سامنے پروفیسر مینوئیل ریمزر انالڈ کھڑا تھا۔ وہی سیاہ چرمی ہینڈ بیگ اس کے ایک ہاتھ میں تھا۔ دوسرے میں ماریو کی چھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ پر ربر کے میڈیکل دستانے پہن رکھے تھے۔ "اوہ تم...... خوشی ہوئی اپنے بیڈ روم میں تمہیں دیکھ کر۔"

میں سخت حیران تھا۔ وہ آواز پروفیسر کی نہیں بلکہ ماریو کے اطالوی لب و لہجے والی آواز تھی۔ میرے حواس کام نہیں کر رہے تھے۔ ماریو کی آواز اور پروفیسر کا وجود...... میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔

اس نے چھڑی دیوار کے ساتھ ٹکائی۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا ایک گچھا بھی نظر آ رہا تھا۔

"ڈرومت......" اس نے بریف کیس اپنے قدموں کے ساتھ فرش پر رکھا۔ "میں بھوت نہیں بس ایک خیال ہوں۔" یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں ہنسا۔ "دوہری تخلیق، دوہرا جیون......"

"کیا......" میں نے حیرت سے کہا۔

"وہی جو میں نے ابھی ابھی کہا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ایک وہ جسے دنیا معزز پروفیسر مینوئل کی حیثیت سے جانتی ہے اور ایک ناول نگار ماریو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

میں گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ کیرولینا کو بھی اب ہوش آ گیا تھا۔ وہ چلائی۔ "بھوت، بھوت۔"

"میں بھوت نہیں ہوں میری جان......" اس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "ایک کردار ہوں اور بس......" یہ کہہ کر وہ رکا اور ہم دونوں پر باری باری نظر ڈالی۔ "میں ایک کردار ہوں اور کردار صرف ذہن کی تخلیق ہوتے ہیں۔ ان سے ڈرنا نہیں چاہیے۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اس سے پہلے کم از کم کیرولینا کو تو ڈرا اڈرا کر ادھ موا ضرور کر دے گا۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ بیڈ پر چادر لپیٹے کیرولینا بیٹھی تھی۔ برابر میں، میں کھڑا تھا اور سامنے مسکراتا ہوا ماریو یا پروفیسر...... سمجھ نہیں آ رہا کہ اسے کیا کہوں۔

"کیا سوچ رہے ہو تم لوگ......" ماریو کی آواز نے کمرے کا سکوت توڑا۔ "جانتا ہوں کہ میرے کمرے میں کیا چل رہا تھا، بہتر ہے کہ تم دونوں شریفانہ طریقے سے نیچے ڈائننگ ہال میں آ جاؤ۔ کچھ اہم باتیں کرنی ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے دیوار سے ٹکی چھڑی اور فرش پر رکھا بریف کیس اٹھایا۔

......ایک بار پھر مانوس کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

کیرولینا اور میں، دونوں کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔

کچھ دیر سمجھ ہی نہیں آیا کہ کیا کریں۔ "چلو...... نیچے چلتے ہیں۔" کچھ سوچنے کے بعد میں نے کیرولینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پانچ منٹ بعد ہم ڈائننگ ہال میں تھے۔ اس نے تین گلاس بھرے۔ دو ہمارے سامنے رکھے اور پھر کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ "آج کی اس رات میں، انوکھی ملاقات کے نام۔" اس نے گلاس اٹھایا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔

"پروفیسر لوئے......" اس نے میری طرف دیکھا۔ "جانتی ہو کیرولینا...... گردن گھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس میں کئی خوبیاں ہیں، ذہین ہے، ادبی حیثیت بھی حاصل کر لے گا۔ دولت کمانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور تمہاری نظروں سے دیکھوں تو لمبا چوڑا ہے، مردانہ صفات اس کی شخصیت کا حصہ ہیں اور نوجوان ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت بھی ہے۔" یہ کہہ کر کچھ توقف کیا اور باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ "ٹھیک کہا نا میں نے۔" اس کی نگاہیں سوالیہ اور لہجہ طنزیہ تھا۔

وہ بیک وقت ہم دونوں سے مخاطب تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ میں نے کیرولینا کی طرف

دیکھا۔ وہ بھی خاموش تھی۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں ہم دونوں شرمندہ ہونے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔

''مسٹر لوئے......'' پروفیسر نے طنزیہ انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ ''میں یہاں تعریفوں کے پل باندھ رہا ہوں اور تم دونوں لاتعلق بنے بیٹھے ہو۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہے لیکن ذرا میری بھی تو تعریف کر دو۔''

یہ سن کر تو جیسے میں زمین میں گڑ گیا۔

''بھئی میں بھی بڑا قابل ہوں۔'' اس نے فخریہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا۔ ''مجھ میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ساتھ ہی کچھ دوسروں کی نظروں سے اب تک پوشیدہ تھیں۔ جیسا کہ میں اچھا بہروپیا ہوں۔ زبردست اداکاری کر لیتا ہوں۔'' اس نے طنزیہ نگاہوں سے ہمیں گھورا۔ ''اب تک تو تم دونوں میری یہ خوبیاں اچھی طرح جان چکے ہو گے۔''

میں نے کیرولینا کی طرف کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ خود میری اپنی حالت بھی بہت بری تھی۔

''ایک تو تم دونوں گفتگو کے موڈ میں نہیں لگتے۔'' کچھ دیر خاموشی کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''ہر انسان کے اندر ایک دوسرا شخص چھپا ہوتا ہے اور مجھے دیکھ کر تم یہ تو سمجھ چکے ہو گے کہ ماریو ہو یا پروفیسر، میں نے دونوں کے ساتھ بھرپور انصاف کیا لیکن تم کیرولینا......'' بات ادھوری چھوڑ کر وہ خاموش ہوا اور میری طرف دیکھا۔ ''ویسے تم دونوں کے اندر چھپا انسان بھی آخر جلد ہی باہر آ گیا۔''

''نہیں......'' بالآخر میں نے خاموشی توڑی۔ ''تم کچھ غلط کہہ رہے ہو۔ جو کچھ ہوا، وہ سب انجانے میں ہوا...... جب بظاہر ماریو دنیا میں رہا ہی نہیں تو پھر کیرولینا کی کیا غلطی۔'' اپنی دانست میں دونوں کی صفائی پیش کرنے کی کمزور سی کوشش کی۔ یقین نہ تھا کہ وہ یہ دلیل مان لے گا۔

''لیکن ماریو مرا کیوں؟'' اس نے کیرولینا کی طرف دیکھا۔ ''اگر سب کچھ موت کے بعد ہوا تو پہلے تم دونوں میں کیا چل رہا تھا؟''

''میرے خیال میں اب اس پر مزید دلیل دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''جو ہوا، سب کچھ تم جان چکے ہو۔''

میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر اس کے ہاتھوں موت سے بچ گیا تو وہ میرا کیریئر ختم کر دے گا۔ موریس روڈ پر لگژری اپارٹمنٹ اور نئی بی ایم ڈبلیو کار...... مجھے اپنے خواب ٹوٹتے ہوئے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں تو شاید دنیا کے سامنے یہ بات کبھی ثابت ہی نہیں کر پاتا کہ ماریو دراصل پروفیسر مینوئیل ریمز رانسالڈ ہے مگر وہ مجھے تباہ کرنے کی پوری قوت رکھتا تھا۔ اس وقت وہ ہم دونوں کی جان لینے کی پوزیشن میں تھا۔ اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دیتا، تب بھی وہ مجھے جیتے جی مار سکتا تھا۔ مجھے نقصان پسند نہیں مگر اب تو سودا ہر صورت خسارے میں تھا۔ زندگی کے سب سے کڑے امتحان کا سامنا تھا۔

''کیرولینا میری بیوی ہے اور یہ بات دنیا نہیں جانتی۔'' کافی دیر خاموش سے، چھوٹی چھوٹی چسکیاں لے کر گلاس خالی کرتے رہنے کے بعد پروفیسر نے زبان کھولی۔

''میں اس سے بہت پیار کرتا تھا۔'' اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

''تم مجھ سے پیار کرتے تھے۔'' پہلی بار کیرولینا نے زبان کھولی۔

''یہ سچ ہے......''

''تو پھر یہ کیا ہے، ماریو یا پروفیسر...... میں کس کی بیوی تھی؟'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''میری......'' پروفیسر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اوہ میرے خدا...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' کیرولینا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ''تم مجھے اتنا بڑا دھوکا دے گئے......'' اس کی آواز بھرا چکی تھی۔

کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ اُس نے ایک اور گلاس بھرا اور دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگا۔

میرا دماغ تیزی سے چل رہا تھا۔ اب مجھے سمجھ آ چکا تھا کہ سال میں دو تین بار ماریو اٹلی اور پروفیسر مشرقِ وسطیٰ اور یورپ کے دوروں کے نام پر کہاں آتا جاتا تھا۔ مجھے نہایت حیرت تھی کہ ایک ذہین اور عالم فاضل شخص نے کس طرح اپنی ایک زندگی کو دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ''معاف کیجیے گا......'' میں نے خود میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے پروفیسر کو مخاطب کیا۔ ''سمجھ نہیں سکا کہ آخر دو کرداروں میں بٹ کر زندگی گزارنے کا مقصد کیا تھا۔''

پروفیسر نے میری طرف دیکھا۔ ''ذہین ہو، اچھا سوال کیا۔'' یہ کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر میری طرف متوجہ ہوا۔ ''سادہ سی بات ہے۔ یہ میرے اندر کی نفسیاتی الجھن تھی۔ ایک زندگی تو سب ہی جیتے ہیں، ایک زندگی میں دو زندگیاں جینا میرا بچپن سے خواب تھا۔''

میں سمجھ گیا کہ پروفیسر دُہری شخصیت کے مرض میں

بری طرح جلا تھا۔

"اب میں دو کردار ادا کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد صرف پروفیسر کی زندگی جیوں۔ اس لیے ماریو کا مرنا بھی ضروری تھا۔"

"لیکن وہ کسی اور طرح بھی تو مر سکتا تھا پھر......" کیرولینا نے روتے روتے پوچھا۔

"یہ ماریو کا اَن لکھا آخری ناول ہے۔ اسے اُس کی موت کے بعد شائع ہونا تھا۔" پروفیسر نے عجیب سے انداز میں کہا۔ "سب کچھ میرا منصوبہ تھا میری جان...... اگر میں نہ چاہتا تو لوئے کبھی یہاں نہ آتا۔"

"اوہ میرے خدا......" کیرولینا نے سر تھام لیا۔ "میرے ساتھ یہ کیا ہو رہا ہے۔" اس کے لہجے سے بے بسی عیاں تھی۔

اب کھیل ختم ہونا ہے تو کرداروں کے ساتھ انصاف بھی ہونا چاہیے۔" یہ کہتے ہوئے پروفیسر نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔

میں دم بخود تھا۔ اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگا پستول نظر آرہا تھا۔ ہم دونوں اُس کے نشانے پر تھے۔

"ایک بات بتانا بھول گیا۔ مجھے قتل کرنے کی بڑی خواہش تھی اور وہ بھی بے وفا بیوی کو اس کے چاہنے والے کے ساتھ۔ یہی میرے آخری ناول کا انجام ہونا ہے۔"

"کیا......" کیرولینا نے گھگیاتے ہوئے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ اس کی پیشانی پہ گولی داغ چکا تھا۔

کیرولینا کا سر ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

"شکریہ کیرولینا...... تم نے میرا سوچا کردار بالکل ٹھیک ٹھیک نبھایا۔" پروفیسر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ستائشی لہجے میں کہا۔

اس دوران میں تیزی سے ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ پروفیسر میری طرف متوجہ ہوتا، میں جلدی سے اٹھا اور پروفیسر کے اوپر حملہ کر دیا۔ ذرا سی جدوجہد کے بعد میں پستول چھین لینے میں کامیاب ہو گیا۔ "تم اپنی دو زندگی جی چکے مگر مجھے اپنی ایک زندگی ابھی بھرپور طریقے سے جینا ہے۔" یہ کہہ کر میں زور سے ہنسا۔

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ابھی میری عمر ہی کیا ہے، مجھے زندہ رہنا ہے، بہت کچھ لکھنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اس کی پیشانی پر گولی چلا دی۔ ایک گولی ہی اپنا کام دکھا چکی تھی۔ "وہ فرش پر بے جان پڑا تھا۔

"پروفیسر...... مجھے مطالعے کے ساتھ ساتھ شوٹنگ کا بھی بہت شوق تھا۔ بیونس آئرس کا شوٹنگ چیمپئن رہ چکا ہوں۔" میں نے اس کی لاش کو زوردار ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

کمرے میں دو لاشیں پڑی تھیں۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر اندھیرا تھا اور مجھے اپنا کام جلد از جلد نمٹا کر نکلنا تھا۔

میں نے گلاس بھرا اور ایک ہی سانس میں ختم کر دیا۔ میرا دماغ تیزی سے سوچ رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں سارا منصوبہ بن گیا۔

میں رات دیر گئے یہاں پہنچا تھا۔ خوش قسمتی سے اندھیری رات میں گھر میں داخل ہوتے ہوئے مجھے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بڑی احتیاط سے پورے گھر میں اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کیے۔ پستول سے سائلنسر نکال کر اپنے تھیلے میں ڈالا، انگلیوں کے نشانات صاف کیے اور اپنا سامان لے کر گھر سے نکل آیا۔ ہائی وے پر کافی دور پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک ٹیلی فون بوتھ نظر آیا۔

"ہیلو......" میں نے پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ "میں سانتا اسٹیلا مارس کا ایک رہائشی بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی میں نے کسی گھر سے کئی گولیاں چلنے کی آوازیں سنی ہیں۔" یہ کہہ کر فون بند کر دیا اور آگے بڑھا۔

میں جانتا تھا کہ ہماری پولیس کتنی مستعد ہے۔ مجھے یقین تھا کہ قاتل پکڑا نہیں جائے گا۔ بڑے اطمینان سے چلتا رہا اور آخر ویران ہائی وے پر مجھے ایک ٹرک والے سے لفٹ مل گئی۔ میری تحقیق مکمل ہو چکی تھی۔ اس کی اشاعت کے بعد یقیناً یونیورسٹی میں مجھے خاصا اہم مقام مل جائے گا۔ ماریو اور پروفیسر...... دونوں میرے ہیرو تھے۔ میں ایک زندگی میں ہی ان دونوں کو حاصل ہونے والا مقام پانا چاہتا تھا۔

بعد میں ایسا ہی ہوا!

کیرولینا اور پروفیسر کا قتل اندھا ہی رہا۔ میں نے ماریو کے غیر مطبوعہ ناولوں کو اپنے نام سے شائع کرایا اور خوب دولت کمائی لیکن برسوں ہو چکے۔ ماریو کے اُس آخری ناول کو نہیں لکھ سکا جس کا انجام میں نے بدل دیا تھا۔

چلو...... ایک بار پھر یہ کہانی لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔

ایلون بوائڈ، خونی تھا، لٹیرا اور قاتل تھا۔ خون، بارود، دھواں اور قانون سے آنکھ مچولی...... یہی اس کے روز و شب تھے۔ اکثر مردوں کی عورتوں میں دلچسپی عام بات ہے لیکن بوائڈ اس کے برعکس شراب پسند کرتا تھا۔ اسے وہسکی مرغوب تھی۔ تاہم مے نوشی کے معاملے میں وہ کسی حماقت کے مظاہرے سے پرہیز کرتا تھا۔

اس وقت وہ ایلکو اسپرنگ بینک سے الٹے قدموں کھسک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موجود کولٹ کی نال سے دھوئیں کی پتلی لکیر بل کھاتی نکل رہی تھی۔ کیشیئر نے کاؤنٹر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر اچانک ہتھیار جھپٹنے کی دلیرانہ لیکن معصوم بھول کی تھی...... اس کے سامنے بوائڈ تھا جس کی گولی کیشیئر کی دونوں آنکھوں کے درمیان جا گھسی تھی۔

''کوئی اور ہیرو؟'' وہ پھنکارا۔ ''دوسرا نمبر تمہارا ہوگا۔ خاموش بیٹھی رہو۔'' بوائڈ نے اسٹینوگرافر کو تنبیہ کی۔

باہر طوفانی گرج چمک نے گولی کا دھماکا جذب کرلیا تھا۔ اِدھر اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اچھل کر گھوڑے پر سوار

بھولے بسرے رنگوں سے تلاش کردہ ایک انوکھا آہنگ

انسان بھی نہایت عجیب ہے... سخت ہے تو چٹانوں کو مات دے دیتا ہے... گداز اختیار کرتا ہے تو ریشم و موم جیسی نرماہٹ کو چھو لیتا ہے... بیک وقت سنگدلی اور نرم دلی کا سنگم... ایک دلیر نوجوان کی سرگزشت... آگ... بارود... خون... لوٹ مار اس کی رگوں میں دوڑتے خون کا حصہ تھیں۔ رشتے دار نہ... کوئی غم خوار... نہ غمگسار... مگر ایک گزرے ہوئے واقعے کی یاد نے اسے وہ قدم اٹھانے پر مجبور کردیا جو اس کی سرشت میں شامل نہ تھا۔

قرض

امجد رئیس

ہوا۔ پانچ منٹ بعد وہ طوفان میں غائب ہو چکا تھا۔ کاٹھی سے لٹکا ہوا تھیلا موٹی رقم کے باعث بوجھل ہو رہا تھا۔

وہ مسکرایا، تعاقب کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شیرف اس وقت کہاں مصروف ہے۔ طوفان کے آغاز کے ساتھ ہی وہ ٹاؤن میں اپنے ہدف پر جا پہنچا۔ طوفان نے گھوڑے اور اس کے سوار کو متاثر نہیں کیا تھا۔ بوائڈ نے بھینس کی کھال سے بنا کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کا گھوڑا بھی بہترین تھا۔ گھوڑا وہ اپنی پسند کا استعمال کرتا تھا۔ گھوڑا چرانا اس کے لیے عام بات تھی۔ وہ جنوب کی سمت بڑھ رہا تھا۔ وہ گرفتاری کے خوف سے اپنی حرکات و سکنات شاذ ہی تبدیل کرتا تھا۔ جنوب میں رائے پاور، پاور کی بیوی اور خاصی شراب موجود تھی۔ پاور کا مسکن انڈین علاقے میں دریا کے پار تھا۔ پاور ایک احمق آدمی تھا۔ تاہم اتنی عقل رکھتا تھا کہ زبان کب کھولنی ہے۔ زیادہ تر وہ اپنا منہ بند ہی رکھتا تھا۔ بوائڈ اسے خوش رکھنے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔

پاور کی بیوی عام سی عورت تھی۔ لیکن شیرف ”روزا پاور“ سے بھی کوئی مفید معلومات حاصل نہیں کر سکا تھا۔ پاور کو ہاتھ پیر ہلائے بغیر آسانی سے رقم مل جاتی تھی۔

تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ پہاڑیوں تک پہنچنے میں بوائڈ کو سو میل کا سفر کرنا تھا۔ اس کی منزل پراری ڈاگ کریک تھی۔ گھوڑا اور سوار دونوں سخت جان تھے۔ ورنہ ایسے موسم میں متواتر ناہموار راستوں پر سفر کرنا آسان نہ تھا۔ بوائڈ نے سوچا کہ وہ صبح ہوتے ہی کچھ وقفہ لے گا۔ بعد ازاں شام تک پاور کے کیبن تک پہنچ جائے گا۔ اس نے رقم سے لبریز تھیلے پر ہاتھ پھیرا۔ زبان سے ہونٹ کو چھوا، اسے وہسکی کی یاد ستا رہی تھی۔ اس کے پاس اس وقت بھی وہسکی کی کچھ مقدار محفوظ تھی۔ تاہم وہ منزل پر پہنچے بغیر اسے ہونٹوں تک لے جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس سے ایک مرتبہ یہ غلطی سرزد ہوئی تھی اور کچھ دیر بعد وہ گھوڑے سے لڑھک گیا تھا۔ اس وقت رائے پاور، آوارہ گھوڑوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ اتفاقاً وہ بوائڈ تک جا پہنچا اور اسے اپنے کیبن میں لے آیا۔ دونوں میاں بیوی نے اس کی دیکھ بھال کی اور وہ بہت جلد اپنے نئے مشن پر روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے وہسکی بھی خوب چڑھائی اور کافی کچھ بکواس کر ڈالی۔ دونوں میاں بیوی اس کی اصلیت جان گئے۔ تاہم دونوں کی زبان ہمیشہ بند ہی رہی۔

وہ دونوں بوائڈ کے واحد دوست تھے۔ گزشتہ موسم بہار کے بعد وہ ان دونوں سے نہیں مل سکا تھا۔ اس کے زیادہ دوست ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ اس کے سر کی قیمت مقرر تھی۔ خاصی قیمت تھی۔ لوگ اس سے دور رہتے اور اسے قابو کرنے کے لیے موقع کی تاک میں بھی رہتے...... تاہم کوئی بھی تنہا اس کے پیچھے آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ بوائڈ ایک جگہ نہیں ٹکتا تھا۔ کبھی ٹیراسکا، کبھی مونٹانا...... گھوڑے کی پیٹھ کا وہ عادی تھا۔ بوائڈ ابھی محض 23 سال کا تھا اور آٹھ افراد اس کے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ وہ ایک خطرناک اور پھرتیلا گن فائٹر تھا۔

☆☆☆

بالآخر سفر تمام ہوا۔ طویل اور خراب سفر کے اثرات بہر حال گھوڑے اور سوار دونوں کے حلیے سے عیاں تھے۔

پاور کا کیبن نگاہ کی رسائی میں تھا۔ بوائڈ گھوڑے سے اتر کر چٹان کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے وہ گھوڑے کے لیے پانی کا بندوبست کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس کا اصول تھا کہ خود سے پہلے سواری کا خیال رکھا جائے۔ پھر اس نے اپنے پاس محفوظ وہسکی نکال کر ٹن کے پیالے میں انڈیلی۔ وہسکی زیادہ نہیں تھی۔ تاہم وہ نصف گھنٹے تک وہاں بیٹھا رہا۔ گھوڑا، گھاس پھوس میں منہ مار رہا تھا۔ بھوک سے بوائڈ کی انتڑیاں آپس میں الجھ رہی تھیں۔ بالآخر وہ کھڑا ہو گیا۔

کیبن کی گرمائش اور طعام و قیام کا تصور اسے نئی توانائی بخش رہا تھا۔ وہ اپنے واحد دوست کے کیبن سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔

بوائڈ نے دروازے پر دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ معلق رہ گیا۔ کچھ گڑبڑ تھی۔ بوائڈ نے ادھر ادھر دیکھا اور کولٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس نے زمین کا جائزہ لیا۔ کوئی مشکوک نشان نہیں تھا۔ باڑے میں پاور کے گھوڑے پرسکون تھے۔ بوائڈ نے سر اٹھا کر چمنی کو دیکھا جس میں سے دھواں نکل رہا تھا...... یعنی کیبن خالی نہیں تھا۔

”اندر آجاؤ۔“ اندر سے پاور کی آواز آئی۔ اس نے دروازہ کیوں نہیں کھولا؟ بوائڈ نے سوچا اور کھڑکی کی جانب دیکھا۔ خراب موسم کے باعث کھڑکی دھندلائی ہوئی تھی۔ کھڑکی سے اندر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

بوائڈ نے کولٹ ہاتھ میں لے کر اس کی پن اوپر کی اور لات مار کے دروازہ کھولا۔

”سب ٹھیک ہے، آجاؤ۔“ پاور کی آواز میں نقاہت تھی۔ بوائڈ چند ساعت دروازے میں کھڑا رہا۔ اس کی پتلیاں آنکھوں میں گردش کر رہی تھیں۔ پھر اس نے کیبن میں قدم رکھ دیا۔ کولٹ واپس ہولسٹر میں چلا گیا تھا۔

خواب گاہ میں سے اس کی بیوی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ بوائڈ الجھن کا شکار تھا۔ وہ سوال کرنے ہی والا تھا

کہ پاور نے کہا۔ ”ایک ہفتہ قبل میرے گھوڑے کا پیر ایک چٹانی رخنے میں دھنس گیا تھا۔ ہم دونوں گرے...... میری ایک ٹانگ زد میں آکر ٹوٹ گئی۔ روزا نے میری خبر گیری کی، پھر وہ مجبور ہوگئی۔ وہ خود امید سے تھی۔ ولادت کا وقت قریب آگیا اور سو میل تک کوئی ڈاکٹر موجود نہیں ہے۔“

بوائڈ کو بات سمجھنے میں پندرہ سیکنڈ لگے۔ تھوڑی سی وہسکی اور خالی پیٹ کے ساتھ اس کا دماغ پوری طرح کام نہیں کررہا تھا۔

”وہ مرجائے گی، بوائڈ۔“ رائے پاور کی آواز لڑکھڑا گئی۔

”ڈاکٹر؟“ بوائڈ نے اپنا کاؤبوائے ہیٹ پیچھے کیا۔

”مجھے اپنی پروا نہیں ہے۔ روزا اور بے بی کو زندہ رہنا چاہیے...... پلیز بوائڈ۔“ پاور کراہ اٹھا۔

”اسے کچھ نہیں ہوگا، پاور۔“ بوائڈ نے کان کھجایا۔

”نہیں، بوائڈ...... نہیں۔ وہ حمل کے آخری مراحل میں ہے۔“

بوائڈ نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اسے ان معاملات کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس کے دلِ سنگ و آہن میں زندگی، موت عورت و مرد ایک جیسے تھے۔ جب اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا، تب اس کے والدین فساد کی نذر ہوگئے تھے۔ وہ اکلوتا تھا۔ بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ آگے چل کر وہ غلط راستوں کا مسافر بنا اور خود دہشت کی علامت بن گیا۔

بوائڈ باہر سے جگ لے کر آیا اور تین عدد ٹن کے پیالوں میں وہسکی انڈیلی۔ ”پاور یہ پیو، سکون سے بات کرو...... پھر سوچتے ہیں کہ اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔“

وہ ایک پیالہ لے کر خوابگاہ میں چلا گیا۔

”ہیلو روزا، باہر نکلو...... یہاں پڑے پڑے تمہاری تکلیف کم نہیں ہوگی۔“

روزا نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اس نے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ بوائڈ نے ایک ہاتھ اس کے سر کے نیچے رکھ کر سہارا دیا اور پیالہ ہونٹوں سے لگادیا۔ روزا نے چند گھونٹ لے کر سر واپس تکیے پر ٹکا دیا۔

بوائڈ واپس پاور کے پاس آگیا۔ اپنا پیالہ خالی کر کے اس نے ایک طرف اچھال دیا۔ ذہن کچھ روشن ہوا۔

”ڈیئر پاور، تم جانتے ہو کہ میرے سر کی قیمت مقرر ہے؟“ بوائڈ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

”ہاں۔“ پاور نے بے بسی سے کہا۔

خوابگاہ سے اذیت میں ڈوبی ہوئی کراہ بلند ہوئی۔ ماضی کے دریچوں سے بوائڈ کے تصور میں ماں کی چیخ ابھری...... آگ، دھواں، دھماکے...... وہ ماں کی گود میں تھا۔ ماں اِدھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔ باپ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اطراف میں لاشیں پڑی تھیں۔ کوئی ہل رہا تھا...... کوئی ساکت تھا۔ دور بہت دور سے قہقہوں اور چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

بوائڈ کا چہرہ پتھرا گیا۔

”بوائڈ۔“ پاور نے آس بھری نظروں سے اُسے پکارا۔

”پنسل اور کاغذ؟“ بوائڈ نے سوال کیا۔

پاور نے ایک کیبنٹ کی طرف اشارہ کیا۔

بوائڈ، کاغذ اور پنسل لے آیا اور پاور کے حوالے کیا۔

”تمہاری روزا بچ جائے گی، دوست۔“

بوائڈ نے اعتماد سے کہا۔ پاور کا چہرہ تمتمانے لگا۔

”ڈاکٹر کے نام پیغام لکھو...... میں لکھ نہیں سکتا...... جب تک میں تیار ہوتا ہوں۔“ بوائڈ باہر نکل گیا۔ اس نے پاور کا سب سے مضبوط گھوڑا منتخب کیا۔ اپنے گھوڑے کی کاٹھی اس پر منتقل کی۔ رائفل چیک کر کے رقم کا تھیلا الگ کیا اور اندر آگیا۔

”یہ میں بھوسے کے ڈھیر میں چھپا رہا ہوں۔“ بوائڈ نے پاور کو بتایا۔ بعدازاں بوائڈ نے ایک لفافے میں مکئی کے دانے بھرے، پانی کی بوتل بھری...... وہسکی ساتھ رکھی۔

”کیا کررہے ہو؟ تم ٹاؤن تک نہیں پہنچ سکو گے۔“ پاور نے کہا۔

بوائڈ نے سنی ان سنی کردی۔ ”تم تھوڑا بہت چل سکتے ہو؟“

”ہاں، لکڑی کے ساتھ۔“

”اس تھیلے میں خاصی رقم ہے...... اسے کیبن سے باہر محفوظ ترین جگہ پر چھپانا۔“ بوائڈ نے کہا۔

”کیوں؟“

”ممکن ہے، میں واپس نہ آسکوں۔ اس صورت میں تمام رقم تمہاری ہے۔ کیبن میں تم کہیں بھی چھپاؤ گے، وہ ڈھونڈ لیں گے۔“ بوائڈ نے سمجھایا۔ ”میں باہر کہیں خود محفوظ کردیتا لیکن روزا کو بچانا اہم ہے اور میرے پاس بہت کم وقت ہے۔“

چند نوٹ بوائڈ نے جیب میں رکھ لیے۔

”بوائڈ...... ڈ......“ پاور سسک اٹھا۔

”دل مضبوط رکھو...... میں روزا سے مل کر نکل رہا ہوں۔“ بوائڈ نے کاغذ پاور کے ہاتھ سے لیا۔ پیغام کے نیچے پنسل گھسیٹی۔ قبل اس کے کہ پاور کچھ کہتا، بوائڈ نکل چکا تھا۔

☆☆☆

جلد ہی بوائڈ کو راستے میں دو چرواہے مل گئے۔ بوائڈ نے رک کر انہیں پاور کی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔

”میں ڈاکٹر کو لینے جارہا ہوں۔ تم دونوں ان کا خیال رکھو۔“

بوائڈ نے جیب سے چند نوٹ نکال کر اُن کے حوالے کیے اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔

طوفان رک چکا تھا۔ تاریکی پھر پھیل رہی تھی۔ تیسرا دن تھا، بوائڈ سویا نہیں تھا۔ وہ آدھ، ایک گھنٹے میں وسکی کا گھونٹ لیتا رہا اور گھوڑے کی پشت پر جما رہا۔ وہ دوست کا قرض ادا کرنے موت کے منہ میں واپس جارہا تھا۔ وہ کبھی پکڑا نہیں گیا تھا، کبھی گن فائٹ نہیں ہارا تھا...... اس نے کبھی جیل کا منہ نہیں دیکھا تھا۔

اس نے سرد رات کے سناٹے میں قہقہہ لگایا۔ اس نے کاغذی پیغام چرمی پاؤچ میں رکھ کر ڈوری کے ساتھ گلے میں لٹکالیا۔

وہ بڑھتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔ تارے ایک ایک کر کے غائب ہوتے گئے۔ وہ قوتِ ارادی کے بل پر سفر کررہا تھا۔ پہاڑیوں سے نکل کر گھوڑا مرکزی سڑک پر آگیا۔ صبح کاذب نمودار ہورہی تھی۔ بوائڈ پر نیند کے حملے جاری تھے۔ اس پر ایک ہی قرض، ایک ہی دوست تھا...... اسے قرض اتارنا ہی تھا۔

اسے ایک بھیڑیا سڑک پار کرتا نظر آیا۔ بھیڑیے کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور وہ سونے کے لیے محفوظ مقام کی طرف جارہا تھا۔ بوائڈ نے کبھی کسی بھیڑیے کو ہلاک نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھیڑیا تھا۔ لون وولف...... ایک قاتل، سنگ دل اور بے حس۔

اچانک بوائڈ کو احساس ہوا کہ بھیڑیے کے تعاقب میں درجن بھر گھڑسوار تھے۔ بھیڑیا سونے نہیں بلکہ جان بچا کے بھاگ رہا تھا۔

اب گھونٹ بھرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بوائڈ نے بچی ہوئی وسکی غٹاغٹ چڑھائی اور دہاڑا۔

”بھیڑیا ادھر ہے، لڑکو۔“

گھڑسواروں کی توجہ بٹ گئی۔ کسی رائفل کی گولی بوائڈ کے سر کے قریب سے جھنجھناتی گزری۔

بوائڈ نے گھوڑے کے پہلو سے لٹکی کاربائن کھینچی اور گھڑسواروں پر چڑھائی کردی۔

مخالف سمت سے گولیوں کی باڑ آئی۔ ایک گولی گھوڑے کی پیشانی میں گھس گئی۔ وہ لڑکھڑایا۔ بوائڈ نے رکابوں سے پیر نکالنے کی کوشش کی لیکن تاخیر ہوگئی تھی۔ گھوڑا اور سوار دونوں ساتھ گرے۔ بوائڈ کی ٹانگ میں درد کی خوفناک لہر اٹھی۔ گولیاں اطراف میں برس رہی تھیں۔ چند مزید گولیاں گھوڑے کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ وہ مرچکا تھا۔

مخالف پارٹی قریب آگئی تھی۔ بوائڈ نے لیٹے لیٹے کولٹ نکالا اور میگزین خالی کردیا۔ اس کے دونوں ہتھیاروں کی گولیاں، سر پر فضا میں یا پھر زمین سے ٹکرائی تھیں...... مخالفین میں سب صحیح سلامت تھے۔

وہ سر پر پہنچ چکے تھے۔ بوائڈ غیر معروف شخص نہیں تھا۔

انہوں نے اسے پہچان لیا۔ چار پانچ گولیاں اس کے سینے سے ٹکرائیں۔ بوائڈ نے خون تھوکتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ کولٹ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ وسکی کی خالی بوتل پہلے ہی گر چکی تھی۔ پھر اس کا سر بھی ڈھلک گیا۔

”شرابی تھا، ہوش میں نہیں تھا۔“ ایک نے کہا۔

”لیکن یہ ایلون بوائڈ ہے۔“ دوسرا بولا۔

”یہ بے خطا نشانے باز ہے جبکہ ہم سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔“ تیسرے نے تبصرہ کیا۔

”سب احمق ہو، اس نے کسی کو مارنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔“ چوتھے نے وضاحت کی۔

”تو کیا خودکشی کرنے آیا تھا۔“

”کچھ سمجھ نہیں آیا۔ دو دن پہلے تو وہ یہاں سے بینک لوٹ کر گیا تھا پھر واپس کیوں آیا...... وہ بھی خودکشی کے لیے......“ چہ میگوئیاں جاری تھیں۔

دھماکوں کی آوازیں سن کر کچھ اور افراد بھی آگئے۔ ان میں پولیس مین اور شیرف بھی شامل تھے۔ انہوں نے لوگوں کو دور ہٹایا۔

شیرف نے بھیڑیے کے تعاقب میں جانے والی پارٹی کی باتیں سنیں...... چند سوالات کیے اور اچنبھے سے بوائڈ کی لاش کی طرف دیکھا۔

”گھوڑے کو ایک طرف کرو۔“ اس نے پولیس اہلکاروں کو ہدایت دی۔ اچانک اس کی نظر بوائڈ کے سینے پر چرمی پاؤچ پر گئی جو خون میں بھیگ گئی تھی۔

شیرف نے نیچے بیٹھ کر ڈوری سمیت پاؤچ گلے سے نکال لی۔ اسے کھول کر کاغذ نکالا۔ جھٹپٹا ختم ہوا اور آفتاب نے اُفق سے جھانکا۔

”یہ تمہارے لیے ہے۔“ شیرف نے پیغام پڑھ کر ایک اہلکار کے حوالے کردیا جس کے پاس اسلحہ کے بجائے سیاہ رنگ کا بیگ تھا...... پھر وہ دوسرے اہلکاروں کی طرف مڑا۔

جوانوں، بوائڈ کو احترام اور احتیاط سے لے چلو۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ کم از کم ایک دوست ہے اس کا۔ اور وہ اپنے دوست کے لیے ہی واپس آیا تھا۔ اس کی واپسی کا ایک مقصد تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ایک قابلِ احترام کام کیا ہے، اپنے دوست کے لیے۔ اور اس کے لیے اس نے اپنی جان دے دی۔ اس کے دوست کی بیوی ولادت کے لیے تڑپ رہی ہے۔ بوائڈ، ڈاکٹر کو لینے آیا تھا...... اسے نرمی سے اٹھاؤ۔“ شیرف نے نہایت شائستگی سے کہا۔

وہ عورت

تنویر ریاض

کائنات کی تمام تر رنگینی وجودِ زن کی مرہونِ منت ہے۔ اس کی شخصیت میں پہیلی یاسیت... اجنبیت اور پہیلی پن کو کوئی کوئی ہی سمجھ پایا ہے... ایک ایسی ہی عورت کے گرد گھومتی کہانی... جو بظاہر اپنے شوہر کی رفاقت سے محروم ہو چکی تھی... رشتے دار اور ملنے جلنے والے اس کھوج میں تھے کہ وہ اب اپنے شوہر کے بنا روز و شب کیسے گزار رہی ہے۔

ازدواجی زندگی کی باریکیوں میں الجھی ایک دل گداز تحریر

جب بل فنطے نے آرٹ کی موت کے بارے میں ای میل پڑھی تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہ یہ آرٹ کون ہے پھر اس نے بھیجنے والے کے نام پر نظر ڈالی۔ وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا جو شکاگو میں رہتا تھا اور آرٹ فنطے اس کا بڑا بھائی ہی ہو سکتا تھا جسے اس نے گزشتہ اکیس سال سے دیکھا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی رابطہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ باون اور آرٹ اٹھاون برس کا تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ آخری بار اسے آرٹ کا خیال کب آیا لیکن کچھ یاد نہیں آیا۔ اس

نے ای میل کا مضمون پڑھا، لکھا تھا۔ ''آرٹ اپنے گھر میں مردہ پایا گیا۔ لاش اس عورت نے دریافت کی اور اسے شناخت کرلیا۔ اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں نے بھی اسے کافی عرصے سے نہیں دیکھا تھا۔ بہتر ہوگا کہ تم تجہیز و تکفین میں شرکت کے لیے آجاؤ۔''

جیک اور بل نے تقریباً ایک ہی وقت میں آرٹ سے دوری اختیار کی تھی جب اس نے اس عورت یعنی پینی کو اپنی چوتھی بیوی بنایا۔ البتہ اسے یہ کریڈٹ دینا چاہیے کہ وہ پندرہ سال بلکہ اس سے بھی زائد کچھ عرصہ تک آرٹ کے ساتھ رہی۔ گزشتہ دنوں میں بل کو آرٹ کے بارے میں بہت کم معلومات ہوئیں اور وہ بھی تین چار لوگوں سے گزر کر اس تک پہنچی تھیں۔ اسے بس اتنا معلوم تھا کہ وہ عورت ان کے خاندانی گھر سے محض اس لیے جانے پر مجبور ہوئی کہ آرٹ کی مغلظات سے لبریز گفتگو اور اس کا ذہنی اختلال روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔ وہ اس صورتِ حال سے نباہ نہیں کرپارہی تھی۔ اس نے طلاق نہیں لی بلکہ ایک الگ اپارٹمنٹ میں رہنے لگی لیکن وہ اسے باقاعدگی سے دیکھنے آتی تھی۔ وہ آرٹ سے تقریباً تیس سال چھوٹی تھی گوکہ اس کی دوسری اور تیسری بیویاں بھی نسبتاً جوان تھیں لیکن یہ شادیاں آرٹ کی دولت و جائداد کی کشش کے باوجود کامیاب نہ ہوسکیں۔

بہرحال وہ مرچکا تھا اور پینی نے اپنی یہ ذمے داری سمجھی کہ وہ خط کے ذریعے متعلقہ لوگوں کو وضاحت کردے کہ اس نے آرٹ کے آخری ایام میں اس کی دیکھ بھال کیوں نہیں کی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کی عیادت کرنے فلوریڈا چلی گئی تھی پھر اس کے ساتھ الگین کے مغرب میں واقع بزرگ شہریوں کے مرکز میں رہنے لگی۔ اسی وجہ سے وہ دس ہفتوں تک آرٹ کو دیکھنے نہ جاسکی جبکہ وہ چھ ہفتے قبل کرسی پر بیٹھے بیٹھے مرچکا تھا اور اس کی لاش بُری طرح مسخ ہوچکی تھی۔

آرٹ کے جانے کے بعد بل فنلے کو اپنی فکر ہوگئی۔ وہ بھی تہتر سال کا ہوچکا تھا اور اس کی الماری دواؤں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ دل کا مریض تھا۔ اس کی آنکھوں میں موتیا اُتر آیا تھا اور گھٹنوں کی تکلیف بڑھتی جارہی تھی۔ ڈاکٹرز نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر فزیوتھراپی اور دواؤں سے اس کی تکلیف میں کمی واقع نہ ہوئی تو گھٹنے کا آپریشن کرنا ہوگا گوکہ وہ شکاگو تک کا سفر کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن بھائی کی آخری رسومات میں شرکت کرنا بھی ضروری تھا چنانچہ اس نے اگلے دن کے لیے ٹرین کے فرسٹ کلاس سلیپر میں سیٹ بک کروائی اور جیک کو ای میل کے ذریعے اس کی اطلاع دے دی اور ساتھ ہی اپنے دوست کو فون کردیا کہ وہ اسے اسٹیشن تک پہنچادے۔

آرٹ کی تدفین بند تابوت میں ہوئی کیونکہ لاش بُری طرح مسخ ہوجانے کی وجہ سے کسی کو اس کا چہرہ نہیں دکھایا جاسکتا تھا۔ اس موقع پر کل تیرہ افراد موجود تھے جن میں پادری اور آرگن نواز کے علاوہ پینی، جیک اور اس کی بیوی، تین بچے، جیک کے تین سابق ملازمین اور بل فنلے شامل تھا جبکہ چودھواں باریش شخص محراب کے باہر ایک وہیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ فیلٹ ہیٹ سے چھپا رکھا تھا۔

''یہ ضرور اس عورت کا باپ ہوگا۔'' جیک نے جنازہ گاہ میں داخل ہوتے ہوئے بل سے سرگوشی کی۔ بل اپنے گھٹنے کی تکلیف اور موتیا کی وجہ سے اسے قریب جاکر نہ دیکھ سکا۔ ویسے بھی وہ چلتے پھرتے لڑکھڑا رہا تھا اور اسے بیٹھنے کے لیے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ وہ اپنے بھائی کی بیوہ کے برابر میں بیٹھ گیا۔ بل کو اس سے کوئی عداوت نہیں تھی بلکہ اسے آرٹ سے کچھ دوسری باتوں پر اختلاف تھا۔ حیرت اس بات پر تھی کہ اس نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ اس کی عمر زیادہ ہوگئی تھی لیکن وہ پہلے کی طرح خوب صورت تھی۔

''بل فنلے، یہ تم ہو، آرتھر چاہتا تھا......'' وہ اس کا پورا جملہ نہ سن سکا اور ماضی کے دھندلکوں میں کھوگیا۔ پینی کے آنے کے بعد اس کا بھائی آرٹ سے آرتھر فنلے ہوگیا تھا جو ایک بڑی انجینئرنگ کمپنی فنلے اینڈ سنز کا مالک تھا۔ یہ نام ان کے باپ کے زمانے سے چلا آرہا تھا جب بل نے کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹانا شروع کیا اور آرٹ بھی تعلیم سے فارغ ہوکر ان کے ساتھ شامل ہوگیا۔ باپ کے مرنے کے بعد بھی یہی نام چلتا رہا گوکہ چند سالوں بعد بل نے نیویارک میں ایک دوست کے ساتھ مل کر اپنا کام شروع کردیا تھا۔

''تمہارے ہاتھ میں چھڑی ہے اور میں نے تمہیں لنگڑاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' پینی کا غیر متوقع سوال سن کر وہ حال میں واپس آگیا اور اسے مناسب جواب دینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ قبرستان پہنچ کر بھی وہ جیک کی مرسڈیز میں ہی بیٹھا رہا جبکہ دوسرے لوگ پیدل چلتے ہوئے قبر تک گئے۔ جیک کی کار کے برابر میں ہی پینی کی کار کھڑی تھی جس میں اس کا باپ کسی سوچ میں غلطاں بیٹھا ہوا

تھا۔ اگر اتفاقاً اس کی نظر بل پر جاتی تو وہ فوراً ہی اپنی نگاہیں دوسری جانب کر لیتا۔

☆☆☆

معیشت اور کاروبار میں مندی کے سبب پرائیویٹ سراغ رساں آر جے مائیکل بھی ان دنوں فارغ تھا۔ ورنہ وہ کبھی جیمس فنلے اور اس کے گرم مزاج وہمی باپ جیک سے ان کے مسئلے پر بات نہیں کرتا جس کے بارے میں فون پر بتا دیا گیا تھا۔ اسے یہ ہارڈی کی خزانے کی تلاش، جیسا افسانوی موضوع لگا جو اس جیسے سراغ رساں کے شایانِ شان نہیں تھا لیکن فارغ بیٹھے رہنے سے کچھ کرنا بہتر تھا۔ اس لیے وہ جمعرات کی صبح ان سے ملنے بڑے بھائی کے گھر پہنچ گیا جو اسی کی دہائی کا اینٹوں سے بنا حویلی نما مکان تھا۔ لیونگ روم میں ایک تیسرا فنلے بھی موجود تھا جسے جیک نے اپنے بڑے بھائی بل فنلے کے طور پر متعارف کروایا۔ وہ اپنی بائیں ٹانگ پھیلائے بیٹھا تھا۔ پوری گفتگو کے دوران میں وہ کچھ نہیں بولا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی اور بھتیجے کے خیالات سے متفق نہیں ہے۔ وہ دونوں اس کے مقابلے میں دبلے اور پستہ قد تھے۔ جیمس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کچھ وضاحتی نوٹس تیار کیے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے انہیں پڑھنا شروع کیا۔ ”پہلے میں کچھ پس منظر بتانا چاہتا ہوں۔ اٹھارہ سو اڑسٹھ میں یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ایک بہت بڑا اینٹوں کا مکان تعمیر کیا گیا۔ انیس سو دو میں یہ مکان اور اس سے متصل پانچ ایکڑ زمین میرے پردادا اینگس فنلے نے خرید لی جو کہ خود بھی ماہر سول اور میکینکل انجینئر تھے۔ ان کا ایک ہی بیٹا آرتھر سینئر تھا جسے پردادا کی وفات کے بعد یہ مکان ورثے میں ملا۔ اس کے تین بیٹے آرتھر جونیئر، میرے تایا بل اور والد اسی مکان میں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ میرے دادا نے جائداد کو وسعت دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ زمین خریدی اور کاؤنٹی سے معاہدہ کر لیا کہ قدرتی ماحول کے تحفظ کے لیے اس دو سو ایکڑ زمین کو محفوظ کر دیا جائے جو اب فنلے وڈز کہلاتی ہے۔

انیس سو اڑسٹھ میں دادا کے انتقال کے بعد یہ مکان میرے انکل آرتھر کو منتقل ہو گیا جو اس وقت پینتالیس سال کے تھے لیکن وہ انیس سو چوہتر تک اس مکان میں نہیں آئے جب ان کی تیسری بیوی سے علیحدگی ہوئی۔ ان سات سالوں میں مکان سے جو بے پروائی اختیار کی گئی، اس کا ازالہ کبھی نہ ہوسکا۔ انیس سو اسی کے آغاز تک مکان کی حالت بدتر ہو چکی تھی اور میدان میں جابجا گھاس اور جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ پتھر اور لوہے کی بنی ہوئی باڑ جگہ جگہ سے مرمت طلب ہو رہی تھی اور درختوں کی آزادانہ افزائش نے مکان کو چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس کی پوری ذمے داری آرتھر یا ان کی روز بروز گرتی ہوئی ذہنی اور جذباتی کیفیت پر عائد ہوتی ہے۔ انیس سو اٹھتر میں انہوں نے چوتھی شادی کر لی۔“

”اس عورت سے!“ جیک نے بات کاٹتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ہاں، ڈیڈی اسی عورت سے۔“ جیمس نے کہا۔

”وہی اب ان کی بیوہ ہے۔ کئی سال تک اس جائداد کی دیکھ بھال ہوتی رہی لیکن اس کی حالت میں کوئی بہتری نہیں آئی لیکن انیس سو اسی میں آرتھر کو مالی بحران کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجے میں انجینئرنگ فرم فروخت ہو گئی اور انکل اپنے خاندانی گھر تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اس کے بعد بتدریج ان کی حالت زوال پذیر ہوتی گئی۔ وہ بات بات پر شک اور غصہ کرنے لگے اور شراب نوشی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اعتدال پر نہ رکھ سکے۔ اس رویے کی وجہ سے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئیں۔ وہ مکان اپنی خستہ حالی کی وجہ سے نوجوانوں کے مذاق کا نشانہ بن گیا اور وہ اسے آسیب زدہ کہنے لگے۔“

”میں اس آسیب کا نام بتا سکتا ہوں۔ یہ وہی عورت ہے۔“ جیک نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

”اس عورت پینی لوپ این رائٹ کے کہنے کے مطابق وہ کسی وجہ سے آرتھر کی دماغی خلل اور گالم گلوچ کو ممکنہ حد تک برداشت کرتی رہی لیکن جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اسے اپنے تحفظ اور عزتِ نفس کی خاطر بالآخر وہاں سے جانا پڑا لیکن اس کے باوجود وہ آرتھر کی ضروریات کا خیال رکھتی رہی اور مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ اس سے ملنے ضرور آتی۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے وہ اپنی ذمے داری سمجھتی تھی۔“

”وہ پیسوں کی خاطر وہاں جاتی تھی۔“ جیک بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”آرتھر نے مرنے کے لیے غلط وقت کا انتخاب کیا۔“ جیمس اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پینی اپنے باپ کی تیمارداری کے لیے فلوریڈا گئی ہوئی تھی جب پینی واپس آئی تو اسے مکان میں آرتھر کی لاش ملی جس کا چھ ہفتے

پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ چودہ مارچ کی بات ہے۔ حیرت انگیز طور پر آرتھر نے اپنی وصیت میں جائداد کو مساوی طور پر تقسیم کر دیا جن سے اس نے برسوں پہلے دوری اختیار کر رکھی تھی اور اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ اس نے اپنی تین بیمہ پالیسیوں کا حق دار جینی کو بنا دیا جن کی مجموعی مالیت ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر تھی۔"

"انکل بل کو اس جائداد کا مختار نامزد کیا گیا لیکن انہوں نے نیویارک میں رہائش پذیر ہونے کی وجہ سے معذرت کر لی اور اپنی جگہ مجھے نامزد کر دیا کیونکہ مجھے اس کام کا تھوڑا بہت تجربہ ہے اور میں گزشتہ تین سال سے اپنی ساس کی جائداد کا مختار ہوں۔"

یہ کہہ کر جیمس فنلے نے اپنے نوٹس میز پر رکھ دیے اور مائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب میں اصل مسئلے کی طرف آتا ہوں۔ آرتھر کے وکیل نے فوری طور پر وصیت نامہ عدالت میں پیش کر دیا اور گزشتہ جمعے مجھے ایک خط موصول ہوا کہ میں مختار کی حیثیت سے اپنا کام شروع کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی رات اس پرانے مکان میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈیڈی بھی میرے ساتھ تھے۔ اس سے پہلے میں جینی سے بات کر چکا تھا اس نے چابیوں کا گچھا اور آرتھر کے بنیادی معاملات سے متعلق تمام ریکارڈ میرے حوالے کر دیا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ مکان میں بجلی، پانی اور گیس وغیرہ بند کر چکی ہے لہٰذا ہم نے وہاں جانے کے لیے گرم کپڑے پہنے اور اپنے ساتھ تین دو برقی لالٹینیں اور ایک کافی کا تھرماس لے لیا۔

جب ہم وہاں پہنچے تو باہر تھوڑی بہت روشنی تھی لیکن مکان کے اندر جا کر لگا جیسے کسی غار میں آ گئے ہیں۔ میں نے چھ وولٹ کی اسپاٹ لائٹ روشن کی اور اسٹڈی کا رخ کیا کیونکہ وہیں پر دستاویزات اور قیمتی اشیا مل سکتی تھیں۔ وہاں ہم نے ایک بڑی مہاگنی کی میز دیکھی جو شاید ایلنکس فنلے کے زمانے کی تھی۔ ہم نے درازیں دیکھنا شروع کیں جن میں بہت سارے کاغذات بھرے ہوئے تھے اور اس روشنی میں انہیں چھانٹنا بہت مشکل تھا۔ مجھے لگا کہ شاید ہم نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔"

ہم کیونکہ آ چکے تھے اس لیے ہم نے گھر کے باقی حصے دیکھنے کا بھی فیصلہ کیا۔ اسٹڈی کی دیوار میں ایک خلا تھا جس میں ایک بڑی سی سیف نصب تھی جو دیکھنے میں کپ بورڈ لگ رہی تھی جب میں نے اس کے دروازے کھولے تو وہاں سیف نہیں بلکہ دو عدد فائر پروف کیبنٹ تھے جو مقفل تھے اور جینی نے جو گچھا دیا تھا، اس میں ان کی چابیاں نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ ہمیں میز پر سے بھی کوئی چابی نہیں ملی۔ اسی وقت مکان میں سے چرچراہٹ اور کراہنے کی آوازیں آنے لگیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ واقعی پُراسرار جگہ ہے۔ اس وقت ڈیڈی کافی پینا چاہ رہے تھے لیکن میں فائل کیبنٹ کی چابیاں تلاش کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ مجھے بھی ضد ہو گئی تھی۔ اگر ہم خالی ہاتھ چلے آتے تو وہاں جانے کا مقصد فوت ہو جاتا۔

بہرحال میں نے ڈیڈی کو وہیں چھوڑا اور سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چلا گیا۔ وہاں چھ یا سات بیڈ روم تھے لیکن میرا خیال تھا کہ انکل آرتھر ماسٹر بیڈ روم میں سوتے ہوں گے۔ میں کھلے دروازے سے اندر چلا گیا اور ٹارچ روشن کر کے وہاں کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں ایک بیڈ تھا اور اس کے برابر میں میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ میں چابی کی تلاش میں اس میز کی جانب بڑھا کہ مجھے فلیپ فلیپ کی آواز سنائی دی۔ میرے بائیں جانب کھڑکی کا پردہ تقریباً پندرہ فٹ اوپر اٹھا اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ بمشکل ایک سیکنڈ بعد میرے عقب میں دروازہ زور سے بند ہوا اور میرے دل کی دھڑکن ایک بار پھر تیز ہو گئی۔ فوراً ہی میرے ذہن میں خیال آیا کہ ضرور اس مکان میں کوئی اور بھی موجود ہے۔ میں نے روشنی کا دائرہ پورے کمرے میں پھیلایا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کمرے میں دو الماریاں بھی تھیں لیکن میں انہیں نظر انداز کر کے باتھ روم کی طرف بڑھ گیا اور جب میں نے اس کا دروازہ کھولا تو مجھے کراہنے اور غرانے کی آوازیں آنے لگیں جو کئی سیکنڈ تک جاری رہیں۔ وہ کسی جانور کی نہیں بلکہ انسان کی آواز تھی۔

میں سب کچھ چھوڑ کر دن کی روشنی میں باہر آ گیا۔ خوف زدہ تو نہیں لیکن وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، اسے دیکھ کر گھبرا ضرور گیا تھا۔ اگلے روز میں ایک قفل ساز کو لے کر وہاں گیا۔ جب وہ ان فائل کیبنٹ کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں ہاتھ میں پستول لے کر ایک کمرے سے دوسرے میں کسی حملہ آور کے آثار تلاش کرنے لگا جس کی مجھے بہت کم امید تھی لیکن اس کے ساتھ ہی مجھے نقب زنی یا کسی کے حالیہ قیام کا نشان بھی نہیں ملا۔ جہاں تک فائل کیبنٹ کا تعلق ہے تو وہ بالکل خالی تھے۔ اس مکان سے کوئی ایسی چیز نہیں ملی جو ہمارے لیے کارآمد ہوتی۔"

آرتھر فنلے کروڑپتی تھا لیکن سوشل سیکیورٹی کے کرنٹ اکاؤنٹ اور پنشن کے علاوہ اس کا مالیاتی اداروں

سے کوئی لین دین نہیں تھا۔ اس کے وکیل نے مجھے بتایا کہ آرتھر نے انیس سو اٹھاسی میں اس مکان کے علاوہ اپنے تمام اثاثے فروخت کر کے رقم گھر میں محفوظ کر لی جو دس لاکھ ڈالر کے قریب تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعد میں اس نے یہ رقم سونے جواہرات کی خریداری یا......"

"یہ سب اس عورت کی کارستانی ہے۔" جیک فنلے چلاتے ہوئے بولا۔ "تم کیوں نہیں کہتے جیمس کہ وہ سب کچھ چرا چکی ہے۔ اگر اس نے پہلے یہ کام نہیں کیا تو آرتھر کے مرنے کے بعد بھی اس کے پاس ایک مہینا تھا۔"

اس موقع پر دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ آر جے مائیکل نے اس کیس کو لینے کا فیصلہ کر لیا جس میں اس کا واسطہ پُراسرار مکان، جیک فنلے اور دیگر لوگوں سے پڑ سکتا تھا۔ اس دوران میں بل فنلے بالکل خاموش رہا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مائیکل کو دیکھ کر تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے چھڑی کے سہارے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

مائیکل بہت سے معاملات میں اپنی بیوی جینی سے مدد لیا کرتا تھا جسے خود بھی سراغ رسانی سے دلچسپی تھی چنانچہ جینی کو آرتھر کی بیوہ پینی سے ملنے کے لیے بھیجا۔ دروازہ اس نے ہی کھولا جسے دیکھ کر جینی حیران رہ گئی۔ وہ کسی طرح بھی چور نہیں لگ رہی تھی بلکہ اسے ایک عام عورت کہا جا سکتا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی تقریباً پچاس سال کی دلکش نقش و نگار والی عورت تھی۔

"مسز رائٹ۔" جینی نے کہنا شروع کیا۔ "میں اپنی والدہ کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ میں نے مقامی دفتر میں اس کا ذکر کیا تو وہاں ایک شخص نے بتایا کہ یہ صورتِ حال بالکل ویسی ہے جیسی تمہاری اپنے باپ کے ساتھ تھی۔ میری ماں کی صحت ٹھیک نہیں اور وہ فلوریڈا میں تنہا ہیں۔ میرے والد کا گزشتہ برس انتقال ہو چکا ہے اور میں اس بارے میں کوئی مناسب راستہ تلاش کر رہی ہوں۔"

پینی کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس جھوٹی کہانی پر شک نہیں کر رہی۔ اس میں سچ صرف اتنا ہی تھا کہ جینی کی ماں واقعی فلوریڈا میں رہتی تھی۔ "میں سمجھ رہی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے دو منٹ دو تاکہ میں پھیلی ہوئی چیزیں سمیٹ سکوں پھر ہم کافی پئیں گے اور باتیں کریں گے۔"

"شکریہ، تم واقعی بہت مہربان ہو۔" جینی نے کہا اور دروازے پر کھڑے کھڑے گردوپیش کا جائزہ لینے لگی۔

بوڑھوں کے لیے مخصوص یہ علاقہ چار عمارتوں، ایک بڑے کثیر المقاصد مرکز بمع دفاتر، ایک ریستوران، ڈائننگ روم، جم، سوئمنگ پول، اِن ڈور ٹینس کورٹ اور ایک چھوٹے آڈیٹوریم پر مشتمل تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے پیچھے چلتی ہوئی لیونگ روم میں چلی گئی۔

"یہ میرے والد ہیں۔" پینی نے ایک باریش، عینک پوش بوڑھے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جو ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر بڑبڑانے والے انداز میں ہیلو کہا تو جینی بولی۔

"اوہ، میں نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کروایا مجھے ورجینیا مائیکل کہتے ہیں۔"

"اور میرا نام پینی لوپ رائٹ ہے لیکن سب مجھے پینی ہی کہتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اسے کچن ٹیبل تک لے گئی اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود کافی بنانے لگی۔ جب وہ سامنے بیٹھ گئی تو جینی نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے بات شروع کروں۔ پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ۔ اس دوران میں تم پر کیا گزری؟"

"میں نے بہت ہی مشکل وقت گزارا ہے۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں تقریباً روزانہ ہی کچھ سنتی رہتی ہوں۔"

"اوہ۔" جینی نے قدرے تاسف سے کہا۔

"میں ایلیکوین اسپتال میں ایڈمیشن رجسٹرار کے طور پر کام کرتی ہوں۔"

"اوہ میرا خیال تھا کہ تم ایک اچھی زندگی بسر کر رہی ہو کیونکہ یہ جگہ کافی مہنگی ہے۔"

"نہیں۔" پینی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "چند برس قبل شوہر سے علیحدگی ہونے کے بعد میں دوبارہ صحت کے شعبے میں چلی گئی۔ اس سے پہلے بھی ایک ڈاکٹر کے پاس استقبالیہ پر کام کر چکی تھی۔ میرا شوہر بہت ضعیف تھا۔ اس لیے میں علیحدہ ہونے کے باوجود اسے دیکھنے جایا کرتی تھی لیکن جب میں ڈیڈی کی تیمارداری کے لیے فلوریڈا گئی تو میری غیر موجودگی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو قصوروار جانا۔ لیکن میری مصروفیت بہت زیادہ تھی۔ پہلے میں نے یہ جگہ تلاش کی اور ڈیڈی کو لے کر یہاں آ گئی۔ اس کے بعد مجھے اپنا اور ڈیڈی کا سامان بھی یہاں منتقل کرنا

پڑا اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال ڈیڈی اب پہلے سے بہتر ہیں۔ جہاں تک آرتھر کا تعلق ہے تو میں ہر تیسرے چوتھے ہفتے اسے دیکھنے جایا کرتی تھی۔ اس کے ساتھ بہت سے مسائل تھے لیکن اس مرتبہ دو مہینے کا وقفہ آگیا۔ جب میں آخری بار دیکھنے گئی تو اسے مرے ہوئے کئی ہفتے ہو چکے تھے۔"

پینی کی آنکھوں سے پچھتاوا جھلک رہا تھا۔ جینی نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ "تم واقعی بہت مصیبت زدہ ہو۔ تمہارے مقابلے میں میرے مسائل بہت معمولی ہیں۔"

"اب ڈیڈی کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "جہاں تک مالی مسائل کا تعلق ہے تو ان کے علاج معالجے کے اخراجات کمیونٹی برداشت کر رہی ہے، اب تم اپنے بارے میں بتاؤ۔"

جینی اس سوال کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ اس نے من گھڑت کہانی سنانا شروع کر دی۔ "میری پریشانی بھی مالی نوعیت کی ہے اگر مما یہاں آنے پر تیار ہو جائیں تو ہم مل کر اس پر قابو پا سکتے ہیں۔ میں خود بھی ہائی اسکول کونسلر کے طور پر کام کرتی ہوں اور اس ملازمت کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ میں ساری پینشن یک مشت حاصل کر سکوں اور میرے لیے قرب وجوار میں کوئی مکان حاصل کرنا بہت مشکل ہے لیکن اگر مما کے لیے اس جیسا اپارٹمنٹ مل جائے جہاں ان کی نگہداشت ہوتی رہے تو وہ زیادہ بہتر رہے گا۔"

"تمہاری شادی نہیں ہوئی۔" پینی نے پوچھا۔

"میری شادی ہو چکی ہے۔" جینی نے کہا۔

"اور تمہاری عمر کتنی ہے؟"

"گزشتہ ماہ باون برس کی ہو چکی ہوں۔"

"اوہ لیکن دیکھنے میں تم پینتیس کی لگتی ہو۔" اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "تم نے میرے حالات کے بارے میں پوچھا تھا تو صاف صاف بتا دوں کہ یہ ملازمت نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے شوہر کے مرنے پر بیمے کی رقم ملی تھی لیکن وہ مشکل وقت میں عارضی سہارا ثابت ہوئی۔ آرتھر کی ساری جائداد اس کے بھائیوں کو چلی جائے گی۔ یہ خاندانی روایت ہے جو اس کے باپ دادا سے چلی آرہی ہے اور آرتھر کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ اگر ڈیڈی کی حالت بہتر ہوتی رہی تو پھر میں صرف ویک اینڈ ہی ان کے ساتھ گزاروں گی۔ میں نے اپارٹمنٹ خالی نہیں کیا ہے اور میرا فرنیچر بھی ابھی تک وہیں ہے۔"

جینی کچھ دیر اس سے باتیں کرتی رہی لیکن اسے آرتھر کی چھوڑی ہوئی نقد رقم کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں مل سکا۔ اس کے برعکس وہ جس عورت سے مل کر واپس لوٹی تو وہ توقع کے خلاف ایک پریشان حال، غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ایک مصیبت زدہ عورت نظر آرہی تھی۔

آر جے مائیکل کا خیال تھا کہ سب سے پہلے وہ فنلے ہاؤس کی مکمل تلاشی لے۔ اس کے لیے اسے ایسٹر کی تعطیلات ختم ہونے کا انتظار تھا۔ جیمس فنلے کو بھی اس سلسلے میں کوئی جلدی نہیں تھی۔ البتہ وہ پینی رائٹ سے تحقیقات کے لیے بے چین تھا۔ اس بارے میں مائیکل نے پہلے تو انٹرنیٹ سے ابتدائی معلومات حاصل کیں پھر اس نے اپنی بیوی اور معاون کو پینی کے پاس بھیجا تاکہ وہ اس سے کچھ اگلوا سکے۔ جب وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ مائیکل نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "تم کچھ غیر مطمئن لگ رہی ہو؟"

"نہیں، جینی اپنا کوٹ صوفے پر ڈالتے ہوئے بولی۔ "میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتی کہ مجھے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا یا میں غلطی نہیں کر سکتی لیکن میں قطعی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ پینی لوپ پر شبہ کرنا ٹھیک نہیں اور میرے پاس اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ وہ ایک پونٹیاک کار استعمال کرتی ہے جو چار پانچ سال پرانی ہے۔ وہ کئی جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکی ہے لیکن ابھی تک اس کی مرمت نہیں ہو سکی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ریٹائرمنٹ سینٹر میں رہ رہی ہے جو بہت معمولی اور سستا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہاں کے تمام اخراجات اس کے باپ کی بچت اور پینشن سے پورے ہوتے ہیں۔ اس کے بدن پر معمولی لباس تھا اور تمہیں معلوم ہے کہ جب سے وہ فنلے ہاؤس چھوڑ کر آئی ہے، اپنے گزارے کے لیے ملازمت کر رہی ہے اور اس نے اپنے کام کی جو نوعیت بتائی اسے دیکھتے ہوئے مجھے شبہ ہے کہ اس کی کافی معقول تنخواہ ہو گی۔ البتہ اس نے یہ اعتراف کیا کہ شوہر کے مرنے پر اسے بیمے کی رقم ملی تھی جس سے اسے تھوڑا بہت سہارا ملا۔ اگر اس پر شک کیا جائے تو سوچا جا سکتا ہے کہ اس نے آرتھر فنلے کے چھوڑے ہوئے لاکھوں ڈالر کسی سیف ڈپازٹ بکس میں چھپا دیے ہوں گے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرے گی؟ وہ اس قسم کی عورت نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ اپنے حالات کے بارے میں بتایا، وہ سچ پر مبنی تھا۔ وہ ایک اجنبی عورت سے جھوٹ کیوں بولے گی۔ ابھی تک اس نے اپارٹمنٹ اپنے

پاس رکھا ہوا ہے اور جیسے ہی باپ کی طبیعت بہتر ہوئی تو وہ وہاں واپس چلی جائے گی۔''

اگلے روز مائیکل صبح نو بجے کے قریب آرتھر فنلے کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنی گاڑی میں ضروری اوزار رکھ لیے۔ مکان کی چابی اسے جیمس فنلے نے دے دی تھی۔ اس نے لوہے کا گیٹ کھولا اور گاڑی احاطے کے اندر لے گیا۔ اس نے اندر جانے سے پہلے عمارت کا باہر سے جائزہ لیا۔ اس نے گیراج کا دروازہ کھولا اور گاڑی احاطے کے اندر لے گیا۔ اس نے اندر جانے سے پہلے عمارت کا باہر سے جائزہ لیا۔ اس نے گیراج کا دروازہ کھول کر دیکھا۔ وہاں ایک پرانی جیگوار سیڈان کھڑی تھی اور باغبانی کے آلات رکھے ہوئے تھے۔ اس کار کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ آرتھر مکمل طور پر تارک الدنیا نہیں تھا گو کہ پینی اس کے تمام معاملات کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ وہ خود گاڑی چلا کر شاپنگ کرنے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نائی، دندان ساز اور ڈاکٹر کے پاس بھی وقتاً فوقتاً جایا کرتا تھا۔

جب وہ مکان کے اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں دو تھیلے اوزاروں اور ایک تھیلا پرزوں کا تھا۔ میں نے وہ چیزیں ڈیوڑھی میں رکھیں اور اندر کا جائزہ لینے لگا۔ گراؤنڈ فلور بہت زیادہ صاف نہیں تھا لیکن وہاں کوئی غیر ضروری سامان نظر نہیں آیا۔ کیبنٹ میں ایک بوربن کی بند بوتل رکھی ہوئی تھی جبکہ دوسری سائڈ ٹیبل پر تھی۔ کہیں کوئی اخبار نہیں تھا البتہ کرسی کی پشت پر ایک پرانا گاؤن پڑا ہوا تھا۔ مختلف کمروں میں چار ٹیلی فون اور اسٹڈی میں ایک آنسرنگ مشین رکھی ہوئی تھی۔ لیونگ روم میں اسکنڈے نیوین طرز کا فرنیچر رکھا ہوا تھا اور بڑے سائز کے ٹی وی کے سامنے ایک آرام کرسی تھی۔ کچن میں بھی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ ان میں مائیکروویو، ڈش واشر، ریفریجریٹر اور گیس کا چولہا وغیرہ شامل تھے۔ پورا مکان سینٹرلی ائرکنڈیشن تھا اور اسے گرم رکھنے کے لیے گیس فرنیس بھی لگائی گئی تھی۔ دیواروں پر آف وہائٹ پینٹ کیا گیا تھا جو جگہ جگہ سے مدھم ہو رہا تھا۔ مائیکل کو وہاں ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے اندازہ ہوتا ہو کہ وہاں کسی بھوت یا بدروح کا بسیرا ہو سکتا ہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر پہنچا جہاں دو زیرِ استعمال اور چار خالی بیڈ روم بمع تین باتھ روم تھے۔ اس نے ماسٹر بیڈ روم کا جائزہ لیا اور پہلی منزل پر آگیا۔ اس کے پاس پیمائش ناپنے کا فیتہ تھا۔ پہلے اس نے اسٹڈی کا معائنہ کیا پھر لیونگ روم میں ایک ایک چیز

مس کال

فقیر: ''باجی بھوکا ہوں اللہ کے نام پر کھانا دے دو۔''

باجی: ''کھانا ابھی پکا نہیں ہے۔''

فقیر: ''باجی کوئی بات نہیں میرا موبائل نمبر لکھ لو جب کھانا پک جائے تو مجھے مس کال کر دینا۔''

عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی

بنکاک کی سب سے خطرناک سواری ٹیکسی ہے۔ ٹیکسی تیز رفتاری سے ٹریفک سے بھرے ہوئے راستوں سے گزر رہی ہوتی ہے کہ اچانک مہاتما بدھ کا کوئی مندر نظر آتا ہے اور ڈرائیور فوراً ہی اسٹیئرنگ وہیل سے ہاتھ ہٹا کر نہیں جوڑ لیتا ہے اور سر جھکا کر مہاتما بدھ کو نمستے کہتا ہے۔

بنکاک کی ہر سڑک پر مہاتما بدھ کے کئی کئی مندر ہیں اور وہاں کا ایک ٹیکسی ڈرائیور بھی ایسا نہیں ہے جو مہاتما کا عقیدت مند نہ ہو۔

کو کھنگالا۔ فرنیچر، قالین کے نیچے کا فرش، آتش دان کی چمنی، دیواروں پر آویزاں تصاویر، تمام الماریاں اور کیبنٹ دیکھ ڈالے۔ گیارہ بجے تک اس کی تلاش مکمل ہو چکی تھی اور اب اس میٹل ڈیٹکٹر استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو وہ ایک دن کے لیے کرائے پر لایا تھا۔ ابھی وہ ڈائننگ روم کی دیواریں چیک کر رہا تھا کہ اس نے مکان کے عقبی دروازے کا تالا کھلنے کی آواز سنی۔ وہ یہ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھا کہ کہیں جیک فنلے نہ ہو لیکن وہاں پینی اسپتال کے گلابی رنگ والے لباس میں کھڑی تھی۔ کوٹ کی جیب پر اس کے نام کا بیج آویزاں تھا۔

''میں نے باہر کار کھڑی دیکھی تھی۔'' اس نے مائیکل کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم کون ہو؟''

''ٹھیکے دار۔'' مائیکل نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے مکان کا معائنہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ کیا میں تمہارا نام جان سکتا ہوں؟''

''میں پینی رائٹ ہوں اور یہ مکان میرے شوہر کا تھا گو کہ میں الگ رہ رہی تھی لیکن میری کچھ چیزیں یہاں رہ گئی تھیں۔ میں نے ہی اس کی لاش دریافت کی تھی لیکن اس کے بعد مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکی۔ اس ہفتے میری بارہ سے

آتھر کی شفٹ ہے اس لیے موقع مل گیا۔ میں اپنی چیزوں کے علاوہ کچن سے بھی اسپتال کے مریضوں کے لیے خشک خوراک لے کر جاؤں گی۔ جیمس فنلے کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''یہ میرا دردِ سر نہیں ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''البتہ اگر سامان زیادہ ہو تو اسے اٹھانے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''

جینی نے اس کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ دیکھنے میں سیدھی سادی اور ہمدرد نظر آرہی تھی، جب اس نے دو تھیلے اٹھا کر اس کی گاڑی میں رکھے تو وہ احسان مند نظر آنے لگی۔ جب وہ دوبارہ اوپر گیا تو سب کچھ ویسا ہی تھا البتہ ماسٹر بیڈروم کے پردوں کے پیچھے لگی ہوئی کھینچنے والی ریل غائب ہو چکی تھی گو کہ اس نے باتھ روم کی چوکھٹ میں لگی ہوئی ساؤنڈ ڈیوائس کو نہیں ہٹایا تھا۔ اس نے تانبے کی پلیٹ پر لگے ہوئے انگلیوں کے نشانات کی تصویریں لیں جو دیکھنے میں اس کے نشانات سے بڑے نظر آرہے تھے۔

اس تلاشی کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آرتھر یا اس کی بیوی نے وہ دولت اتنی مہارت سے چھپائی تھی کہ اس کے اوزار اور آلات بھی اس کی نشاندہی نہیں کر سکے یا پھر وہ دولت اس عمارت میں نہیں تھی۔ ساڑھے چار بجے اس نے دفتر پہنچ کر جیمس فنلے کو فون کیا اور پوچھا کہ کیا اسے آرتھر فنلے کی میز سے ملنے والے کاغذات سے کچھ معلومات ہوئیں۔

''ہاں۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''گزشتہ برس انکل آرتھر اپنے مکان پر واجب الادا ٹیکس کی دوسری قسط ادا نہیں کر سکے تھے۔ اس کے علاوہ انتقال کے وقت ان کے کریڈٹ کارڈ پر بھی دس ہزار ڈالر کے بقایاجات تھے جب میں نے اس بارے میں جینی کو فون کیا تو اس نے کہا کہ وہ صرف کریڈٹ کارڈ کے واجبات کے بارے میں جانتی ہے لیکن آرتھر نے کبھی اسے اپنے پیسوں کے حساب کتاب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔''

''کیا تم نے اس کی بات پر یقین کر لیا؟'' مائیکل نے پوچھا۔

''میں نے بینک اسٹیٹمنٹ دیکھا ہے اور اس سے اس کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے انکل آرتھر کی مالی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جینی نے مارچ دو ہزار سے پہلے ہی انکل کو دھوکا دے دیا ہو۔ کریڈٹ کارڈ کا ادھار اس کے بعد سے ہی بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔''

مائیکل نے بحث کرنے کے بجائے اس سے پوچھا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس جائداد کے بارے میں تمہارا کیا منصوبہ ہے؟''

''اسے موقع ملتے ہی فروخت کرنا ہے۔ اب اس جائداد کو خاندان میں رکھنا ممکن نہیں۔ خدا جانے میرے دادا نے جذبات میں آکر اس پر کتنا پیسا خرچ کر دیا لیکن ان کا یہ خواب کہ ہم اس مکان میں رہیں گے، آرتھر کے ساتھ ہی مر گیا۔''

''ایک اور سوال۔ تمہارے خیال میں اس مکان اور ملحقہ زمین کی کیا قیمت ہوگی؟ اندازے سے ہی بتا دو۔''

''بہت مشکل سوال ہے۔ اس مکان پر ٹیکس کا تخمینہ ہی پانچ لاکھ ترانوے ہزار ڈالر ہے اور عام طور پر جائداد کی مارکیٹ پرائس کے ایک تہائی کے برابر ہوتا ہے۔ اس طرح یہ قیمت اٹھارہ لاکھ کے قریب بنتی ہے۔''

''لیکن اس کے باوجود تمہارے والد اور تایا کی نظریں اس دولت پر ہیں جو کہیں چھپائی گئی ہے۔ انہیں امید ہے کہ اس میں سے بھی ہر ایک کے حصے میں پانچ پانچ لاکھ آجائیں گے۔''

''شاید اس سے بھی زیادہ۔'' جیمس نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک کہانی پڑھی تھی جس میں ایک بخیل شخص اپنی دولت کو سونے میں تبدیل کر کے اسے ہتھوڑے سے کوٹ کر پتلی چادروں میں تبدیل کر دیتا ہے اور اسے لائبریری میں لگے تختوں کے پیچھے چھپا دیتا ہے۔ انکل آرتھر بھی ایک انجینئر تھے اور انہیں اپنے کام میں بہت ہوشیار سمجھا جاتا تھا۔''

''میں نے آج میٹل ڈیٹیکٹر کی مدد سے اس مکان کی ایک ایک دیوار، چھت، فرش، الماریاں، خفیہ خانے، فرنیچر اور پچھلے پندرہ بیس برسوں میں کیا گیا پلاستر، سب کچھ کھنگال لیا لیکن کہیں بھی سونے یا کسی ایسے دھاتی برتن کا سراغ نہیں ملا جس میں کرنسی نوٹ، ہیرے جواہرات یا بانڈز وغیرہ ہوں۔ کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ آرتھر نے اپنی دولت کسی محفوظ مقام پر منتقل نہیں کی؟'' مائیکل نے بتایا۔

جیمس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، اب یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ جینی ساری دولت سمیٹ کر لے گئی۔ لہٰذا مسٹر مائیکل! اب یہ جاننا بہت ضروری ہو گیا ہے کہ اس نے یہ رقم کہاں رکھی ہوئی ہے تاکہ میں کسی وکیل سے بات کر سکوں۔''

''میں پہلے ہی اس پر کام کر رہا ہوں لیکن فی الحال

تفصیل نہیں بتا سکتا۔"

بلومنگ ڈیل ایسا مضافاتی علاقہ نہیں تھا جہاں سستے اپارٹمنٹ دستیاب نہ ہو سکیں۔ پینی نے بھی اپنے لیے ایسا ہی ایک اپارٹمنٹ تلاش کر لیا تھا۔ اسی روز شام کو چھ بج کر پینتیس منٹ پر آر جے مائیکل اپارٹمنٹ نمبر ایک سو بارہ کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ پینی رائٹ ان دنوں اپنے باپ کے پاس رہ رہی تھی اس لیے اس اپارٹمنٹ کی تلاشی لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی لیکن حیرت انگیز طور پر دروازے کے برابر والی کھڑکی سے روشنی کی لکیر باہر آ رہی تھی۔ اور وہ اندر سے آنے والی ٹیلی وژن کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ اصولاً مائیکل کو اس وقت وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ یہ کوشش بعد میں بھی کر سکتا تھا لیکن اس کا تجسس بڑھ گیا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ اندر کون ہے۔ لہٰذا اس نے دروازے پر دستک دے دی لیکن دروازہ کھولنے والا کوئی اور نہیں بلکہ آرتھر اور جیک کا بھائی بل فنلے تھا۔

"مسٹر...... معاف کرنا، میں تمہارا نام بھول گیا۔"

"آر جے مائیکل۔ مسٹر فنلے، میرا خیال تھا کہ یہ پینی لوپ کا اپارٹمنٹ ہے۔"

"میں یہاں عارضی طور پر رہ رہا ہوں۔" اس نے مائیکل کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "اندر آ جاؤ۔ مجھے تم سے بات کرنا ہے۔"

اس نے جونہی پورا دروازہ کھولا، مائیکل تیزی سے اندر داخل ہو گیا۔ بل اس کے پیچھے چلتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں گزشتہ جمعہ سے ہوں۔ جیک اور میں ہمیشہ سے ہی ایک دوسرے کے اعصاب پر سوار رہتے ہیں اور اس کی بیوی بیٹی کبھی نہیں چاہے گی کہ میں اس کے گھر قیام کروں۔ تم کرسی پر بیٹھ جاؤ اور صوفہ میرے لیے چھوڑ دو۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ بل نے ریموٹ کے ذریعے ٹی وی بند کیا اور بولا۔ "پہلے میں اپنے بارے میں بتا دوں۔ میں نیویارک میں رہتا ہوں اور ریٹائرڈ مکینیکل انجینئر ہوں۔ یہاں آرتھر کی تدفین میں آیا تھا لیکن اس سفر نے مجھے ادھ موا کر دیا اور میرے گھٹنے کی تکلیف بڑھ گئی چنانچہ میں ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ اس نے فوری طور پر گھٹنوں کا آپریشن تجویز کیا ہے۔ میں ریٹائرڈ اور غیر شادی شدہ شخص ہوں اور یہاں میرا کوئی دوست بھی نہیں ہے۔ آپریشن میں تین ہفتے باقی ہیں اور اس کے بعد خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے ٹھیک ہونے میں کتنا وقت لگے گا۔

"اب ہم پینی کی طرف آتے ہیں۔ جیک اس کے بارے میں غلطی پر ہے۔ وہ بینک میں کام کر چکا ہے۔ اس لیے صرف پیسوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہ آرٹ اور پینی کی شادی کے خلاف تھا اور اس پر اس کا آرٹ سے جھگڑا بھی ہو گیا۔ اس کے بعد ان دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی اور بیس سال سے ان کی بات چیت بھی بند تھی حالانکہ وہ ایک دوسرے سے بہت قریب رہتے تھے۔ جہاں تک میرے یہاں رہنے کا تعلق ہے تو پینی کو کسی طرح میرے گھٹنے کی تکلیف کا پتا چل گیا۔ شاید میں نے ہی اسے تدفین کے موقع پر بتایا ہو۔ اس نے دو دفعہ فون کر کے میری خیریت دریافت کی اور مشورہ دیا کہ میں یہاں قیام کروں۔ مجھے بھی ایک پرائیویٹ جگہ چاہیے تھی۔ پہلے تو میں نے انکار کر دیا لیکن جیک کے رویے کی وجہ سے مجھے یہاں آنا پڑا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "اب تمہارے بولنے کی باری ہے۔ شروع ہو جاؤ۔ فریج میں بیئر رکھی ہے اور تمہاری ٹانگیں مجھ سے بہتر حالت میں ہیں۔"

"یقیناً۔" مائیکل نے کہا اور فریج میں سے بوتل نکال کر لے آیا۔ پھر اس نے دو گلاس تیار کیے اور ایک فنلے کو دیتے ہوئے بولا۔ "تم نے پوچھا ہے کہ میں نے یہ کیس کیوں لیا تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ کیس دلچسپ لگا اور دوسری یہ کہ ان دنوں میرا دھندا مندا چل رہا ہے اور مجھے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔"

"گویا تم اس سے لطف اندوز ہو رہے ہو؟"

"کسی حد تک۔ درحقیقت میں نے آج ہی کام شروع کیا ہے۔ اگر تم یہاں نہ ہوتے تو میری کارروائی چل رہی ہوتی کیونکہ میں یہی سوچ کر آیا تھا کہ پینی رائٹ کہیں اور رہتی ہے اور اس ہفتے اس کی اسپتال میں دوپہر بارہ سے رات آٹھ بجے تک ڈیوٹی ہے۔"

"اوہ۔" بل کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ "گویا تم خفیہ دولت کی تلاش میں یہاں آئے ہو۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ تم اس اپارٹمنٹ کی تلاشی لے سکتے ہو۔"

"یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔" مائیکل نے کہا۔ "پہلے تم اپنے بھائی آرتھر کے بارے میں بتاؤ۔ وہ کس قسم کا شخص تھا؟"

"اس کی حالیہ زندگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا البتہ بچپن میں اسے اپنا آئیڈیل سمجھتا تھا۔ وہ مجھ سے چھ

سال بڑا تھا اور اس میں لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی صلاحیت تھی لیکن اس کی شخصیت کے کچھ ناگوار پہلو بھی تھے جن کی وجہ سے بہت سے لوگ اس سے دور ہو گئے۔ اس نے چار شادیاں کیں جن میں کوئی کامیاب نہ ہو سکی۔ دونوں بھائیوں سے بھی اس نے دوری اختیار کر رکھی تھی۔ اس سے میرا اختلاف چینی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ میں واپس آ کر فنطلے اینڈ سنز میں اس کا پارٹنر بن جاؤں جبکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ شراکت کامیاب نہیں ہو گی۔ میں پہلے ہی نیویارک میں دوسرے پارٹنرز کے ساتھ مل کر کمپنی چلا رہا تھا۔''

''ایک اور سوال۔'' مائیکل نے کہا۔ ''تم اور جیک گم شدہ دولت کے لیے کتنے بے چین ہو؟''

''بالکل بھی نہیں۔'' بل نے کہا۔ ''جب ڈیڈی کا انتقال ہوا تو وہ افراطِ زر سے پہلے کا زمانہ تھا۔ آرٹ کے حصے میں مکان اور کاروبار آیا جبکہ مجھے اور جیک کو پانچ پانچ لاکھ ملے۔ ہم دونوں اپنا کام کر رہے تھے اور آرٹ ہی اس جائیداد کا حقدار تھا۔ شاید اسی لیے اس نے یہ جائیداد ہم دونوں میں تقسیم کر دی کیونکہ اصل اثاثہ انجینئرنگ کمپنی کا تھا جو آرٹ پہلے ہی ٹھکانے لگا چکا تھا اور وہ مکان محض ایک بوجھ ہے جس پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے لیکن ڈیڈی کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس نے مکان فروخت نہیں کیا۔ تمہارے سوال کے جواب میں یہی کہوں گا کہ میرے پاس بہت کچھ ہے جبکہ جیک اور چینی دو کروڑ کے مالک ہیں لیکن یاد رہے کہ یہ بات میں نے تمہیں نہیں بتائی۔''

مائیکل اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''اب میں تھوڑا سا کام کر لوں۔ تم یہیں صوفے پر بیٹھے رہو۔''

مائیکل پہلے ہی کچن دیکھ چکا تھا۔ اب دو بیڈ روم اور چار الماریاں باقی تھیں۔ وہ پہلے بڑے بیڈ روم میں گیا جہاں کا زیادہ تر فرنیچر چینی پہلے ہی ریٹائرمنٹ ہوم میں منتقل کر چکی تھی۔ اب وہاں دیوار گیر آئینے کے نیچے صرف ایک سنگار میز تھی جس پر اس کی شادی کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ سوٹ میں ملبوس آرٹ فنطلے تھا جس کی شکل بل فنطلے سے بہت مل رہی تھی۔ اس کمرے کی الماری بالکل خالی تھی۔ دوسرے بیڈ روم میں بل فنطلے کی ذاتی اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ بستر کے نیچے مائیکل کو دو گتے کے باکس نظر آئے جن میں چینی کا اپنا مالیاتی ریکارڈ رکھا ہوا تھا۔ اس کے کریڈٹ کارڈ اور پے رول اسٹیٹمنٹ کا جائزہ لینے کے بعد مائیکل کو اس کی آمدنی کے ذرائع معلوم ہو گئے۔ اس کے پاس اٹھارہ ہزار اور پندرہ ہزار ڈالر مالیت کے دو سرٹیفکیٹ بھی تھے۔ اس کمرے کی ایک الماری سے مائیکل کو فوٹو البم بھی ملی جس میں شادی کی تصویر کی ایک ڈپلی کیٹ موجود تھی۔ مائیکل نے ایک حالیہ تصویر کے ساتھ وہ بھی البم سے نکال لی اور البم کو واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا پھر وہ لیونگ روم میں واپس آیا تو بل نے پوچھا۔

''کام ختم ہو گیا؟''

''نہیں، میں تمہارے بھتیجے سے ایک بات پوچھنا بھول گیا۔ شاید تم کچھ مدد کر سکو، کیا تمہیں معلوم ہے کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کی وجہ کیا بتائی گئی تھی۔ کیا اس کی ذہنی کیفیت مخدوش ہو چکی تھی؟''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ اس کی موت حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے ہوئی۔ مجھے اس کے اصل الفاظ تو یاد نہیں لیکن میں نے جیمس کے پاس اس کی موت کے سرٹیفکیٹ کی نقل دیکھی تھی۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ اسے چینی رائٹ کے جانے کا صدمہ تھا۔''

بل نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''کیا خیال ہے اگر میں تمہاری خدمات حاصل کر لوں۔ مجھے تمہارا معاوضہ معلوم ہے لیکن میں تمہیں چھ سو کے بجائے ایک ہزار ڈالر روزانہ دوں گا لیکن تم اپنی رپورٹ جیمس کو دینے سے پہلے مجھے دکھاؤ گے۔''

''تم مجھے دگنا معاوضہ کیوں دے رہے ہو جبکہ خود بھی اس جائیداد میں حصے دار ہو۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اپنا حصہ چینی اور اس کے باپ کو ایک ٹرسٹ کی صورت میں دینے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس طرح پیسا ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتا رہے گا۔''

''میں اس بارے میں سوچ کر جواب دوں گا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''کیا یہاں کا ٹیلی فون کام کر رہا ہے؟''

''ہاں۔'' بل نے میز پر رکھے ہوئے سیٹ کی طرف اشارہ کیا اور مائیکل نے وہاں کا نمبر نوٹ کر لیا۔ اس کے بعد وہ بل سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

منگل کے روز پانچ بج کر دس منٹ پر چینی کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ بل نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب سے مائیکل بول رہا تھا۔ ''مسٹر فنطلے! تم نے گزشتہ شب جو پیشکش

کی تھی، اس کے جواب میں میری ایک تجویز ہے ایک ہزار ڈالر کو بھول جاؤ۔ میرا معاوضہ چھ سو ڈالر مع اخراجات ہے۔ جہاں تک تمہیں پیشگی رپورٹ دینے کا تعلق ہے تو میں اس کے لیے تیار ہوں لیکن یہ میں جینی اور اس کے باپ کی موجودگی میں کروں گا۔ میں آج شب ساڑھے آٹھ بجے ایلکن میں اس سے ملاقات کر رہا ہوں۔ کیا تم وہاں آسکتے ہو؟''

اس سے پہلے کہ بل کوئی جواب دیتا، مائیکل نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں سواری کی ضرورت ہوگی؟''

''نہیں، میں پہنچ جاؤں گا۔'' بل نے ناگواری سے جواب دیا۔

آٹھ بجے بل اپنے اپارٹمنٹ سے روانہ ہوگیا۔ مائیکل وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ایک پُرکشش نوجوان خاتون سے بل کا تعارف کروایا جو اس کی بیوی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد جینی اپنی کار میں وہاں آئی اور گاڑی مقررہ جگہ پر پارک کر کے عمارت میں چلی گئی۔ اس کے بعد وہ لوگ گروپ کی شکل میں اس کے دروازے پر پہنچے۔ جینی نے ڈور بیل بجائی اور جب جینی نے دروازہ کھولا تو جینی بولی۔ ''مزید کوئی بات کرنے سے پہلے میں تم سے ہفتے کے روز بولنے والے جھوٹ پر معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ دراصل میں ورجینیا مائیکل ہوں۔''

''اوہ۔'' جینی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے یاد آگیا۔''

''آرچے مائیکل میرا شوہر ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اس سے مل چکی ہو۔''

وہ سب لوگوں کو اندر لے گئی۔ اس نے ان کے بیٹھنے کا انتظام کیا اور خود بوڑھے شخص کے برابر میں بیٹھ گئی۔ مائیکل نے بولنا شروع کیا۔ ''مسز رائٹ! میری خدمات حاصل کی گئی ہیں تاکہ میں تمہارے مرحوم شوہر کے اثاثوں سے متعلق بے قاعدگیوں کا پتا لگا سکوں۔''

''ہاں، بل نے مجھے پچھلے ہفتے بتایا تھا۔''

''جیمس نے مجھے تمہارے شوہر کے زوال کی پوری تاریخ بتائی ہے لیکن اس کی چھوڑی ہوئی نقد رقم کا پتا نہیں چل رہا۔ تمہارے بارے میں کہا گیا ہے کہ تم ہی ممکنہ فرد ہو جس کی اس میں دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن میں پہلے سے قائم تصورات کی بنیاد پر تحقیقات نہیں کیا کرتا۔ مجھے شروع سے ہی یہ لگ رہا ہے کہ اس کیس میں ایک نہیں بلکہ تین بھید ہیں۔ پہلا یہ کہ گمشدہ دولت کہاں گئی۔ دوسرا یہ کہ اس مکان میں داخل ہونے والے کو ڈرانے کے لیے بوبی ٹریپ کیوں لگائے گئے اور تیسرا معما تم خود ہو مسز رائٹ کیونکہ تم نے اپنے مرحوم شوہر کی زندگی اور موت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے تمہیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔

''یہ کہنا غلط ہوگا کہ میں نے جیمس کی فراہم کردہ اطلاعات کی بنیاد پر تمہارے بارے میں رائے قائم نہیں کی لیکن اس کے علاوہ بھی مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ ان میں سے ایک یہ کہ مکان کی مکمل تلاشی لی جائے اور دوسرے یہ کہ تمہارے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے لیے جینی نے اپنی خدمات رضاکارانہ طور پر پیش کیں۔ اس نے تم سے ملنے کے بعد جو محسوس کیا، اس بارے میں وہ خود ہی بتائے گی۔''

جینی نے کہنا شروع کیا۔ ''جیسا کہ میں مائیکل کو بتا چکی ہوں۔ تم سے ملنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ جیک قطعے اور اس کے بیٹے کا شبہ غلط ہے اور تم نے اس سلسلے میں کوئی فراڈ نہیں کیا۔ تمہاری ظاہری حالت، رہن سہن اور گزر اوقات کے لیے معمولی ملازمت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایک غریب عورت ہو۔''

''میں نے بھی تمہارے بارے میں یہی تاثر قائم کیا۔'' مائیکل نے کہا۔ ''لیکن اگر تم نے وہ دولت نہیں ہتھیائی تو وہ کون ہو سکتا ہے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ تمہارے شوہر نے اپنی ساری دولت مکان میں کہیں چھپا دی ہو اور مرتے دم تک اس بارے میں کسی کو نہیں بتایا لیکن تلاشی لینے کے بعد یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ میری تمام تحقیق، جستجو اور گزشتہ روز بل سے ہونے والی گفتگو کے بعد تمہارے شوہر کی دولت کے بارے میں جو حقائق سامنے آئے۔ وہ کچھ یوں ہیں۔''

مائیکل نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''جب تمہارے سسر کا انتقال ہوا تو آرتھر نے اس کے چھوڑے ہوئے اثاثے تقسیم کر دیے۔ بھائیوں کو ان کا حصہ نقد رقم کی صورت میں دے دیا اور اپنے پاس جائیداد رکھ لی جو انجینئرنگ فرم اور اس پرانے خاندانی مکان پر مشتمل تھی۔ انیس سو چوہتر تک وہ مکان خالی رہا پھر آرتھر اس میں منتقل ہوگیا اور چار یا پانچ سال بعد اس نے تم سے شادی کر لی۔ اسی دوران اس نے کوشش کی کہ بل واپس آکر خاندانی کاروبار میں اس کا ہاتھ بٹائے مگر بل نے انکار کر دیا۔ اس کے پانچ سال بعد کاروبار میں نقصان ہونے کی وجہ سے اس نے انجینئرنگ فرم فروخت کر دی اور خود فراغت کی زندگی گزارنے لگا۔ انیس سو چھیانوے میں تمہاری

شوہر سے علیحدگی ہوگئی اور تم نے گزر اوقات کے لیے ملازمت کرلی۔ سن دو ہزار میں اس نے کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادھار لینا شروع کیا اور پراپرٹی ٹیکس کی دوسری قسط بھی ادا نہیں کرسکا۔ انتقال کے وقت اس کا ریٹائرمنٹ فنڈ نہ ہونے کے برابر تھا۔ دراصل وہ کاروباری شخص نہیں تھا۔ اسی لیے اسے کاروبار میں نقصان ہوا۔ اس نے انجینئرنگ فرم بیچ کر وہ پیسا اسٹاک میں لگایا لیکن چار سال بعد اسٹاک مارکیٹ پر زوال آیا تو اس نے گھبرا کر تمام شیئرز فروخت کردیے۔ انیس سو چھیانوے تک وہ پراپرٹی ٹیکس کی مد میں ساڑھے تین لاکھ ڈالر ادا کرچکا تھا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ آرتھر فنلے نے انیس سو سڑسٹھ سے گزشتہ برس تک اس مکان اور زمین کا دس لاکھ ڈالر سے زیادہ پراپرٹی ٹیکس ادا کیا جسے وہ اپنے باپ سے کیے گئے وعدے کے مطابق اپنے خاندان کے لیے رکھنا چاہتا تھا۔"

"جیک اور جیمس فنلے نے اس کی دولت کے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے۔ اس کی قدر تو انیس سو ستاسی میں ہی گھٹ گئی تھی۔ بقیہ افراط زر، ٹیکسوں اور مصارف زندگی کی نذر ہوگئی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر سب لوگوں کو دیکھا پھر بولا۔ "اس طرح ایک معما تو حل ہوگیا۔ جہاں تک بوبی ٹریپ کا تعلق ہے تو یہ حرکت آرتھر فنلے کی ہوسکتی ہے۔ وہ ایک انجینئر تھا اور اس نے اپنے مکان کو چوروں سے محفوظ رکھنے کے لیے یہ بوبی ٹریپ لگائے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جیمس فنلے وہ مکان دیکھنے گیا تو اسے مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں سنائی دیں اور وہ خوف زدہ ہوکر وہاں سے چلا آیا۔"

اس کے بعد مائیکل نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تھوڑا سا ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کہ اب سچ سامنے آنا چاہیے۔ گزشتہ رات آرچ مائیکل تمہارے اپارٹمنٹ گیا تھا اور بل نے اسے تلاشی کی اجازت دے دی تھی تلاشی کے دوران اسے یہ دو تصویریں ملیں۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ دونوں فوٹو جینی کے زانو پر رکھ دیے۔ جینی کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "اوہ۔"

"اپنے باپ کے بارے میں بتاؤ، جینی۔ اس کی موت کس طرح ہوئی تھی؟"

☆☆☆

سوموار کی شام جب مائیکل گھر پہنچا تو آٹھ بج چکے تھے اور جینی کھانے پر اس کا انتظار کررہی تھی۔ اس سے زیادہ اسے یہ جستجو بھی تھی کہ وہ جس مقصد سے جینی کے اپارٹمنٹ گیا تھا۔ اس میں اسے کتنی کامیابی ہوئی اور اب تک اس کی تحقیقات کہاں تک پہنچی۔ یہ ان کا معمول تھا کہ وہ کھانا شروع کرنے سے پہلے لیونگ روم میں بیٹھ کر کچھ دیر باتیں کرتے لہٰذا جینی اس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔

"میں نے آرتھر کی گمشدہ دولت کی حقیقت معلوم کرلی ہے۔" مائیکل نے بولنا شروع کیا۔ "اس کا کوئی وجود نہیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا اور دوسرے یہ کہ جینی اتنی معصوم نہیں جتنی نظر آتی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے دو تصویریں نکالیں جن میں جینی ایک بوڑھے شخص کے ساتھ نظر آرہی تھی۔ ان میں سے ایک آرتھر فنلے کے ساتھ اس کی شادی کی تصویر تھی جبکہ دوسری میں وہ ایک ایسے شخص کے ساتھ تھی جس کا چہرہ اس سے بہت مل رہا تھا۔

جینی کو خیال آیا کہ جس شخص کو اس نے گزشتہ ہفتے جینی کے گھر دیکھا تھا۔ وہ اس کا باپ نہیں بلکہ آرتھر فنلے تھا۔ چوبیس گھنٹوں بعد وہ ان تصویروں کے ساتھ جینی کے سامنے بیٹھی ہوئی اس سے وضاحت طلب کررہی تھی۔ آرتھر فنلے نے ہی اس سکوت کو توڑا اور اپنا بازو اس کی گردن میں ڈالتے ہوئے آہستہ سے بولا۔ "مجھے افسوس ہے جینی، یہ ایک اچھی کوشش تھی۔"

اس مرحلے پر جینی کا ضبط جواب دے گیا اور وہ آرتھر فنلے کے سینے میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ جینی اپنی کرسی پر واپس آگئی۔ تبھی بل فنلے بولا۔ "کیا تم میاں بیوی انہیں تنہا چھوڑ سکتے ہو؟"

"ہاں۔" جینی نے کہا۔ "بشرطیکہ ہمیں سچ معلوم ہو جائے۔"

"میں بتاتی ہوں۔" جینی نے کہا۔ "جس رات ہم لوگ اس شہر میں آئے۔ میرے باپ کا سوتے میں انتقال ہوگیا جبکہ فلوریڈا میں کارڈیالوجسٹ نے انہیں سفر کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن یہ سفر ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ پہلی پرواز دو گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوئی۔ پچیس منٹ جہاز سے باہر آنے میں لگے اور ایک گھنٹا ٹیکسی کا انتظار کرنا پڑا۔ ہم پونے آٹھ بجے گھر پہنچے اور بری طرح تھک چکے تھے۔ رات کے کھانے میں ہم نے انڈے اور توس کھائے اور سوگئے۔ صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب میری نظر اپنے باپ پر گئی۔ ان کی سانس بند ہوچکی تھی اور نبض بھی نہیں چل رہی تھی۔ میں سمجھ گئی کہ انہیں مرے ہوئے ایک گھنٹا ہوچکا ہے۔

میری نیند پوری نہیں ہوئی تھی لیکن دماغ تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس وقت مجھے آرتھر اور اس کی خراب مالی حالت کا

خیال آیا جو کہ بہت ہی خوفناک تھا لیکن میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی تھی۔ میں نے فون کر کے اسے جگایا اور کہا کہ مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہے اور میں پندرہ منٹ میں اس کے پاس آرہی ہوں لہٰذا وہ لباس تبدیل کرلے پھر میں اسے یہاں لے آئی اور اپنا منصوبہ سمجھایا۔"

"میں نے سوچا کہ اس کا دماغ چل گیا ہے۔" آرتھر فنطلے نے کہا۔ "لیکن وہ میری بھلائی کے لیے یہ سب کررہی تھی۔ میں نے گزشتہ سالوں میں اسے بہت دکھ دیے تھے اور ان کی تلافی اسی طرح ہوسکتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس کی بات مان لی۔"

"ہم ڈیڈی کو کار میں ڈال کر آرتھر کے گھر لے گئے۔ انہیں آرتھر کے کپڑے پہنائے اور ان کی مخصوص آرام کرسی پر بٹھا دیا۔ پھر آرتھر کی ذاتی اشیا اکٹھی کیں اور انہیں لے کر یہاں آگئی۔ میں اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ میں نے کئی ہفتے اسی پریشانی میں گزار دیے۔ سب سے مشکل مرحلہ لاش دریافت کرنے کا تھا۔ بے چارے ڈیڈی، میں اپنے دل کو تسلی دیتی رہی کہ یہ سب کچھ میں آرتھر کی بھلائی کے لیے کررہی ہوں۔"

"بہرحال آرتھر نے داڑھی بڑھانا شروع کردی اور جب وہ گزشتہ ہفتے طبی معائنے کے لیے گیا تو کسی کو شک نہیں ہوا کہ وہ میرا باپ نہیں بلکہ آرتھر ہے۔"

بل اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "میں نے اسے قبرستان میں ہی پہچان لیا تھا۔ ہماری کاریں برابر برابر کھڑی ہوئی تھیں گو کہ وہ پہلے سے دبلا ہوگیا تھا اور اس نے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی جو وہ پہلے نہیں پہنتا تھا۔ اس سلسلے میں تم مجھے بھی الزام دے سکتے ہو۔ جب میرے بھتیجے نے تمہیں فون کیا مسٹر مائیکل، تو مجھے اندازہ تھا کہ تمہیں اس سلسلے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"یہ سچ ہے کہ اس عورت کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی تھی۔" مائیکل نے کہا۔ "لیکن وہ اب تک اس کا خیال رکھتی رہی ہے۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دس ہفتوں تک اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے اسے ایک مرتبہ بھی فون نہ کرے خواہ دوسرے معاملات میں کتنی ہی مصروف کیوں نہ ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ آرتھر کے گھر میں فون نہ ہو جبکہ میں نے وہاں چار عدد ٹیلی فون اور ایک آنسرنگ مشین بھی دیکھی تھی۔"

"تم نے ثابت کر دیا کہ واقعی بہت اسمارٹ ہو۔" آرتھر فنطلے نے آہستہ سے کہا۔ "کیا تم ہمارا یہ چھوٹا سا راز اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکو گے؟"

"آرتھر!" پینی چلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں، تمہیں یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

آرتھر نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "میں بہت تھک گیا ہوں پینی اور خوف زدہ بھی ہوں۔ انہوں نے ہمیں پہچان لیا ہے۔"

اس موقع پر جینی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "ہم سوچ رہے ہیں کہ کیا تمہارے پاس کوئی ایسا ریکارڈ ہے جس سے آرتھر کے مالی معاملات کی تفصیل معلوم ہوسکے۔"

آر جے مائیکل نے کہا۔ "اگر ایسا کوئی ریکارڈ ہے تو پینی اسے بل کے حوالے کردے تو وہ اسے اپنے بھتیجے کو دکھا دے گا اور اسے سادہ لفظوں میں سمجھا دے گا کہ آرتھر کے پاس کوئی ایسی دولت نہیں تھی جو پینی نے چھپا رکھی ہو۔ اس طرح تم دونوں محفوظ ہوجاؤ گے جب تک تم خود کو اس راز کو چھپائے رکھو۔"

"جہاں تک میری رپورٹ کا تعلق ہے تو جیمس کو یہی بتاؤں گا کہ میں آرتھر فنطلے کی مفروضہ دولت تلاش نہیں کرسکا اور میری تحقیق کے مطابق پینی کے پاس وہ دولت نہیں ہے۔ میں اسے یہ بھی بتادوں گا کہ اس کے ساتھ مزید کام کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اب میرا بل سے معاہدہ ہوگیا ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک کہانی گھڑنا ہوگی کہ تم نے کس طرح مجھ سے رابطہ کیا۔"

اس کے بعد واقعات اسی ترتیب سے رونما ہوتے گئے جیسا کہ توقع کی جارہی تھی۔ جینی اور پینی مسلسل رابطے میں تھیں اور چند ہفتوں بعد ہی پینی نے کاغذات کا ایک بڑا بنڈل بل کے حوالے کردیا جس میں آرتھر فنطلے کی تیزی سے کم ہوتی ہوئی دولت کا مکمل ریکارڈ تھا اور آخری دنوں میں وہ مالی طور پر بالکل قلاش ہوچکا تھا اسی لیے پینی نے اسے ٹیکس کے بوجھ سے آزاد کرنے کے لیے اس کی موت کا ناٹک رچایا تا کہ وصیت کے مطابق وہ مکان اس کے بھائیوں کے پاس چلا جائے اور وہی اس کی ذمے داریاں پوری کرتے رہیں۔

دو ہزار پانچ میں آرتھر کا بھی انتقال ہوگیا اور پینی مستقل طور پر ریٹائرمنٹ روم میں رہنے لگی۔ اس کے کچھ عرصے بعد بل فنطلے بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور اس نے تمام جائداد پینی کے نام کردی جس نے وہ تمام رقم فنطلے ہاؤس کے مغرب میں آرتھر اینڈ ولیم فنطلے وزیٹرز سینٹر کی تعمیر کے لیے وقف کردی۔ یقیناً اس خبر سے جیک فنطلے اور جیمس کو خوشی نہیں ہوئی ہوگی لیکن وہ بل کو ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے تھے۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

اٹھارہویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خودغرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں یہاں سے بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبر دارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے بھی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ نمبر دارنی کو زخمی کرنے والا مولوی صاحب کا شاگرد طارق تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس "بلیک میلنگ" سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یا سر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر ساتا جی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ ایسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کی تلاش میں ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے دامن میں جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگی محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر پہنچ گئے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماؤجی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی پوتی مہناز عرف مانی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول سے ہماری جان بچ گئی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقرے سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقرے کو چت کر دیا تو میں نے سجاول کو مقابلے کا چیلنج کر دیا۔ میرے چیلنج نے سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔ اس دوران ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر چاند گڑھی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آ گیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ غنڈے ٹیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے

میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں تہلکہ مچاتا رہا اور دوسری طرف اسکائی ماسک کی اوٹ میں ٹیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِ پیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ سنبل کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجاسنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پاراہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ برونائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ برونائی میں اس کی خاندانی دشمنی تھی۔ سب ٹھیک تھا کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پاراہاؤس پر حملہ کردیا جن کا سرغنہ ناقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحبہ کی جان بچائی لیکن سرغنہ ناقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنالیا۔ مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب! پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغواکاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغواکار مار دیے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پاراہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پاراہاؤس میں کوئی بڑا چکر چل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔ یہیں مجھ پر انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر ارم پاراہاؤس کے ذاتی اسپتال میں موجود ہے اور اس نے دھوکے سے رضوان ٹی کو دوبارہ قابو کرلیا ہے۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی گئی تھیں، وہ پاراہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی رونمائی کی گئی تو ان میں ایک زینب تھی۔ زینب، ابراہیم سے منسوب کی گئی تھی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سجاول پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ابراہیم سے ملاقات کی اور اس سے معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ دونوں بھائیوں میں زہریلا پن موجود ہے اسی لیے ان کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں۔ لیکن میں نے ابراہیم کو آگاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور شادی کی صورت میں اسے نقصان ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے خون کی میڈیکل رپورٹ درست نہیں ہے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہوگیا۔ ادھر آقا جان جو پاراہاؤس کا کرتا دھرتا تھا، اس نے سرغنہ ناقب کے فرار کا ڈراما رچایا۔ ایک بار پھر پاراہاؤس میں دھماکے گونج اٹھے۔ تابڑتوڑ گولیاں چلنے لگیں اور مقابلے میں سرغنہ ناقب اور اس کا ساتھی عبرت ناک موت مارے گئے۔ میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کے خون کو دوبارہ ٹیسٹ کرایا۔ تو حقیقت کھل کر سامنے آگئی۔ پہلی رپورٹ ڈاکٹر ارم سے تیار کرائی گئی تھی۔ راز کھل جانے کے ڈر سے ڈاکٹر ارم کو بیدردی سے قتل کردیا گیا۔ رضوان ٹی بھی غائب تھا۔ قتل کا الزام رضوان پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ سب کچھ آقا جان کرا رہا ہے۔ ناقب کی موت کے بعد برونائی میں مخالفین نے بڑی کارروائی کرکے وڈے صاحب کے برادرِ نسبتی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال تھا، ان حالات سے نبردآزما ہونے کے لیے میں اور سجاول وڈے صاحب کے ساتھ برونائی جانے کے لیے تیار تھے۔ برونائی جانے سے پہلے میں ایک نظر تاجور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طویل فاصلہ طے کرکے میں تاجور کی ایک جھلک ہی دیکھ پایا تھا کہ گاؤں کے چند لڑکوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے سامنے وہ بچے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے گلے کا ہار بن گیا اور میرا پیچھا کرتا ہوا پاراہاؤس تک آگیا۔ سیف عرف سیفی کی شخی نکالنے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ برونائی لے آئے تھے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ آقا جان کا بیٹا مخالف پارٹی بن چکا تھا اور امریکا ایجنسی کے ساتھ مل کے پورے حصے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ آقا جان کی بھتیجی قسطینا کمانڈر آفیسر تھی اور جی دار آفیسر تھی.... وہ مجھے پہچان چکی تھی کہ میں ایسٹرن کنگ ہوں۔ وہ ایک خفیہ منصوبہ ترتیب دے چکی تھی اور تنہا اپنے مشن پر جانا چاہتی تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اب رات کے قریباً بارہ بج چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق کچن میں دو مسلح گارڈز موجود تھے۔ عام طور پر کچن میں موجود لوگوں کی تعداد چار پانچ تک ہوتی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جاتا تو کارروائی کے لیے یہ وقت مناسب تھا۔ مناسب نہ بھی ہوتا تو آج رات کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ ہم اِن ٹین کی چادروں کے نیچے کل کے تپتے سورج کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔

میرے پاس ایل ایم جی تھی اور اس کے قریباً چالیس راؤنڈ تھے۔ قسطینا نے جو رائفل تھام رکھی تھی، وہ دراصل حیات کی رائفل تھی۔ حیات تو اپنی مالکن (قسطینا) پر قربان ہو چکا تھا، اب اس کی رائفل مالکن کا ساتھ دے رہی تھی۔ میں نے اپنے اور کچن کے درمیانی فاصلے کو نگاہوں نگاہوں میں بھانپا۔ اگر ہم چادروں کے نیچے سے نکلتے اور رینگتے ہوئے کچن کی طرف جاتے تو ہمیں قریباً ایک منٹ لگتا۔ اگر کچن میں اس وقت واقعی دو افراد تھے تو پھر ہمیں ان پر کنٹرول حاصل کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوسکتی تھی۔ ہماری اولین کوشش یہی ہوتی کہ یہ دونوں افراد آواز نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکیں تاکہ ہم اردگرد کے خطرات سے محفوظ رہیں۔ ان دو افراد پر غلبہ پانے کے بعد ہمیں کیا کرنا تھا، اس کا فیصلہ ہم ابھی نہیں کرسکتے تھے۔

''تیار ہو؟'' قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔

''ایک سو ایک فیصد۔'' میں نے جواب دیا۔

"اپنے کندھے کا خاص خیال رکھنا۔"
"اور آپ کو اپنا خیال رکھنا ہے۔"
اس سے پہلے کہ ہم اپنی جگہ سے حرکت کرتے، ایک زوردار دھماکا ہوا۔ سناٹے کا شیشہ چکنا چور ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا دھماکا ہوا۔ ہم نے دھماکوں کے ساتھ ہی تیز چمک بھی محسوس کی۔ یہ بھاری ہتھیاروں کی شیلنگ تھی۔ یقیناً مارٹر استعمال ہو رہی تھی اور شاید راکٹ بھی داغے جا رہے تھے۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ فائرنگ ریان فردوس کی فورس کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ تاہم جلد ہی رائے زل کے سپاہیوں نے بھی جواب دینا شروع کر دیا۔ دونوں طرف سے مارٹر اور بزوکا کے گولے پھینکے جانے لگے۔ قرب و جوار مسلسل دھماکوں کی وجہ سے لرزنے لگے۔
"کیا آپ کے لوگ ایڈوانس کریں گے؟" میں نے سرگوشی میں قسطینا سے پوچھا۔
وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ "ایڈوانس کرنا تو چاہیے۔ یہ علاقہ دو دن پہلے تک ہمارا تھا...... انہوں نے دھوکے سے حملہ کیا ہے اور علاقہ چھینا ہے۔"
فائرنگ اور شیلنگ کی شدت بڑھتی گئی۔ دھماکوں سے چھت خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ ہم ایک طرح سے کھلی جگہ پر تھے۔ کوئی راکٹ یا شیل چھت پر گرتا تو ہمیں راہیِ عدم کر سکتا تھا۔
قسطینا کو امید تھی کہ حملہ شدت اختیار کرے گا اور افغانی وغیرہ عزت مآب کے حکم پر اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے کی بھرپور کوشش کریں گے۔ مگر کل کی طرح آج بھی اس کی توقع پوری نہیں ہوئی۔ ہیلی کاپٹروں والا حملہ بہت جلد ختم ہوگیا تھا۔ آج یہ گولہ باری قریباً آدھ گھنٹا وقفے وقفے سے جاری رہی پھر ختم ہوگئی۔ عسکری زبان میں اس قسم کی فائرنگ کو "فرینڈلی فائرنگ" کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دشمن کو اپنی موجودگی اور چوکسی کا احساس دلایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ اگر اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ بے شک اس طرح کی فائرنگ میں جانی اور مالی نقصان بھی ہوتا ہے۔
فائرنگ تھم گئی تو ایک بار پھر سب کچھ معمول پر آنے لگا۔ ہمیں نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن اسپتال کے اردگرد مورچوں میں دبکے ہوئے سپاہی یقیناً باہر نکل آئے تھے۔ نچلے فلور سے آنے والی آوازوں سے پتا چلتا تھا کہ اسپتال میں پھر سے معمول کی سرگرمیاں شروع ہوگئی ہیں۔ سرونٹ کوارٹر کی طرف بھی گارڈز کا ہلا گلا بحال ہوگیا تھا۔ تاہم کچن کی طرف خاموشی تھی۔ گولہ باری سے پہلے وہاں دو گارڈز موجود تھے۔ تاہم اب کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے کچن خالی ہے؟" قسطینا نے پوچھا۔
"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"
"تو پھر نکلا جائے؟" قسطینا نے دبے دبے جوش سے کہا۔ کہنے کو تو اس نے سوال پوچھا تھا لیکن حقیقت میں وہ حکم دے رہی تھی۔
پہلے قسطینا پیٹ کے بل رینگ کر چادروں کے نیچے سے نکلی، پھر میں بھی آ گیا۔ پچھلے اڑتالیس بلکہ پچاس گھنٹوں کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں ٹین کی ان منحوس لہریے دار چادروں کے نیچے سے نکلا تھا۔ نیم تاریکی میں ہم رینگتے ہوئے کچن کی طرف گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر ہم اس گھیرے سے نہ بھی نکل سکے تو کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہمیں ٹھنڈا پانی نصیب ہو جائے گا اور کھانے کو کچھ مل جائے گا۔ کچن میں یقیناً اشیائے خورونوش موجود تھیں۔ کسی قورمہ ٹائپ سالن کی خوشبو ہم اتنی دور سے بھی سونگھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ پیاز کی خوشبو تھی اور شملہ مرچ کی مہک تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ بھوک پیاس میں انسان کی قوتِ شامہ بے حد تیز ہو جاتی ہے۔ شدید جانی خطرے کے باوجود حسِ شامہ اپنا کام کر رہی تھی۔
جوں جوں ہم کچن کے قریب ہوتے گئے، دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ میں اور قسطینا تقریباً پہلو بہ پہلو رینگ رہے تھے۔ رائفلیں بالکل تیار حالت میں تھیں۔ قسطینا چند انچ آگے نکل گئی اور پھر ایک دم رک گئی۔
اس نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ "دونوں اندر ہی ہیں۔"
اب میں بھی انہیں دیکھ چکا تھا۔ وہ کچن کے فرش پر ہی ایک چٹائی پر لیٹے تھے اور ان کے قریب ہی وہسکی کی بوتل پڑی تھی۔ وہ ہیڈ فون لگائے شاید موسیقی سن رہے تھے۔ میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر رائفل کو دیوار کے ساتھ رگڑا۔ خاصی آواز پیدا ہوئی نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتا تھا۔ ایک گارڈ نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہ امریکی تھا۔ میں نے اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ایسا کرتے ہوئے میرے بائیں کندھے میں ناقابلِ برداشت ٹیس اٹھی مگر دایاں بازو تو پوری طرح صحت مند تھا۔ گارڈ کوئی آواز نہیں نکال سکا اور اب اس نے کبھی کوئی آواز نکالنا بھی نہیں تھی۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا مگر کوئی رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس لیے گردن پر طاقت کچھ زیادہ صرف ہوگئی تھی۔ وہ میرے ہاتھوں میں توری کی طرح جھول گیا، میں نے اسے آہستہ سے نیچے لٹا دیا۔

ابھی میں اسے لٹا کر سیدھا بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسرا گارڈ پہنچ گیا۔ شاید اس نے کچھ کھٹ پٹ سن لی تھی۔ قسطینا اس کے لیے پہلے سے تیار تھی۔ اس نے وزنی رائفل کے دستے کا نہایت جچا تلا وار نووارد کی کنپٹی پر کیا، وہ گھٹنوں کے بل گرا۔ رہی سہی کسر میرے گھونسے نے پوری کر دی اور وہ چت ہو گیا۔ یہ شکل وصورت سے ملائیشین لگتا تھا۔ ہم نے دونوں کو پھرتی سے کچن میں گھسیٹا اور دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔ یہاں ایک ہی کھڑکی تھی، اس کا پردہ پہلے سے برابر تھا۔

''کیا یہ مر گیا؟'' قسطینا نے امریکی کا چہرہ دیکھ کر کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ امریکی جواں سال تھا۔ اٹھائیس تیس کا رہا ہوگا۔ وہ ایجنسی والوں کی سبز وردی میں تھا۔ ریان فردوس کے سپاہیوں اور ایجنسی والوں کی وردی میں فقط اتنا فرق تھا کہ ایجنسی والوں کی ٹوپیاں سبز اور سرخ دھاریوں والی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا، ایک امریکی کا مرنا کتنا اہم ہوتا ہے اور جب یہی امریکی ہیروشیما میں، ویت نام میں، افغانستان اور عراق میں لاکھوں بے گناہوں کو مار ڈالتے ہیں تو یہ بس حالات کی کارستانی ہوتی ہے۔

امریکی اور ملائیشین گارڈز کی ٹوپیاں ہیلمٹس اور رائفلیں وغیرہ دیوار کی کھونٹیوں پر جھول رہی تھیں۔ ملائیشین کے بارے میں بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے پوری طرح ہوش میں نہیں آئے گا۔ ایک دم میرے ذہن میں خیال آیا۔ میں نے قسطینا سے کہا۔ ''ہم کیوں نہ ان کی یونیفارمز استعمال کریں۔''

اس نے چونک کر دونوں افراد کی طرف دیکھا۔ درمیانے قد کے ملائیشین کی وردی قسطینا کے جسم پر آسکتی تھی۔ ان دونوں کی بلٹ پروف جیکٹس بھی یہاں موجود تھیں اور ہیلمٹس بھی۔ یہ سب چیزیں ہمارے کام آسکتی تھیں۔ کچن کے اردگرد مکمل خاموشی تھی۔ میں نے ریفریجریٹر کھولا۔ منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتلیں موجود تھیں۔ پانی پی کر یوں لگا جیسے جسم میں زندگی اتر رہی ہے۔ جان میں جان آئی۔ کچھ سینڈوچ بھی ریفریجریٹر میں سے نکل آئے۔ آگے بڑھنے کے لیے جسمانی توانائی کی ضرورت تھی۔ ہم نے جلدی جلدی تین چار سینڈوچ نگلے۔ ''لائٹ آف کر دو۔'' قسطینا نے کہا۔

میں نے لائٹ آف کر دی۔ اب بس کھڑکی اور روشن دان سے آنے والی مدھم روشنی ہی کچن میں موجود تھی۔

ہم نے جلدی جلدی اپنا لباس تبدیل کیا۔ ایسا کرتے ہوئے میں نے اپنا رخ قسطینا کی طرف سے پھیر لیا تھا۔ امریکن کی یونیفارم میرے جسم پر بالکل درست آئی۔ جیسے یہ میرے ناپ پر بنائی گئی ہو۔ بہرحال ملائیشین گارڈ والی یونیفارم قسطینا کے جسم پر پوری نہیں اتری۔ لمبائی میں تو یہ تقریباً ٹھیک ہی تھی، کیونکہ قسطینا کا قد لمبا تھا مگر چوڑائی کے رخ پر یہ یونیفارم سے کچھ ڈھیلی رہی۔ اس ڈھیلے پن کی کمی بلٹ پروف جیکٹ نے پوری کر دی۔ ایک بلٹ پروف جیکٹ میرے حصے میں بھی آگئی۔ ہم نے سیفٹی ہیلمٹس بھی سروں پر رکھ لیے۔ بوٹوں کا مسئلہ تھوڑا سا ٹیڑھا ہوا۔ ملائیشین گارڈ والے بوٹ قسطینا کے لیے بہت کھلے تھے۔ وہ یہ بوٹ نہیں پہن سکی اور اس نے اپنے ہی بوٹ دوبارہ پہن لیے۔ دونوں گارڈز کے جسموں پر اب فقط ان کے زیر جامہ ہی تھے۔ ہم نے انہیں گھسیٹ کر ایک کونے میں ڈال دیا اور اوپر چٹائی اس طرح رکھ دی کہ وہ فوری طور پر نظر نہ آسکیں۔ اپنے اتارے ہوئے لباس بھی ہم نے اسی طرح ایک کچن کیبنٹ میں چھپا دیے۔ اپنی رائفلوں کو ''ان لوڈ'' کر کے ہم نے ''اوون'' کے پیچھے ایک خلا میں گھسا دیا، اب ہمارے ہاتھوں میں گارڈز والا اسلحہ ہی تھا۔ اس میں ایک سیون ایم ایم اور ایک ٹرپل ٹو تھی۔ میں نے تنقیدی نظروں سے قسطینا کی طرف اور اس نے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن ہوئے۔

ہر دم بڑھتی ہوئی سنسنی کے سبب رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو چکی تھی۔ ان لمحات میں اتنا تھرل تھا کہ مجھے اپنے کندھے کا درد بھی بھولا ہوا محسوس ہوا۔ ہم ایک ساتھ کچن میں سے باہر نکلے اور سیڑھیوں پر آگئے۔ ہیلمٹ کی ''فیس شیلڈز'' ہم نے اٹھائی تھیں۔ ان کو گرا کر رکھنا شبہے کا باعث بن سکتا تھا۔ سیڑھیوں پر پہنچتے ہی نچلے فلور کی آوازیں واضح ہو گئیں۔ قدموں کی چاپ، دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آہٹیں، مختلف آوازیں جن میں میل اور فی میل نرسوں، ڈاکٹرز کی گفتگو بھی شامل تھی۔ ہم سیڑھیوں کے نچلے سرے پر پہنچے تو ایک اسٹریچر دکھائی دیا۔ دو گارڈز اسٹریچر اٹھائے ہمارے سامنے سے گزرے۔ لگتا تھا کہ اسٹریچر پر کوئی ایسا شخص ہے جس کی ایک ٹانگ اڑ چکی ہے۔ غالباً وہ کچھ دیر پہلے ہونے والی شیلنگ میں زخمی ہوا تھا۔ دونوں گارڈز نے ہماری ہی طرح بلٹ پروف جیکٹس اور ہیلمٹ پہن رکھے تھے۔ اسپتال کے اندرونی حصے سے زخمیوں کی آہ وبکا بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہم ایک کمرے کے سامنے سے گزرے اور یہ جان کر تسلی ہوئی کہ وہاں موجود مسلح سیکیورٹی اہلکاروں نے ہم پر کوئی خصوصی توجہ نہیں دی۔

ہم نیچے والی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ تب ہمیں ایک آفیسر دکھائی دیا۔ وہ اپنے کسی ماتحت کو ہدایات دیتا ہوا جارہا

تھا۔ میں نے اس کی آواز سے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ وہی بندہ تھا جس کی جھلک میں نے دو روز پہلے چھت پر دیکھی تھی۔ جب کچن میں موجود مسلح افراد نرس سے چھیڑ خانی کر رہے تھے تو ''نیوسٹی'' کے اس آفیسر نے آکر اپنے ماتحتوں کو ڈانٹا پھٹکارا تھا اور اس کی جان چھڑائی تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ اب وہی لمبی ناک والا آفیسر نشے میں نظر آرہا تھا اور وہی خوب صورت نرس اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ وہ اسے لے کر ایک کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

ہم سیڑھیاں اترے اور گراؤنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ یہاں مختلف وارڈز تھے اور مریضوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہم سجاول کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں لیکن ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم دو مسلح گارڈز کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک کوریڈور میں آگئے۔ ہم اس کوریڈور میں پندرہ بیس قدم آگے ہی گئے تھے کہ یوں لگا جیسے کسی نے عقب سے پکارا ہے۔ میں سنی ان سنی کر کے آگے بڑھتا رہا۔ یقیناً قسطینا نے بھی یہ آوازیں سن لی تھیں مگر اس نے بھی اپنے قدم روکے نہیں۔ چند سیکنڈ بعد آواز دوبارہ آئی۔ اس مرتبہ وہ کافی واضح تھی۔ ملائی میں کہا گیا۔ ''ٹھہرو، رک جاؤ۔''

اب ہمارے پاس صرف بھاگنے کا آپشن تھا لیکن اس سے پہلے کہ ہم یہ آپشن استعمال کرتے، یہ خودبخود ہی ختم ہو گیا۔ چند قدم آگے جا کر ہمیں پتا چلا کہ یہ کوریڈور آگے سے بند ہے۔ ہمارے پیچھے آتے ہوئے پہریدار بڑی تیزی سے ہمارے سروں پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک غیر ملکی اور دوسرا مقامی تھا۔ مقامی پہریدار کی نگاہ سیدھی قسطینا کے جوتوں پر جارہی تھی۔

''کون ہو تم؟'' پہریدار نے سخت لہجے میں کہا۔

جواب میں قسطینا نے بے دریغ فائر کیا جو سیدھا اس کی پیشانی پر لگا۔ دوسرے پہریدار کو میں نے ٹانگ سے ضرب لگائی۔ یہ ضرب بھی گولی ہی کی طرح مہلک تھی۔ پیٹ کے بالائی حصے پر لگنے والی ایسی ضرب عام طور پر مدِمقابل کے اندرونی اعضا کا کچومر نکال دیتی ہے...... خاص طور سے اگر مدِمقابل ضرب کے لیے تیار نہ ہو۔ میرا مدِمقابل بھی پشت کے بل دیوار سے ٹکرایا اور پھر اوندھے منہ اپنے امریکن ساتھی پر گرا۔ اس کی ناک سے جیسے خون کا فوارہ سا نکل پڑا تھا۔

فائر کی آواز نے ہر طرف ہلچل مچادی تھی۔ یہ کوریڈور سیدھا ہونے کے بجائے خم دار تھا۔ ہمیں تیس چالیس فٹ پیچھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا مگر ہم بھاگتے قدموں کی آوازیں صاف سن سکتے تھے۔ یہ تعداد میں کافی افراد تھے اور یقیناً مسلح ہوں گے۔ ایک طرح سے یہ ''قدموں'' کی چاپ نہیں تھی، موت کی چاپ تھی اور یہ بڑی تیزی سے ہمارے قریب آرہی تھی۔ ہمارے عقب میں سپاٹ دیوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک طرح سے ہم ایک چوہے دان سے نکل کر دوسرے چوہے دان میں پھنس گئے تھے۔ یہ مشکل ترین لمحے تھے۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ تب میں نے ایک ساعت کے لیے قسطینا کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مرنے اور مار دینے والی کیفیت تھی لیکن اس طرح اندھا دھند جان دے دینا میرے نزدیک بے وقوفی ہی تھی۔ بہتر یہ تھا کہ اگر ہم خود کو بے بس پائیں تو سرنڈر کر دیں۔

''کیا خیال ہے؟ لڑنا ہے؟'' میں نے سرسراتے لہجے میں قسطینا سے پوچھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' وہ بھی میرے ہی انداز میں بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ہمارے پہلو میں ایک بند دروازہ اچانک کھلا۔ ''اندر آجاؤ...... بچ جاؤ گے۔'' ایک شخص نے تیز لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی قسطینا کا بازو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اور قسطینا جلدی سے اندر چلے گئے۔ اس شخص نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ گرے یونیفارم میں تھا اور انگلش بول رہا تھا۔ اس کی کمر سے چھوٹی نال کی رائفل جھول رہی تھی۔ میں اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ یقیناً وہی گارڈ تھا جس نے چھت پر پہلی شب کو ٹین کی چادروں کے نیچے اپنی ٹارچ کا روشن دائرہ گھمایا تھا اور مجھے شک گزرا تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ لیا ہے...... ہاں میری نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی...... یہ وہی تھا۔

کوریڈور میں اب تہلکہ سا مچ گیا تھا۔ اس کوریڈور میں دونوں طرف درجنوں دروازے تھے۔ یہ دروازے دھڑادھڑ بجائے جارہے تھے۔ کمرے کے اندر سے بھی مختلف آوازیں آرہی تھیں۔ وہ شخص ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک کچن نما جگہ پر لے آیا۔ اس نے ایک دروازہ کھول کر ہمیں باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں تھا، نہ ہی شکریہ ادا کرنے کا موقع تھا۔ اس وقت فقط یہ احساس ہو رہا تھا کہ کسی نے مشکل ترین وقت میں ہماری مدد کی ہے۔

ہم دروازے سے باہر نکل آئے۔ یہ پارکنگ ایریا تھا۔ بڑی بڑی لائٹس اس ایریا کے مختلف حصوں کو روشن کر رہی تھیں۔ یہاں ابھی تک سکون تھا۔ سامنے ہی دو بکتر بند گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک

گاڑی کی طرف لپکے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ہٹا کٹا امریکن موجود تھا۔ وہ اپنی دھاری دار کیپ کی وجہ سے دور ہی سے پہچانا جارہا تھا۔ وہ کچھ ہراساں نظر آیا۔ یقیناً اس نے اندر ہونے والے فائر اور ہڑبونگ کی آوازیں سن لی تھیں۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ گاڑی سے باہر نکل آیا۔

''کیا ہوا ہے وہاں؟'' اس نے انگلش میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے اسے زبانی جواب دینے کے بجائے عملی جواب سے نوازا۔ ایک بھرپور مُکا اس کی گردن پر سامنے کی طرف لگا اور وہ بے جان چھپکلی کی طرح اوندھے منہ قسطینا کے قدموں میں گرا۔ سپر پاورز کے بندے قدموں میں کب گرتے ہیں مگر جنگ اور محبت میں بہت کچھ معمول سے ہٹ کر ہوتا ہے۔

چابی اگنیشن میں ہی تھی۔ قسطینا اچک کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے ساتھ والی نشست سنبھالی۔ بکتربند گاڑی سے صرف تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر ایجنسی کا ایک اور گارڈ موجود تھا۔ اپنی دھاری دار کیپ کی وجہ سے وہ بھی دور ہی سے پہچانا جارہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر وہ اپنے بالکل قریب ہونے والی اس کارروائی سے یکسر بے خبر رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تمام تر توجہ اسپتال کے اندرونی حصے سے ابھرنے والی آوازوں کی طرف تھی۔ یہاں اب جگہ جگہ دھاری دار ٹوپیوں والے ایجنسی کے افراد نظر آرہے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایجنسی والے اب کھل کر سامنے آگئے ہیں...... اور اپنے حقیقی حلیف رائے زل کے کندھے سے کندھا ملارہے ہیں۔ ان کی منافقت کا پردہ چاک ہوگیا تھا۔

قسطینا کی خوب صورت آنکھوں میں شعلے سے لپک رہے تھے۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو باؤنڈری لائن کی طرف بڑھایا۔ وہ ٹھیک سے گیئر نہیں لگا پارہی تھی اور انجن دہاڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمیں ڈھونڈنے والے اب پارکنگ لاٹ میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ وہ ہر طرف بھاگ دوڑ کررہے تھے۔ احاطے میں طاقتور لائٹس آن تھیں۔ ہر منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ افراد ہمارے والی بکتربند کی طرف لپکے۔

''جلدی کریں قسطینا! وہ آرہے ہیں۔''

''گیئر میں کوئی نقص ہے۔'' قسطینا نے جھنجلا کر کہا۔

مگر پھر اچانک گاڑی ایک زوردار جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ پہلے کے بجائے اسے دوسرا گیئر لگا تھا۔ وہ ہچکولے کھاتی کچھ دور تک گئی پھر اس نے ایک دم رفتار پکڑ لی۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ ایک گولی نے بکتربند کی چھوٹی سی ونڈ اسکرین توڑی اور قسطینا کی پسلیوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی لیکن اگر وہ اسے لگ بھی جاتی تو بلٹ پروف جیکٹ موجود تھی۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ایسی مار دھاڑ میں بلٹ پروف جیکٹ اور ہیلمٹ وغیرہ سے تحفظ کا احساس کتنا بڑھ جاتا ہے۔ ہم بلا خوف بارڈر لائن کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ بارڈر لائن کم و بیش 700 میٹر دور ہوگی۔ ہم نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہاں تیز فلڈ لائٹس میں کام ہورہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پول کھڑے کرکے خاردار تار لگایا جارہا تھا۔ یعنی اس سارے رقبے پر اپنا قبضہ مضبوط کیا جارہا تھا۔

فائرنگ کی آوازوں اور انسانی شور نے باڑ کے قریب موجود گارڈز اور ورکرز کو چوکنا کردیا۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ خطرہ کہاں ہے، اور فائرنگ کس پر کی جارہی ہے؟ ان لوگوں کا یہی تذبذب اور یہی بے خبری ہمارے لیے آسانی فراہم کررہی تھی۔ ہم ان گارڈز کے درمیان سے گزرتے باؤنڈری لائن کے قریب تر ہوتے جارہے تھے۔

پھر شاید کچھ لوگوں کو اندازہ ہوگیا کہ باؤنڈری لائن کی طرف بڑھنے والی بکتربند بے شک اپنی ہے مگر اس میں اپنے لوگ نہیں ہیں۔ انہوں نے ہم پر فائر کھولا۔ اب ہم پر دوطرفہ گولی چل رہی تھی۔ عقب سے اور بائیں جانب سے پگھلا ہوا سیسہ آرمڈ گاڑی کی آہنی پلیٹوں سے ٹکراتا تھا اور شدید تھرتھراہٹ پیدا ہوتی تھی۔ قسطینا کی گرفت گاڑی کے اسٹیئرنگ پر بہت مضبوط تھی۔ وہ ایکسلیریٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھاتی چلی جارہی تھی، اس نے باؤنڈری لائن پر ایک ایسا حصہ ڈھونڈ لیا تھا جہاں ابھی پول نہیں گاڑے گئے تھے۔ وہ سیدھی اسی حصے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا جسم سنسنا اٹھا کہ ایک کھلی چھت کی جیپ جس پر بوفرز گن فٹ ہے، ہمارے راستے میں آگئی ہے اور اس گن کا رخ ہماری طرف ہے۔ ہم پر کسی بھی وقت بڑا فائر ہوسکتا تھا اور ہمیں ہرگز پتا نہیں تھا کہ یہ فائر ہماری آرمڈ گاڑی برداشت کرسکے گی یا نہیں۔ کم ازکم مجھے تو بالکل پتا نہیں تھا۔ میں نے اپنے اکلوتے سلامت بازو کو حرکت دی اور اپنی ٹرپل ٹو کا رخ جیپ کی طرف کردیا۔ میرا چلایا ہوا طویل برسٹ کارگر رہا اور میں نے گن مین کو پلٹ کر جیپ سے نیچے گرتے دیکھا۔

''سر نیچے کرلو ایسٹرن۔'' قسطینا نے پکار کر کہا اور خود بھی سر جھکا لیا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ ہماری گاڑی اب

باؤنڈری لائن کراس کر رہی تھی۔ دو اطراف سے ہم پر تابڑ توڑ فائر آرہے تھے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے جب ہم لیہ میں تھے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم اس طرح کھلے پانیوں کے اس دور دراز جزیرے پر پہنچیں گے اور ہمیں وہاں اس قسم کے دھماکا خیز حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سب کسی جنگی فلم کے مناظر تھے...... پردۂ اسکرین پر ایسے مناظر دیکھنا اور بات ہے، حقیقت میں ان میں سے گزرنا اور بات۔ پردۂ اسکرین پر بارود اور جلے ہوئے گوشت کی بو نہیں ہوتی، دھوئیں کی گھٹن نہیں ہوتی، گولی لگنے کی اذیت نہیں ہوتی...... کچھ بھی تو نہیں ہوتا......

ہم نے باؤنڈری لائن پار کرلی مگر اب ایک اور شدید ترین خطرہ سر پر تھا۔ یقینی بات تھی کہ اب ہمارے اپنے ہی ہم پر فائر کریں گے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ گرے فورس کی اس آرمڈ گاڑی کے اندر ان کی اپنی کمانڈر قسطینا ہے۔

مارٹر، بزوکا یا یوفرز جیسی کسی بڑی گن کا فائر اس آرمڈ گاڑی کو مہلک نقصان پہنچا سکتا تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ بھی نہیں تھا کہ ہم فوری طور پر اپنے لوگوں کو بتائیں کہ ہم کون ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لڑائیوں میں ایسے موقعوں پر سفید جھنڈا استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی سفید جھنڈا یا کپڑا ڈھونڈنے کے لیے ہم واپس مقبوضہ علاقے میں تو نہیں جاسکتے تھے۔ اس وقت ہمیں شدید اور خوشگوار حیرت ہوئی جب کافی اندر آنے کے باوجود ہم پر کوئی فائر نہیں کیا گیا۔

''پتا نہیں کون سی نیکی کام آگئی ہے؟'' قسطینا حیرانی سے بڑبڑائی۔

اس نے قریباً پچاس کلومیٹر کی رفتار سے بھاگتی ہوئی گاڑی کو ایک ٹرن دیا اور ایک تباہ حال سرکاری دفتر کے عقب میں جا کھڑا کیا۔

جونہی گاڑی کھڑی ہوئی ریان فردوس کی سبز پوش فورس کے کئی مسلح ارکان ہماری طرف دوڑے۔ ان کے ہاتھوں میں چند ٹارچیں بھی لشکارے مار رہی تھیں۔ ٹارچوں کی روشنی ہمارے چہروں پر ڈالی گئی۔ ہم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ سبز وردیوں والے گارڈز نے ہمارے گرد حفاظتی حصار سا بنا دیا۔ ان کے رویّے سے پتا چلتا تھا کہ وہ ہماری آمد سے آگاہ ہوچکے تھے۔ پتا نہیں ایسا کیونکر ہوا تھا۔ جونہی قسطینا نے سیفٹی ہیلمٹ اپنے سر سے اتارا، گارڈز اور آفیسرز نے اسے سیلوٹ کیا۔

''چلیے یور ہائی نس۔ یہ جگہ خطرے میں ہے۔'' ایک آفیسر نے انگلش میں کہا۔

ہم قریباً بھاگنے والے انداز میں ایک کار تک پہنچے اور اندر بیٹھ گئے۔ دو آفیسرز اور دو گن بردار بھی ہمارے ساتھ تھے جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ اسپیشل بم پروف کار تھی۔ ہمارے بیٹھتے بیٹھتے ہی بھاری ہتھیاروں سے دو طرفہ فائرنگ شروع ہوگئی۔ روشنی کے جھماکوں اور زوردار دھماکوں کے ساتھ مارٹر وغیرہ کے شیل آس پاس گرنے لگے۔ میں زندگی میں پہلی بار اس طرح کا جنگی ماحول دیکھ رہا تھا اور اس کا حصہ بنا ہوا تھا۔ ہر طرف بارود اُڑ رہا تھا۔ بھاری گنوں کے گولے سیٹی کی سی آواز نکالتے ہوئے اپنے ہدف کی طرف بڑھتے تھے اور دھماکے سے گرتے تھے۔ لیکن یہ گولے کوئی بہت زیادہ نقصان نہیں پہنچا رہے تھے۔ بم پروف کار فراٹے بھرتی ہوئی ڈی پیلس کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

''آپ اور آپ کا ساتھی زخمی تو نہیں ہیں یور ہائی نس؟'' ایک آفیسر نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔

''میرا جواب تو نہیں میں ہے...... اور تمہارا جواب؟'' قسطینا نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے اپنے آپ کو ٹٹول کر دیکھا اور ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''لگ تو ٹھیک ہی رہا ہوں، یور ہائی نس۔''

اس نے غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف بڑھایا اور اسے گرمجوشی سے دبایا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی...... ہم نے کوشش کی اور ہم نے کر دکھایا۔

میں نے قسطینا سے کہا۔ ''کیا یہاں لوگوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ بکتر بند میں ہم ہیں؟''

قسطینا نے جواب دینے کے بجائے آفیسر سے ملائی میں بات کی۔ اس دو منٹ کی گفتگو کے بعد اس نے میری طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ہولے سے بولی۔ ''میں بعد میں بتاؤں گی۔''

یہ بم پروف کار ڈی پیلس کے اندر جا کر رکی۔ درجنوں مسلح سپاہی قسطینا کے استقبال کے لیے دو رویہ اٹینشن کھڑے تھے۔ جونہی قسطینا گاڑی سے اتری اسے کھٹا کھٹ سیلوٹ کیے گئے۔ ہر چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا تھا۔ فورس کی ہردلعزیز لیڈر تین دن تک لاپتا رہنے کے بعد صحیح سلامت واپس ڈی پیلس پہنچ گئی تھی۔ اس کے حوالے سے یقیناً بہت سی پُراندیشہ قیاس آرائیاں کی گئی ہوں گی۔ شاید کچھ لوگوں نے یہاں تک سوچا ہو کہ وہ زندہ نہیں بچ سکی۔ اب وہ لوگ اسے اپنے درمیان دیکھ کر جیسے پھر سے جی اٹھے تھے۔ ان میں فورس کے سپاہی بھی تھے اور وہ بے شمار رضا کار بھی جو جگہ جگہ سے یہاں ڈی پیلس میں آن موجود ہوئے تھے اور اب

پُریقین تھے کہ ریان فردوس کو اس جزیرے "پولاؤ جاماجی" کا بااختیار حاکم بنا کر رہیں گے۔ امریکیوں کی سازش ان کے سامنے کھل گئی تھی۔ وہ جان گئے تھے کہ ایجنسی والے یہاں ان کی حفاظت کے لیے نہیں ہیں بلکہ رائے زل کے ساتھ مل کر اس پورے آئی لینڈ کو ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ جزیرے میں موجود معدنیات پر ایجنسی والوں کی رال ٹپک رہی ہے۔

آقا جان اور حلمی وغیرہ بھی وہاں موجود تھے۔ ہر ایک بے تاب تھا کہ ہر ہائی نس قسطینا سے اس کی رُوداد سنے۔

میں نے ہولے سے اس کے کان میں کہا۔ "میں الجھن میں رہوں گا۔ مجھے یہ تو بتادیجیے کہ ہماری اپنی فورس کی طرف سے ہم پر فائر کیوں نہیں ہوا؟"

اس نے اپنے بوائے کٹ بال پیشانی سے ہٹائے اور بولی۔ "ہمیں یہ سہولت بھی اس شخص کی وجہ سے ملی جس نے اسپتال کے بند کوریڈور میں ہمیں گرے گارڈز سے بچایا۔ جب ہم بکتر بند میں گھس کر بارڈر کی طرف آنے کا ارادہ کررہے تھے اس نے وائرلیس پر حلمی صاحب کو براہِ راست اطلاع دی کہ بکتر بند پر فائر نہ کیا جائے، اس میں ہم دونوں ہیں۔"

"کون ہے یہ بندہ؟"

اس سے پہلے کہ قسطینا جواب میں کچھ کہتی، آقا جان کے ماتھے پر ناگواری کی شکن نمودار ہوئی۔ وہ تیزی سے بولا۔ "قسطینا بیٹی! عزت مآب بے حد شدت سے آپ کا انتظار کررہے ہیں، آئیے......"

قسطینا، آقا جان، حلمی اور فوجی افسران کے ساتھ عزت مآب کی طرف چل دی۔ چند قدم چل کر وہ پھر میرے پاس آئی۔ "میں بہت جلد فارغ ہو کر آتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہارے کندھے کا کام بری طرح بگڑا ہوا ہے۔ اسے فوری اور بہترین علاج کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے کندھے سے بھی زیادہ فکر اس بندے کی ہے جو میرے کندھے سے کندھا ملا کر رکھتا تھا۔ میں جلد از جلد اپنے ساتھی سجاول کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"بے فکر رہو، امید ہے ہم چند گھنٹوں میں اس کے بارے میں جان لیں گے۔"

وہ تیز قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس نے ہیلمٹ اتار دیا تھا اور بلٹ پروف جیکٹ بھی۔ گرے فورس کے گارڈ کی ڈھیلی ڈھالی وردی میں وہ کچھ بے ڈھنگی سی لگ رہی تھی۔

قریباً پانچ کلومیٹر کنٹرول لائن پر وقفے وقفے سے ہلکے اور بھاری ہتھیاروں کی فائرنگ ہو رہی تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ ابھی تک دونوں طرف سے شہری علاقے کو نشانہ نہیں بنایا گیا تھا مگر جس طرح لڑائی کی آگ پھیل رہی تھی، کسی وقت یہ نوبت بھی آسکتی تھی۔

کنٹرول لائن سے آنے والی دھماکوں کی آواز تھوڑی دیر بعد تھم گئی۔

میں انیق کے کمرے میں پہنچا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اس کے مقامی خدمت گار سے پوچھا۔ "انیق صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے شکستہ انگلش میں جواب دیا۔ "صاحب بہت موڈی بندے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو عجیب لگتے ہیں۔"

"کیا عجیب کیا ہے اس نے؟"

"دوپہر سے کمرے کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کہہ رہے تھے میں کوئی چلہ کاٹ رہا ہوں۔ میرے پوچھنے پر بتایا کہ وہ آپ کی بخیریت واپسی کے لیے چلہ کاٹ رہے ہیں۔ رات دس بجے کے بعد انہوں نے یہ چلہ ختم کردیا مگر......"

"مگر کیا؟"

خدمت گار اپنی مسکراہٹ کو جیسے بمشکل دبا کر بولا۔ "انہوں نے کچھ اس طرح ٹانگوں کو پھنسا کر آلتی پالتی ماری ہوئی تھی کہ جب اٹھنا چاہا تو آلتی پالتی کھل نہیں پائی۔ انہوں نے آواز دے کر ملازموں کو اکٹھا کرلیا۔ بڑی مشکل سے ان کی ٹانگیں کھولی گئیں۔ وہ کافی دیر لنگڑا لنگڑا کر چلتے رہے۔ اب کہہ رہے تھے کہ میں ذرا ٹانگوں کو وارم اپ کر آؤں۔ کافی دیر سے نکلے ہوئے ہیں، واپس نہیں آئے۔"

میں خدمت گار کے ساتھ انیق کی تلاش میں نکلا۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ وہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا، پھر بھاگتا ہوا آیا اور لپٹ گیا۔ "آپ کے لیے بہت زیادہ فکرمندی تھی شاہ زیب بھائی۔ شکر ہے کہ آپ کو ٹھیک ٹھاک اور صحیح سلامت دیکھ رہا ہوں۔"

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ ہم تھوڑی ہی دیر پہلے حلمی کے ساتھ ڈی پیلس پہنچے ہیں۔

وہ بولا۔ "ہم سے آپ کی کیا مراد ہے۔ کوئی اور بھی آپ کے ساتھ تھا؟"

"ہاں، ہر ہائی نس قسطینا۔"

"زبردست۔" وہ خوش ہو کر بولا۔ "میں سمجھا، کہیں امریش پوری تو نہیں تھا۔"

میں نے اسے گھورا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ اگر سجاول

میرے ساتھ ہوتا تو تمہیں دکھ ہوتا؟"

"نن...... نہیں جناب...... میرا مطلب یہ تھا کہ ہر ہائی نس قسطینا کی واپسی تو سجاول کی واپسی سے بہت زیادہ ضروری تھی۔ لوگ بہت پریشان تھے ان کے لیے۔ باقی کوئی بات نہیں اللہ نے چاہا تو اس کے بارے میں بھی کوئی اچھی خبر ملے گی۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے...... اور نہ میری قسمت اتنی چمک دار ہے۔" آخری الفاظ اس نے ہولے سے کہے۔

"اچھا بکواس بند کرو...... اب کہاں سے آرہے ہو؟"

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ "دراصل آپ کی بخیریت واپسی کے لیے میں نے ایک مشکل سی آلتی پالتی مار کر ایک خاص وظیفہ کیا تھا۔ شام کے بعد جب میں نے آلتی پالتی کھولنے کی کوشش کی......"

"پھر وہی بکواس، مسخرہ بننے کی کوشش نہ کرو، اگر کوئی کام کی بات ہے تو مجھے بتاؤ...... ویسے...... مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی کام کی بات ہے۔" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس سے بڑی کام کی بات اور کیا ہوگی شاہ زیب بھائی کہ وہ آلتی پالتی......"

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر مُکا دکھایا تو اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "بالکل ہے ایک کام کی بات...... بالکل ہے...... میں بتاتا ہوں۔"

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ فوراً میرے پاؤں چھو کر بولا۔ "چلہ تو میں نے کاٹا تھا لیکن لگتا ہے کہ ولایت آپ کو مل گئی ہے۔ غیب کی باتیں بتا رہے ہیں۔"

ہم دونوں واپس انیکسی میں آگئے۔ سجاول کے کمرے کا دروازہ لاک اور کھڑکیاں تاریک تھیں۔ یہ تاریک کھڑکیاں دیکھ کر دل میں گھونسا سا لگا۔ پتا نہیں، اب اس نے اس کمرے میں واپس آنا بھی تھا یا نہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے قسطینا نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد سجاول کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان جائے گی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ رائے زل کے زیرِ قبضہ علاقے میں (جسے نیوسٹی کہا جاتا تھا) عزت مآب فیملی کے کچھ جاسوس موجود ہیں جو وہاں کی خبریں ڈی پیلس میں پہنچاتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ ان کے ذریعے ہی سجاول کا کچھ پتا لگ جاتا۔

اپنے کمرے میں آکر انیق نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ وہ میرے ورم زدہ کندھے کے بارے میں بہت فکر مند تھا...... میری رُوداد سننے کے لیے اس کی بے چینی بھی عروج پر تھی۔ میں نے اسے مختصر الفاظ میں اسپتال میں اور اسپتال کی چھت پر پیش آنے والے واقعات بتائے...... اور یہ بتایا کہ ہم نے کس طرح دو دن اور تین راتیں ٹین کی چادروں تلے گزاری ہیں۔

میری رُوداد کے بعد انیق کی باری آئی۔ اس نے کہا۔ "یہاں کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔"

"کس حوالے سے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"مولوی جی کی بیٹی زینب کے حوالے سے۔"

میرا جسم سنسنا گیا۔ "کیوں کیا ہوا اُسے؟"

"وہ ڈی پیلس میں موجود نہیں...... کل صبح سے اُسے مسلسل ڈھونڈا جا رہا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کسی نے......"

"نہیں، وہ اپنے شوہر ابراہیم کے لیے کوئی خط بھی چھوڑ گئی ہے۔"

"کہاں جا سکتی ہے وہ؟" میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔

انیق نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی انکشاف کرنے لگا ہے...... مگر اسی دوران میں دروازے پر بلند دستک ہوئی۔ انیق نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ابراہیم کا ذاتی محافظ کھڑا تھا۔ دو مسلح گارڈ اس کے عقب میں تھے۔ اس نے بڑے احترام سے مجھے مخاطب کیا۔ میری خیریت دریافت کی اور بولا۔ "اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو چھوٹے صاحب ابراہیم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی...... اسی وقت۔"

میں نے انیق کی طرف دیکھا، پھر محافظ کی طرف دیکھا۔ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ ذاتی محافظ کے ساتھ چل دوں۔

میں اٹھا تو ذاتی محافظ نے میرا شکریہ ادا کیا۔ ہم وسیع انیکسی سے نکلے اور احاطے کی پھول دار کیاریوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈی پیلس کی مرکزی عمارت میں داخل ہوئے۔ احاطے میں اب بھی مشتعل گروہوں کی نعرہ بازی سنائی دے رہی تھی۔ باؤنڈری لائن پر ہونے والی گولہ باری اب مکمل طور پر تھم گئی تھی مگر مشرق سے چلنے والی ہوا اپنے ساتھ بارود کی بُو لا رہی تھی۔ ڈی پیلس کے اندر بھی ہر طرف جنگی ماحول تھا۔ احاطے میں ایک طرف خندقیں کھدی ہوئی نظر آئی تھیں۔ مرکزی عمارت کے اردگرد مورچے بنائے گئے تھے۔

ڈی پیلس کے عظیم الشان کوریڈور سے ہوتے ہوئے ہم اس خاص حصے میں پہنچ گئے جہاں ابراہیم رہائش پذیر تھا۔ یہاں مجھے ہر چہرہ اترا ہوا نظر آیا۔ بڑی بیگم ابراہیم کے کمرے سے نکلیں اور اپنی خادماؤں کے ساتھ زنانے حصے کی طرف مڑ

گئیں۔ ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑ سکی تھی۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ابراہیم کو جائے نماز پر پایا۔ بڑی بیگم کے باہر نکلتے ہی شاید اس نے نوافل کی نیت باندھ لی تھی۔ میں ایک طرف نشست پر بیٹھ گیا۔ ابراہیم کا چہرہ اندوہ کی تصویر تھا، آنکھیں ورم زدہ تھیں۔ ذاتی محافظ مجھے کمرے میں چھوڑ کر واپس جا چکا تھا۔

ابراہیم سلام پھیرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور خیر خیریت دریافت کی۔ اسے میرے کندھے کی شدید چوٹ کا پتا چل چکا تھا اور وہ فکر مند تھا۔ اس نے کہا۔ ”بڑی بہن قسطینا نے مجھے وہ سب کچھ بتایا ہے جو وہاں اسپتال میں پیش آیا۔ بہت شکر کا مقام ہے کہ آپ دونوں وہاں سے صحیح سلامت نکل آئے۔ انشاء اللہ مسٹر سجاول کے بارے میں بھی جلد معلومات حاصل ہو جائیں گی۔“

”یہ میں کیا خبر سن رہا ہوں ابراہیم؟“ میرا سارا اضطراب میرے لہجے میں شامل ہو گیا۔

وہ بولا۔ ”خود میری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا۔ پتا نہیں کہ یہ سب کیوں ہوا۔ وہ ایسی تو نہیں تھی۔ وہ نہیں تھی ایسی۔“

”ہو سکتا ہے کہ کوئی سازش ہوئی ہو ابراہیم، میرا اپنا دل بھی یہی کہتا ہے کہ وہ آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی...... کسی صورت نہیں۔“

ابراہیم نے اپنے مخملی چغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور وہ خط مجھے دکھایا جس کا ذکر ابھی تھوڑی دیر پہلے انیق نے کیا تھا۔ ”یہ اسی کی تحریر ہے شاہ زیب...... میں تو اردو نہیں پڑھ سکتا لیکن مترجم نے جو کچھ بتایا ہے، آپ بھی پڑھ لیں۔“

میں نے کاغذ کی تہ کھول کر دیکھا۔ فاؤنٹین پین سے خوبصورت اردو لکھائی میں یہ قریباً آٹھ نو سطور تھیں۔ اگر یہ واقعی زینب نے لکھا تھا، تو خط کچھ اس طرح تھا۔

”ابراہیم! میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ مجھے پتا ہے میرے اس طرح اچانک بتائے بغیر پاکستان واپس چلے جانے سے آپ کو بہت زیادہ دکھ ہوگا مگر میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ میں اب بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہوں کہ ہم دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ آپ کے ساتھ کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے آپ خود بھی مجبور ہیں۔ میں ان مجبوریوں کو لمبا اور تکلیف دہ کرنا نہیں چاہتی۔ ہم دونوں کی محبت اپنی جگہ لیکن حالات کی سختی اپنی جگہ ہے۔ جب تک آپ کو یہ خط ملے گا میں یہاں موجود اپنے ایک ”بزرگ ہمدرد“ کے ساتھ جزیرے سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ پلیز میرے پیچھے مت آیئے گا اور نہ مجھے پاکستان میں ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے گا۔ اپنی زندگی کے لیے نئے راستے تلاش کر لیجیے۔ میں بھی کرنے کی کوشش کروں گی۔ زندگی سے بڑھ کر قیمتی کچھ نہیں ہوتا اور میں ابھی زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ اللہ حافظ۔“

میں اور ابراہیم کتنی ہی دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھے رہے۔ خط میرے ہاتھ میں تھا اور پنکھے کی ہوا سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔

”کیا نتیجہ نکالا آپ نے؟“ ابراہیم نے پوچھا۔

”تحریر تو بے شک زینب ہی کی ہے لیکن یہ سب کچھ اس نے اپنی مرضی سے لکھا ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا اس واقعے سے پہلے اس نے آپ کو کسی طرح کا اشارہ دیا تھا؟“

”نہیں...... مجھے تو بالکل یاد نہیں آتا۔ ہاں رات کے کھانے پر وہ کچھ خاموش سی تھی۔ میں نے ایک دو بار پوچھا مگر اس نے سر درد کا بہانہ بنایا۔ ہم کچھ دیر ایک ساتھ رہے پھر اپنے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلے گئے۔ صبح وہی آ کر مجھے جگاتی تھی اور تازہ پھولوں کا گلدستہ میرے سرہانے رکھتی تھی۔ وہ نہیں آئی...... سات بجے کے لگ بھگ میں خود ہی جاگا۔ یہی وقت تھا جب زینب کی خاص خادمہ بھی اس کے کمرے کا دروازہ ”ناک“ کر رہی تھی۔ دروازہ دھکیلا تو وہ کھلا تھا۔ ہم اندر گئے۔ وہ وہاں نہیں تھی۔ ایک ڈیکوریشن پیس کے نیچے یہ خط رکھا تھا......“ بات کرتے کرتے ابراہیم کی آواز غم سے ٹوٹ رہی تھی۔ وہ جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ کس طرح زینب کی تلاش شروع ہوئی۔ کیسے سمندر میں لانچیں اور اسپیڈ بوٹس دوڑائی گئیں اور کیسے پچھلے بیس گھنٹے سے جزیرے کے اندر بھی اسے جگہ جگہ ڈھونڈا جا رہا ہے اور مشتبہ افراد کو پکڑا جا رہا ہے۔

میں نے خط کے نیچے والی سطور پڑھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں مسز زینب نے کسی ہمدرد بزرگ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بندہ کون ہو سکتا ہے؟“

”میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میری عقل نے کام کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“ اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی کو مسلا۔ اس کی عمر اٹھارہ اور بیس سال کے درمیان تھی لیکن کسی وقت وہ ایک بالکل بے بس نوعمر لڑکا دکھائی دینے لگتا تھا۔

اس کے بستر کے سرہانے باسی گلدستہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ گلدستہ رکھنے والا یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ کہاں ہے؟ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ابراہیم نے دل فگار آواز میں کہا۔ ”قمری کیلنڈر کا یہ مہینا اکثر ہمارے خاندان کے لیے بری خبریں ہی لاتا ہے۔ پتا نہیں کیوں...... مجھے ایسے

لگتا ہے کہ..... زینب اب.....‘‘
وہ فقرہ مکمل نہ کرسکا اور سر جھکا کر سسک اٹھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور تسلی دی۔ ’’آپ بے فکر رہیں ابراہیم۔ میں پھر کہتا ہوں، مجھے یقین ہے وہ اس طرح آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔‘‘
دروازے پر دستک ہوئی۔ ابراہیم نے جلدی سے آنسو پونچھے اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ’’آجاؤ۔‘‘
درمیانی عمر کی وہی خادمہ اندر داخل ہوئی جو نکاح سے پہلے ابراہیم اور زینب کے درمیان ’’رابطے‘‘ کا کام کرتی تھی۔ خادمہ نے اطلاع دی کہ عزت مآب چند منٹ بعد ابراہیم سے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔
میں ابراہیم سے اجازت لے کر واپس انیکسی میں آگیا۔ انیق اپنے کمرے میں تھا۔ وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہوچکا تھا اور اب میرے سامنے بھی اپنی اوٹ پٹانگ حرکات سے باز نہیں آتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے آلتی پالتی مار رکھی تھی اور آنکھیں بند کر کے بستر پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ میری آہٹ سن کر اس نے لال لال آنکھیں کھول دیں اور بولا۔ ’’میرا وظیفہ بس آخری مرحلے میں ہے۔ اگر آپ دو منٹ باہر تشریف رکھیں تو میں آپ کو معرفت کی بہت سی باتیں بتاسکوں گا۔‘‘
میں نے کہا۔ ’’تمہاری معرفت کی ایسی تیسی۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔‘‘
’’آپ مذاق نہ سمجھیں شاہ زیب بھائی! مجھے مستقبل کی چیزیں نظر آنا شروع ہوگئی ہیں، یقین کریں۔‘‘
’’لیکن تمہیں وہ جوتا نظر نہیں آرہا جو میں ابھی اتار کر تمہارے سر پر برسانے والا ہوں۔‘‘
میں نے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ ایک دم سیدھا ہوگیا۔ ’’ٹھیک ہے جی، آپ خود ہی اپنا نقصان کررہے ہیں۔‘‘
اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ وہ کوئی ایسی عجیب قسم کی آلتی پالتی مارتا تھا کہ آسانی سے کھلتی نہیں تھی۔ میں نے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی۔ وہ گیند کی طرح لڑھک کر وارڈ روب سے ٹکرایا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔
میں نے کہا۔ ’’جب بھی تم وظیفہ کرو تو بعد میں مجھے بلالیا کرو۔ میں تمہاری آلتی پالتی کھول دیا کروں گا۔‘‘
’’آپ میری ہر بات کو مذاق میں لیتے ہیں جناب۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ مجھ پر کشف ہونے شروع ہوگئے ہیں اور جو پہلا کشف ہوا ہے وہی بڑا دھانسو قسم کا ہے۔ اللہ خیر کرے۔ مجھے تو فکر پڑگئی ہے کہ کہیں لوگ مجھے پیر و مرشد وغیرہ نہ بنالیں۔‘‘
’’لوگوں کی عقلوں پر ابھی اتنے پتھر نہیں پڑے۔ بہر حال کیا کشف ہوا ہے تمہیں؟‘‘
’’کشف یہ ہے جناب کہ زینب کو کچھ نہیں ہوا۔ وہ حیات ہے..... خیریت سے ہے اور ہمارے آس پاس ہی کہیں ہے۔‘‘
میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے لگا کہ وہ ضرور کچھ جانتا ہے۔ وہ اتنا بے کار ہرگز نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے میرے بعد ڈی پیلس میں کچھ کھوج کھرا لگایا ہو۔ میں نے کہا۔ ’’اوٹ پٹانگ کے لیے وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے اگر زینب کو کچھ ہوگیا تو.....‘‘
’’اسے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ ایک بہت ذہین، ہمدرد اور جی دار شخص کے پاس ہے۔‘‘
’’کون ہے وہ؟‘‘
’’آپ کے سامنے تو کھڑا ہے بقلم خود۔‘‘ وہ چہکا۔
میں بھونچکا رہ گیا۔ ’’کیا کہہ رہے ہو۔ کہاں ہے وہ؟‘‘
’’انڈین فلم کا گانا ہے..... آپ کے کمرے میں کوئی رہتا ہے..... ہم اس بے ہودہ گانے میں تھوڑی سی تبدیلی کریں گے..... امریش پوری کے کمرے میں کوئی رہتا ہے۔‘‘
میں نے تیزی سے سوچا۔ ’’تم سجاول کے کمرے کی بات کررہے ہو؟‘‘
اس نے اثبات میں سر ہلایا اور قدرے سنجیدہ ہو کر بولا۔ ’’جسے چپے چپے پر ڈھونڈا جارہا ہے۔ وہ یہیں پر ہے جناب۔ پچھلے قریباً بیس گھنٹے سے ہے۔ وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھالا ہوا ہے۔‘‘
’’تم..... مذاق تو نہیں کررہے انیق؟‘‘ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔
’’یہ مذاق کا موقع نہیں ہے جی، آپ نے ابھی خود ہی تو کہا ہے۔‘‘
’’کہاں ملی وہ تمہیں؟‘‘
’’ایک خواجہ سرا کے مکان سے۔ بہت مصیبت میں تھی۔ میں نہ پہنچتا تو پتا نہیں کہاں پہنچ چکی ہوتی۔‘‘
’’مجھے تفصیل سے بتاؤ انیق..... لیکن نہیں..... پہلے مجھے اُسے دیکھنے دو۔‘‘
’’ابھی چند منٹ انتظار کرنا ہوگا آپ کو۔ وہ سجاول کے کمرے میں ہے۔ باہر گارڈ ٹہل رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں ہوتا ہے تو ہم کمرے میں جائیں گے۔‘‘ میری دھڑکن بڑھ گئی۔

موسم سرما کے سنہرے، روپہلے شب و روز کو پرلطف بناتا پاکیزہ دسمبر 2016ء کا شمارہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
انجم انصار اور رفعت سراج کے دلکش ناولوں کی پرلطف اقساط
سحر ساجد کی اچھوتی تحریر..... من جانبازم کی اگلی قسط
سیما رضا ردا نے کھولی کچھ گرہیں، اپنے خوب صورت منی ناول..... ہم کو عبث بدنام کیا میں
اللہ تعالیٰ پر مکمل توکل و یقین کی پرحیرت داستان میمونہ صدف کے قلم سے.....
نگہت سیما سے دلچسپ ملاقات کا مزید احوال جانیں..... وہ آئے بزم میں
کسبِ حلال پر اختر شجاعت کا ایمان افروز مضمون.....
نفیسہ سعید اور رفاقت جاوید کی خصوصی تحریریں.....
شائستہ زریں نے کی بھرپور
میزبانی..... وہ بھی معروف ٹی وی اینکر حنا نقوی کی
پاکیزہ کے مہمان میں.....
اس کے علاوہ
فرحین اظفر، سلمیٰ غزل، بشریٰ ماہا، نور عین، سنبل،
تنزیلہ زاہرہ افضل و دیگر معروف قلمکاروں کی حسین تحریریں
دلچسپ معلوماتی و تفریحی مستقل مضامین و حسین شاعری صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

''وہ خیریت سے تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔
''جی ہاں، معمولی خراشیں ہیں دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گی۔''
''تم کیسے پہنچے خواجہ سرا کے گھر تک۔ اور یہ ذاتِ شریف ہے کون؟''
''عزت مآب کے خاندان کا پرانا نمک خوار ہے۔ ڈی پیلس میں کم و بیش بیس اور خواجہ سرا بھی ہیں جو مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ یہ ان کا انچارج ہے۔ یہ کل شام کی بات ہے۔ میں آپ اور امریش پوری (سجاول) کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان تھا۔ حلمی صاحب سے اجازت لی اور ڈی پیلس سے نکل کر ٹہلتا ہوا سمندر کی طرف چلا گیا۔ ایک گارڈ بھی میرے ساتھ بھیجا گیا تھا لیکن میں نے اسے بہلا پھسلا کر واپس بھیج دیا۔ وہاں بالکل ساحل پر کافی گھر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی بالکونیاں اور برآمدے سمندر کی طرف ہیں۔ سمندر کا پانی ان کی دیواروں سے ٹکراتا ہے۔ اب تو جنگ کا ماحول ہے لیکن امن کی حالت میں یہاں کا نظارہ بہت خوب صورت ہوتا ہوگا۔ میں پام کے پیڑوں تلے بیٹھ گیا اور چاند کے ابھرنے کا منظر دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ سوچتا رہا کہ آپ دونوں کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ خبریں یہی آرہی تھیں کہ آپ محفوظ ہیں اور اسپتال کے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں۔ حلمی صاحب نے یہ بھی بتایا تھا کہ ہر ہائی نس قسطینا سے ٹیلی فونک رابطہ بھی ہوا ہے۔

میں انہی سوچوں میں گم بیٹھا تھا، جب مجھے کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔ کوئی عورت ''بچاؤ بچاؤ'' کی پکار کر رہی تھی۔ مگر یہ پکار صرف دو سیکنڈ کے لیے ہوئی، پھر اس پکارنے والی کو گھر کی بالکونی سے اندر کھینچ لیا گیا۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ زینب ہوگی لیکن جو کوئی بھی تھی، وہ میری ہم زبان تھی۔ مجھے لگا کہ مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ رات کوئی گیارہ بجے کا وقت تھا اور ساحل سنسان نظر آتا تھا۔ آگے سمندر میں کوسٹ گارڈز کی دو کشتیاں گشت کر رہی تھیں۔ پہلے میں نے سوچا کہ کسی طرح ان گارڈز کی مدد لوں۔ مگر پھر میں اکیلا ہی آگے بڑھا۔ میرے پاس آپ والا پستول تھا۔ دیوار پھاندنے میں مجھے زیادہ وقت پیش نہیں آئی۔ رکھوالی کا کتا موجود تھا، تاہم بندھا ہوا تھا۔ اس نے تھوڑا سا شور مچایا، پھر اس کے دل میں پتا نہیں کیا آئی کہ خاموش ہو کر لیٹ گیا۔ میں برآمدے میں پہنچا۔ پوری کوٹھی سنسان پڑی تھی...... یوں لگتا تھا کہ مالک مکان نے لڑکی پر دست درازی کرنے کے لیے باقی اہلِ خانہ اور ملازمین کو کہیں بھیج دیا ہے۔ آپ جانتے ہیں داؤد بھاؤ نے مجھے تالے وغیرہ کھولنے میں ''ٹرینڈ'' کیا ہوا ہے۔ میں نے ایک تار کی مدد سے مین دروازے کا تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ بالائی منزل کے ایک کمرے سے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں دروازہ توڑ کر اندر گھس گیا۔ میرا خیال تھا کہ کسی ہٹے کٹے غنڈا صفت سے پالا پڑے گا۔ جس شخص سے پالا پڑا وہ ہٹا کٹا تو ضرور تھا مگر ایک ہیجڑا تھا پھر میری نظر زینب پر پڑی جو ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اسے وہاں دیکھوں گا۔ ہیجڑا درمیانی عمر کا تھا۔ آدھا سر گنجا تھا۔ اس کے بھدے ہونٹ لپ اسٹک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں کاجل اور لباس ست رنگا تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد وہ ایک الماری کی طرف لپکا اور پستول نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے دبوچ کر دیوار سے دے مارا۔ دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ لڑکھڑایا اور باہر کو بھاگا۔ شاید کوئی اور ہتھیار تھامنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ میرا دھکا لگنے سے وہ سیڑھیوں پر گرا اور کوئی دس فٹ نیچے پختہ فرش سے ٹکرا کر بالکل بے سدھ ہو گیا۔

میں زینب کی طرف بڑھا تو اس نے کہیں سے ایک چھری پکڑ لی۔ وہ ابھی تک مجھ پر بھروسا نہیں کر پا رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دشمن نہیں دوست ہوں۔ شاہ زیب بھائی کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ اب اس کی پکار سن کر یہاں اس گھر میں پہنچا ہوں۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ مقامی لباس میں تھی۔ اس کے جسم پر چھڑیوں کے نشان تھے اور خراشیں تھیں۔ اس کے پاؤں رسی سے باندھنے کی کوشش کی گئی تھی جو پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ زینب نے اپنے پاؤں کھول دیے۔ اس نے بتایا کہ اس بدمعاش نے اسے بری طرح مارا ہے اور نوچا کھسوٹا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے کوئی خاص قسم کا پان بھی کھار کھا تھا جس کی وجہ سے اس کا دماغ گھوما ہوا تھا۔

ہیجڑے نے اب کراہنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر پستول کے دستے سے ایک زوردار چوٹ لگائی اور اسے پھر سے بے ہوش کر دیا۔ اس کے لباس کی تلاشی لی۔ کچھ مقامی کرنسی، تاش کے پتے اور پان کی ڈبیا نکلی۔ یہ چیزیں اب بھی میرے پاس ہیں۔'' انیق نے کہا۔
''پھر وہاں سے نکلے کیسے؟'' میں نے پوچھا۔
''میرے دوست خانساماں ازمیر طیب نے اس سلسلے میں میری مدد کی۔ میں نے اسے فون کیا۔ پوری طرح اعتماد میں لیا۔ وہ فارم ہاؤس سے تازہ سبزیاں لینے کے لیے رات کو پچھلے پہر گاڑی پر نکلتا ہے۔ اس وقت بھی نکلا ہوا تھا۔ وہ فارم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہاؤس سے سیدھا اس ساحلی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ وہ ایک لوڈر گاڑی تھی۔ اس میں گوبھی، گاجر، پالک، ٹماٹر اور پتا نہیں کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ کچھ سبزیاں ایسی تھیں جو زندگی بھر نہیں دیکھیں۔ ہم نے زینب کو سبزیوں کی گانٹھوں کے عقب میں چھپایا...... اور نکل آئے۔ ڈی پیلس کے قریب پہنچ کر میں پیدل ہو گیا اور ڈی پیلس میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ازمیر بھی زینب کو لے کر انیکسی میں آ گیا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے اسے گاڑی سے نکالا اور کمرے میں پہنچا دیا۔"

یہ رُوداد واقعی تحیر خیز تھی۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ "وہ کیا بتا رہی ہے...... ڈی پیلس سے اس ہیجڑے کے پاس کیسے پہنچی؟"

"کچھ نہیں بتا رہی۔" انیق نے نفی میں سر ہلایا۔ "کل سے بس روتی ہی جا رہی ہے کہتی ہے کہ وہ واپس جانا چاہتی ہے یا پھر مرجانا چاہتی ہے اگر کسی نے اس کی مدد نہ کی تو وہ اپنی جان لے لے گی۔"

"ابراہیم کے بارے میں کچھ کہتی ہے؟"

"نہیں...... بس ایک دو بار یہ کہا ہے کہ بڑی بیگم سے بات کرنا چاہتی ہے، لیکن اس طرح کہ کسی دوسرے کو پتا نہ چلے...... اللہ جانے کیا چکر ہے۔"

کچھ ہی دیر بعد میں اور انیق، زینب کے پاس جانے کو تیار تھے۔ انیق نے کہا۔ "آپ اس سے ہیجڑے کی مار پیٹ والی بات نہ کیجیے گا وہ زیادہ دکھی ہو جائے گی۔ میرے خیال میں اگر ہم اسے تسلی دیں کہ اسے یہاں سے نکال کر پاکستان پہنچانے کی کوشش کریں گے تو وہ کچھ نہ کچھ بتانے پر آمادہ ہو جائے گی۔"

اسی دوران میں میرے سیل فون پر قسطینا کی کال آ گئی، وہ بولی۔ "میں آ رہی ہوں۔ تمہیں اسپتال لے کر جانا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یور ہائی نس! اب صبح کا انتظار کر لیتے ہیں۔ میں نے پین کلر انجکشن لگوایا ہے اور اب کچھ دیر سو جانا چاہتا ہوں۔"

قسطینا نے ایک لمبے توقف کے بعد کہا۔ "تم ایک بہت بڑے اسٹار ہو۔ تمہیں پتا نہیں تمہیں کہاں کہاں چاہا جاتا ہے۔ میں یہاں تمہاری موجودگی پر بے حد حیران ہوں اور جتنی حیران ہوں اس سے کہیں زیادہ فکرمند ہوں۔ تمہارے کندھے کے ساتھ بہت برا ہو چکا ہے ایسٹرن، اور یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تم...... ٹھیک نہ ہوئے...... تو میں خود کو کبھی...... معاف نہیں کر سکوں گی۔" وہ رک رک کر بے حد جذباتی لہجے میں بولی۔

میں نے کہا۔ "آپ کی یہ اسٹار والی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بہرحال آپ فکر نہ کریں، مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"

وہ مجھے ابھی اسپتال لے جانا چاہتی تھی۔ تھوڑی سی بحث تمحیص کے بعد اس نے صبح تک کی چھٹی دے دی۔ پین کلر انجکشن میں واقعی انیق سے لگوا چکا تھا اور افاقہ محسوس کر رہا تھا۔

ہم نے اپنے کمرے مقفل کر کے دروازے پر "ڈسٹرب نہ کریں" کی پلیٹ لگا دی اور سجاول والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ پُرآسائش کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ وہ بستر پر ڈری سہمی بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکی۔ اس سے پہلے میرے ساتھ اس کا زیادہ تعارف نہیں تھا۔ ہم نے ایک دو بار دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ اسے کیا پتا تھا کہ اگر میں یہاں اس آئی لینڈ میں موجود ہوں تو اس کی ایک اہم وجہ وہ خود ہے۔ انیق نے اس کی اجازت سے ٹیوب لائٹ آن کی۔ کمرا روشن ہو گیا۔ اس نے بالوں کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں چوٹی کی صورت باندھ رکھا تھا۔ اب وہ اس زینب سے بہت مختلف تھی جسے میں نے چند ماہ پہلے ایک موبائل فون کے وڈیو کلپ میں دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بیماری کے گھیرے میں تھی۔ چودھری عالمگیر کی زہریلی ڈوز نے اسے نیم جان کر رکھا تھا مگر اب وہ ایک موزوں جسم کی قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے کی ملاحت اور معصومیت غیر معمولی کشش رکھتی تھی اور اس کشش کو ایک طرح کی پارسائی اور نیک خوئی نے ڈھانپ رکھا تھا اگر ابراہیم اس پر ہزار جان سے فدا ہوا تھا تو کچھ ایسا انوکھا نہیں تھا۔ رو رو کر اس کی نازک پلکیں متورم ہو چکی تھیں۔

ہم دونوں اس کے قریب بید کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور دل جوئی کی باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ بھی جھجک سے نکل آئی اور تھوڑا بہت بولنے لگی۔ اس نے کہا۔ "انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ آپ بھی پاکستان سے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں اکثر بات کرتے رہتے تھے۔"

"انہوں" سے زینب کی مراد اس کا شوہر ابراہیم ہی تھا۔

میں نے کہا۔ "زینب! میں بھی آپ کی طرف سے باخبر رہنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ آپ میری ہم وطن ہیں اور ایسے حالات میں ہیں کہ آپ کو کسی بھی وقت تعاون اور مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

وہ بولی۔ "آپ نے جس طرح پارا ہاؤس میں گھسنے والوں کا مقابلہ کیا تھا اور ماں جی (بڑی بیگم) کو بچایا تھا، اس کا سب کے ذہنوں پر بڑا اچھا اثر ہے۔ وہ آپ اور سجاول

صاحب پر بہت بھروسا کرتے ہیں۔"

بات شروع ہوئی تو میں بہت جلد زینب کو ڈھب پر لے آیا۔ اگر وہ ڈھب پر آئی تو اس کی ایک وجہ میرے اندر کی نیک نیتی اور بے لوث ہمدردی بھی تھی۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے وہ اثر رکھتی ہے۔ اس نے یہاں بھی اثر کیا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ سہلایا تو اس کی آنکھوں میں نمی آگئی...... ہاں یہ وہی ڈری سہمی چڑیا تھی جو ریان فردوس اور آقا جان جیسے بڑے بڑے عقابوں کی زد میں تھی۔

رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ انیق بہانے سے باہر جا چکا تھا۔ زینب مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ میں نے یہ سوال تیسری مرتبہ دہرایا تھا کہ آخر وہ ابراہیم کے ساتھ رہنا کیوں نہیں چاہتی؟

بالآخر وہ سسک کر بولی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ وہ عام نہیں ہیں، ان کے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ انہوں نے...... نکاح کرتے وقت کہا تھا...... یہ میں صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ برونائی لے جا سکوں...... ابھی ہم میاں بیوی کی طرح نہیں رہیں گے...... لل...... لیکن......" وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ شرم اور گھبراہٹ کے سبب اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ اگر وہ درست کہہ رہی تھی تو پھر یہ افسوسناک تھا۔ مجھے جاناں کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ زینب کبھی کبھی اس سے رازداری کی باتیں بھی کر لیتی ہے۔ اس نے زینب کے جسم پر کچھ نشان دیکھے تھے۔ یہ ابراہیم کے چھونے کا نتیجہ تھے۔ تو کیا ابراہیم اپنی تمام تر نیک خوئی اور متانت کے باوجود خود کو سنبھالنے میں ناکام رہا تھا...... اور نتیجے میں زینب اس سے خوف زدہ ہو گئی تھی مگر بہت سے سوالات اب بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ زینب ڈی پیلس کے نہایت محفوظ شاہانہ ماحول سے نکل کر اس خبیث خواجہ سرا تک کیسے پہنچی؟

ایک بات اور بھی توجہ طلب تھی...... اور وہ یہ کہ وہ ڈی پیلس سے نکلنے کے باوجود بڑی بیگم سے ملنے کی خواہش کیوں کر رہی تھی۔ کیا اسے توقع تھی کہ وہ بڑی بیگم نسا نورل کو اپنا ہمنوا بنا سکتی ہے۔

انیق نے مجھے بتایا تھا کہ زینب نے پچھلے اٹھارہ بیس گھنٹوں سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے۔ اس کا چہرہ زرد اور ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ میں نے کوشش کر کے اسے تھوڑا سا جوس پلایا اور پیزے کے دو ٹکڑے کھلائے۔ وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ اور بولنا نہیں چاہ رہی ہے۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور اپنے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگ گئی۔ انجکشن کا اثر ختم ہو رہا تھا اور درد کی لہریں پھر پورے جسم میں پھیل رہی تھیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ دن چڑھ آیا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے ڈی پیلس کے وسیع و عریض احاطے کا کچھ حصہ دکھائی دیتا تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ مجھے ڈی پیلس کی مرکزی عمارت سے رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ پھر میں نے خادماؤں کی ایک جماعت کو دیکھا جو باقاعدہ سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ پورے جسم میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

میں انیق کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ خالی تھا۔ میں نے سجاول والے کمرے کو بغیر آواز پیدا کیے "ان لاک" کیا۔ زینب کمرے میں موجود تھی اور جیسے تھک ہار کر سو گئی تھی۔ دروازہ دوبارہ لاک کر کے میں مرکزی عمارت کی طرف بڑھا۔ زخمی کندھے والے بازو کو میں نے ایک بیلٹ کے ساتھ کندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ ہر چہرے پر غم و غصے کی کیفیت تھی۔ لوگ ڈی پیلس کے فواروں اور رنگ برنگی کیاریوں کے پاس ٹولیوں کی شکل میں کھڑے چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ اندر سے خواتین کے رونے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

مجھے پریشان حال کمال احمد نظر آیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ میں نے ادب کے ساتھ پوچھا۔ "کیا ہوا کمال صاحب؟"

وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "زینب مل گئی ہے...... لیکن زندہ نہیں۔"

"کیا مطلب یور ہائی نس؟"

"اس کی باڈی ملی ہے۔ ابھی صبح باؤنڈری لائن کے پاس اسے ایک کاٹیج کے ملبے سے نکالا گیا ہے۔" کمال احمد نے جواب دیا۔

میں سناٹے میں تھا جس لڑکی کو میں ابھی دو منٹ پہلے سجاول کے کمرے میں صحیح سلامت دیکھ کر آیا تھا۔ اس کی لاش یہاں پہنچ چکی تھی۔ پورچ میں کچھ دیگر گاڑیوں کے ساتھ ایک جدید ایمبولینس بھی کھڑی تھی۔ اچانک یہ ایمبولینس حرکت میں آئی اور عمارت کے اندرونی دروازے کے بالکل پاس رک گئی۔ ابراہیم کا بھائی کمال احمد بھی دوڑتا ہوا ایمبولینس کی طرف گیا۔ میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ کچھ گارڈز نے نو عمر ابراہیم کو ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا اور ایمبولینس میں منتقل کر رہے تھے۔ وہ بے ہوش تھا۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ یہ بے ہوشی شدید صدمے کا نتیجہ ہے۔ اپنے سیل فون سے میں نے اس منظر کا وڈیو کلپ بنایا۔ میں نے بڑی بیگم نسا نورل کو بھی دیکھا۔ انہوں نے اپنے گرد ایک شال لپیٹ رکھی تھی اور روتی ہوئی،

ایمبولینس میں داخل ہو رہی تھیں۔

یہ سب کسی گہری سازش کے پیچ و خم تھے۔ میں انیق کو ڈھونڈ رہا تھا۔ آخر وہ مجھے ایک بڑے ستون کے پاس نظر آ گیا۔ وہ فربہ اندام ازمیر طیب سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میری طرف آیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''کہا جا رہا ہے کہ کل رات دس بجے کے قریب باؤنڈری لائن کی طرف جو شدید گولہ باری ہوئی ہے اس میں زینب بھی ماری گئی ہے۔ اس کی لاش ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں پہنچی ہے۔ یہ صدمہ ابراہیم سے برداشت نہیں ہوا۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا ہے۔''

''لاش کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے؟''

''کہہ رہے ہیں کہ وہ شاہی بہورانی زینب کی ہی ہے۔ بری طرح بگڑی ہوئی ہے۔ کچھ تو کہہ رہے ہیں کہ اس کا اوپری دھڑ ہی نہیں ہے۔ مارٹر وغیرہ کا شیل لگا ہے اُسے......''

عجب تماشا تھا، جس لڑکی کی اندوہناک موت پر بین کیے جا رہے تھے اور قیامت بپا تھی، وہ یہاں سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر انیکسی کے ائر کنڈیشنڈ کمرے میں سو رہی تھی۔

میں نے خانساماں ازمیر طیب کی طرف دیکھا۔ حالانکہ وہ بھی ہم دونوں کی طرح اصل صورتِ حال سے آگاہ تھا لیکن ماحول کا حصہ بنے رہنے کے لیے اس نے بھی چہرہ لٹکا رکھا تھا اور گم صم دکھائی دیتا تھا۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ ''ازمیر تو کہیں زبان نہیں کھول دے گا؟''

''بالکل نہیں۔'' انیق پورے یقین سے بولا۔ ''وہ خود بھی سب کچھ اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔''

میں اور انیق انیکسی میں واپس آ گئے۔ ہم زینب کے آس پاس رہنا چاہتے تھے۔

میں نے سجاول کے کمرے والا دروازہ ان لاک کیا اور ہم دونوں اندر چلے گئے۔ وہ بستر پر تھی اور سوئی ہوئی تھی۔ چہرہ پاکیزگی اور معصومیت کی تصویر نظر آتا تھا۔ اس حالت میں بھی اس نے دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی مصور نے دھیمے رنگوں کے ساتھ ایک سادہ لیکن پُرکار تصویر بنائی ہو۔ وہ یہاں بے خبر پڑی تھی اور وہاں ڈی پیلس میں اس کی ''موت'' پر آہ و بکا ہو رہی تھی۔ میں نے اس کی کلائی کو آہستہ سے ہلا کر اسے جگایا۔ وہ کسمسائی اور پھر ایک دم اٹھ بیٹھی۔ چند سیکنڈ تک سخت ہراس میں رہنے کے بعد وہ نارمل ہو گئی اور اس نے ایک چادر سے خود کو ڈھانپ لیا۔ باہر سے آنے والی کوئی آواز اس کمرے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''زینب! ہم نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ ہم تمہیں پاکستان پہنچانے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ تم کوئی بات بھی چھپاؤ نہیں۔''

''میں کچھ نہیں چھپا رہی۔'' وہ روہانسی ہو کر بولی۔

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ''تم بتا رہی ہو کہ تم نے ڈی پیلس کو صرف ابراہیم اور اس کے رویے کی وجہ سے چھوڑا تھا۔ کیا یہ واقعی ایسا ہے؟''

''ہاں...... لیکن میں سمجھتی ہوں کہ اس میں ان کا کوئی زیادہ قصور نہیں۔ وہ خود سے مجبور تھے۔ ان کی...... بیماری نے ان کو...... جکڑ رکھا ہے......''

''کیا ڈی پیلس سے نکلتے وقت تم نے ابراہیم کو اطلاع دی؟ یا کوئی پیغام وغیرہ لکھا؟''

وہ تذبذب میں رہنے کے بعد بولی۔ ''ہاں، میں نے ان کے نام ایک خط چھوڑا تھا جس میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے وہ خط دیکھا ہے زینب! تم نے بڑی بے رحمی سے ابراہیم سے اپنا دامن چھڑایا ہے...... خط میں تم نے اپنے کسی ہمدرد بزرگ کے بارے میں بھی لکھا ہے، جس کی مدد سے تم یہاں سے نکل کر پاکستان جانا چاہ رہی تھیں۔ کیا وہ ''بزرگ'' یہی بدبخت خواجہ سرا تھا جس کا نام خیام معلوم ہوا ہے؟''

زینب نے بے قراری سے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... وہ کوئی اور تھے......''

''تو پھر یہ خیام اس معاملے میں کیسے آیا؟''

''خدا کے لیے، مجھ سے اس طرح سوال جواب نہ کریں۔ اگر آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں تو آپ کا شکریہ، ورنہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ میں کسی بھی طرف نکل جاؤں گی......'' وہ سسک اٹھی۔

''کسی بھی طرف نکل جاؤ گی اور پھر خیام جیسے کسی خبیث کے ہتھے چڑھ جاؤ گی۔'' میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''کچھ اور نہیں کر سکتی، جان تو دے سکتی ہوں نا؟'' وہ جیسے بلک پڑی اور گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

میں نے تھوڑی دیر اُسے رونے دیا۔ اس کے اندر کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں نے نرم لفظوں میں اسے تسلی دی۔ میں اس کے لباس کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا کہ اس نے کہاں بدلا۔ وہ ''شاہی بہورانی'' کی حیثیت سے ایک قیمتی لباس میں ڈی پیلس سے نکلی تھی اور اب اس کے جسم پر ایک عام سا لبادہ تھا۔ جب دو دن پہلے انیق نے اسے خواجہ سرا خیام کے چنگل

سے چھڑایا تو وہ کاٹن کے اسی براؤن چغے میں تھی جو ٹخنوں تک جاتا تھا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ یہ لباس اس نے خواجہ سرا کے گھر پر ہی بدلا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم نے خود بدلا تھا یا اس نے زبردستی بدلوایا تھا؟''

جواب میں وہ پھر سسکنے لگی۔ جواب واضح تھا۔ وہ شاہی لباس زبردستی بدلوایا گیا تھا۔ انیق نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ہم دونوں سوچ کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ''بارود سے مسخ'' جو لاش ڈی پیلس میں لائی گئی ہے، اس پر وہی لباس ہو جو زینب بہن کر یہاں سے نکلی تھی۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ زینب بتا کم رہی ہے اور چھپا زیادہ۔ مجھے کچھ اور وقت مل جاتا تو شاید کچھ مزید معلوم ہو جاتا...... مگر مسلسل سوالوں سے گھبرا کر وہ ایک دم گم صم سی ہو گئی۔

☆☆☆

علی الصباح ہر ہائی نس قسطینا مجھے لینے کے لیے خود انیکسی میں پہنچ گئی۔ وہ میرے کندھے کے حوالے سے مزید تاخیر برداشت کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ میں نے انیق کو زینب اور اس کی حفاظت کے سلسلے میں کچھ ضروری ہدایات دیں اور قسطینا کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ وسیع و عریض پورچ میں قسطینا کی شاندار ٹویوٹا لینڈ کروزر بلٹ پروف کھڑی تھی۔ دو تین گاڑیاں پروٹوکول کی بھی تھیں۔ قسطینا نے مجھے رات کو ہی تنبیہ کر دی تھی کہ مجھے کچھ کھانا پینا نہیں ہے۔ وہ جلد از جلد میرا آپریشن چاہتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب تو مجھے کندھے کو حرکت دینا بھی دشوار ہو چکا تھا۔

گاڑی میں قسطینا میرے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''مسٹر سجاول کے حوالے سے کوئی اطلاع ملی؟''

وہ ذرا چونک کر بولی۔ ''ہاں...... ایک اطلاع تو ہے اور اسے اچھی اطلاع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس روز اسپتال پر ہونے والے فائر اور کاؤنٹر فائر کے نتیجے میں دونوں طرف کے کم و بیش پچیس افراد جان سے گئے، زخمی ہونے والوں کی تعداد ایک سو چالیس کے قریب ہے۔ مرنے والوں میں سے قریباً بیس افراد تو اسپتال کے بالکل آس پاس موجود تھے۔ ہمارے انفارمر نے اطلاع دی ہے کہ زخمی یا مرنے والوں میں مسٹر سجاول شامل نہیں ہیں۔

''اور جو گرفتار ہوئے؟''

''ہمارے گرفتار ہونے والے افراد کی تعداد بھی تیس کے لگ بھگ ہے۔ یہ سب کے سب سپاہی تھے۔ ابھی ان لوگوں کی تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ مسٹر سجاول گرفتار ہونے والوں میں ہوں۔''

بلٹ پروف کار کی پچھلی اور اگلی نشستوں کے درمیان ایک سلائڈنگ شیشہ تھا۔ میں اور قسطینا جو گفتگو کر رہے تھے وہ ڈرائیور تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ہمارے آگے پیچھے پروٹوکول کی گاڑیاں اور ہیوی موٹر بائیکس تھیں۔ ہوٹرز گونج رہے تھے۔ ابھی سورج کی روپہلی کرنیں بلند عمارتوں کے بالائی کناروں اور بام کے درختوں کی چوٹیوں پر ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ایک موڑ کاٹتے ہوئے میرا کندھا سائڈ سے ٹچ ہوا تو بے ساختہ چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے۔ قسطینا نے بڑے دکھی انداز میں میری طرف دیکھا اور مجھے ایسٹرن کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتی، اگر تم دوبارہ RING میں اترنے کے قابل نہ ہوئے تو میں سمجھوں گی کہ میں نے ایک اسٹار کو اپنے ہاتھوں سے بجھا دیا ہے۔ کاش میں اس رات سے پہلے جان گئی ہوتی کہ تم کون ہو؟''

''میں وہی ہوں جو آپ کے سامنے ہوں۔ شاید میری شکل ''ایم ایم اے'' کے کسی مشہور فائٹر سے ملتی ہے۔ یہی بات اس سے پہلے سجاول اور اس کے ایک نوجوان ساتھی نے کہی تھی۔ اگر آپ یہ سمجھ رہی ہیں کہ......''

''تم مجھے بےوقوف نہیں بنا سکتے۔'' اس نے تیزی سے میری بات کاٹی۔ ''میں نے کل رات انٹرنیٹ پر آدھا گھنٹا گزارا ہے۔''

''لیکن آپ جو کچھ......''

''پلیز، میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے نہیں پتا کہ تم یہ سب کچھ کیوں چھپا رہے ہو، اور کب تک چھپانے کا ارادہ رکھتے ہو۔ لیکن میرے سامنے مت بنو۔ پلیز، مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے کندھے کو یہ چوٹ کب لگی تھی؟''

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور اس چوٹ کے اصل خالق سجاول کا نام چھپاتے ہوئے کہا۔ ''جس دن میں اور سجاول کچھ امریکن عورتوں کو بچانے کے لیے ہوٹل واشنگٹن میں گھسے تھے، ایک رائفل کا وزنی کندا بےحد شدت سے مجھے مارا گیا۔ چوٹ لگتے وقت ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ کچھ غیر معمولی ہو گیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''کاش تم مجھے بتا سکو کہ تمہیں ضرب لگانے والا کون تھا اور میں اسے بتاؤں کہ اس سے مارشل آرٹ کے

شعبے کا کتنا عظیم الشان نقصان ہوا ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے یور ہائی نس، اس سے آپ کا احساسِ جرم تو کم ہو جانا چاہیے۔ میرے کندھے کی یہ حالت آپ اور آپ کے باڈی گارڈ براڈے کی وجہ سے نہیں ہوئی۔"

"اس چوٹ کو بدتر کرنے میں تو میرا ہی ہاتھ ہے۔" وہ جیسے کراہ کر بولی۔ اس کے اندر کا دکھ اس کی آنکھوں اور چہرے پر نمایاں تھا۔

ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "تمہارے ملک پاکستان کے ڈاکٹر اور سرجن پوری دنیا میں مشہور ہیں۔ میں نے ہنگامی طور پر ایک بہترین آرتھوپیڈک سرجن کو کراچی سے بلا لیا ہے۔ بڑی امید ہے کہ سرجن صاحب شام تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ ان کے آنے تک آپریشن کی باقی تیاری ہو گی۔ ایک آسٹروی سرجن برونائی سے بھی یہاں آ چکا ہے۔ میں تمہیں بہترین سے بہترین طبی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ باقی جو او پر والے کو منظور۔"

"آپ ایسے بدترین جنگی حالات میں مجھ پر اتنی توجہ دے رہی ہیں تو او پر والا بھی بہتر ہی کرے گا۔ ویسے آپ کی دعا سے میں کافی سخت جان واقع ہوا ہوں۔ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

اس نے بڑے دکھ سے میری طرف دیکھا۔ "تم اپنے اندرونی جذبات کو چھپا رہے ہو ایسٹرن، اور مجھے پھر بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔ مسئلہ تمہارے کندھے کے صرف ٹھیک ہو جانے کا نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تم پھر سے اسی توانائی اور اعتماد سے RING میں اتر سکو جس کے لیے تم مشہور ہو جس کی وجہ سے تم ہزاروں، لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہو اور میرے جیسے مارشل آرٹ کے شیدائی تم پر جان چھڑکتے ہیں...... ہاں مسئلہ یہ ہے۔" وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں اور لہجے میں عجیب سی کیفیت تھی۔

وہ مجھے ایسٹرن ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی اور میں اس موقع پر کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا کندھا درد سے پھٹا جا رہا تھا اور سوجن ہاتھ تک پہنچ چکی تھی۔ مجھے پہلی بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد اسپتال تک پہنچ جانا چاہیے۔

اسپتال میں ہمیں زبردست پروٹوکول ملا۔ ہر طرف بھاری بوٹوں کی ایڑیاں ٹھکا ٹھک بجنے لگیں۔ یہ اسپتال جاماجی کے مغربی سرے پر واقع تھا اور جنگ کے بادلوں سے قدرے دور تھا۔ اسپتال کے اردگرد مجھے دو تین اینٹی ایئر کرافٹ گنیں بھی نظر آئیں۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے مجھے فوراً اپنی تحویل میں لے لیا۔ بلڈ ٹیسٹ، ایکسرے، ای سی جی اور جو کچھ 'پری آپریشن' ضروریات تھیں، وہ پوری کی گئیں۔ ایک ایکسرے میں نے بھی دیکھا۔ ٹوٹی ہوئی ہڈی اب کافی حد تک اپنی جگہ سے ہل چکی تھی اور اس کا ایک ٹوٹا ہوا کونا گوشت میں گھس رہا تھا۔

ایک اعلیٰ افسر مسلسل میرے ساتھ تھا۔ اپنی بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے قسطینا سہ پہر کے وقت چلی گئی تھی۔ تاہم رات کو آپریشن کے وقت وہ پھر اسپتال پہنچ گئی۔ اگلے تین چار گھنٹے آپریشن اور بے ہوشی کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ انستھیسیا کا اثر دو تین گھنٹے تک تو تنگ کرتا ہی ہے۔ رات ایک دو بجے کے لگ بھگ میں نے تیزی سے سنبھلنا شروع کر دیا۔ میرا بایاں کندھا یوسلیب پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ پلاستر کندھے کے اوپر سے شروع ہو کر کہنی کے نیچے تک چلا گیا تھا۔ کہنی کو تقریباً ساٹھ کے زاویے سے موڑ دیا گیا تھا۔ مجھے سب سے پہلا فون انیق کا ہی موصول ہوا۔ اس نے میرا حال احوال پوچھا۔ اصولی طور پر تو انیق کو اسپتال میں ہونا چاہیے تھا لیکن وہ "معدے کے شدید درد" کی وجہ سے ڈی پیلس میں ہی تھا۔ 'معدے کا یہ درد' مصنوعی تھا۔ دراصل زینب کی دیکھ بھال کے لیے اس کا اپنے کمرے میں رہنا ضروری تھا......

میرے ہوش میں آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی قسطینا واپس ڈی پیلس چلی گئی۔ اسے زینب کی "تجہیز و تکفین" میں شریک ہونا تھا۔ اس "واقعے" نے جزیرے میں رنج و الم کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ میرے اردگرد جو گفتگو ہو رہی تھی اس سے اتنا معلوم ہوا کہ ہز ہائی نس ابراہیم ریان کی نوبیاہتا دلہن کی لاش اس علاقے سے ملی ہے جہاں پرسوں رات نیوسٹی کی گرے فورس اور جاماجی کی گرین فورس میں زبردست گولہ باری ہوئی ہے۔ کوئی بڑا شیل یا راکٹ جسم کے بالائی حصے پر لگا اور لاش کو بری طرح مسخ کر گیا۔ زینب وہاں کیسے پہنچی، اس بارے میں ابھی کچھ پتا نہیں تھا۔

کوئی اور جانتا ہو یا نہ لیکن ہم جانتے تھے کہ آج رات جس کی تجہیز و تکفین کی جا رہی ہے، وہ زندہ ہے اور ڈی پیلس کی انیکسی میں ہے۔ اس سازش کا ایک اہم کردار وہ خواجہ سرا خیال تھا جو ایک ساحلی مکان میں رہتا تھا اور جہاں سے انیق نے زینب کو خستہ حالت میں نکالا تھا۔ وہ شاہی لباس یقیناً خیام کے پاس ہی رہا تھا جس میں کل صبح "زینب کی لاش" ملی تھی۔ مطلب یہ کہ خیام، زینب کو زندہ رکھنا چاہتا تھا مگر اس طرح سے کہ زینب کے ورثا اور عام لوگ اسے مردہ سمجھیں۔ کیا یہ اتنی بڑی سازش صرف خواجہ سرا خیام نے کی تھی یا اس کے پیچھے بھی

کچھ لوگ تھے؟ وہ ہمدرد بزرگ کون تھا جس کا ذکر زینب نے ایک سے زائد بار کیا تھا؟ زینب یہاں پر یہ سب کچھ جھیلنے کے باوجود بڑی بیگم سے ملنا کیوں چاہ رہی تھی؟ بہت سے سوالات تھے۔

اگلے روز میں اسپتال سے واپس انیکسی میں پہنچ گیا تو انیق کے معدے کا "شدید درد" بھی ٹھیک ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "شاہ زیب بھائی! آج صبح ایک مسئلہ ہو گیا۔ صفائی والا آیا۔ اس نے کہا کہ وہ باقی کمروں کے علاوہ سجاول والا کمرا بھی صاف کرنا چاہتا ہے۔ انچارج کا حکم ہے۔ میں نے بمشکل اسے باز رکھا۔ چابی نہ ملنے کا بہانہ بنایا لیکن ایسا کب تک چلے گا۔ کل یا پرسوں یہ لوگ پھر کمرے کی صفائی کرنا چاہیں گے۔ یا ایسا ہی کوئی اور مسئلہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ کل رات زینب دو چار مرتبہ زور سے کھانسی تو ہلکی سی آواز باہر تک آئی۔"

"کمرے سے روشنی تو باہر نہیں آتی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ صرف ایک ٹیبل لیمپ جلاتی ہے اور اس کا رخ بھی میں نے ایسا رکھا ہوا ہے کہ روشنی باہر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ ایک اچھی بات بھی ہوئی ہے میں نے آپ کے اور امریش پوری (سجاول) کے کمرے کا درمیانی دروازہ "ان لاک" کر لیا ہے۔ اب امریش پوری والے کمرے میں آپ کے کمرے کے اندر سے ہی آمدورفت جاری رکھی جا سکتی ہے۔"

"زینب کے کھانے کا کیا کر رہے ہو؟"

"کھانا تو وافر ہوتا ہے۔ اس کی کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن وہ خود بہت "اَپ سیٹ" ہے۔ اسے یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ خبیث خواجہ سرا اسے ڈھونڈتا ہوا یہاں نہ پہنچ جائے۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ وہ تو خود اپنا جرم چھپانا چاہ رہا ہوگا۔"

"خواجہ سرا کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ازمیر طیب کو سن گن لینے کے لیے کہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ خواجہ سرا کا پورا نام خیام مانش ہے۔ وہ ڈی پیلس میں موجود قریباً دو درجن خواجہ سراؤں کا ہیڈ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن پچھلے قریباً ایک ماہ سے وہ چھٹی پر ہے اور سمندر کے کنارے اپنے اس ساحلی گھر میں آرام کر رہا ہے۔ وہاں وہ اپنے کسی عزیز اور دو ملازموں کے ساتھ رہتا ہے لیکن جس رات زینب والا واقعہ ہوا، وہ اس ساحلی گھر میں اکیلا ہی تھا۔ آثار یہ کہتے ہیں کہ وہ ابھی تک اس گھر میں ہی ہے۔"

"اس معاملے کی گتھی وہ سلجھا سکتا ہے یا پھر زینب از خود زبان کھولے تو کچھ پتا چل سکتا ہے۔"

"آپ کے لیے ایک اور اطلاع بھی ہے۔" انیق نے حسب عادت سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "آپ کا وہ پنجابی دوست کبڈی شاہ بھی یہاں پہنچ گیا ہے۔ کل سے اس نے آپ سے ملنے کی رٹ لگائی ہوئی تھی۔"

میں سمجھ گیا۔ انیق، سیف کی بات کر رہا تھا۔ اپنے سفری کاغذات کی وجہ سے وہ ہمارے ساتھ نہیں آ سکا تھا۔ اب اس نے قدم رنجہ فرما لیا تھا۔ اس کی عمر لمبی تھی۔ ابھی ہم بات ہی کر رہے تھے کہ وہ آ دھمکا۔ دروازہ کھلا اور اس کی ٹھیٹ پنجابی صورت دکھائی دی۔ وہ رنگ دار شلوار قمیص اور گرگابی میں تھا۔ گلے میں وہ صافہ نما ٹیکنی کلر کپڑا تھا جسے "پرنا" کہا جاتا ہے۔ اس نے آتے ساتھ ہی مجھ سے بغلگیر ہونا چاہا لیکن پھر میرا زخمی بازو دیکھ کر سنبھل گیا اور پُرجوش مصافحے پر اکتفا کیا۔

"آپ کے بازو کے زخمی ہونے کا سن کر بہت زیادہ افسوس ہوا ہے شاہ زیب صاحب۔"

"یہ شاید تمہاری نظر ہی لگی ہے۔ تم بہت اونچے بانس پر چڑھا رہے تھے مجھ کو۔"

"آپ پہلے ہی بہت اونچی جگہ پر ہیں، آپ کو کون چڑھا سکتا ہے۔ اللہ کرے آپ کی تکلیف مجھ کو مل جائے اور آپ بھلے چنگے ہو جائیں۔" وہ دل سے بولا۔

"بڑی بونگی دعا مانگ رہے ہو۔ میری تکلیف اپنے لیے کیوں مانگ رہے ہو۔ یہ کہو کہ میں ٹھیک ہو جاؤں۔ دینے والے کے پاس کون سی کمی ہے۔"

اس نے میری بات سے اتفاق کیا اور دیگر حال احوال پوچھنے میں لگ گیا۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا کہ کہیں قریب سے (کنٹرول لائن کی طرف سے) گاہے بگاہے دھماکوں کی آوازیں آتی تھیں۔ وہ لڑائی مار کٹائی کا شوقین تھا اور یہ خیال ہی اس کے لیے بے حد فرحت آفریں تھا کہ وہ کسی طرح کی دھواں دھار لڑائی میں حصہ لے گا۔ وہ بہت من موجی قسم کا آدمی تھا۔ اسے یہاں آ کر صرف دو بڑے مسئلے پیش آئے تھے ایک تو یہ کہ ناشتے میں اسے خالص دہی کی لسی نہیں ملی تھی اور دوسرے یہ کہ یہاں باتھ روم میں کموڈ لگے ہوئے تھے۔ جن پر بیٹھنا اسے کافی دشوار محسوس ہوتا تھا۔

اس نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ "استاد جی! میرا اصل کام کب شروع ہوگا؟"

اصل کام سے اس کی مراد لڑائی مار کٹائی ہی تھی۔ میں نے کہا۔ "ذرا دھیری تلے سانس لو۔ سب کچھ ہوگا اور تمہاری

امیدوں سے زیادہ ہوگا۔ ایک دو دن ذرا کھاپی کر جان بنالو۔“

”کھانا پینا کیا ہے استاد محترم۔ یہاں تو ہر طرف برگر، سینڈوچ اور وہ کیا کہتے ہیں چائنیز فوڈ ہی نظر آتے ہیں۔ کوئی دیسی گھی کے پراٹھے ہوں، بکرے کا گوشت ہو، چانپ پا پٹھ کی بوٹیاں ہوں، ساتھ میں تلی ہوئی رہو مچھلی ہو، پر کوئی گل نہیں جی، یہاں اگر آپ کا ساتھ ہے اور لڑائی وغیرہ کا تڑکا ہے تو پھر سب کچھ قبول ہے۔“

”اس طرح کی لڑائی میں تم کیا کرو گے؟ تمہاری کوئی فوجی ٹریننگ تو ہے نہیں؟“

”استاد جی، آپ سب جانتے ہو۔ لڑائی ٹریننگ سے زیادہ یہاں سے لڑی جاتی ہے۔“ اس نے اپنے چوڑے سینے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”اور اگر آپ ٹریننگ کی بات ہی کرتے ہیں تو پھر کبڈی بھی تو ایک ٹریننگ ہی ہے۔ پلٹنا جھپٹنا اور جھپٹنے کے بعد پھر پلٹنا اور پھر جس کو جپھی مار لینا اس کو زمین میں گاڑ کے رکھ دینا۔“

کنٹرول لائن کی طرف پھر کوئی زوردار دھماکا ہوا اور اس کی گونج سنائی دی۔ شاید کوئی بارودی سرنگ بجھاتے بجھاتے بلاسٹ ہوگئی تھی۔ کنٹرول لائن کی دونوں جانب ایک زوردار لڑائی کی تیاری ہو رہی تھی۔ ریان فردوس کی گرین فورس ہر صورت میں اپنا وہ کھویا ہوا علاقہ واپس لینا چاہتی تھی جو پانچ روز پیشتر ایک اچانک حملے میں چھین لیا گیا تھا۔

رات کوئی نو بجے کے لگ بھگ انیکسی میں ہلچل نظر آئی۔ ہمیں اطلاع دی گئی کہ ہر ہائی نس قسطینا تشریف لا رہی ہیں۔ پروٹوکول کی گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دیے۔ سیکیورٹی والے انیکسی میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ تاہم قسطینا کی آمد کی اطلاع غلط ثابت ہوئی۔ اس کی گاڑی تو وہاں آئی تھی مگر وہ خود موجود نہیں تھی۔

مجھے اطمینان ہوا۔ دراصل میں اپنی پہلی فرصت میں ساتھ والے کمرے میں جاکر زینب سے ملنا چاہتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد صورتِ حال پھر تبدیل ہوگئی۔ ایک پروٹوکول آفیسر نے آکر بتایا کہ ہر ہائی نس نے اپنی ذاتی گاڑی بھیجی ہے اور مجھے ڈی پیلس کی اصل عمارت میں بلایا ہے۔

حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے تحت پندرہ منٹ بعد میں ڈی پیلس کی ایک خوب صورت نشست گاہ میں موجود تھا۔ یہ نشست گاہ ریان فردوس کی عظیم الشان نشست گاہ کی طرح پُرشکوہ تو نہیں تھی پھر بھی دیکھنے کے لائق تھی۔ بیش قیمت طویل صوفے تھے جن کے درمیان بلیجیئم کی بنی ہوئی ایک ایسی میز تھی جو آٹومیٹک طریقے سے گھومتی تھی اور اپنی جگہ بھی تبدیل کرتی تھی۔ دیواروں پر جدید ایل سی ڈی ز لگی تھیں۔ اور الیکٹرانک نقشہ جات آویزاں تھے۔ میز پر بھی نقشے وغیرہ پھیلے ہوئے تھے۔ قسطینا سبز یونیفارم میں ملبوس تھی۔ اس کے اردگرد بیٹھے فوجی افسران بھی یونیفارم میں تھے۔ ان کے تھکے ہوئے چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پچھلے کچھ گھنٹوں سے مسلسل میٹنگ میں ہیں۔ اب یہ میٹنگ اختتام پذیر تھی۔ نقشے وغیرہ لپیٹے جارہے تھے۔ قسطینا کی ہدایت پر میں ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

قسطینا نے انگلش میں، میٹنگ برخاست کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ ”اوکے جنٹلمین! میرے خیال میں اب کوئی سوال باقی نہیں ہے۔ ہم تین بجے کے بعد اگلی ملاقات کریں گے......“

قسطینا کھڑی ہوگئی۔ دیگر افراد بھی کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے قسطینا کو پے در پے سیلیوٹ مارے۔ سب کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آرہا تھا۔ سینئر کمانڈر افغانی بھی ان میں شامل تھا۔ یہ اونچا لمبا پٹھان تھا۔ چہرے سے جنگجوانہ طبع کا مالک لگتا تھا۔ یہ ملائی بھی بول لیتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ طویل عرصے سے ریان فردوس فیملی کے ساتھ ہے۔ اس نے اور دو تین دیگر افسروں نے ذرا تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا، مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد قسطینا نے ایک بغلی دروازہ کھولا اور ایک سجے سجائے کمرے میں آگئی۔ یہاں بیڈ اور آرام دہ کرسیاں وغیرہ موجود تھیں۔ ایک طرح سے یہ ریٹائرنگ روم تھا۔ یہاں آکر قسطینا نے کچھ ایزی محسوس کیا۔

”لگتا ہے کہ آپ آج سارا دن بھاگ دوڑ میں مصروف رہی ہیں؟“

اس نے اپنی سبز کیپ اتار کر میز پر رکھی اور ذرا دھیمی آواز میں بولی۔ ”ایسٹرن، ہم رائے زل پر ایک زوردار حملہ کرنے والے ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ حملہ آج رات پچھلے پہر ہوجائے گا۔ ہمیں اس کارروائی سے بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ دعا کرو کہ ہم کامیاب ہوجائیں۔“

”میری اور میرے ساتھیوں کی ساری ہمدردیاں اور نیک تمنائیں یور ہائی نس کے ساتھ ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”پھر وہی یور ہائی نس...... میں نے تم سے کہا بھی تھا۔ کم از کم ”تم“ مجھے اس لقب سے نہ پکارا کرو۔ میں تمہارے لیے بالکل مختلف طرح کے احساسات رکھتی ہوں، تم تو ایک لیجنڈ ہو ایسٹرن۔“

میں نے اپنی پُتلیاں اوپر چڑھائیں۔ ”یور ہائی نس!

پھر وہی ایسٹرن۔"

"اور پھر وہی یور ہائی نس۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ پھر میری کلائی پکڑ کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "انکار اور بحث سے کچھ حاصل نہیں۔ تم پکڑے جا چکے ہو۔ پورے ثبوتوں کے ساتھ۔ اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو پلیز۔"

وہ اٹھی اور سپاہیانہ چال چلتی ایک چھوٹا دروازہ کھول کر ملحقہ کمرے میں گھس گئی۔ چند سیکنڈ بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کئی کلرڈ فوٹوگرافز اور رول کیے ہوئے پوسٹرز تھے۔ اس کے علاوہ سی ڈیز کا ایک پیکٹ بھی تھا۔ اس نے فوٹوگرافز میرے سامنے بکھیر دیے اور پوسٹرز "ان رول" کر دیے۔ ایک بڑے پوسٹر میں مجھے RING کے اندر غیظ و غضب کا روایتی مظاہرہ کرتے دکھایا گیا تھا۔ میں اپنے آئرش حریف پر چلّا رہا تھا۔ اپنے دونوں بازو میں نے اوپر اٹھا رکھے تھے۔ میرے جسم پر فقط ایک نیکر تھی۔ کندھے تک جاتے ہوئے بالوں اور گھنی داڑھی مونچھ نے میرے دو تہائی چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

قسطینا نے میری قمیص کے بٹن کھولے اور میرا سینہ ننگا کر دیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ثبوت تو بہت سے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک ہے لیکن باقیوں کو چھوڑ بھی دو تو یہی ایک کافی ہے۔"

اس نے میری دائیں بغل سے ذرا نیچے ایک تل پر انگلی رکھی۔ یہ دراصل دو تل تھے جو ساتھ ساتھ واقع تھے۔ ایک قدرے بڑا اور دوسرا چھوٹا تھا۔ یہ دونوں تل سامنے پڑے قدِآدم پوسٹر پر بھی واضح نظر آ رہے تھے۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھا، پھر زیرِلب مسکراتے ہوئے میری قمیص کے بٹن بند کر دیے اور پوسٹر کو سمیٹ لیا۔

میں خاموش تھا۔ وہ بولی۔ "اگر مزید ثبوت درکار ہوں تو میں یہ سی ڈیز بھی پلے کر سکتی ہوں۔ ان میں بھی درجنوں ثبوت ہیں اور تو اور تمہاری آواز بھی پکار پکار کر گواہی دے گی کہ میں اسی ایسٹرن کی آواز ہوں جو شاہ زیب بن کر یہاں جاماجی میں موجود ہے۔"

میں نے ایک طویل توقف کے بعد کہا۔ "آپ کیا چاہتی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں...... کچھ بھی نہیں۔" وہ زور دے کر بولی اور مسکرائی۔ "بس مجھے اپنے اعتراف کے ساتھ یہ احساس ہو لینے دو کہ تم ہمارے درمیان موجود ہو، اور میں تمہیں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں...... تم اب تک جان ہی چکے ہو گے کہ میں مارشل آرٹ کی شیدائی ہوں اور خاص طور سے مارشل آرٹ کے اس سنسنی خیز ورژن یعنی "ایم ایم اے" کی۔ ایم ایم اے کے جن دو تین بے مثال کھلاڑیوں کو میں بے حد پسند کرتی ہوں ان میں ایک تم ہو ایسٹرن! میں نے کبھی...... سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن تم کو اس طرح اپنے سامنے دیکھوں گی۔ تم اس چھوٹے سے گمنام جزیرے میں آؤ گے اور میرے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو جاؤ گے۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے فوجی بوٹ اتارتے ہوئے بولی۔ "میں کوئی "رومانی ہیروئن" نہیں ہوں۔ ایک پریکٹیکل لڑکی ہوں۔ مجھ پر بے شمار ذمے داریاں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے پیارے والد کی موت کا بدلہ لینا، میں اپنا اولین فرض سمجھتی ہوں۔ میری زندگی میں شاید کچھ اور سوچنے کی گنجائش ہی نہیں ہے...... بلکہ اب تو شاید...... زندگی کی گنجائش بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہم حالتِ جنگ میں ہیں، کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔"

گفتگو کچھ بوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ دوبارہ ایک الماری کی طرف گئی اور اس میں سے ایک بک نکال لائی۔ بک کا خالی صفحہ میرے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ "آٹوگراف پلیز۔"

میں کبھی آٹوگراف بک کو اور کبھی قسطینا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنا قلم میری طرف بڑھا رہی تھی اور ساکت کھڑی تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی سائن کر دیے۔ وہ بولی۔ "کچھ لکھنا بھی تو چاہیے۔"

میں نے لکھا۔ "ایک انوکھے فوجی کمانڈر کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ۔"

اس نے دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ آٹوگراف میرے ہاتھوں سے لے لی اور بولی۔ "کالج کے زمانے میں آٹوگرافز کا شوق تھا۔ اب ایک عرصے سے یہ بک بند پڑی تھی، تمہارے لیے کھولی ہے اٹ سو اوور...... شکریہ ایسٹرن۔"

میں نے کہا۔ "میری بھی ایک درخواست ہے...... آپ سے...... مجھے ایسٹرن نہ کہیں۔"

"تو تمہیں بھی ایک بات ماننا ہوگی۔ مجھے یور ہائی نس نہ کہا کرو۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟"

"چلو...... لوگوں کے سامنے تو مجبوری ہے مگر جب یہ مجبوری نہ ہو تم مجھے میرے نام سے پکارو گے۔"

"اوکے...... قس...... طینا...... صاحبہ......"

اس نے جرابیں اتاریں۔ اس کے خوب صورت پیروں پر سخت بوٹوں کے سرخ نشان تھے۔ وہ پاؤں کی طرف

توجہ دیے بغیر بولی۔ ”تم بیٹھو، میں ذرا چینج کرآؤں۔ لیکن نہیں...... پہلے کھانے کے لیے کچھ کہہ دوں۔ یقیناً تم نے بھی ابھی نہیں کھایا ہوگا۔“ اس نے ایک بٹن پش کیا وہی خوفناک باڈی گارڈ بڑاڈے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگیا جس نے انیکسی کے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں قسطینا کے ساتھ مل کر میرے کندھے کا بھرتا بنایا تھا۔ وہ نگاہیں نیچی کر کے اٹین شین کھڑا ہوگیا۔ قسطینا نے ملائی زبان میں اس سے کچھ کہا۔

وہ ایک دم اپنے گھٹنوں پر ہوگیا اور میرے سامنے بدھ مت والوں کے انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ شکستہ انگلش میں بولا۔ ”مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی۔ میں اس بھول کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔“

میں نے اس کی معافی قبول کرنے میں دیر نہیں کی۔ ایسے دھانسو قسم کے شخص سے اچھے تعلقات ہی بہتر تھے۔ قسطینا نے ملائی زبان میں اس سے کچھ مزید کہا۔ وہ مؤدب انداز میں چل کر آگے آیا۔ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے اور الٹے قدموں واپس چلا گیا۔ قسطینا لباس بدلنے کے لیے چھوٹے دروازے کی دوسری جانب چلی گئی۔ میرا ذہن مسلسل سجاول کی غلطی پر افسردہ تھا۔ یہ سجاول ہی تھا جس نے قسطینا پر یہ ایسٹرن والا راز فاش کیا تھا۔ اس راز کے کھلنے میں میرے لیے فائدہ کوئی نہیں تھا، نقصان ہی نقصان تھا۔ میں اپنے بدترین دشمنوں جان ڈیرک اور راہول وغیرہ سے ابھی دور رہنا چاہتا تھا لیکن حالات یہ اشارہ دے رہے تھے کہ میں زیادہ دیر دور نہیں رہ سکوں گا۔

کچھ دیر بعد قسطینا لباس بدل آئی۔ اب وہ پنڈلیوں تک جاتے ہوئے ایک پھول دار اسکرٹ میں تھی۔ پاؤں میں خوش رنگ سرخ چپل تھی۔ اس کی نسوانیت اور جسمانی موزونیت پوری طرح نمایاں ہو رہی تھی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ وہ بھرے ہوئے جسم والی ایک پُرکشش لڑکی ہے۔ میری نظر کا زاویہ اور اس کی تپش محسوس کر کے اس کے ابھرے ہوئے رخساروں پر مدھم سرخی کی ایک غیر محسوس لہر دوڑ گئی۔ تاہم فوراً ہی وہ اپنی قدرے رعب دار آواز میں بولی۔ ”آج کی رات ہمارے لیے بڑی اہم ہے...... میں خود کمانڈ کروں گی اور اگلی صفوں میں رہوں گی۔ سپاہیوں اور رضاکاروں کا مورال بہت ہائی ہے۔ تم سن ہی رہے ہوگے۔ ان کے نعروں کی آواز یہاں تک آرہی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ بہت اہم حملہ ہے۔ ہمارے پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

”مگر...... میں بھی اس لڑائی میں شریک ہونا چاہوں

تو......؟"

تو میں پورے ڈی پیلس کو بتادوں گی کہ تم مارشل آرٹ کے انٹرنیشنل اسٹار ہو اور تمہاری حفاظت کی سخت ترین ضرورت ہے۔ اس لیے تمہیں تہ خانے میں بند کردیا جائے۔"

میں نے کہا۔ "آپ اور جو غضب چاہے کر لیجیے گا مگر کسی کو بتانے والا قہر نہ توڑیئے گا۔ یہ میرے لیے ازحد نقصان دہ ثابت ہوگا۔ میں اس بارے میں آپ کو پھر تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"نہیں شاہ زائب! مذاق کررہی ہوں۔ تم سمجھو کہ یہ بات میرے سینے میں اس وقت تک دفن ہے جب تک تم خود نہ چاہو۔" (وہ مجھے شاہ زیب کے بجائے شاہ زائب کہتی تھی)

"بہت شکریہ۔" میں نے کہا۔

"تمہارے کندھے کو دیکھتی ہوں تو مجھے ہول آنے لگتا ہے ایسٹرن...... مم میرا مطلب ہے شاہ زائب! کاش اس رات سے پہلے مجھے معلوم ہوجاتا کہ تم کون ہو۔ اس رات جو کچھ ہوا کیا تم اس کے لیے مجھے معاف کرسکتے ہو؟" اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔

میں نے کہا۔ "اتنی دلکش لڑکی کو تو کوئی بھی "معمولی سی شرائط" کے ساتھ معاف کرنے کے لیے تیار ہوسکتا ہے اور آپ تو یہاں کی سپریم کمانڈر ہیں۔ ویسے بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس رات جو کچھ ہوا، وہ سراسر بے خبری میں تھا۔ آپ یقین کریں اس حوالے سے میرے دل میں کوئی گلہ نہیں۔"

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتی...... ڈنر آگیا۔ ایک ملازم اور دو ملازمائیں طشتریوں میں پُرتکلف سا کھانا لے کر آئیں۔ اس میں کانٹی نینٹل کے علاوہ دو چار چائنیز ڈشز بھی تھیں۔ تین چار طرح کے شیریں اور تلخ مشروبات بھی شامل تھے۔ طرزِ تناول بھی شاہی تھا۔ یعنی چھری کانٹے اور اس طرح کے دیگر لوازمات۔ کھانا سرو ہوگیا تو قسطینا نے ملازمین کو باہر بھیج دیا۔ ہم نے کھانا شروع کیا۔ ایک ہاتھ سے چھری کانٹا استعمال کرنا میرے لیے دشوار ثابت ہورہا تھا۔ وہ اپنائیت سے بولی۔ "چھوڑو، میں تمہاری مدد کردیتی ہوں۔"

میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ میرے لیے خود چھری کانٹا استعمال کرنے لگی اور نوالہ میرے منہ تک لے جانے لگی۔ مجھے یہ سب کچھ ٹھیک تو نہیں لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی...... وہ بولی۔ "میں نے یہاں ایک چھوٹا سا جمنازیم بھی بنا رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تمہیں وہاں دیکھوں۔"

"کس لیے؟"

"یہ جاننے کے لیے کہ تم جم کو کس طرح استعمال کرتے ہو اور تم سے کچھ گر بھی سیکھوں۔ بالکل لائیو...... تمہارے رُوبرو کھڑے ہوکر۔ مگر اس میں دو بڑی رکاوٹیں ہیں۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو آج کی رات ہی بڑی رکاوٹ ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "پتا نہیں، وہاں کیا حالات پیش آنے ہیں۔ واپسی بھی ہونی ہے یا نہیں...... اور اگر واپسی ہو بھی گئی اور سب کچھ ٹھیک بھی رہا تو بھی تمہارا یہ کندھا۔ پتا نہیں کہ یہ کب تک ہلنے جلنے کے قابل ہوگا۔"

"میں اسی کندھے کے ساتھ آپ کی ہر خواہش پوری کرسکتا ہوں...... آپ کی ہر حربی خواہش، آخری الفاظ میں نے فقرے کی صحت درست رکھنے کے لیے کہے تھے۔

کھانے کے دوران میں اس نے آڈیو سسٹم آن کردیا تھا۔ ہلکا سا ملائیشین میوزک کمرے میں گونج رہا تھا۔ وہ بالکل بے باک اور بے تکلف تھی۔ اسے ہرگز پروا نہیں تھی کہ وہ سپریم کمانڈر ہے اور ایک اجنبی کے ساتھ بند کمرے میں بیٹھ کر ڈنر کررہی ہے۔ اس کے آفیسرز اس سے کہیں زیادہ سینئر تھے لیکن ان میں سے بھی کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ قسطینا کے کسی قول یا فعل پر کسی طرح کا اعتراض کرسکتا۔

"تم نے ابھی تک شادی نہیں کی...... تم شادی سے اتنے الرجک کیوں ہو؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"شاید تم بھول گئے ہو، یہ بات تم نے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنے ایک انٹرویو میں کہی تھی۔ آئرش فائٹر کے ساتھ مقابلے سے پہلے۔"

"لگتا ہے کہ آپ میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہیں۔"

"نہیں...... یہ تو غلط ہے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات ہیں...... اور سب سے اہم سوال تو یہی ہے کہ عزت مآب سے تمہاری ملاقات پاکستان میں کیسے ہو پائی...... اور تم یہاں کیونکر موجود ہو۔ تم ایم ایم اے کے میدان سے بھی غائب ہو اور اس بارے میں بہت کچھ کہا جارہا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا باؤنڈری لائن کی طرف دو تین بڑے دھماکے ہوئے۔ میز پر رکھے ہوئے برتن لرزنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اپاچی ہیلی کاپٹر بہت نیچے پرواز کرتا ہوا ڈی پیلس کے اوپر سے گزرا۔ ڈی پیلس کے احاطے سے پُرجوش نعروں کی گونج سنائی دی۔

قسطینا کے چہرے پر اضطراب نظر آنے لگا تھا۔ اس

نے سیل فون پر کسی سے ملائی زبان میں بات چیت کی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ سینئر کمانڈر افغانی ہی تھا۔

افغانی سے بات کرنے کے بعد قسطینا ایک بار پھر سپاہیانہ موڈ میں آگئی۔ اس نے میوزک بند کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہماری فورس بہت پُرجوش ہے۔ رضا کار دستے بھی بالکل تیار ہیں۔ یہ دستے فورس کے عقب میں رہیں گے اور ان کو بوقتِ ضرورت استعمال کیا جائے گا۔ بہت امید ہے کہ آج رات ہم رائے زل کے دانت کھٹے کر دیں گے۔“

”میں آپ کے لیے نیک خواہشات رکھتا ہوں۔“

”شکریہ۔“ اس نے کہا پھر پُرتپش لہجے میں بولی۔ ”گریے فورس ہم پر جو قرض چڑھا رہی ہے وہ بڑھتا جا رہا ہے۔ تمہیں ابراہیم کی دلہن کے بارے میں بھی پتا چل گیا ہو گا۔ اس کی موت کا سبب بھی گریے فورس کی جارحیت ہی بنی ہے۔ وہ تمہاری ہم وطن تھی اور اس سے پہلے تمہارا ہم وطن مسٹر سجاول بھی اسی جارحیت کا شکار ہوا ہے۔ اللہ کرے وہ زندہ ہو۔ آج ہم اس طرح کے سارے مظالم کا حساب بے باق کریں گے۔“ اس کے انداز میں برق کوند رہی تھی۔ اس کی نگاہیں جیسے اپنے والد کی خون آلود لاش کو دیکھ رہی تھیں۔

اس کے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنا شروع ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب آپ بہت مصروف ہونے والی ہیں۔ کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟“

وہ کھڑی ہو گئی۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اپنے بازو کا بہت دھیان رکھو اور چند روز مکمل آرام کرو۔ میں نے ڈاکٹرز کو بھی تمہارے لیے خصوصی ہدایات کر دی ہیں۔“

”بہت شکریہ یور......“ میں کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

وہ مسکرائی اور میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر گرم جوشی سے دبایا، لیکن اس طرح سے کہ میرے کندھے پر دباؤ نہ آئے۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی و گرمی میں ایک خاص طرح کی اپنائیت تھی۔ میں واپس جا رہا تھا...... تاہم یہاں میں اپنی ایک ”خاص چیز“ چھوڑ کر جا رہا تھا۔

باہر قسطینا کی ذاتی گاڑی مجھے انیکسی تک لے جانے کے لیے موجود تھی۔

☆☆☆

میں واپس پہنچا تو انیق پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اندر سجاول کے کمرے میں زینب مسلسل رو رہی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ وہ یہاں سے واپس پاکستان جانا چاہتی ہے اور اگر ہم نے جلد ہی اس کے لیے کچھ نہ کیا تو وہ اپنی جان لے لے گی۔ وہ کچھ کھا پی بھی نہیں رہی ہے۔ میں نے انیق کو تسلی دی

سمجھایا تھا کہ وہ زینب سے 'لاش' وغیرہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کرے گا۔ یہ ذکر چھیڑ کر ہم زینب کی پریشانی میں اضافے کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

میں اپنے کمرے کے اندرونی دروازے سے اس کے پاس پہنچا۔ کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ کی روشنی تھی۔ وہ رنج و الم کی ایک تصویر نظر آتی تھی۔ معصوم اور کسی چڑیا ہی کی طرح سہمی ہوئی۔

میں نے اس سے کہا۔ ”تمہیں ابراہیم کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے؟“

”کیا ہوا؟“ اس کی آنکھوں میں اَن گنت اندیشے سمٹ آئے۔

”وہ تمہارے بعد بے حد پریشان ہے۔ اسے نیم بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اب تک وہیں ہے۔“

”اب...... اُن کی حالت...... کیسی ہے؟“ اس نے اپنی تشویش چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتی ہے اور اس کی وجہ خود ابراہیم ہے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھال نہیں پا رہا اور ایک شوہر کی حیثیت سے اس کے لیے خطرہ بنا ہوا ہے لیکن اب جس طرح کے تاثرات اس کے چہرے پر نظر آئے تھے۔ وہ اس کے بیان سے میل نہیں کھاتے تھے۔ وہ جیسے چند سیکنڈ کے لیے تڑپ سی گئی تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ بہت کچھ چھپا رہی ہے۔ مجھے ابراہیم جیسے نیک خو اور سلجھے ہوئے لڑکے سے ایسی بے صبری اور چھچھورے پن کی توقع نہیں تھی۔ بے شک وہ نوجوانی کی خطرناک ترین عمر میں تھا۔ زینب پر ہزار جان سے فدا ہو چکا تھا اور وہ اسے ہر طرح سے میسر بھی تھی مگر میرا دل کہتا تھا کہ وہ زینب کو کسی خطرے میں نہیں دھکیل سکتا۔

تو کیا پھر کوئی اور چکر تھا۔ زینب نے یہاں آ کر چند بار بڑی بیگم نورل کا نام بھی لیا تھا۔ وہ ان سے کیوں ملنا چاہتی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ زینب کے ڈی پیلس سے نکلنے میں کسی طور بیگم کا ہاتھ ہو۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں وہ ٹھیک تو ہیں؟“ اس کا اشارہ ابراہیم کی طرف تھا۔

میں نے کہا۔ ”اگر اسپتال کے بستر پر بے ہوش پڑے ہونے کو اور اکھڑے ہوئے سانس لینے کو تم ٹھیک ہونا کہتی ہو تو پھر وہ ٹھیک ہی ہے۔“

وہ سسک اٹھی۔ کچھ دیر چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر خود کو

سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی، پھر بولی۔ ”انہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ...... بڑی جلدی...... اس صدمے سے سنبھل جائیں گے۔ میرا دل یہ گواہی دیتا ہے اُن کو کچھ نہیں ہوگا لیکن میرے یہاں رہنے سے بہت کچھ ہوسکتا ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“

میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”زینب! بڑی بیگم نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تمہارے چھپانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔“

اس کے معصوم چہرے پر رنگ سا گزر گیا، بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اس سادہ لوح لڑکی کو آہستہ آہستہ بولنے پر مجبور کر دینا میرے لیے بہت زیادہ دشوار ثابت نہیں ہوا۔ وہ میری باتوں میں الجھ کر رہ گئی اور اس کے منہ سے بے ساختہ کچھ ایسے فقرے نکلے جنہوں نے مجھے اس پر مزید حاوی کر دیا۔ جب میں نے اپنے سیل فون پر بنایا ہوا وہ وڈیو کلپ زینب کو دکھایا جس میں نیم بے ہوش ابراہیم کو افراتفری میں ایمبولینس میں داخل کیا جا رہا تھا...... تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے کہا۔ ”زینب! اپنی اور ابراہیم کی زندگی کو بچانا چاہتی ہو تو کچھ بھی چھپاؤ نہیں۔ ورنہ بہت نقصان ہو جائے گا اور ہم تم سے پوری ہمدردی رکھنے کے باوجود کچھ نہ کر سکیں گے۔“

”لیکن وہ کہتی ہیں۔ اندر خانے بات بہت بگڑ چکی ہے۔ عزت مآب اپنی جان لے لیں گے یا اُن کی......“ آواز اس کے ہونٹوں میں ٹوٹ رہی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ بڑی بیگم کی طرف ہے۔ یہ بات تو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھی کہ زینب سے شادی کر کے ابراہیم نے اپنے والد ریان فردوس کو اپنے بہت خلاف کر لیا ہے۔ اب شاید بیگم نسا نورل نے اس معاملے میں رازداری سے مداخلت کی تھی اور زینب کو اس سلسلے میں بری طرح ڈرایا دھمکایا تھا۔ بیگم نورل یوں تو ایک اصول پسند خاتون تھیں مگر لگتا تھا کہ اپنے گھر کے کسی طوفان کا رخ بدلنے کے لیے انہوں نے تھوڑی سی بے اصولی کی گنجائش نکالی ہے۔

میں نے بے آسرا اور حواس باختہ زینب کو پوری رازداری اور تعاون کا یقین دلایا اور اس نے اگلے آدھ پونے گھنٹے میں مجھے کافی کچھ بتا دیا۔ بدھ کی رات ڈی پیلس میں درونِ خانہ ایک شدید جھگڑا ہوا تھا۔ ریان فردوس کی انا اور ضد نے باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ بے شک ابراہیم کی تربیت اس کی ماں نے بہت اچھی کی تھی اور باپ جیسا بھی تھا وہ اس کے سامنے آنکھ نہیں اٹھاتا تھا مگر چونکہ ابراہیم نے ریان فردوس کے منشا کے بغیر زینب سے نکاح کیا تھا، باپ بیٹے کے درمیان ایک بڑی خلیج حائل ہو گئی تھی۔ بدھ کی رات ایک زلزلے کے ساتھ یہ خلیج وسیع وعریض ہو گئی۔ بیٹے نے پہلی بار اپنے ضدی باپ کے سامنے آنکھ اٹھائی اور زبان بھی کھولی۔ یہ حرکت اس کے لیے قیامت بن گئی۔ شراب کے نشے میں دھت ریان فردوس نے ابراہیم سے کہا کہ وہ زینب کو طلاق دے یا پھر اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو گولی مار دے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو پھر وہ خود اپنے بزدل اور نافرمان بیٹے کو گولی مارے گا۔

یہ واقعہ بیگم نورل نے پوری تفصیل اور شرح کے ساتھ اسی رات زینب سے بیان کیا اور روتے ہوئے اپنی چادر زینب کے قدموں میں ڈالی کہ وہ ابراہیم کی جان بچا لے کیونکہ اپنی اور ابراہیم کی جان پر عزت مآب نے بہت بڑی قسم کھائی ہے اور اب وہ اس قسم سے پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ زینب کو زیادہ کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا گیا جو کچھ بھی ہوا، سب اسی ایک رات میں ہی ہوا۔ رات پچھلے پہر زینب نے اپنے محبوب شوہر کے نام وہ خط لکھا جو میں خود بھی پڑھ چکا تھا۔ اس تحریر کے بعد بیگم نورل نے بڑی رازداری کے ساتھ زینب کو ایک نہایت بااعتماد شخص کے سپرد کر دیا۔ اس شخص کا نام زینب کو معلوم نہیں تھا لیکن وہ جو حلیہ اور شکل وصورت بتا رہی تھی، اس کی نسبت سے پتا نہیں کیوں میرا دھیان سینئر کمانڈر افغانی کی طرف جا رہا تھا۔ درمیانی عمر کا یہ کمانڈر اس جزیرے کی لڑائی میں بے حد فعال اور موثر کردار ادا کر رہا تھا۔ رضا کاروں کے جو جتھے ڈی پیلس میں پہنچ رہے تھے، انہیں وہی کنٹرول کرتا تھا اور ان کے جوش وجذبے میں نہ صرف اضافہ کرتا تھا بلکہ اس کو درست سمت بھی دیتا تھا۔ اس کی اپنی بہادری اور جنگی صلاحیت بھی بے مثل تھی۔ لیکن کیا اسی بے مثل کمانڈر نے زینب کو بیگم نورل سے موصول کر کے خیال جیسے مکروہ شخص کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر زینب یہی کہہ رہی تھی کہ اسی شخص نے اسے خواجہ سرا خیام تک پہنچایا۔

زینب نے روتے ہوئے بتایا۔ ”وہ ہمدرد شخص پہلے مجھے اپنے بہت بڑے گھر میں لے گیا۔ اس کی باتوں سے یہی پتا چلتا تھا کہ وہ مجھے بڑی خاموشی کے ساتھ کسی لانچ میں بٹھا کر یہاں سے نکال دینا چاہتا ہے مگر اگلے روز دوپہر کے وقت مجھے ایک بند گاڑی میں بٹھا کر سمندر کے کنارے اس گھر میں پہنچا دیا گیا۔ اس شخص نے مجھ سے کہا کہ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ یہ مسئلہ لڑائی پھیلنے کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب ہم کچھ دن سمندر

میں سفر نہیں کر سکتے۔ مجھے اسی گھر میں اس خواجہ سرا کے ساتھ رہنا ہوگا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تم نے پوچھا نہیں کہ کتنے دن رہنا ہوگا؟‘‘

زینب آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے پوچھا تھا مگر اس نے جھڑک کر کہا کہ شکر کرو تمہاری جان بچ رہی ہے، جب وقت آئے گا تم کو نکال بھی دیا جائے گا۔‘‘

’’وہ شخص تم سے کس زبان میں بات کرتا تھا؟‘‘

’’وہ اردو بولتا تھا۔ جیسے پہاڑی علاقے کے لوگ بولتے ہیں۔ اس کی کچھ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔‘‘

میرا دھیان ایک بار پھر افغانی کی طرف ہی گیا۔ میں نے پوچھا۔ ’’تمہارے سامنے خواجہ سرا نے اس بندے سے بات کی؟ یا اُسے کسی نام سے بلایا؟‘‘

زینب نے نفی میں سر ہلایا اور رخساروں سے آنسو صاف کیے۔

’’تم سے لباس بدلنے کے لیے اسی خواجہ سرا نے کہا تھا؟‘‘ میں نے دریافت کیا۔ اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں کمروں کے درمیانی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یہ انیق ہی تھا۔ میں نے تصدیق کے بعد دروازہ کھولا۔ دوسرے کمرے میں اندھیرا تھا۔ انیق نے سرگوشی میں کہا۔ ’’بلیک آؤٹ کا آرڈر ہوا ہے جی۔ آپ بھی ٹیبل لیمپ بند کر دیں۔ تھوڑی تھوڑی روشنی دروازے کی درزوں میں محسوس ہو رہی ہے۔‘‘

ایک ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتا ہوا فراٹے سے گزر گیا۔ لگتا تھا کہ حملے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ’’وہ سیف کا کچھ پتا چلا ہے آپ کو؟‘‘ انیق نے سرگوشی میں کہا۔

’’کیوں کیا ہوا؟‘‘

’’کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔ رضا کاروں کے ایک دستے کے ساتھ بارڈر کی طرف چلا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ مالِ غنیمت لے کر آؤں گا اور اگر مالِ غنیمت میں کوئی اچھی سی لڑکی مل گئی تو تمہاری اس سے شادی کرا دوں گا، عجب بے صبرا بندہ ہے۔‘‘

’’احمق ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’تمہاری طرح۔‘‘

دھماکوں کی گھن گرج بڑھ گئی تھی۔ رضا کاروں کے دستے ابھی تک نعرہ زنی کرتے ہوئے بارڈر کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ ان میں بہت سے نوآموز لوگ بھی تھے۔ مگر ان کا جذبہ اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ جیسا کہ قسطینا نے بتایا تھا، لڑائی میں ان لوگوں کو گرین فورس کے عقب میں رہنا تھا اور ضرورت پڑنے پر ہی ان سے کام لیا جانا تھا۔

انیق نے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھایا تو کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ مسلسل دھماکوں سے ڈری ہوئی زینب کچھ اور بھی ڈر گئی۔

’’آپ نے...... اندھیرا...... کیوں کر دیا؟‘‘ وہ منمنائی۔

’’یہ ضروری ہے۔ باہر لڑائی ہو رہی ہے۔‘‘

بارڈر کی طرف گولہ باری شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ درودیوار مسلسل لرز رہے تھے۔ مارٹر اور بزوکا وغیرہ کے علاوہ اب قدرے بھاری توپیں بھی چلائی جا رہی تھیں۔ جو کچھ بھی تھا زینب ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ وہ دو طرفہ خوف کی زد میں تھی۔ ایک تو جنگ کا خوف۔ دوسرا ایک بند اندھیرے کمرے میں ایک غیر محرم کے ساتھ موجود ہونے کا خوف۔ ’’پلیز، آپ لیمپ جلا دیں۔‘‘ وہ پھر منمنائی۔

میں نے لیمپ تو نہیں جلایا مگر اس کا خوف کم کرنے کے لیے انیق کو بھی اسی کمرے میں بلا لیا۔ انیق نے اسے خیام کے چنگل سے نکالا تھا اور قدرتی بات تھی کہ وہ اس پر اعتماد کرتی تھی...... ہیلی کاپٹرز مسلسل پروازیں کر رہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ یہ دشمن کے ہیں یا اپنے۔ پھر ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا ڈی پیلس کے اندر یا آس پاس ہی کہیں ہوا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ چھت ہم پر آن گری ہے۔ زینب تاریکی میں چلائی اور اس نے جھپٹ کر میرا بازو تھام لیا۔ تاریکی میں اس کو کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے وہی بازو تھاما تھا جو پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ درد کی لہر کو میں نے بمشکل ضبط کیا۔

پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ اس کی شدت بھی جگر پاش تھی۔ یقیناً یہ ہوائی حملہ تھا۔ ڈی پیلس کے اندر اور اردگرد لگی ہوئی اینٹی ایئر کرافٹ گنوں نے اپنے دہانے کھول دیے۔ ایک شورِ محشر برپا ہو گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑائی وقتِ مقررہ سے کچھ پہلے ہی شروع ہو گئی ہے۔ بارڈر کی طرف ہونے والی دوطرفہ فائرنگ میں بھی بہت تیزی آگئی تھی۔

یکے بعد دیگرے دو تین مزید سماعت شکن دھماکے ہوئے۔ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ بم ہیلی کاپٹرز سے گرائے جا رہے ہیں یا کسی ایئر کرافٹ سے۔ طیارہ شکن گنوں کی مخصوص جھٹکے دار آواز صاف پہچانی جا رہی تھی۔

ایک دو منٹ بعد زوردار دھماکوں کا سلسلہ تو بند ہو گیا مگر بارڈر پر ہونے والی لڑائی میں مزید تیزی آگئی۔ یوں لگتا تھا کہ چپے چپے پر بارود پھٹ رہا ہے اور دونوں طرف کی فورس اپنا تمام ایمونیشن ایک دوسرے پر نچھاور کر دینا چاہتی ہے۔ ڈی پیلس کے اندر جو دھماکے ہوئے تھے، ان کے اثرات بھی

ہماری سماعت تک پہنچ رہے تھے۔ بھاگو دوڑو کی آوازیں آرہی تھیں۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی کا سائرن بھی سنائی دیا۔ شاید کسی حصے میں تھوڑی بہت آگ بھی لگی تھی۔

”باہر نکل کر دیکھوں؟“ انیق نے کہا۔

”نہیں۔ رہنے دو۔“ میں نے کہا۔

ہم محاذ سے کم و بیش چھ میل دور بیٹھے تھے لیکن جو کچھ وہاں ہو رہا تھا، اس کی ”شدت“ آوازوں کی صورت میں ہم تک پہنچ رہی تھی۔ حملہ تو یقیناً قسطینا اور گرین فورس نے ہی کیا تھا مگر دوسری طرف سے بھی بھرپور مزاحمت مل رہی تھی، میں تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا کہ فرنٹ پر کیا صورتِ حال ہوگی۔ مسلسل دھماکوں کی مہلک آواز اور قاتل چمک، دھواں، آگ، زخمیوں کی پکار، مرنے والوں کے چیتھڑے، گرین فورس کے جانباز غم و غصے سے بھرے ہوئے۔ اپنی سابقہ ہزیمت کا بدلہ چکانے کے لیے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے...... قسطینا آگے بڑھ بڑھ کر اپنے جاں نثاروں کا حوصلہ بڑھاتی ہوئی اور خود بھی آگ اور بارود سے نبرد آزما...... میں نے سب کچھ تصور میں دیکھا۔

انیق نے سیل فون کے ذریعے اپنے دوست ازمیر طیب سے رابطہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ”ازمیر! آگے کیا صورتِ حال ہے؟“

”بڑا گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے انیق، زخمی آرہے ہیں۔ کچھ شہادتیں بھی ہوئی ہیں۔“ ازمیر کی آواز ہنگامی صورتِ حال کے سبب کانپ رہی تھی۔

”کچھ کامیابی ہوئی؟“

”ابھی ٹھیک سے پتا نہیں چل رہا۔ بہرحال ہماری فورس حملہ کر کے کچھ اندر تو گئی ہے۔“ ازمیر نے اپنی شکستہ انگلش میں جواب دیا۔ اس کی آواز فون کے اسپیکر کے ذریعے ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ ڈی پیلس پر ہیلی کاپٹرز کے ذریعے چند منٹ بمباری کی گئی ہے جس سے کچھ ہلاکتیں بھی ہوئی ہیں اور اسٹور روم کی طرف آگ لگی ہے۔ تاہم اینٹی ائیر کرافٹ گنز کی فائرنگ نے حملہ آور ہیلی کاپٹرز کو مار بھگایا۔

بات کرتے کرتے ازمیر طیب نے ذرا توقف کیا اور بولا۔ ”ایجنسی والے اب کھلم کھلا رائے زل کی مدد کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری فورس پر دو طرف سے حملہ کیا ہے۔ کچھ اور زخمی ڈی پیلس میں لائے گئے ہیں۔ دو لاشیں بھی ہیں۔ ان میں کمانڈر افغانی صاحب کے ایک قریبی ساتھی اکبر بھائی کی لاش بھی ہے۔ بڑا بہادر بندہ تھا۔ پورا جسم چھلنی ہے اس کا......“

ازمیر نے مرتعش لہجے میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے ڈنمارک میں اور کچھ دیگر یورپی ملکوں میں اب تک کافی دھواں دھار زندگی گزاری تھی مگر اس طرح کی جنگی صورتِ حال سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ مجھے یہ پتا بھی پہلی بار چل رہا تھا کہ ہیلی کاپٹرز کے ذریعے بھی بمباری کی جاتی ہے اور ایسے ہیلی کاپٹرز کو عسکری زبان میں اٹیک ہیلی کاپٹرز کہا جاتا ہے۔ بے شک ہم محاذ سے بہت پیچھے تھے پھر بھی بے پناہ سنسنی محسوس کر رہے تھے۔ میرا دھیان بار بار سجاول کی طرف بھی جا رہا تھا۔ کیا اس لڑائی کے آخر میں ہمیں اس کی طرف سے کوئی اچھی خبر مل سکتی تھی؟

ہم اس تاریک کمرے میں موجود رہے۔ انیق گاہے بگاہے سیل فون کے ذریعے خانساماں ازمیر طیب سے باہر کے حالات پوچھتا رہا۔ پتا چل رہا تھا کہ ریان فردوس کی گرین فورس کی زبردست مزاحمت ہو رہی ہے بلکہ اپنے بے پناہ جوش و خروش کے باوجود انہیں ایک دو جگہوں پر کچھ پیچھے بھی ہٹنا پڑا ہے۔ پھر ایسی خبریں آئیں کہ گرین فورس کے علاوہ رضاکار دستوں سے بھی اِکا دُکا زخمی اور جاں بحق ہونے والے قریبی اسپتالوں میں پہنچ رہے ہیں۔ مجھے کبڈی شاہ سیف کی طرف سے بھی فکر تھی۔ وہ یونہی منہ اٹھا کر رضاکاروں کے ساتھ چل پڑا تھا۔

انیق نے کہا۔ ”شاہ زیب بھائی! آپ کو کچھ محسوس ہو رہا ہے؟...... لگتا ہے کہ لڑائی اب نیوسٹی کے قبضے والے علاقے میں نہیں ہو رہی۔“

”ہاں...... لگتا تو کچھ ایسے ہی ہے۔ فائرنگ کی آوازیں اب نسبتاً قریب سے آرہی ہیں۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟ رائے زل کی گرے فورس آگے آگئی ہے؟“ اس کے لہجے میں تشویش کی لہر تھی۔

”ابھی یقین سے کیا کہا جاسکتا ہے لیکن یہ بات تو ہے کہ امریکن ایجنسی کے لوگ رائے زل کی بھرپور مدد کر رہے ہیں۔“

ایک بار پھر اینٹی ائر کرافٹ گنز کی خوفناک آوازیں سنائی دیں۔ ڈی پیلس کے اردگرد چند زوردار دھماکے ہوئے۔ زینب اس تاریک کمرے میں ایک سہمی ہوئی روح تھی جو گاہے بگاہے میرے بازو کو اپنی لرزاں گرفت میں لے لیتی تھی۔ کسی وقت وہ منہ میں کچھ پڑھنے بھی لگتی تھی۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور نرم سرگوشی میں کہا۔ ”گھبراؤ نہیں زینب، جب تک ہم ہیں تم پر کوئی آنچ

نہیں آئے گی۔"

سیل فون کے ذریعے جو اطلاعات ہم تک پہنچ رہی تھیں، وہ کچھ حوصلہ افزا نہیں تھیں پھر ان اطلاعات نے تشویشناک رنگ اختیار کرلیا۔ پتا چلا کہ گرین فورس پسپا ہورہی ہے اور ایک دو جگہ اس کا بھاری جانی نقصان ہوا ہے۔ پھر خبر آئی کہ دو مقام پر رائے زل کی فورس اور ایجنسی کے الائنس کو کامیابی ملی ہے اور وہ آگے بڑھ آئے ہیں۔ ایک خبر کافی لرزہ خیز تھی۔ ازمیر طیب نے رندھی ہوئی آواز میں فون پر انیق کو اطلاع دی۔ "کہا جارہا ہے کہ کمانڈر افغانی صاحب شہید ہو گئے ہیں...... ہماری فورس کچھ پیچھے ہٹ کر اپنی دوسری دفاعی لائن پر آگئی ہے۔"

"مطلب یہ کہ...... پسپائی ہورہی ہے؟" انیق نے پوچھا۔

ازمیر طیب نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ حرامی ایجنسی والے غدار ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہادروں کی پیٹھ میں چھرا گھونپتے ہیں...... ہمیشہ گھونپتے ہیں۔"

اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ پوری تیاری اور جذبے سے جوابی حملہ کرنے کے باوجود گرین فورس کو شکست ہوئی تھی اور اب گھمسان کی جنگ میں وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ پتا نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا نکلنا تھا۔ مجھے شروع سے یہ اندیشہ تھا کہ عزت مآب کے لیے امریکنوں سے جیتنا آسان نہیں ہوگا۔

اسی دوران میں میرے والے کمرے کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں دونوں کمروں کے درمیانی دروازے سے گزر کر اپنے والے کمرے میں آیا اور دروازہ کھولا۔ سامنے دھواں دھار چہرے کے ساتھ حلمی کا ایک اسسٹنٹ کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "جناب آپ کے لیے حلمی صاحب کی طرف سے ایک انسٹرکشن ہے۔"

"کیا؟"

"وہ کہہ رہے ہیں کہ لڑائی کی صورتِ حال غیر یقینی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو انیکسی چھوڑ دیں اور ڈی پیلس کے اندرونی حصے میں آجائیں۔ وہ خود بھی اب ڈی پیلس میں آگئے ہیں۔ ڈی پیلس کا اندرونی حصہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔"

یہ گڑبڑ والا معاملہ تھا۔ ہمارے ساتھ یہاں زینب موجود تھی (اور اس کی "تجہیز و تکفین" دو دن پہلے ہو چکی تھی) ہم اسے یہاں چھوڑ کر تو نہیں جاسکتے تھے۔ میں نے پیغام رساں سے کہا۔ "اطلاع کا شکریہ۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی ہمیں یہیں رہنا چاہیے۔ اگر کوئی سنگینی محسوس ہوئی تو ہم ہدایت پر عمل کریں گے۔"

وہ جز بز سا واپس چلا گیا۔ میں نے دروازہ بند کردیا۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر مشرقی جانب دیکھا۔ ڈی پیلس کے ایک حصے میں ابھی تک شعلے تھے اور دھواں اٹھ رہا تھا۔ افراتفری سی دکھائی دے رہی تھی۔ گھپ اندھیرے کے پس منظر میں افق پر دھماکوں کے ساتھ روشنی کے زبردست جھماکے ہورہے تھے۔

میں زینب والے کمرے میں واپس آیا۔ سنگین صورت حال کے باوجود انیق کی حسِ مزاح برقرار تھی۔ مغموم لہجے میں بولا۔ "کیا اچھا ہوتا، اگر افغانی جیسے بہادر کے بجائے آقا جان کے مرحوم ہونے کی خبر آجاتی...... یا پھر کم از کم......" وہ رک گیا۔

"کیا کم از کم؟" میں نے پوچھا۔

"یا پھر کم از کم سجاول صاحب کے بارے میں ہی "تصدیق" ہوجاتی۔"

تصدیق کا لفظ اس نے "وفات" کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔ میں اس کا لب و لہجہ اب اچھی طرح سمجھنے لگا تھا۔

"کچھ شرم کرو۔" میں نے غصیلی سرگوشی کی۔ یہاں بارود برس رہا ہے اور تمہیں مذاق سوجھ رہے ہیں۔"

"ہم...... مذاق نہیں بھائی۔" وہ مجھ سے ذرا دور کھسک کر بولا۔ "وہ کہتے ہیں نا جی کہ جو مر جاتے ہیں ان کے لیے چین آجاتا ہے لیکن جو بچھڑ جاتے ہیں، ان کا دکھ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ رات دن سجاول صاحب کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ وہ بہادر تھے، مجھے یقین ہے کہ وہ آٹھ دس بندوں کو مار کر ہی مرے ہوں گے۔ اللہ اُن کے درجے بلند کرے۔" اس نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا۔ "وہ واپس آگیا اور اسے تمہارے خیالات کا پتا چل گیا تو تمہارے "درجوں" میں بھی کافی ردوبدل کرے گا۔"

اب دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ زینب بدستور میرا بازو پکڑے بیٹھی تھی۔ بالکل ایک سہمی ہوئی چڑیا تھی وہ...... در و دیوار مسلسل بارودی دھماکوں سے گونج رہے تھے۔

باہر ایمبولینسز کے سائرن چنگھاڑ رہے تھے اور گاہے بگاہے ہیلی کاپٹرز یا چاپرز کے پروں کی پھڑپھڑاہٹیں سنائی دیتی تھیں۔ مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر حلمی نے دوبارہ سختی سے آرڈر کیا یا خود ہی یہاں آگیا تو کیا ہوگا۔ ہمیں اس کے ساتھ

جانا پڑے گا اور زینب یہاں اکیلی رہ جائے گی۔

اچانک یوں محسوس ہوا کہ توپوں کی گھن گرج کم ہوگئی ہے۔ اگلے پانچ دس منٹ میں دھماکوں میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ میں بھی اب وہ پہلے جیسی شدت نہیں تھی یا تو یہ مختصر وقفہ تھا یا لڑائی عارضی طور پر رک گئی تھی۔ کمرے میں بھی ہلکا سا اجالا ہو گیا تھا۔ اجالا ہونے کے بعد زینب نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے جنہیں وہ بار بار اپنی اوڑھنی میں سمیٹنے کی کوشش کرتی تھی۔ چھوٹی سی ناک مسلسل رونے سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس کے کومل ہاتھوں پر ابھی تک سہاگ کی مہندی کا پھیکا سا رنگ موجود تھا۔ اس رنگ نے دل پر ٹھیس لگائی۔

میں نے کہا۔ ”انیق! میں باہر کا چکر لگا کر آتا ہوں۔“

وہ خود جانا چاہتا تھا لیکن چونکہ میں نے پہلے کہہ دیا تھا، اس لیے اسے خاموش رہنا پڑا۔ میں نے اپنے کمرے میں جا کر پہلے پین کلر اور اینٹی بائیوٹک کھائی، اس کے بعد اپنے ”آپریشن شدہ“ بازو کو دائیں ہاتھ سے سہارا دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ دروازہ میں نے مقفل کر دیا تھا۔ احاطے میں پہنچا تو نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ ہر چہرہ مُتا ہوا تھا۔ کچھ رضا کار دستے واپس آ رہے تھے اور ان کے چہروں پر ”شکست“ لکھی ہوئی تھی۔ بہت سے ایسے تھے جن کے جسموں پر چھوٹے موٹے زخم بھی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بکھرے بکھرے سے تھے۔ چند گھنٹوں پہلے والے جوش و خروش کا کہیں نشان نہیں تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو امریکنوں کی شان میں گالیاں بک رہے تھے۔ کچھ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تھے۔

ایک شخص ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور ملائی میں غصے بھری تقریر کرنے لگا۔ اس کی تقریر میں بار بار عزت مآب کا نام بھی آ رہا تھا۔ وہ غالباً عزت مآب اور ان کی فیملی پر غفلت اور سست روی کے الزامات دھر رہا تھا۔ ایک طرف سے ایک باقاعدہ فوجی نمودار ہوا اور اس نے تقریر کرنے والے کی پٹائی شروع کر دی۔ کچھ دیگر سپاہی بھی اس فوجی افسر کی مدد کو پہنچ گئے اور تقریر کرنے والے کو اٹھا کر وہاں سے دور لے گئے۔ میں سیف کو ڈھونڈ رہا تھا، اچانک میری نظر حلمی اور آقا جان کے مشترکہ اسسٹنٹ کیپٹن حارڈ پر پڑ گئی۔ وہ انگلش روانی سے بولتا تھا۔

میں نے اس کو جا پکڑا۔ ”کیا ہوا کیپٹن حارڈ؟“

اس نے جبڑے بھینچے اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”کامیابی نہیں ہوئی...... کافی جانی نقصان بھی ہوا ہے۔ ہمارے اسپتال اور کلینک زخمیوں سے بھر گئے ہیں، جاں بحق ہونے والوں کی تعداد بھی کافی ہے۔“

”اب لڑائی رک گئی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی۔“ وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”رائے زل اور ایجنسی کے لوگ مزید آگے آگئے ہیں۔ ٹیلوں تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں ہماری فورس اونچائی پر ہے اور انہوں نے ان کی پیش قدمی روک دی ہے۔ کم از کم وقتی طور پر تو روک دی ہے۔“

”تمہارے کہنے کا مطلب ہے کیپٹن کہ مزید علاقہ گرے فورس کے قبضے میں چلا گیا ہے؟“

”ہاں...... کافی زیادہ۔ ایجنسی نے جدید ترین ہتھیار استعمال کیے ہیں۔ ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی۔ لیکن...... ان ساری بری خبروں کے درمیان ایک چھوٹی سی اچھی خبر بھی ہے۔ پہلے یہ اطلاع آئی تھی کہ کمانڈر افغانی لڑائی میں مارے گئے ہیں لیکن اب پتا چلا ہے کہ وہ صرف زخمی ہوئے تھے۔ اسپتال میں مرہم پٹی کے بعد وہ پھر بارڈر پر موجود ہیں۔ وہ جس جاں فشانی کے ساتھ اس لڑائی میں حصہ لے رہے ہیں، وہ بے مثال ہے۔“

اسی دوران میں میری نظر سیف پر پڑ گئی۔ ہجوم میں مجھے اس کی جھلک نظر آئی تھی۔ میں اس کی طرف لپکا۔ ”میں آپ ہی کو ڈھونڈ رہا تھا۔“ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔

”اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر کدھر چلے گئے تھے تم؟ کیا کارہائے نمایاں انجام دے کر آئے ہو؟“ میں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

وہ بولا۔ ”اس کی تو نوبت ہی نہیں آئی جی۔ ہم تو ابھی پچھلے مورچوں میں تھے۔ اگلے مورچوں والوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ پھر ایک دم ایک پکا فوجی ہمارے پاس آیا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ ہمیں دائیں اور بائیں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہم فوراً اس گھیرے سے نکلیں اور ٹیلوں تک پیچھے ہٹ جائیں۔ ہم افراتفری میں وہاں سے نکلے...... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بھاگے۔ اس دوران میں جانی نقصان بھی ہوا۔“

سیف بھی اکثر رضا کاروں کی طرح عام لباس میں تھا۔ ہاں اسے ایک گرین کیپ دے دی گئی تھی۔ اس کے پاس ایک سیون ایم ایم رائفل اور اس کے فالتو راؤنڈ بھی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ راؤنڈ وہ راستے میں بھاگتے ہوئے گرا آیا تھا۔ اس نے بھی لڑائی کے حوالے سے تقریباً وہی باتیں بتائیں جو تھوڑی دیر پہلے کیپٹن حارڈ بتا چکا تھا۔ آخر میں وہ بولا۔ ”یہ پہلا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہوا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اگلے تجربے اچھے ہوں۔ دراصل میں بھاگنے والا نہیں پکڑنے والا

بندہ ہوں اور یہاں سین ہی بھاگنے والا تھا۔'' وہ کبڈی کے حوالے سے بات کر رہا تھا)

میں قسطینا کی خیر خیریت کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ آخر وہ بھی نظر آ گئی۔ لیکن احاطے میں نہیں، اوپر بالکونی نما جھروکے میں۔ یہ وہی جھروکا تھا جہاں سے چند دن پہلے بھی اس نے سپاہیوں اور رضا کاروں سے خطاب کیا تھا۔ وہ اپنے افسران اور کمان داروں کے ساتھ اچانک ہی جھروکے میں نمودار ہوئی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں سیدھی جھروکے میں پڑ رہی تھیں اور ہر منظر واضح تھا۔ قسطینا یونیفارم میں تھی۔ بلٹ پروف جیکٹ بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جنگ کا دھواں اور گرد تھی لیکن حوصلہ اب بھی پست نہیں تھا۔ اسے جھروکے میں دیکھتے ہی بکھرے ہوئے لوگ یوں جھروکے کے نیچے جمع ہوئے جیسے ایک طاقتور مقناطیس نے لوہ چون کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ لوگوں نے اسے دیکھ کر بلند نعرے لگائے۔ وہ وقتی طور پر اپنے زخموں اور شکست خوردگی کو بھول گئے اور شاید قسطینا چاہتی بھی یہی تھی۔ لوگ جوق در جوق جھروکے کی طرف لپکے چلے آ رہے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو ڈی پیلس کے اندرونی حصوں سے برآمد ہوئے تھے۔ انیق بھی انیکسی سے نکلا تھا اور میرے پہلو میں آن کھڑا ہوا تھا۔

قسطینا نے ایک پُرجوش تقریر کی۔ آقا جان اور حلمی صاف ستھرے کپڑوں میں قسطینا کے پیچھے کھڑے تھے۔ یقیناً آقا جان ان لوگوں میں سے تھا جو خود نہیں لڑتے بلکہ دوسروں کو لڑاتے ہیں۔ حسب توقع قسطینا نے ایک پُرجوش تقریر کی۔ یہ تقریر ملائی میں تھی اور اس کے کچھ الفاظ ہی میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ بہرحال پتا چلتا تھا کہ وہ اس وقتی شکست کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی...... ساتھیوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد برقرار رکھیں۔ ہم اپنے علاقے کے ایک ایک انچ کا دفاع کریں گے۔

سپاہیوں اور رضا کاروں میں ایک بار پھر جوش کی لہریں دکھائی دینے لگیں، تاہم ان لہروں میں وہ پہلے جیسی اٹھان نہیں تھی۔ یہ بھی سننے میں آ رہا تھا کہ گھمسان کی لڑائی میں کم و بیش چار سو افراد جان سے گئے ہیں جن میں گرین فورس کے کئی اہم کمانڈر بھی ہیں۔ میں، انیق اور سیف واپس انیکسی میں پہنچے۔ انیق تو رازداری کے ساتھ فوراً زینب کے پاس چلا گیا۔ میں اور سیف باتیں کرتے رہے۔ وہ مجھے استاد جی کہہ کر بلا رہا تھا اور بار بار ٹوکنے پر بھی باز نہیں آتا تھا کہنے لگا۔ ''استاد جی، لگتا ہے کہ کل کا دن ہی چنگا نہیں تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے دن کی شروعات لسی سے نہیں کی تھی۔ لسی نہ پیوں تو لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا گناہ ہوا ہے جس کا وبال رات تک سر سے نہیں اترے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ گناہ تو تمہیں آج پھر کرنا ہوگا کیونکہ میں نے یہاں کہیں لسی دیکھی نہیں ہے۔''

''پر میں نے دیکھ لی ہے جی بلکہ پیڑوں والی۔ کل ایک سردار جی سے ملاقات ہوئی تھی۔ ان کے مسئلے مسائل بھی وہی ہیں جو میرے ہیں۔ لسی، مکھن، دیسی گھی کا پراٹھا، دیسی ککڑ اور دودھ جلیبی وغیرہ۔ سب کچھ ملے گا یہاں۔'' اس کے چہرے پر چمک تھی۔

وہ سارا دن الجھن اور پریشانی میں ہی گزرا۔ محاذ پر مکمل خاموشی تھی۔ ڈی پیلس میں اور ڈی پیلس سے باہر مختلف جگہوں پر، مرنے والے افسروں اور جوانوں کی آخری رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ زخمیوں کے لیے خون کے عطیات کی اپیل کی جا رہی تھی۔ یہ اپیل جاماجی کے اپنے دو ٹی وی چینلز پر بھی ہو رہی تھی۔ ایک سوگ کی سی کیفیت تھی۔ سجاول کے بارے میں تا حال کوئی خبر نہیں تھی اور یہ میرے لیے بڑی پریشانی کی بات تھی۔ پرسوں قسطینا نے مجھے تسلی دی تھی کہ اگلے چند گھنٹوں میں جاماجی کے انفارمر (مخبر) سجاول کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم کر لیں گے مگر ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں تھی۔ دوسری طرف چھوٹے صاحب ابراہیم کے بارے میں بھی کوئی اچھی اطلاعات نہیں تھیں۔ وہ اسپتال سے ڈی پیلس واپس تو آ گیا تھا مگر اس کی حالت دگرگوں تھی۔ اس نے زینب کی ''موت'' کا بہت گہرا صدمہ لیا تھا۔ وہ دواؤں کے زیر اثر اب بھی نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے قسطینا سے اپنی آخری ملاقات میں، میں اس کے کمرے میں اپنی ایک اہم چیز چھوڑ آیا تھا۔ اب اس چیز سے رزلٹ لینے کا وقت تھا۔ یہ وہی جدید ترین اسپائی کیمرا تھا جس کا سائز چنے کی دال کے دانے سے زیادہ نہیں تھا۔ یہ پن ہول کیمرا قسطینا کے اسی ''ریٹائرنگ روم'' میں تھا جہاں اس نے کل رات دس بجے کے لگ بھگ میرے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ میں نے کیمرا بڑی صفائی سے ایک ''ڈیکوریشن پیس'' کے ساتھ چپکا دیا تھا...... اور وہ ہم رنگ ہونے کی وجہ سے بالکل ''کیموفلاج'' ہو گیا تھا۔ اس کیمرے کا وائرلیس لنک میرے سیل فون کے وڈیو سسٹم کے ساتھ تھا۔

رات کو میں نے کمرے میں بند ہو کر اس لنک کو آن کیا تو سگنلز میری توقع کے عین مطابق صاف اور واضح تھے۔ جو منظر نظر آیا، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ کیمرا قسطینا کو سائڈ سے دکھا رہا تھا اور وہ جو صبح کے وقت جھروکے میں باحوصلہ اور

پُرعزم نظر آتی تھی، اس وقت تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اندر سے بالکل ٹوٹی ہوئی ہے پھر ایک اور مقامی لڑکی فریم میں دکھائی دی۔ متوازن، مضبوط جسم اور ذہانت بھری آنکھوں والی یہ لڑکی ایک دو دفعہ پہلے بھی قسطینا کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ اس کی حیثیت قسطینا کی سہیلی جیسی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی نم دکھائی دیں۔ اس نے کہا۔ ''قسطینا پلیز! ایک بار پھر سوچ لو، مجھے تو اس میں...... ضرورت سے زیادہ...... رسک لگ رہا ہے۔''

''نہیں ماریہ، جتنا سوچنا تھا، سوچ لیا ہے۔ مجھے اس کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ میں اس طرح بچ بھی گئی تو یہ زندگی میرے لیے بیکار ہوگی۔ میں نہیں جی سکوں گی اس طرح......''

اس نے ایک طرف سے ایک فریم شدہ تصویر اٹھائی۔ تصویر ٹھیک سے دکھائی نہیں دی لیکن میں نے یہ پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ میں جان گیا کہ یہ قسطینا کے والد مرحوم ''آدم'' کی تصویر ہے۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں تصویر کو چوما اور رخسار سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں معلوم نہیں ماریہ! پاپا کی صورت ہر وقت میری نگاہوں میں گھومتی ہے، وہ شام جب وہ لڑائی پر روانہ ہو رہے تھے...... وہ انداز جس میں انہوں نے مجھے الوداع کہا۔ انہوں نے کہا...... میرے بچے! یہ لڑائی ہم پر مسلط کی گئی ہے۔ ہم دفاع نہ کریں گے تو ہماری نسلیں ہم کو معاف نہیں کریں گی۔ میں واپس نہ آیا تو میرے بعد تم لوگ یہ لڑائی جاری رکھنا۔ رائے زل اور ایجنسی کے گٹھ جوڑ کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا وہ اب بھی مجھ سے پوچھتے ہیں، میرا خون رائگاں تو نہیں گیا قسطینا؟''

ماریہ بولی۔ ''ان کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔ ہمارے کسی شہید کا نہیں جائے گا، یہ وقتی پسپائی ہے قسطینا، ہم ضرور سرخرو ہوں گے۔'' ماریہ شستہ انگلش میں بولی۔

''سرخرو تب ہی ہوں گے جب کچھ کریں گے اور میں ضرور کروں گی ڈاکٹر ماریہ، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ میں اپنے پاپا کے قاتل کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔''

''یہ بہت خطرناک ہے قسطینا! دشمن کے علاقے میں گھسنا آسان نہیں ہے۔ ہر جگہ سیکیورٹی ہائی الرٹ ہے، جب تم پہلی بار گئی تھیں، اس وقت بات اور تھی اب یہ سراسر خودکشی ہے اور تم سوچو...... اگر تم کامیاب ہو بھی گئیں...... تم نے چیف گیرٹ کو مار بھی دیا تو اس سے کیا ہوگا؟ وہ لوگ ہار تو نہیں مان جائیں گے، کوئی اور اس خبیث کی جگہ سنبھال لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پھر وہ زیادہ شدت اور جوش سے حملہ کریں۔''

''نہیں ماریہ، میں جانتی ہوں وہ چیف گیرٹ پر بہت انحصار کرتے ہیں، ان کی کمر ٹوٹ جائے گی اور پھر سب سے بڑی کامیابی، میرے لیے یہ احساس ہوگا کہ میرے پاپا کا قاتل زمین پر دندناتا نہیں رہا۔''

''جو کچھ بھی ہے قسطینا، میں آپ کو......''

''پلیز شٹ اپ...... پلیز۔'' قسطینا نے نہایت درشتی سے اپنی دوست کی بات کاٹی۔ ''میں نے کہا ہے نا، میں فیصلہ کر چکی ہوں...... جو کچھ میں نے کہا تھا، وہ لے آئی ہو؟''

ماریہ نے ایک بار پھر کچھ کہنا چاہا مگر قسطینا نے زیادہ سختی سے اسے جھڑک دیا...... ماریہ دکھی انداز میں باہر گئی اور کچھ چیزیں لاکر ایک گوشے میں رکھ دیں۔ میرا اسپائی کیمرا اس گوشے کا احاطہ نہیں کر رہا تھا۔ مجھے یہی لگا جیسے کچھ کپڑے ہیں اور گتے کا ڈبا سا ہے۔

کیمرے کی کارکردگی میری توقع سے بڑھ کر تھی۔ کمرے میں لائٹ بھی بڑی مناسب تھی۔ دو تہائی کمرا فریم کا حصہ تھا۔ آڈیو بھی مناسب تھی۔ میں سیل فون کی 5 ضرب 3 اسکرین پر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ قسطینا نے کمرے کو اندر سے مقفل کرنے کے بعد ایک دو منٹ تک خود کو کمپوز کیا...... پھر ایک گہری سانس لے کر ان اشیا کی طرف متوجہ ہوگئی جو ماریہ لائی تھی۔

جو پہلا منظر میں نے دیکھا، وہی چونکا دینے والا تھا۔ قسطینا نے جو چیز اٹھائی وہ سیاہ گھونگرالے بالوں والی ایک نفیس سی وگ تھی۔ اس نے وگ کو اپنے بوائے کٹ بالوں کے اوپر رکھ کر دیکھا۔ گھونگرالے بال اس کے شانوں تک پہنچنے لگے۔ پورا حلیہ ہی تبدیل دکھائی دیا۔ اس نے وگ ایک طرف رکھ دی۔

اگلا منظر مزید سنسنی خیز تھا۔ اس نے خود کو مکمل بے لباس کر دیا۔ دودھیا ٹیوب لائٹ میں ایک برق سی کوند رہی تھی۔ اس نے لچک دار اسٹریپ کے ذریعے اپنی ٹانگ کے ساتھ ایک سائیلنسر لگا کولٹ پسٹل باندھا۔ پھر اپنی کمر کے ساتھ ایک اور لچک دار بیلٹ کلپ کی۔ اس بیلٹ میں موجود چیز کو دیکھ کر میں لرز گیا۔ یقیناً یہ ایک دھماکا خیز ڈیوائس تھا اور ایک چھوٹی سی ڈوری کھینچنے کے ذریعے پھٹ سکتا تھا۔ اس کے بعد قسطینا نے اتاری ہوئی گرین یونیفارم کے بجائے ایک اور لباس پہننا شروع کر دیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کیمرے کے فریم سے نکل گئی تھی۔ اسے دوبارہ دیکھنے کے لیے مجھے دو چار منٹ انتظار کرنا پڑا۔ وہ واپس کیمرے کے سامنے آئی تو ایک دم ناقابلِ شناخت لگ رہی تھی۔ وہ جزیرے کے مقامی لباس

میں تھی۔ ایک اسکرٹ نما لمبا چغہ، سر پر اسکارف نما رومال، جس کو بوقتِ ضرورت نقاب کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ مجھے ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا مگر شک ہو رہا تھا کہ اس نے آئی لینز بھی لگائے ہیں جنہوں نے اس کی بادامی آنکھوں کو گہرا سیاہ شیڈ دے دیا ہے۔

اسی دوران میں اس نے وہ ڈبا اٹھایا جس میں اس کی ساتھی ماریہ کچھ لے کر آئی تھی۔ مجھے کیمرے کی آنکھ نے جو کچھ دکھایا، وہ ناکافی تھا۔ بہرحال یوں لگا کہ ڈبے میں چھوٹے چھوٹے پھول بھرے ہوئے ہیں۔

قسطینا نے ڈبا دوبارہ اس کی جگہ پر رکھ دیا اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ اس نے پھول دار رومال کو نقاب کی شکل دی تو اس کا نصف سے زائد چہرہ ڈھک گیا۔ اسی دوران میں اس کے سیل فون پر سگنل آئے۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دو تین رسمی فقروں کے بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ دوسری طرف آقا جان ہے۔

وہ یقیناً اس سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ قسطینا نے نمناک آنکھوں کے ساتھ بتایا کہ اس کا فیصلہ حتمی ہے۔

آقا جان کی آواز تو مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی مگر گفتگو کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ آقا جان اسے اس خطرناک کارروائی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کوشش میں کوئی جان نہیں تھی اور لگتا تھا کہ وہ صرف رسمی کارروائی کر رہا ہے۔ آخر اس نے قسطینا سے پروگرام کے بارے میں پوچھا جس کے جواب میں قسطینا نے کہا۔ ”انکل! میں اسی طرح جاؤں گی جیسے پہلے گئی تھی اور رائے زل کے ساتھ گیرٹ کی وڈیو بنائی تھی۔ میرے پاس ڈینی فلاورز ہیں اور آپ کو پتا ہی ہے کہ ایجنسی کے افسروں میں ان کی کتنی مانگ ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ مجھے گیرٹ کے قریب پہنچنے میں کوئی دشواری ہوگی۔“

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ جواب میں قسطینا بولی۔ ”آپ بالکل فکر نہ کریں انکل...... اور میں جو کچھ کر رہی ہوں اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں آپ سب کو بہت اچھی اور بہت بڑی خبر دوں گی۔ آپ بس اتنا کریں کہ ”مقبوضہ علاقے“ میں اپنے تینوں انفارمرز کو پوری طرح الرٹ کر دیں۔ خاص طور سے اسے جس کا نام آپ نے بن مشہد بتایا تھا۔ اس نے شفا اسپتال سے نکلنے میں بھی ہمارا بہت ساتھ دیا تھا۔“

آقا جان نے کوئی اور بات کہی جس کے جواب میں قسطینا بولی۔ ”وہی راک گھاٹ والی جگہ ہے انکل۔ قدرتی دراڑ ہے جو آگے جا کر سرنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ سب میرے لیے بہت آسان ہے، میں پہلے بھی اس کا تجربہ کر چکی ہوں، اب مزید ہوم ورک بھی کر لیا ہے۔ آپ اس بارے میں بے فکر رہیں۔“

اس گفتگو کے دوران میں قسطینا میرے اسپائی کیمرے میں نظر نہیں آ رہی تھی اور آڈیو بھی زیادہ کلیئر نہیں تھی مگر ماجرا تقریباً سارا سمجھ میں آ رہا تھا۔ قسطینا کی اس کیفیت کو شاید جوش و خروش تو نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ شدید ڈپریشن میں تھی اور اسی ڈپریشن میں کوئی ایسا کام کرنے جا رہی تھی جو بہت خطرناک تھا۔

یہ بھی پتا چل رہا تھا کہ چند دن پہلے اس نے عزت مآب اور دیگر اعلیٰ فوجی اور سول افسران کے سامنے جو وڈیو دکھائی تھی اور جس نے ایجنسی کے چہرے سے نقاب نوچا تھا وہ خود قسطینا نے ہی بنائی تھی۔ وہ بھیس بدل کر رائے زل کے علاقے میں گھسی تھی اور یہ اہم ترین ثبوت حاصل کیے تھے۔ اب وہ اسی انداز میں پھر گھسنا چاہ رہی تھی مگر تب کے گھسنے اور اب کے گھسنے میں بہت فرق تھا۔ اب باقاعدہ لڑائی ہو رہی تھی اور دونوں طرف ریڈ الرٹ تھا۔

وہ آقا جان سے کہہ رہی تھی۔ ”انکل! آپ نے ہر صورت رازداری برقرار رکھنی ہے۔ اگر...... اگر...... مجھے کچھ ہو بھی جائے...... تو بھی کوشش یہی ہونی چاہیے کہ خبر سامنے نہ آئے۔ آپ جانتے ہی ہیں...... ہم اس وقت حالتِ جنگ میں ہیں......“

دوسری طرف سے غالباً آقا جان نے ایک بار پھر حجت پوری کرنے کے لیے قسطینا کو نتائج و عواقب سے آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ رسمی کارروائی ہے۔ پنجابی میں ایسے موقعوں کے لیے پہلوان حشمت نے ایک محاورہ استعمال کیا تھا۔ اس نے کہا تھا ایسی خانہ پُری کی باتوں کو ”گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنا“ کہا جاتا ہے۔ سو یہاں بھی گونگلو جھاڑے جا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کمرا تاریک ہو گیا۔ قسطینا شاید کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میرے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔ قسطینا کی حیثیت سپریم کمانڈر کی سی تھی...... وہ ناموافق حالات کو دیکھ کر شاید جذباتیت کا شکار ہو گئی تھی۔ ایک ایسا کام کرنا چاہ رہی تھی جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو گرین فورس کا مورال کنوئیں میں جا گرتا۔ قسطینا کے بعد کمانڈر افغانی کا نمبر آتا تھا اور مجھے پتا چلا تھا کہ وہ بھی زخمی ہے۔

میں نے موبائل بند کرنے کے بعد فوراً انیق کو اپنے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیم ُالحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کمرے میں بلایا۔ میں نے کہا۔ ''انیق! ایک بری خبر ہے۔''

''اناللہ......'' اس نے فوراً کہا اور مسمسی صورت بنا کر بولا۔ ''کہاں سے ملی ہے مرحوم کی ڈیڈ باڈی......؟''

''انیق! میں واقعی تھپڑ ماردوں گا۔ یہ ایک بہت سیریس معاملہ ہے۔'' میں نے بھڑک کر کہا۔

میرے تیور دیکھ کر وہ سنبھل گیا اور سجاول کے بارے میں مزید کچھ کہنے سے رک گیا۔ میں نے نہایت مختصر الفاظ میں اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی متحیر ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''فوراً اپنے موٹے دوست سے رابطہ کرو اور اس سے دو باتوں کے بارے میں پوچھو۔ ایک تو یہ کہ راکی گھاٹ کس جگہ کا نام ہے اور وہ کہاں ہے۔ دوسرے یہ ڈینی فلاور کیا ہیں اور ان کی کیا اہمیت ہے؟''

موٹے دوست سے میری مراد خانساماں ازمیر طیب ہی تھا۔ انیق نے کہا۔ ''راکی گھاٹ کے بارے میں ازمیر سے پوچھ لیتے ہیں، لیکن ڈینی فلاورز کے بارے میں تو میں آپ کو خود بتا سکتا ہوں۔''

''بتاؤ۔''

''یہ اس جزیرے کا ایک خودرو پھول ہے۔ اسے جنگلی پھول بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اونچے ساحلی ٹیلوں پر بڑی تعداد میں کھلتا ہے اور اس میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔ لیکن ان ڈینی پھولوں میں کچھ پھول ایسے ہوتے ہیں جن کے پولن کا رنگ اندر سے زرد کے بجائے سرخ ہوتا ہے۔ یہ ہزاروں ڈینی پھولوں میں بس دو چار ہی ہوتے ہیں۔ دراصل ان کو ہی اصل ڈینی پھول کہا جاتا ہے۔ ان کی خوشبو کستوری کی طرح نایاب ہوتی ہے...... اور یہ پانی میں رکھے جائیں تو کئی ہفتوں تک بالکل تازہ رہتے ہیں، مقامی لوگ ان کو شہر میں لے جا کر بیچتے ہیں۔''

''چلو ٹھیک ہے، اب راکی گھاٹ کا پتا کرو۔ لیکن احتیاط سے۔ ازمیر کو شک نہیں ہونا چاہیے۔''

انیق نے ازمیر طیب سے فون پر رابطہ کیا۔ پہلے اس کی لاڈلی بندریا لوسی کا حال احوال پوچھا۔ پھر باتوں باتوں میں راکی گھاٹ کے بارے میں دریافت کیا۔

ازمیر طیب نے بتایا کہ یہ جزیرے کے جنوب میں لائٹ ہاؤس سے ذرا آگے ایک چھوٹی کھاڑی سی ہے۔ اس کو راکی گھاٹ کہا جاتا ہے۔

میں قسطینا کو اس کارروائی سے روکنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے پتا تھا کہ اس وقت کوئی مجھے اس تک پہنچنے نہیں دے گا۔ ڈی پیلس کے اندر وہ سیکیورٹی کے سخت پہروں میں رہتی تھی اور جب تک وہ خود نہ چاہتی، کوئی اس کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آج اور اس وقت وہ مجھ سے ہرگز ملنا نہ چاہے گی۔ ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا تھا کہ میں اسے ''راکی گھاٹ'' پر روکنے کی کوشش کرتا۔

میں نے گھڑی دیکھی، گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ آقا جان کے ساتھ اپنی گفتگو میں قسطینا نے کہا تھا کہ وہ رات ایک بجے تک روانہ ہو جائے گی۔ مطلب یہ تھا کہ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک وہ راکی گھاٹ کے پاس ہوگی۔ وہ وہاں کیسے اور کیونکر جائے گی، اس کا مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے کسی حد تک اس کے مزاج کو پرکھ لیا تھا۔ وہ ارادے کی بہت پکی تھی اور جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھی تو اس پر جم جاتی تھی۔

میں نے ضروری تیاری کی اور انیق کو سب کچھ سمجھا دیا۔ اسے زینب کی پوری نگہداشت رکھنا تھی اور کسی بھی صورت میں اس کی یہاں موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا تھا۔ وہ جیسا بھی اوٹ پٹانگ تھا لیکن مجھے اس کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔

میں نے کہا۔ ''بالفرض اگر مجھے واپسی میں کچھ تاخیر بھی ہو جائے تو پریشان نہیں ہونا۔ میں کوشش کروں گا کہ فون پر بھی تم سے رابطہ رکھوں لیکن تمہیں خود مجھے کال نہیں کرنی۔''

وہ بولا۔ ''میں بھی آپ سے وہی درخواست کروں گا جو قسطینا صاحبہ کی ڈاکٹر دوست نے اُن سے کی ہے۔ آپ بھی کسی طرح کا رسک نہ لیں۔ آپ کے بازو کی حالت مہم جوئی والی ہرگز نہیں۔''

''میں اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

☆☆☆

میں اس جگہ موجود تھا جسے راکی گھاٹ کہا جاتا تھا۔ رات تاریک اور ابر آلود تھی۔ کسی وقت ہلکی پھوار بھی پڑنے لگتی تھی۔ سمندر کی طرف سے نم ہوا چلتی تھی اور پام کے بلند و بالا درخت ہولے ہولے جھومتے تھے۔ میں پتلون قمیص میں تھا۔ یہ مقامی طرز کا لباس تھا۔ شرٹ کو پینٹ سے باہر رکھا جاتا تھا۔ شرٹ بھی کچھ عجیب سی تھی، اس کے کف وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ اپنی پنڈلی کے ساتھ میں نے لاسٹک بینڈ کے ذریعے پسٹل باندھ رکھا تھا۔ میں ایک بڑے پتھر سے ٹیک لگائے ایک تاریک گوشے میں بیٹھا تھا اور اس راستے کی طرف دیکھ رہا تھا جو پختہ سڑک سے نکل کر ساحل کی طرف آتا تھا۔ یہ جگہ رات کے اس پہر قریباً سنسان تھی۔ بس سمندر میں کوسٹ گارڈز کی اسپیڈ بوٹس تیر رہی تھیں۔ جن کی نشاندہی ان کی روشنیوں سے ہوتی تھی...... لہروں کے شور میں کسی وقت کسی فائر کی آواز بھی سنائی دے جاتی تھی۔ میرے اندازے کے

مطابق یہ ہوائی فائر تھے جو کوسٹ گارڈز، دشمن کو یہ بتانے کے لیے کر رہے تھے کہ ہم ہوشیار ہیں۔ محاذ پر یوں تو مکمل خاموشی تھی مگر گاہے بگاہے اپاچی ہیلی کاپٹرز کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ ضرور ابھرتی تھی۔

میری نگاہیں مسلسل راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے جب اس نیم پختہ راستے پر ایک کار ہچکولے کھاتی نظر آئی۔ میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ کار مجھ سے قریباً پچاس فٹ کی دوری پر رک گئی۔ یہ ایک سلور ہنڈا تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس رکنے سے پہلے ہی بجھا دی گئی تھیں۔ کار میں سے دو لڑکیاں اتریں۔ میں نے ان کے ہیولوں سے ہی انہیں پہچان لیا۔ ایک قسطینا اور دوسری ڈاکٹر ماریہ تھی۔

ہوا میں اڑتی ہوئی سی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ قسطینا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ماریہ اب تم جاؤ۔“

جواب میں ماریہ نے کچھ کہا جو میری سماعت تک نہیں پہنچا۔

قسطینا بولی۔ ”خدا سے خیر مانگو۔ سب ٹھیک ہوگا...... گڈ بائے۔“

ڈاکٹر ماریہ بوجھل قدموں سے دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کا جیسے وہاں سے جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر یہ قسطینا کا حکم تھا۔ اس نے ہیڈ لائٹس آن نہیں کیں، اور کار کو یوٹرن دے کر واپس پختہ سڑک کی طرف چلی گئی۔ قسطینا کا ہیولا اپنی جگہ موجود رہا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ان ویران ٹیلوں میں جو لڑکی اسکرٹ نما جُغا پہنے اور ایک باکس نما شے اٹھائے تنہا کھڑی ہے وہ یہاں کی گرین فورس کی سپریم کمانڈر ہے، سیکڑوں لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتے ہیں اور اس کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

کار جب پختہ سڑک پر پہنچ گئی اور اس کی ہیڈ لائٹس آن ہوگئیں تو قسطینا نے رخ پھیرا اور ٹیلوں کی ڈھلوان پر چڑھنے لگی۔ اچانک میں نے اس کے ہیولے کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ جیسے کسی پناہ کی تلاش میں تھی۔ پھر وہ ایک پتھر کے پیچھے اوجھل ہوگئی۔ چند سیکنڈ بعد مجھے وہ ”وجہ“ بھی سمجھ میں آگئی جس نے اسے بھاگنے اور چھپنے پر مجبور کیا تھا۔ کوسٹ گارڈ کی ایک بوٹ بالکل کنارے پر رکی تھی اور اس میں سے سرچ لائٹ کا ایک بڑا روشن دائرہ نمودار ہو کر ٹیلوں پر رینگنے لگا تھا۔ میں نے بھی خود کو چٹان کے پیچھے کچھ مزید سمیٹ لیا۔ روشن دائرہ قریباً ایک منٹ تک ”رسمی کارروائی“ کے انداز میں نشیب و فراز پر حرکت کرتا رہا۔ پھر اوجھل ہوگیا۔ بوٹ بھی سمندر میں آگے نکل گئی۔

قسطینا کا ہیولا پتھر کے پیچھے سے نمودار ہوا اور وہ پھر آگے بڑھنے لگی۔ میں محفوظ فاصلہ رکھ کر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ یہ ٹیلے سرسبز تھے۔ تاہم کہیں کہیں ننگی چٹانیں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اس تاریک ویرانے میں قسطینا کی پیش رفت دلیری اور بے خوفی کی غماز تھی۔ قریباً نصف کلومیٹر آگے جانے کے بعد ایک فوجی پوسٹ نظر آئی۔ راستے کی ایک سائڈ پر بنکر سا بنا ہوا تھا اور چھت پر سرچ لائٹ بھی نظر آتی تھی۔ فی الحال یہ سرچ لائٹ آف تھی اور پوسٹ کے اندر بھی کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ قسطینا اس پوسٹ کے سامنے سے پہلا رکاوٹ گزر گئی۔ اس کے پیچھے میں بھی گزر گیا (جیسا کہ بعد میں پتا چلا، آقا جان کے حکم پر یہ پوسٹ عارضی طور پر خالی کرائی گئی تھی تاکہ قسطینا کو آگے جانے میں کوئی دشواری نہ ہو)

رم جھم میں میرا لباس بھیگ چکا تھا۔ خنکی کے سبب زخمی کندھے میں بھی ہلکی اینٹھن ہو رہی تھی۔ بہرحال میں آگے بڑھتا رہا۔ اب ہم ایک تنگ دراڑ میں سے گزر رہے تھے۔ قسطینا نے ایک پنسل ٹارچ روشن کرلی تھی لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا اس لیے مجھے زیادہ دشواری کا سامنا تھا۔ کسی بھی وقت اس تعاقب کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ ایک جگہ دراڑ کا راستہ مسدود نظر آیا۔ سامنے جھاڑ جھنکاڑ تھا۔

مجھے ازحد حیرت ہوئی جب قسطینا چند سیکنڈ تک اس جھاڑ جھنکاڑ کے پاس رکنے کے بعد اوجھل ہوگئی۔ دراڑ بند نظر آتی تھی مگر راستہ موجود تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ کے پاس پہنچنے کے بعد میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا، پھر نتائج کے خیال کو ایک طرف رکھ کر اندر داخل ہوگیا۔ دراڑ کی نسبت تھوڑی سی کشادگی کا احساس ہوا۔ یہ وہی قدرتی سرنگ تھی جس کا ذکر میں نے سنا تھا، یہ ذکر قسطینا نے ہی آقا جان سے کیا تھا۔

میں قسطینا کا ہیولا ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک میری پشت پر ایک زوردار ضرب لگی اور میں لڑکھڑا کر سرنگ کی دیوار سے ٹکرایا۔ زخمی بازو جھنجھنا اٹھا۔

”ہینڈز اَپ۔“ کڑک دار آواز سنائی دی۔ بے شک یہ قسطینا ہی تھی۔

اس نے پنسل ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر پھینکا۔ میں تب تک اپنا اکلوتا سلامت ہاتھ اوپر اٹھا چکا تھا، مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ تناؤ میں فائر ہی نہ کردے۔

”او گاڈ...... یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟“ قسطینا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اور میں بھی حیران ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں؟“

وہ کتنی ہی دیر جیسے سناٹے میں رہنے کے بعد بولی۔

"شاہ زائب! یہ سب کیا ہے، کیا تم...... میرا مطلب ہے تم...... میری جاسوسی کرتے پھر رہے ہو؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے قسطینا! یہ سب ایک اتفاق ہے۔ بالکل اتفاق۔" میں نے ہاتھ نیچے گرادیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ تنک کر بولی۔

ایک لمبے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "پتا نہیں کہ آپ یقین کریں یا نہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں کچھ بے چینی محسوس کررہا تھا۔ اپنے دیرینہ ساتھی (سجاول) کا خیال بری طرح ستا رہا تھا۔ میں حلمی صاحب سے اجازت لے کر ہوا خوری کے لیے ڈی پیلس سے باہر نکل آیا۔ یہاں ساحل پر گھوم رہا تھا کہ گاڑی کی ہیڈلائٹس دیکھ کر حیران ہوا۔ کچھ عجیب سا لگا کہ رات کے اس پہر کوئی سمندر کی طرف آرہا ہے...... پھر سوچا فوج کی کوئی گشتی جیپ ہی نہ ہو۔ خواہ مخواہ باز پرس شروع ہوجائے گی ایک پتھر کی اوٹ میں ہوگیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کی ہنڈا کار میرے قریب آکر ہی رکی تھی۔"

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری اس کہانی پر یقین کرلوں؟" قسطینا نے متذبذب لہجے میں کہا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا لیکن قدرے جھک گیا تھا۔

"یہ کہانی نہیں ہے قسطینا! لیکن جو کچھ اب میں یہاں دیکھ رہا ہوں، یہ ضرور کسی خاص کہانی کا حصہ لگتا ہے۔ آپ کا حلیہ تو ایسا ہے کہ میں آپ کو پہچان ہی نہیں سکا تھا۔ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا اور جب آپ کی ساتھی نے آپ کو قسطینا کہہ کر مخاطب کیا تو مجھے یقین ہوگیا۔ میں اس وقت آپ سے صرف آٹھ دس قدم کی دوری پر موجود تھا۔"

قسطینا نے پنسل ٹارچ کا رخ زمین کی طرف کر رکھا تھا۔ مدھم روشنی میں ہم ایک دوسرے کے تاثرات وضاحت سے نہیں دیکھ پارہے تھے۔ پھر بھی میں محسوس کررہا تھا کہ قسطینا بے حد متحیر اور سٹپٹائی ہوئی ہے۔ یہ سارا منظر ہی ڈرامائی تھا۔

وہ بولی۔ "میرا خیال ہے کہ بات اس سے بڑھ کر ہے جو تم بتا رہے ہو لیکن اگر ایسا ہے بھی تو تم نے جاسوسی کی کوشش کی ہے تم میرے پیچھے کیوں آئے؟"

"اسے آپ میری غلطی کہہ سکتی ہیں لیکن اس غلطی میں بھی آپ کی ہمدردی اور خیرخواہی پوشیدہ ہے۔ آپ اور آپ کی ساتھی کے درمیان جو مختصر گفتگو ہوئی ہے، اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ آپ اس وقت بھیس بدل کر کوئی بہت خطرناک کام کرنے جارہی ہیں۔ ایسا کام جو آپ کی ساتھی کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں...... پلیز قسطینا! پلیز مجھے بتائیں کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ آپ اس طرح تنِ تنہا اپنی جان خطرے میں کیوں ڈال رہی ہیں؟ آپ اور افغانی گرین فورس کی کمان کررہے ہیں بلکہ آپ کی ذمے داری افغانی صاحب سے بھی زیادہ ہے۔ آپ کو اس طرح اپنی جان کسی نامعلوم خطرے میں ڈالنے کا حق کس نے دیا ہے؟"

"اور...... تمہیں اس طرح مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟ یہ حق میں نے اپنے فادر کے سوا بھی کسی کو نہیں دیا اور نہ کبھی دوں گی۔ تم بالکل ایک غیر متعلق معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "تھوڑا بہت حق بھی نہیں......؟ ایسٹرن کو بھی نہیں؟"

اس نے جیسے چونک کر میری طرف دیکھا اور چپ سی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ذرا بدلے ہوئے اور نرم لہجے میں بولی۔ "تم نہیں جانتے کہ ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے تم میرے لیے کتنی اہمیت رکھتے ہو۔ لیکن یہ اور طرح کے معاملے ہیں...... فوجی نوعیت کے...... شاید تم ان کو اس طرح نہ سمجھ سکو جس طرح میں سمجھ رہی ہوں۔ اس میں کچھ زبردست پیچیدگیاں ہیں اور ٹائمنگ کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ میں نے جو سوچا ہے وہ مجھے کرنا ہی ہے۔ تم مجھے اس سے روکنے کی کوشش نہ کرو۔ بعد میں تمہیں خود اندازہ ہوجائے گا کہ جو میں نے کیا، وہ کتنا ضروری تھا۔ تم اسے میرا حکم سمجھ لو یا درخواست۔ تم فوراً ڈی پیلس واپس جاؤ۔"

وہ اب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ میں بھی بیٹھ گیا۔ سرنگ کا داخلی دہانہ جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا تھا اور ہم سے بس دس پندرہ فٹ ہی دور تھا۔ بارش کی بوندوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ کسی وقت بجلی کی چمک بھی اندر تک پہنچتی تھی اور پھر طویل گڑگڑاہٹ جو سرنگ کی دیواروں کو لرزا دیتی تھی۔ وہ ڈبا جسے میں گتے کا سمجھ رہا تھا، دراصل لکڑی کا شاندار سا باکس تھا۔ اس کے ساتھ ایک چوڑا "اسٹریپ" تھا۔ اس اسٹریپ کی مدد سے باکس کو گلے میں لٹکایا جاسکتا تھا۔ باکس کے اوپر شیشہ لگا ہوا تھا اور شیشے کے نیچے وہ نایاب پھول تھے جنہیں ڈینی فلاور کہا جاتا تھا۔ پھولوں کو ہوا کی فراہمی کے لیے لکڑی کے باکس کی سائڈوں پر باریک سوراخ کیے گئے تھے۔ پھولوں کی جادوئی مہک ان سوراخوں سے نکل کر فضا میں پھیل رہی تھی اور ذہن کو جیسے ہواؤں میں اڑا رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "گستاخی معاف قسطینا! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان پھولوں کا کیا مصرف ہے۔ آپ کا لباس اور یہ باکس دیکھ کر تو یوں لگتا ہے جیسے آپ یہ پھول کہیں فروخت

کرنے جارہی ہیں۔''

''پلیز شاہ زائب! اس سوال جواب سے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ہاں میں تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتی ہوں کہ میں کوئی خطرناک یا جان لیوا کام کرنے جارہی ہوں۔ یہ سب کچھ بہت ''بھانپا'' ہوا اور ناپا تلا ہے۔ میں کل رات سے پہلے دوبارہ ڈی پیلس میں تم لوگوں کے بیچ ہوں گی۔''

''یعنی اب...... کچھ دیر بعد آپ ہم لوگوں کے بیچ نہیں ہوں گی؟''

''کیا مطلب؟''

''قسطینا! یہ پتا تو مجھے بھی چل رہا ہے کہ جس سرنگ نما راستے میں آپ آگے جانا چاہتی ہیں یہ کہیں نیوسٹی کے علاقے میں جانکلے گا۔ آپ عین جنگ کے زمانے میں دشمن کے علاقے کے اندر گھس کر کوئی خطرناک کارروائی کرنا چاہ رہی ہیں۔ گستاخی معاف، اتنا میں بھی جانتا ہوں کہ لڑائیوں میں اس طرح کی کارروائیاں کی جاتی ہیں لیکن اس کے لیے کمانڈوز اور گوریلاز وغیرہ ہوتے ہیں۔ ملک کا سربراہ یا فوج کا کمانڈر خود بھیس بدل کر اس طرح کی آگ میں نہیں کودپڑتا۔''

''پلیز شاہ زائب!'' وہ جز بز ہو کر بولی۔ ''تم وہ بات نہ کرو جس کے بارے میں تم جانتے نہیں ہو۔ تم بیکار میں اپنا اور میرا وقت ضائع کرو گے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوں، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں اور وہ مجھے ''کرنا'' ہے۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

میری نگاہوں کے سامنے وہ مناظر کوند گئے جو میرے اسپائی کیمرے نے مجھے دکھائے تھے۔ ڈاکٹر ماریہ کا رونا بلکنا اور قسطینا کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرنا...... پھر آقا جان سے قسطینا کی گفتگو اور اس گفتگو کا رنگ ڈھنگ۔ آقا جان بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ قسطینا کتنا بڑا اور خطرناک قدم اٹھانے جارہی ہے۔ یقیناً قسطینا شدید ترین ڈپریشن میں تھی...... رائے زل اور ایجنسی کے الائنس پر بھرپور حملے کے باوجود گرین فورس کو کامیابی نہیں ہوئی تھی بلکہ الٹا بہت سا اہم علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اسپتالوں میں لاشوں اور زخمیوں کے ڈھیر لگ گئے تھے اور کچھ معلوم نہیں تھا کہ کب گرے فورس دوبارہ پیش قدمی شروع کر دے۔ اس صورت حال نے قسطینا کو فرسٹریشن کے گرداب میں پھنسا یا تھا اور وہ ایک خلاف عقل کام کے ارادے سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ آقا جان کی کمینگی تھی کہ اس نے سب کچھ جانتے بوجھتے اسے روانہ ہونے دیا تھا، کم از کم میری سمجھ میں تو یہی آرہا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قسطینا، آپ ارادے کی پکی ہیں تو میں بھی کچا نہیں ہوں۔ میں آپ کو اس مہلک مشن پر جانے نہیں دوں گا۔ میں وہی کروں گا جو ایسے موقعوں پر سچے دوست کرتے ہیں۔'' میں نے سیل فون نکال لیا۔

''کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''عزت مآب اور بیگم نورل وغیرہ کو آپ کے ارادے سے آگاہ کر رہا ہوں...... وہ آپ کو روک سکتے ہیں۔''

کچھ دیر ہمارے درمیان بحث ہوئی...... پھر ایک دم مجھے چونکنا پڑا۔ قسطینا کے ہاتھ میں وہی سائلنسر لگا پستول دوبارہ نظر آرہا تھا۔ جو اسپائی کیمرے کی آنکھ نے مجھے دکھایا تھا۔ ''پلیز...... شاہ زائب! یہ سیل فون مجھے دے دو اور پلیز...... یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اگر میں انکار کروں تو......''

وہ درد بھرے لہجے میں بولی۔ ''آئی ایم ویری سوری، میں کسی بھی حد تک جاسکتی ہوں۔''

''یعنی آپ مجھے شوٹ کر دیں گی؟''

خاموشی کا بوجھل وقفہ آیا، پھر وہ بولی۔ ''شوٹ نہ بھی کیا تو زخمی کر دوں گی۔ سیل فون مجھے دے دو اور یہاں سے واپس چلے جاؤ۔''

''میں انکار کرتا ہوں۔ میں آپ کو واپس لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ آپ نے گولی چلانی ہے تو چلا دیں۔''

اسے مجھ سے بھی زیادہ خطرہ شاید سیل فون سے تھا۔ میں اس کے ذریعے کسی بھی وقت کال ملا کر قسطینا کے سفر کو فل اسٹاپ لگوا سکتا تھا۔ کوئی بھی گشتی گاڑی دو چار منٹ میں راکی گھاٹ تک پہنچ سکتی تھی۔ ''شاہ زائب! اپنے آپ سے میری عقیدت اور چاہت کو امتحان میں نہ ڈالو۔ سیل فون میری طرف پھینک دو۔''

''میں نے کہا ہے نا، میں انکار کر رہا ہوں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

یہی وقت تھا جب ایک مدھم سی آہٹ نے قسطینا کی توجہ بانٹی۔ شاید کوئی چوہا یا لیزارڈ وغیرہ تھا جس نے اپنی جگہ سے حرکت کی تھی۔ میں نے ٹانگ کو برق رفتاری سے حرکت دی۔ چوٹ قسطینا کے پستول والے ہاتھ پر لگی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکلا، پتھروں پر گرا اور پھر ایک چار پانچ فٹ لمبی فرشی دراڑ میں گم ہو گیا۔ پنسل ٹارچ کی روشنی میں پستول کے لڑھکنے اور اوجھل ہونے کا منظر صاف نظر آیا۔

قسطینا جیسے سٹپٹا کر اور بپھر کر مجھ پر جھپٹ پڑی۔ پہلے

اس نے میرا منہ نوچنے کی کوشش کی، تب ایک دم ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھی جو طیش میں آجائیں تو خود کو سنبھال نہیں سکتے۔ وہ چلّا رہی تھی۔ یقیناً اس کو زیادہ صدمہ اس بات کا تھا کہ جس سائلنسر لگے پستول کو وہ بڑے اہتمام سے اپنے ساتھ لائی تھی، وہ کہیں گہرائی میں گر گیا تھا۔

اس نے مجھ پر مُکّے برسائے اور ٹھوکریں رسید کیں۔ میں نے اپنا صرف دفاع کیا اور یہ کوشش کی کہ وہ کوئی کارگر چوٹ نہ لگا سکے، خاص طور سے ایسی چوٹ جو میرے پہلے سے زخمی بازو کو نقصان پہنچا جائے۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی تھی۔ ہم دونوں سنگلاخ فرش پر گرے۔ وہ جیسے اپنے حواس میں نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے اور اس کے مزید نقصان سے بچنے کے لیے اسے وہی فرشی داؤ لگا دیا جس سے میں نے اسے ساؤنڈ پروف میٹنگ روم میں بے بس کیا تھا۔ اپنے زخمی بازو کے ساتھ اس لاک کو مکمل کرنا کسی عام بندے کے بس کا روگ نہیں تھا۔ میں نے ایک ٹانگ سے اس کی دونوں زیریں پنڈلیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر میری گرفت زیادہ مضبوط نہیں تھی، مگر یہ دونوں ہاتھ اس کی اپنی ہی کمر کے نیچے تھے لہٰذا وہ انہیں چھڑا نہیں سکتی تھی۔ اپنا زخمی بازو میں نے اس کی گردن پر رکھا ہوا تھا لیکن یہ دباؤ ظالمانہ نہیں دوستانہ تھا۔ ہاں اگر وہ زیادہ مزاحمت کرتی تو پھر میں اس دباؤ کو بقدرِ ضرورت بڑھا سکتا تھا۔

اس کا جنون ابھی برقرار تھا۔ ”چھوڑ دو مجھے۔“ وہ پھنکاری اور مچھلی کی طرح تڑپ کر گرفت سے نکلنا چاہا مگر پھر فوراً ہی سمجھ بھی گئی کہ یہ وہی گرفت ہے، جو پہلے بھی ایک دفعہ اس کو بے بس کر چکی ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ایک دم جیسے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی بند آنکھوں کے گوشے میں ہلکی سی نمی تھی۔ یہ نمی سنگلاخ فرش پر پڑی پنسل ٹارچ کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ سیاہ گھونگریالے بالوں کے نیچے اس کی روشن پیشانی پر رگڑ کا تازہ نشان تھا۔

اس کا رویہ دیکھ کر میں نے بھی اپنی گرفت ڈھیلی کر دی لیکن وہ اسی طرح پڑی رہی۔ بے حس و حرکت آنکھیں بند کیے۔ ”مجھے معاف کر دیں قسطینا! میں یہ سب نہیں چاہتا تھا۔“

وہ خاموش رہی۔ آنکھوں کے گوشوں میں دو ننھے موتی نظر آئے۔ لیکن اپنی جگہ ٹھہرے رہے، اس کے رخساروں پر یا کنپٹیوں کی طرف نہیں گئے۔ ”میں نے صرف اپنا دفاع کیا ہے قسطینا، آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں لگی؟“

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔ بڑی نرم سی کیفیت تھی اس کی آنکھوں میں۔ میں اسے اپنائیت کے سوا کوئی نام نہیں دے سکا۔ اس کے ماتھے پر اب ہلکا سا ابھار نمودار ہو گیا تھا۔ پتا نہیں کس جذبے کے تحت میں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ ”سوری قسطینا! میں نے آپ کو چوٹ پہنچائی۔“

وہ اٹھ بیٹھی۔ ”تمہیں بھی تو چوٹ لگی ہوگی۔ تمہارے بازو کو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے زخمی بازو کو آہستہ سے حرکت دی۔

میرا بوسہ جیسے ابھی تک اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا۔ وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے پنسل ٹارچ اٹھائی اور گھٹنے ٹیک کر اس خلا میں جھانکنے لگی جہاں سائلنسر لگا طاقتور کولٹ پسٹل گرا تھا۔ اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”میں تمہیں ایک بات بتا دوں شاہ زائب! مجھے آج، اپنی کارروائی کے لیے جانا ہے اور ہر صورت جانا ہے۔“ اس کا لہجہ چٹان سا تھا۔

اس کے ارادے کی غیر معمولی سختی دیکھ کر میں نے کہا۔ ”تو پھر آپ کو بھی میری ایک بات ہر صورت ماننا ہوگی۔ میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“

میرے لہجے کے حتمی اور فیصلہ کن انداز نے شاید اُسے بھی چونکایا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ ”کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو، تمہارا کندھا......“

”میرا کندھا ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”اگر میں نے آپ جیسی ”فیلڈ مارشل“ کو جھیل لیا ہے، تو ایروں غیروں کو بھی جھیل لوں گا۔ میں اس کندھے کو کسی طرح کا ضعف پہنچائے بغیر اب بھی دو چار بندوں سے بہ آسانی نمٹ سکتا ہوں۔“

ہمارے درمیان اس بارے میں تھوڑی سی بحث ہوئی۔ آخر وہ بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارا لباس...... تمہاری زبان...... تم ملائی کے دو چار لفظ بھی نہیں بول سکتے......“

”لباس کا مسئلہ کوئی نہیں۔ میں نے یہاں سکھوں کو بھی دیکھا ہے اور پاکستانی لباس والے بھی نظر آئے ہیں۔ باقی رہا زبان کا مسئلہ تو میں آپ کا گونگا مددگار بن جاؤں گا۔ آخر آپ ایک ”جوان دیہاتن“ کے روپ میں پھول بیچنے شہری آبادی میں جا رہی ہیں، آپ کے ساتھ کوئی نگہبان، کوئی نگران تو ہونا چاہیے۔“

”مگر تمہارا بازو......“

"بازو بھی تو ایک معقول بہانہ ہے جیسا کہ سب جانتے ہیں یہ سرخ پولن والے ڈیزی فلاور دشوار گھاٹیوں اور ٹیلوں پر ملتے ہیں۔ میں آپ کا گونگا مددگار بھی پھول ڈھونڈتے ڈھونڈتے اونچائی سے گر کر زخمی ہوا ہوں...... کیا سمجھیں؟"

یہ بحث دس پندرہ منٹ مزید چلی۔ آخر قسطینا کی سمجھ میں آگیا کہ اس کا واسطہ اپنے ہی جیسے ایک "ہٹ دھرم" سے پڑ گیا ہے۔ وہ کچھ شرائط کے ساتھ آمادہ نظر آنے لگی۔ اس کو سب سے زیادہ فکر اپنے پسٹل کی تھی۔ اس نے پنسل ٹارچ کی روشنی پھر دراڑ میں ڈالی۔ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ دیکھو، نیچے کچھ چمکتا ہے۔ کہیں یہ پسٹل کا دستہ تو نہیں؟"

میں نے بھی گھٹنے ٹیک کر اور آگے کو جھک کر نظر دوڑائی۔ چار پانچ فٹ نیچے کچھ چمک تو رہا تھا۔ میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ اتاری۔ قسطینا نے اپنے دیہاتی روپ میں رنگ بھرنے کے لیے کانوں میں چاندی کے بڑے بڑے آویزے پہن رکھے تھے۔ یہ ایک طرح سے چاندی کے گول رنگ تھے۔ میں نے اس سے ایک آویزہ اتروایا اور اسے توڑ کر ایک ہک کی شکل دے دی۔ اس ہک کو اپنی بیلٹ کے ساتھ منسلک کر کے میں نے تین چار انچ چوڑی دراڑ میں لٹکا دیا اور اس کی چمکیلی چیز کو ہک میں پھنسانے کی کوشش کرنے لگا۔ قسطینا نے ٹارچ کا روشن دائرہ مطلوبہ جگہ پر مرکوز کر رکھا تھا۔ جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ سائلنسر لگا پسٹل ہی ہے۔ کوشش کچھ طویل رہی لیکن ناکام نہیں ہوئی۔ میں پسٹل نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ قسطینا نے اسے چیک کیا اور اپنا اسکرٹ نما چغہ اٹھا کر اسے دوبارہ ٹانگ کے بالائی حصے سے منسلک کر لیا۔ میری نگاہوں میں وہ منظر چمک گیا جب میں نے اسے اسپائی کیمرے کے ذریعے فطری لباس میں دیکھا تھا۔

پستول واپس حاصل کر لینے کے بعد قسطینا نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کا آویزہ ضائع ہو گیا تھا اس لیے میں نے دوسرا بھی اتار کر دراڑ میں پھینک دیا۔ اس نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے بھی وہ وڈیو دیکھی تھی جس میں رائے زل اور لمبے چہرے والا چیف گیرٹ ایک ہوٹل میں خفیہ ملاقات کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ وڈیو میں نے ہی زیرِ قبضہ علاقے میں گھس کر بنائی تھی۔ میں اسی بھیس میں وہاں گئی تھی جس میں اب نظر آ رہی ہوں۔ اس وڈیو نے رائے زل اور ایجنسی والوں کے گٹھ جوڑ کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ لوگوں کی آنکھیں کھل گئی ہیں لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی گویا ہوئی۔ "میں دیکھ رہی ہوں شاہ زائب! کہ یہ گٹھ جوڑ بڑا طاقتور ہو چکا ہے۔ یہ کہیں پر بھی ہمارے پاؤں جمنے نہیں دے رہا۔ لگتا ہے کہ ہم نے بہت دیر کر دی ہے...... اور اس دیر کی اصل وجہ عزت مآب کی امن پسندی اور چشم پوشی ہی ہے۔ وہ خون خرابے سے بچنا چاہتے تھے اور شاید اب بھی چاہتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا راستہ باقی ہی نہیں بچتا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... تو پھر اس راستے پر چل کر کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟"

وہ کچھ دیر تک عجیب انداز میں میری آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر سخت چٹانی لہجے میں بولی۔ "میں کل کی رات کو چیف گیرٹ کے لیے آخری رات بنا دینا چاہتی ہوں......"

میں چیف گیرٹ کے حوالے سے قسطینا کے خیالات پہلے بھی سن چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گیرٹ مارا گیا تو رائے زل اور گرے فورس کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ لیکن...... صورتِ حال برعکس بھی تو ہو سکتی تھی اگر اس نہایت خطرناک کوشش میں قسطینا خود ماری جاتی تو گرین فورس کی کمر بھی ٹوٹ سکتی تھی۔

اس نازک معاملے پر میرے اور قسطینا کے درمیان چند منٹ مزید بات ہوئی۔ قسطینا کے ذہن میں ایک مکمل پلان تھا جو اس کے خیال میں پوری طرح قابلِ عمل بھی تھا۔ اس پلان کے مطابق مقبوضہ علاقے یعنی نیوسٹی میں پہلے سے موجود دو انفارمرز (جاسوسوں) کو قسطینا کی مدد کرنا تھی۔ کل انگریزی کیلنڈر کے مطابق ویک اینڈ کی رات تھی اور قسطینا اچھی طرح جانتی تھی کہ اس رات چیف گیرٹ محاذ پر نہیں ہوگا بلکہ کسی "اور جگہ" ہوگا۔

قسطینا مجھے ہر بات جلدی جلدی بتا رہی تھی۔ اس کے پاس وقت زیادہ نہیں تھا، ورنہ شاید وہ ایک بار پھر مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی۔ (حالانکہ وہ اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ جس طرح وہ باز نہیں آئی، میں بھی نہیں آؤں گا)

ہمارے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہو گیا اور ہم اس تنگ سرنگ میں بڑی احتیاط سے آگے بڑھنے لگے۔ یہاں خاصی گھٹن اور سیلن تھی۔ کہیں کہیں فرش پر پانی بھی موجود تھا۔ کسی جگہ راستہ اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ لگتا تھا مسدود ہو گیا ہے۔ ہمیں وہاں سے ترچھا ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ پنسل ٹارچ قسطینا کے ہاتھ میں تھی اور وہ دو قدم آگے چل رہی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ قسطینا نے اپنے جسم کے ساتھ ایک چھوٹا سا بم بھی باندھ رکھا تھا۔ یہ EXPLOSIVE مادہ یقیناً بدترین

حالات کے لیے تھا۔ کہیں وہ گھیرے میں آجاتی اور بچنا محال ہوتا تو وہ خود کو ختم کرسکتی تھی۔ بہرحال میں نے اس حوالے سے قسطینا کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی کر بھی کیسے سکتا تھا؟ جو کچھ میں اسپائی کیمرے کی آنکھ سے دیکھ چکا تھا، وہ قسطینا پر آشکار کرنا ممکن نہیں تھا۔

سرنگ کی چھت آٹھ دس فٹ کے قریب اونچی تھی۔ کئی جگہ جالے لگے ہوئے تھے جیسے مدتوں سے یہاں کوئی گزرا نہ ہو۔ ٹارچ کی روشنی میں کہیں کہیں چوہے، چھپکلیاں اور دیگر حشرات الارض دکھائی دیے تھے۔ ایک جگہ کئی چمگادڑیں اچانک اڑیں اور ہمیں بری طرح ٹھٹکا گئیں۔

قریباً ایک کلومیٹر سے زائد فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں یہ سرنگ مزید تنگ ہوگئی۔ یوں لگا جیسے کوئی فربہ اندام بندہ یہاں سے گزر ہی نہیں سکتا۔ یہاں ہمیں ہوا کا احساس بھی ہورہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ دوسرا دہانہ قریب ہے۔ بالآخر ہم دہانے پر پہنچ گئے۔ دہانہ کیا بس جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی ہوئی ایک درز سی تھی۔ یہ احساس سنسنی خیز تھا کہ اب ہم اپنے نہیں دشمن کے علاقے میں ہیں۔ بارش اب رکی ہوئی تھی۔

پہلے قسطینا نے قدم باہر نکالے، پھر میں نکل آیا۔ یہ ”نیوسٹی“ کا ایریا تھا۔ اونچے نیچے تاریک ٹیلوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اچانک قسطینا نے نشیب میں کچھ روشنیاں دیکھیں اور ٹھٹک گئی۔ ”یہاں لوگ ہیں۔“ اس نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی وہ مجھے لے کر واپس سرنگ میں آگئی۔ ”گرے فورس کے گارڈز؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے دیکھ رہے تھے کوئی ڈیڑھ سو میٹر نیچے نشیب میں ان کی موجودگی یہاں سے بھی نوٹ ہورہی تھی۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ان کے ادھر اُدھر ہٹنے کا انتظار کرنا ہوگا۔“ اس نے اپنی آستین کے نیچے چھپی ہوئی رسٹ واچ دیکھ کر کہا۔

ہم سرنگ میں چند فٹ پیچھے آگئے۔ یہاں کم از کم بیٹھنے کے لیے جگہ موجود تھی۔ ہم نے سنگلاخ، ناہموار دیوار سے ٹیک لگالی۔ نایاب ڈینی فلاورز والا باکس قسطینا نے بڑی احتیاط سے اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا۔ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے ہوئے تھی۔ اب رات کے تین بج چکے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق اجالا ہونے سے پہلے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنا تھا۔ گرے فورس کا ایک ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتا ہوا اور ساحل پر اپنا روشن دائرہ پھینکتا ہوا مشرق کی سمت نکل گیا۔ مجھے پتا تھا کہ انیق بڑی شدت سے میرا انتظار کررہا ہوگا اور پریشان ہوگا۔ میں نے قسطینا سے اجازت لے کر اسے فون کیا اور بتایا کہ مجھے واپسی میں دیر ہوجائے گی ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کل رات کو واپسی ہو۔

میں اردو میں بات کررہا تھا اور یقینی بات تھی کہ قسطینا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ انیق نے کہا۔

”زیبی بھائی! زینب مسلسل رو رہی ہے۔ اس نے ابھی مجھے ایک نئی بات بھی بتائی ہے۔“

”کیا؟“

”ایک ہینڈ بل پر کمانڈر افغانی صاحب کی فوٹو چھپی ہوئی تھی، اس نے فوٹو دیکھی تو بری طرح چونک گئی۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ یہ وہی ہیں جو اسے ڈی پیلس سے نکال کر لے گئے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میں تمہیں واپس پاکستان پہنچاؤں گا۔ وہ اسے اپنے گھر میں لے گئے تھے لیکن پھر پتا نہیں کیوں انہوں نے ایک دم ارادہ بدلا اور اسے خواجہ سرا خیال کے سپرد کردیا......“

مجھے پہلے ہی سے شک تھا کہ وہ اپنے جس ہمدرد کا ذکر کررہی ہے، وہ کمانڈر افغانی ہوسکتا ہے۔ میں نے انیق کو ضروری ہدایات دے کر فون بند کردیا۔ قسطینا پنسل ٹارچ کی روشنی میں ایک چھوٹا سا نقشہ دیکھنے میں مصروف تھی۔ چاند بادلوں میں چھپ گیا تھا اور سرنگ سے باہر گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ میرا ذہن انیق کی گفتگو میں الجھ گیا۔ حالات سے ظاہر ہوتا تھا کہ عزت مآب کے بے پناہ خوف سے بیگم نورل نے زینب کو خط لکھنے پر مجبور کیا اور پھر اسے کمانڈر افغانی کے حوالے کردیا۔ کمانڈر افغانی، بیگم سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق زینب کو جزیرے سے نکال کر پاکستان پہنچا دینا چاہتا تھا لیکن پھر کسی وجہ سے اس نے ارادہ بدلا یا اسے بدلنا پڑا اور اس نے زینب کو فی الحال جزیرے میں ہی رکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسے خیام کے حوالے کرکے خود لڑائی کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔

اچانک زور سے بادل گرجا اور میں اپنے خیال سے چونک گیا۔ سرنگ سے باہر گھپ اندھیرا تھا۔ تاہم جھاڑ جھنکاڑ کے اندر سے نشیب میں وہ روشن نقطے نظر آرہے تھے جن کو دیکھ کر ہم رکنے پر مجبور ہوئے تھے۔ دفعتاً ہی زوردار آواز سے بادل گرجے اور ایک بار پھر بارش ہونے لگی۔ تاریک آسمان پر برق لہرائی اور ایک لمحے کے لیے قسطینا کا چہرہ بھی روشن ہوگیا۔ وہ دیوار سے ٹکی ہوئی کوئی داستانی کردار ہی لگ رہی

تھی۔ خوب صورت چہرے پر جلالی کیفیت اور آنکھوں میں مر مٹنے کا عزم۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تم اپنے کندھے پر بہت ظلم کررہے ہو شاہ زائب۔ اور اس سے بڑا ظلم یہ ہے کہ تم نے مجھے یہ ظلم دیکھنے پر مجبور کردیا ہے۔“

”میں بھی بہت کچھ دیکھنے پر مجبور ہوں اس لیے... فی الحال اس ٹاپک کو کلوز ہی رکھتے ہیں......“

وہ غصے اور ہمدردی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخ پھیر کر باہر دیکھنے لگی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر ہم اس موجودہ صورتِ حال سے زندہ بچ نکلے اور ہمیں کچھ عرصہ ساتھ چلنے کا موقع ملا تو کیا ہمارے درمیان کوئی ”تعلق“ پروان چڑھ سکتا ہے؟ جواب ہاں میں تھا۔ وہ اشاروں کنائیوں میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کرچکی تھی......اور میں تو تھا ہی ایک ضرورت مند کی طرح، جسے کچھ نہایت گہرے گھاؤ اور درد بھلانے کے لیے زلفوں کے طویل سایوں کی ضرورت تھی۔ ایک ایسا فرار جس کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ ”میرا خیال ہے شاہ زائب کہ یہ بارش ہماری مدد کرے گی۔ وہ دیکھو نیچے روشنیاں اوجھل ہوگئی ہیں۔“

وہ درست کہہ رہی تھی۔ تیز بارش نے گارڈز کو غالباً کھلی جگہ سے ہٹنے پر مجبور کردیا تھا۔ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد ہم نکل کھڑے ہوئے۔ میں نے اپنا موبائل اور پستول ایک پولیتھین میں لپیٹ کر محفوظ کرلیا تھا۔ قسطینا نے بھی اسی طرح کا اقدام کرلیا۔ اسے زیادہ فکر ڈینی فلاورز کی تھی۔ وہ شیشے میں محفوظ تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر اس نے پولیتھین کا ایک ٹکڑا باکس پر بھی ڈال دیا۔ باہر نکلتے ہی بارش کی بوچھاڑوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہوا تیز تھی ناریل، کیلے اور تاڑ کے طویل درخت دہرے ہو ہو کر جھوم رہے تھے۔ ہم آگے بڑھتے رہے اور ٹیلوں کی بلندی پر چلنے سے گریز کرتے رہے۔ جلد ہی بارش کا زور ٹوٹ گیا، ہم اس وقت تک سرنگ سے کم و بیش دو کلومیٹر آگے نکل آئے تھے۔ ایک سڑک اور اس پر چلتی ہوئی گاڑیوں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ جنگی حالات یہاں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں خندقیں کھدی ہوئی تھیں، کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ چپکائے گئے تھے۔ اِکا دُکا گھروں کے کھنڈر بھی دکھائی دیتے تھے۔

اب اُجالا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم چلتے رہے اور شہری علاقے سے قریب ہوتے گئے۔ فوجی گاڑیوں کا ایک کانوائے ہمارے پاس سے گزرا۔ یہ گرے فورس کی گاڑیاں تھیں اور بارڈر کی طرف جارہی تھیں۔ قسطینا نے فوجیوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ دو چار فوجیوں کی طرف سے جوابی ہاتھ ہلایا گیا۔ میری طرح یقیناً قسطینا کا دورانِ خون بھی تیز ہوچکا تھا۔ ایک چھوٹی سی چوکی پر چند سپاہی موجود تھے، وہ ہمیں گھورنے لگے۔ قسطینا کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ ان سے کترانے کے بجائے اُن کے قریب سے گزری۔ ایک فوجی افسر نے مقامی زبان میں اس سے کچھ کہا۔ اس نے مقامی زبان میں ہی جواب دیا۔ آفیسر نے غالباً میرے بارے میں بھی کچھ کہا۔ قسطینا نے اس سوال کا جواب بھی اعتماد سے، مسکراتے ہوئے دیا۔ پھر وہ الہڑ انداز میں چند قدم آگے گئی اور باکس میں سے ایک ڈینی فلاورز نکال کر مقامی آفیسر کو پیش کیا۔ وہ مطمئن نظر آنے لگا۔ ہم آگے بڑھ گئے۔ چلتے ہوئے وہ مجھ سے اشاروں کنائیوں میں بات کررہی تھی جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ میں بول نہیں سکتا۔

یہاں ٹیلوں پر جگہ جگہ فورس کے جوان موجود تھے، کہیں کہیں دھاری دار ٹوپیوں والے امریکن بھی دکھائی دیتے تھے۔ ان کے پاس جدید ترین اسلحہ تھا۔ ہمیں کوئی ایک امریکی بھی بلٹ پروف جیکٹ اور سیفٹی ہیلمٹ کے بغیر دکھائی نہیں دیا۔ اُن کی عقابی نظریں جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ہم اب مضافات سے گزر رہے تھے۔ یہاں عزت مآب کے باغی بیٹے رائے زل کا حکم چلتا تھا۔ جگہ جگہ ایک خاکستری جھنڈا بھی لہراتا دکھائی دیتا تھا، یہ نیوشی کا جھنڈا تھا۔ سڑکوں پر آمد و رفت شروع ہوچکی تھی۔ فوجی گاڑیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اکثر فوجی فتح اور وہسکی کے نشے میں چور نظر آتے تھے۔ مقامی لوگ ان کی طرف دیکھ کر وکٹری کا نشان بناتے اور کچھ جوشیلے نعرہ زنی بھی کرتے تھے، ایک دو جگہ ہم نے بھی وکٹری کا نشان بنایا۔

ایک مقام پر سڑک پر کافی بڑا گڑھا نظر آرہا تھا۔ یقیناً یہ کل رات والی بمباری کا نتیجہ تھا۔ ہم ٹریفک سگنل کے قریب سے سڑک پار کرنے کا سوچ رہے تھے، جب ایک آواز نے ہمیں ٹھٹکا دیا۔ ”ٹھہرو، بات سنو۔“ انگلش میں کہا گیا۔ پھر ایک شخص تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھا۔ میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ وہ وردی میں تھا۔ اس کے تیور اچھے نہیں تھے۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

خزانے کا عفریت

سلیم انور

بعض فضائیں ایسی دلربا ہوتی ہیں کہ ان فضائوں میں پہنچتے ہی سانسیں معطر ہو جاتی ہیں ... اور کچھ فضائوں میں ایسا زہریلا دھواں پھیلا ہوتا ہے کہ لے سانس بھی آہستہ ... گردو پیش کے ماحول کو خوف زدہ کردینے والے خوفناک عفریت کی سنسنی خیز داستان ... وہ نگاہوں سے اوجھل تھا ... مگر اس کی دہشت اور بربریت نے ہر شخص کو خوفناک شکنجے میں جکڑا ہوا تھا ...

لالچ وہوس اور عیش و عشرت کے دلدادہ حریصوں کا کھیل

جب میری باس میکڈانلڈ نے مجھ سے کہا۔ ''سنو! ٹام فرگوسن، مجھے اپنی نئی ہارر فلم کی عکس بندی کے لیے ایک نہایت عمدہ لوکیشن درکار ہے جو دیکھنے میں ساؤتھ سی آئی لینڈ کے مانند لگتی ہو۔'' تو میرا خیال فوراً ہی جینی مورگن کی طرف چلا گیا۔

جینی سے میری ملاقات گزشتہ سال ہالی ووڈ میں ہوئی تھی۔ ہم اکٹھا گھومتے اور کھاتے پیتے تھے۔ وہ ایک کھلے دل کی عورت تھی اور ہمارے درمیان ایک معتبر دوستی قائم

ہوگئی تھی۔ جب وہ ایسٹ کوسٹ جانے کے لیے مجھ سے رخصت ہونے لگی تو اس کے انداز میں خلوص شامل تھا، وہ بولی۔ ”اگر تمہارا کبھی نیویارک آنے کا اتفاق ہو تو میرے ڈیڈی سے ضرور مل لینا۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ میں کہاں پر ہوں اور اگر تمہیں اپنی کسی جذباتی یا ایڈونچر فلم کی عکس بندی کے لیے ساؤتھ سی کی لوکیشن کی ضرورت پڑے تو میامی میں ہماری خاندانی ریاست اور بڑی سی کوٹھی کو استعمال میں لے آنا۔ وہاں ایک نگراں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔“

میرے باس کی فلم کمپنی کا نام میکڈانلڈ پکچرز تھا۔ اس ادارے کی زیر تکمیل فلم ایک بحری ہواباز کے بارے میں تھی۔ جسے اپنا طیارہ فنی خرابی کے باعث بحرالکاہل کے ایک ویران جزیرے میں لینڈ کرنا پڑ جاتا ہے۔

میں لوکیشن کی بات کرنے کے لیے نیویارک چلا گیا۔ وہاں میں نے جینی کے حوالے سے اس کے ڈیڈی مسٹر مورگن سے بات کی۔ وہ بہت عمدہ انسان ثابت ہوئے۔ انہوں نے بلاجھجک لوکیشن کے لیے اپنی اراضی استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔

سو اسی سلسلے میں یہاں فلوریڈا میں موجود تھا۔ لوکیشن بالکل فلم کی کہانی کی ڈیمانڈ کے مطابق تھی...... تاڑ کے درخت، نیم دلدلی زمین، پام کے چھوٹے درخت، پانی میں کھڑی ہوئی گھنی گھاس اور ایک ٹراپیکل جھیل...... جیسا کہ باس چاہتا تھا سب کچھ وہاں موجود تھا۔

البتہ جب میں اس خیال سے وہاں پہنچا کہ حویلی غیر آباد ملے گی اور نگراں کے علاوہ کوئی موجود نہیں ہوگا تو میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ وہاں خاصی ہلچل تھی...... دلچسپی سے بھرپور ہلچل۔

جینی کے ڈیڈی مسٹر مورگن نے نیویارک میں ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ ان کے خیال میں جینی ہارس شو دیکھنے کے لیے آئیکن گئی ہوئی ہے۔ لیکن جینی اپنے ڈیڈی کے علم میں لائے بغیر اپنے دوستوں کے ہمراہ تفریح منانے کے لیے اپنی خاندانی اراضی گئی ہوئی تھی۔ تفریح کے لحاظ سے یہ ایک آئیڈیل اور الگ تھلگ جگہ تھی۔

جینی اور اس کے دوستوں کا قیام فلوریڈا کی اس ریاستی حویلی ہی میں تھا۔ یہاں گھرداری کا سارا سامان موجود تھا۔ جینی ایک طویل ویک اینڈ گزارنے کی تیاری کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ جینی کے ہمراہ آئے ہوئے تین دوستوں میں سے ایک کا نام بل ڈریک تھا۔ وہ ایک ہینڈسم جوان تھا جو حال ہی میں جنگ کے دوران ٹانگ میں گولی لگنے کی وجہ سے فوج سے نکالا گیا تھا۔ اس کے ہمراہ اس کی منگیتر بربرا ولیز بھی تھی۔ وہ سنہری زلفوں والی خوبرو حسینہ تھی جس کا حسن ہالی ووڈ کی سڑکوں پر ٹریفک روانی میں خلل ڈال سکتا تھا۔ تیسرے فرد کا نام ہیریسن تھا لیکن میری ملاقات اس سے نہ ہوسکی کیونکہ یہاں پہنچنے کے پہلے ہی دن اس نے جھیل میں ایسی ڈبکی لگائی کہ اس کا سر جھیل کی تہ میں ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر بُری طرح زخمی ہوگیا تھا اور وہ اپنا علاج کرانے کے لیے میامی گیا ہوا تھا۔

چوتھی شخصیت مسز اسمتھ نامی معمر خاتون کی تھی جو کھانا پکانے کے ساتھ جینی کی نگہبانی کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔ وہ ایک پیاری خاتون تھی جس کی خاکستری گھنگھریالی زلفیں اس کے شانوں پر لہراتی تھیں۔ وہ تمام مہمانوں کا بےحد خیال رکھتی تھی۔

میرا پہلا دن اچھا گزرا۔ میں زخمی ہیریسن کی قائم مقامی کررہا تھا۔ ہم نے رات کھانے سے پہلے رقص کیا، پھر کھانے کے بعد کچھ مشروبات سے لطف اندوز ہوئے اور چاندنی میں چھوٹی کشتی میں سوار ہوکر جھیل کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے۔

اس رات جھیل کی ٹھنڈی ہوا نے مجھے کسی بےبی کے مانند پُرسکون اور گہری نیند سلا دیا۔ میرا کمرا اوپری منزل پر تھا۔ اس کا رخ جھیل کی جانب تھا۔ حویلی کے سامنے کے حصے میں ایک بڑی اور لمبی بالکنی بنی ہوئی تھی۔ نیچے ایک خوبصورت لان تھا۔ جھیل کی ٹھنڈی ہوا میرے بیڈ کی پائنتی کی جانب بنی ہوئی بڑی سی کھڑکیوں کے پردوں سے چھن کر اندر کمرے میں آرہی تھی اور بےحد پیاری لگ رہی تھی۔

جن غیرواضح آوازوں کی وجہ سے میری آنکھ کھلی وہ ان ہی کھڑکیوں کی جانب سے آرہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں یہی سمجھا کہ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں ساکت لیٹا رہا۔ میری نگاہیں اس ہلکی مٹمیلی روشنی پر جمی ہوئی تھیں جو چاندنی کے صبح کے اجالے میں تبدیل ہونے کے باعث دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔

وہ آواز پھر سنائی دی، ہلکی گھٹی گھٹی جنونی آواز جو بتدریج بڑھ رہی تھی۔

میں فوراً ہی بیڈ پر سے نیچے کھسک آیا اور دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔ تب لہراتے پردوں کے نیچے ایک سایہ نمودار ہوا۔ وہ سایہ جلد ہی ایک ہیولے میں بدل گیا۔ ایسا لگا جیسے میں کوئی ڈراؤنی فلم دیکھ رہا ہوں۔ وہ ہیولا ڈگمگا رہا تھا۔

وہ انسان اور حیوان کی ملی جلی شبیہ تھی۔ بلند قامت اور حیرت انگیز طور پر بلند قامت، اس کے باوجود کہ وہ ہیولا جھکا ہوا تھا۔ اس کا جسم بے ہنگم بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن اس کا سر!

اس کے سر کو دیکھتے ہی میں خود بخود بڑبڑانے لگا۔ وہ چپٹا اور لمبا تھا اور اس پر مچھلی کے کھپروں جیسی جلد تھی۔ یہ کھپرے پورے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سر دائیں بائیں اس طرح حرکت کر رہا تھا جیسے کسی محور پر رکھا ہوا ہو۔ اس کی تھوتھنی آگے کو نکلی ہوئی تھی اور اس کے جبڑے تواتر کے ساتھ کھل بند ہو رہے تھے۔ کمرے میں سڑے ہوئے گوشت کی بو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اندر آنے لگی۔

پھر جوں ہی وہ عفریت مکمل طور پر نمایاں ہوا تو میں نے اپنے سوٹ کیس کی جانب قلانچ بھری جہاں میں نے اپنا اعشاریہ تین دو کا ریوالور رکھا ہوا تھا۔

اس عفریت نما شے نے ایک عورت کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا ہوا تھا۔

پھر جوں ہی میں کھڑکی کے پاس پہنچا مجھے نیچے سے ایک دھپ کی سی آواز سنائی دی۔ عفریت نما شے نے اس عورت سمیت بالکنی سے نیچے چھلانگ لگا دی تھی اور اب کیکڑے کے مانند تیز تیز قدم اٹھاتا لان کے پار بھاگ رہا تھا۔

میں نے اتنے فاصلے سے اس کا نشانہ لینے کی ہمت نہیں کی کیونکہ نشانہ خطا بھی ہو سکتا تھا اور گولی اس عورت کو بھی لگ سکتی تھی۔ البتہ میں نے چند ہوائی فائر کر دیے۔

فائر ہوتے ہی اس عفریت نے عورت کو نیچے گھاس پر گرا دیا اور دوڑتا ہوا جھیل کے کنارے پھیلی ہوئی ان گھنی جھاڑیوں میں گھس گیا جو ٹیرس کی ڈھلان کے آخری سرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

میں کمرے میں پلٹا! جلدی سے باتھ روب پہنی اور تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتا ہوا باہر لان کی جانب لپکا۔

پھر میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا جیسے میرے قدم جم گئے ہوں۔ جھیل کنارے کی جانب سے ایک انسانی ہیولا نمودار ہو رہا تھا۔ چاندنی میں اس کا جسم جھلملا رہا تھا۔ وہ کنارے سے پلٹ کر میری جانب دوڑنے لگا۔ میں فوراً ہی ایک قریبی جھاڑی کی آڑ میں دبک گیا اور اس شخص کے نزدیک آنے کا انتظار کرنے لگا۔

جوں ہی وہ شخص سامنے آیا، میں نے اس کے پیروں کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے چھلانگ لگا دی۔ اس شخص کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی اور وہ مجھ پر جھپٹ پڑا۔ تب میں نے اسے پہچان لیا۔

وہ جینی مورگن کا دوست بل ڈریک تھا!

وہ بھی مجھے پہچان گیا۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

”یہ فائر کی آوازیں کیسی تھیں؟“ اس نے جاننا چاہا۔

”تم صبح پو پھٹنے سے پہلے جھیل میں نہا رہے ہو؟“ میں نے الٹا سوال کر دیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی تو میں نے سوچا کہ ساحل پر چل کر تازہ دم ہو لیتے ہیں۔ اس لیے جھیل میں تیراکی کرنے آ گیا تھا۔ تب مجھے فائر کی آوازیں سنائی دیں تو مجھے تشویش ہوئی۔ کیا ماجرا ہے؟“

”فرینک ٹائن نما کوئی کردار میرے کمرے کی کھڑکی کے پاس سے ایک عورت کو گھسیٹ کر لے جا رہا تھا۔ میں نے اس پر الل ٹپ گولیاں چلائیں تو اس نے عورت کو جھیل کے پاس پھینک دیا۔“ میں نے بل ڈریک کو بتایا اور اسے واپس جھیل کی جانب چلنے کو کہا۔

”وہ عورت وہاں پڑی ہوئی ہے۔“ میں نے گھاس پر ایک ڈھیر کی جانب اشارہ کیا جو چاندنی میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔

بل ڈریک نے جیب سے ماچس نکال کر دیا سلائی جلائی اور نزدیک روشنی میں اس کا چہرہ دیکھتے ہی تیزی سے بولا۔ ”او مائی گاڈ یہ تو برتھا ہے!“

برتھا بے سدھ گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کا آدھا لباس پھٹ چکا تھا۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ اس کے گلے پر رکھ دیا۔ اس کی نبض خاصی تیز چل رہی تھی۔

”یہ بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے بل ڈریک سے کہا۔ ”صرف خوف سے بے ہوش ہو گئی ہے۔“

بل ڈریک نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا تو وہ کراہنے لگی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے۔“ اس نے برتھا سے کہا۔ ”میں بل ڈریک ہوں۔“

”اسے واپس حویلی میں لے جاؤ اور تھوڑی سی برانڈی پلا دو۔“ میں نے بل ڈریک سے کہا۔ ”میں اطراف سے کنگ کانگ کے اس چھوٹے ایڈیشن کو تلاش کرتا ہوں۔“

میں نے اپنے اعشاریہ تین دو کے ریوالور میں نئی

گولیاں لوڈ کیں اور ان گھنی جھاڑیوں میں داخل ہوگیا جن میں نے اس عفریت کو غائب ہوتے دیکھا تھا۔ چند ٹوٹی پھوٹی جھاڑیاں اس راستے کی سمت اشارہ کررہی تھیں جدھر وہ عفریت گیا تھا۔ لیکن پھر وہ نشانات بھی گھپ اندھیرے کی وجہ سے معدوم ہوگئے۔

میں جھیل کی جانب چلا گیا۔ نصف گھنٹے کی تلاش کے باوجود مجھے اس عفریت کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آگے زمین اتنی دلدلی تھی کہ اس میں مزید آگے بڑھنا ممکن نہیں تھا۔

میں پلٹ گیا۔ اس مرتبہ حویلی کا شارٹ کٹ راستہ اختیار کرنے کی خاطر میں داہنی طرف گھوم گیا۔ میں نے خود کو حویلی کے نگہبان جیک میڈلن کی کٹیا کے سامنے پایا۔ میں نے کٹیا کے دروازے پر دستک دی۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ البتہ ایک سایہ دار کھڑکی سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ لاک نہیں تھا۔ میں کٹیا میں داخل ہوگیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میرا سانس حلق میں اٹکنے لگا۔ فرش پر ایک عورت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹ اس انداز سے کھلے ہوئے تھے جیسے وہ ہنسنے کی کوشش کررہی ہو۔ لیکن یہ ایک کریہہ منظر تھا کیونکہ ان ہونٹوں پر موت اپنی مہر ثبت کرچکی تھی۔ اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں اور یوں جیسے میرے چہرے پر مرکوز ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس ہولناک جاد ہنسی والے منہ سے کسی بھی لمحے ایک وحشیانہ قہقہہ بلند ہونے والا ہے۔

کسی نے اس بوڑھی عورت کا گلا چیر دیا تھا۔ اس کے گھناؤنے زخم سے خون ابھی تک اُبل رہا تھا اور کٹیا کے خستہ حال قالین میں دائرے کی شکل میں پھیلتا جارہا تھا۔

میں نے اس نیم تاریک کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو کسی کو ایک گوشے میں دبکا ہوا پایا۔ میں نے فوراً اپنا اعشاریہ تین دو کا ریوالور نکال لیا۔ لیکن پھر میں نرم پڑ گیا۔

وہ ایک لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ برس کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ اس کے جسم پر ایک خستہ حال پھٹا ہوا دھاری دار سوتی لباس دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ننگے پیر تھی اور اس کا چہرہ جنگلی صحرائی حسن کے امتزاج کا ایک دلکش نمونہ تھا۔ البتہ اس وقت اس کے چہرے پر نرا خوف طاری تھا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں اور ماما یہاں جیک سے ملنے کے لیے آئے تھے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''اس وقت صبح پانچ بجے۔''

''نہیں سر! ہم رات کو یہاں آئے تھے۔'' ہم گھاٹ پر کافی آگے کی جانب رہتے ہیں۔ جب ہم گھر واپس جانے کے لیے نکلے تو ماما کو ڈر محسوس ہونے لگا۔ تب ہم واپس یہاں آگئے۔ جیک نے ہمیں یہیں پر سونے کی اجازت دے دی اور کہا کہ وہ باہر ٹول ہاؤس میں سوجائے گا۔''

میں نے فرش پر پڑی ہوئی لاش کی جانب اشارہ کیا۔ ''یہ تمہاری ماں ہے؟''

لڑکی کی نظریں بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''جی سر! یہی سمجھیں۔ یہ میری حقیقی ماں تو نہیں لیکن جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا ان ہی کے ساتھ رہ رہی تھی۔''

میں لڑکی کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے سیاہ گھنے بال اس کے بیضوی چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس کی جلد کی رنگت زیتونی تھی۔ گو وہ خوف سے کانپ رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کے حسن میں کوئی کمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''جیک میڈلن اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنے شانے اچکا دیے۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ بڑی حویلی کی طرف گیا ہے۔ میری آنکھ فائرنگ کی آواز سے کھلی تھی۔ میں یہی سمجھی کہ مسٹر جینی مورگن کے دوست جانوروں کا شکار کررہے ہیں۔ میں یقیناً دوبارہ سوگئی تھی۔ اس کے بعد آنکھ کھلنے پر میں نے دیکھا کہ نیم روشن کمرے میں ایک ہیبت ناک شے ماما پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کا سر مگرمچھ کے مانند تھا۔ میں اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ یقیناً بے ہوش ہوگئی تھی۔ کیونکہ جب مجھے ہوش آیا تو تم یہاں موجود تھے اور ماما فرش پر پڑی ہوئی تھی......''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور ہسٹیریائی انداز میں کانپنے لگی۔ میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کردیا۔

''کم آن! ہم حویلی کی طرف چلتے ہیں۔ میں وہاں سے شیرف کو فون کروں گا تاکہ وہ پولیس کا دستہ یہاں بھیج دے۔ تمہاری ماما کا نام کیا ہے؟''

دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے لڑکی مجھ سے چمٹ سی گئی۔ ''لوگ اسے ماما توبر کے نام سے پکارتے تھے۔ میں لیزا ہوں!''

☆......☆......☆

حویلی میں برتھا ولیز کاؤچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ بل ڈریک اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خالی گلاس تھا۔ مسز اسمتھ بھی قریب میں کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں سونگھنے کی بوتل تھی۔ برانڈی اور نمکیات نے برتھا کے شکستہ اعصاب کو کافی حد تک سکون پہنچا دیا تھا۔

اتنے میں جینی مورگن دوڑتے ہوئے میرے پاس آئی۔ ”برتھا مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔“ اس نے کہا، ”کیا تمہیں ڈھونڈنے سے کچھ ملا؟“

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے حویلی کا نگہبان جیک میڈلن اندر داخل ہوا اور فوراً بول پڑا۔ ”مس جینی! فون ڈیڈ پڑا ہے۔ میں آپریٹر سے رابطہ نہیں کرسکتا۔“ پھر میری جانب گھوم گیا۔ ”مسٹر...... کیا تم نے اس شے کو واقعی دیکھا تھا؟“

جیک میڈلن اس خطے کے مخصوص باسیوں کی طرح تھا۔ دراز قامت اور سخت محنت کش۔ فلوریڈا کی کڑی دھوپ میں اپنی تمام زندگی گزارنے کا عکس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی کھال اتنی سخت تھی کہ ان کی رگڑ کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ اس کا لہجہ جنوبی علاقے کے لوگوں کے مانند نرم اور ڈھیلا ڈھالا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ”ہاں، میں نے اسے دیکھا تھا۔“

جیک میڈلن یہ سن کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ ”اوہ، لارڈ“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”مجھے ابھی تک اس پر یقین نہیں آیا تھا۔“

”کس بات پر یقین نہیں آیا تھا؟ میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”گزشتہ طوفانی ہواؤں کے بعد سے لوگ کسی ایسے شے کے راتوں میں دلدلی زمین پر شکار کی تاک میں منڈلانے کی باتیں کرنے لگے تھے۔ خشک زمین پر کتوں کی چیر پھاڑ کی ہوئی لاشیں ملنے لگی تھیں۔ جہاں پہلے بھی کوئی مگرمچھ نہیں ہوا کرتے تھے۔ ان کی بچی ہوئی لاشوں کو دیکھ کر یہی اندازہ لگایا گیا تھا جیسے انہیں کسی مگرمچھ نے چیرا پھاڑا ہو۔ ماماتو برجب گزشتہ شب میرے گھر سے اپنے گھر جانے کے لیے نکلی تھی تو اس نے ایسی ہی کسی شے کی آوازیں سنی تھیں۔ وہ اور لیز اتنی زیادہ خوفزدہ ہوگئیں کہ پلٹ کر واپس آگئیں۔ انہوں نے رات میری ہی کٹیا میں گزاری۔“

میرا ذہن اس قابلِ رحم لاش کی جانب چلا گیا جو جیک میڈلن کی کٹیا کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ ”میں شیرف کو لانے کے لیے اپنی کار میں فرنٹڈیل جا رہا ہوں۔“ میں نے انہیں بتایا۔

پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور پاجامے کی جگہ پتلون اور ایک رف جیکٹ پہن لی۔

میں اناج کی خالی کوٹھری میں داخل ہوا تو اس وقت روشنی ہو رہی تھی۔ یہ کوٹھری گیراج کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اندر تین گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ میری کوپے، جینی کی مرسیڈیز اور ایک اسٹیشن ویگن۔

میں اپنی کوپے میں سوار ہوگیا اور اگنیشن کا سوئچ گھمایا۔ موٹر نے جھرجھری سی لی لیکن اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ میں نے ایک بار پھر سے کوشش کی۔ لیکن اس مرتبہ بھی کچھ نہیں ہوا۔ میں کار سے نیچے اتر آیا، ہڈ اٹھا کر دیکھا تو اسپارک پلگ ٹوٹے ہوئے تھے۔

پھر میں نے پہلے جینی کی مرسیڈیز اور اس کے بعد اسٹیشن ویگن کا جائزہ لیا۔ ان دونوں گاڑیوں کو بھی ناکارہ کر دیا گیا تھا۔

صورتِ حال گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔

میں گیراج سے باہر نکلنے کے ارادے سے پلٹا تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ دروازے پر پہنچتے ہی میری آمنے سامنے سے ایک شخص سے ٹکر ہوگئی۔ اس کے حلق سے ایک غراہٹ سی بلند ہوئی اور اس کا پائپ نیچے گر گیا۔

میں نے پیچھے ہٹ کر اپنے ریوالور پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ شخص دیکھنے میں بدوضع لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا شوخ رنگ کا چارخانے دار کوٹ خستہ حالت میں تھا اور قمیص گردن تک کھلی ہوئی تھی۔

اس نے نیچے جھک کر اپنا گرا ہوا پائپ اٹھایا اور بولا۔ ”گڈ مارننگ! میں بس یہاں بوڑھے مورگن کی اراضی پر صبح سویرے ٹہلنے کے لیے نکل کھڑا تھا۔“

میں نے اس کے جوتوں پر نظر ڈالی تو اس کی پتلون کے ایک پائنچے پر خون دکھائی دیا۔

اس اجنبی نے میری نظروں کا تعاقب کیا۔ ”میرے گھوڑے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔“ اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”آج صبح میں نے اس کی زخمی ٹانگ کی مرہم پٹی کی ہے۔“

"تم یہاں نزدیک ہی رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔
اس نے اثبات میں سرہلایا۔ "ہاں۔ برابر کی اراضی پر۔ میرا نام اسٹرلنگ ہے...... جون اسٹرلنگ! ماما ٹوبر میرے یہاں صفائی کا کام کرتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہاں کچھ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ میں ان سے ملاقات کرنے اور اپنی نیازمندی کا اظہار کرنے کے لیے ادھر آرہا تھا۔"

"تو پھر حویلی میں چلتے ہیں۔" میں نے اشارہ کیا۔ "میرا نام فرگوسن ہے۔ ٹام فرگوسن۔"
ہم حویلی کی سمت چل دیے۔ ہمارے درمیان خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میرے ذہن میں اسٹرلنگ کے نام پر گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میں نے اسٹرلنگ اور مورگن کے نام لاس اینجلس کے اخبار کے فنانشل صفحات پر دیکھے تھے۔ ان کا شمار وال اسٹریٹ کے بڑے حریفوں میں ہوتا تھا۔

اسٹرلنگ کے ہاتھ میں ایک چھڑی سی تھی جس سے وہ لمبی گھاس میں راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ "جب سے تم یہاں آئے ہو کیا تم نے وہ بھوت یا مگرمچھ دیکھا ہے؟" اسٹرلنگ نے ہنستے ہوئے کہا۔
میں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور ہنس رہا تھا۔ البتہ مجھ سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا اور چھڑی سے گھاس میں راستہ بنانے میں مگن تھا۔
"ہاں" میں نے کہا۔ "اس نے مس جینی مورگن کے مہمانوں میں سے ایک کو اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔"
یہ سنتے ہی اسٹرلنگ کی ہنسی غائب ہوگئی۔ وہ چلتے چلتے رک گیا اور اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "تم مذاق تو نہیں کر رہے؟" اس نے تیز آواز میں کہا۔
میں نے نفی میں جواب دیا اور اسے صبح پیش آنے والا پورا واقعہ سنا دیا۔ اس دوران ہم حویلی کی جانب چلتے رہے، وہ مسلسل حیرانی سے سرہلاتا رہا۔
"تمہیں معلوم ہے کہ مقامی لوگوں کے درمیان ایک ایسے مگرمچھ کے بارے میں کہانیاں گردش کررہی ہیں جو اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آگ برستی ہے۔ اس قسم کی فضول باتیں سننے میں آتی ہیں۔ کیا تم وثوق سے کہہ رہے ہو کہ تم نے اس شے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟" وہ اب میری طرف گھورنے لگا۔
ہم اس وقت تک حویلی کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ چکے تھے۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور میں اس کی اطلاع شیرف کو دینے جارہا ہوں۔ کیا تمہارے پاس کوئی کار ہے جو تم مجھے مستعار دے سکو؟"
"تمہاری کار کیا ہوئی؟"
"اناج کوٹھری کے گیراج میں کھڑی تمام کاروں کو ناکارہ بنادیا گیا ہے۔"
اسٹرلنگ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "میری کار نئے رنگ کے لیے میامی گئی ہوئی ہے۔ لیکن میں تمہیں اپنا گھوڑا دے سکتا ہوں۔ اس پر سوار ہوکر تم چند گھنٹوں میں فرنڈیل پہنچ جاؤگے۔" پھر جیسے ہی اس پر یہ عیاں ہوا کہ میں نے کیا کہا تھا اس کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور وہ تقریباً چیخ پڑا۔ "کیا..... کیا! تمہارا کیا مطلب ہے کہ انہیں ناکارہ بنادیا گیا ہے؟"
اتنے میں جینی مورگن داخلی دروازے سے باہر آئی اور ہمارے درمیان گفتگو میں مخل ہوگئی۔ میں نے جینی مورگن کا تعارف اس کے پڑوسی سے کروایا تو وہ اس طرح مسکرادیا کہ اس کے تمباکو آلودہ دانت عیاں ہوگئے۔
میں نے محسوس کیا کہ جینی مورگن کو اسٹرلنگ بھلا نہیں لگا تھا۔ وہ میری جانب گھوم گئی۔ میں اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔
"سنو" میں نے کہا۔ "کسی نے تینوں گاڑیوں کے پلگ ناکارہ کردیے ہیں۔ اس شخص اسٹرلنگ نے اپنا گھوڑا دینے کی پیشکش کی ہے۔ لہٰذا تمہیں اعتراض تو نہیں کہ میں جیک میڈلن کو فرنڈیل روانہ کردوں تاکہ وہ شیرف کو یہاں لے آئے۔؟ معاملات پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ اس لیے میں یہاں سے نہیں جاسکتا۔"
اس نے خاموشی سے سرہلایا اور میں نے دیکھا کہ وہ خوف زدہ تھی۔ میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "میں جیک میڈلن کو روانہ کردوں تو بہتر ہوگا۔ میں اس مگرمچھ کی تلاش میں نکلنا چاہتا ہوں کیونکہ ابھی روشنی ہورہی ہے۔"
میں نے جیک میڈلن کو بلالیا اور وہ اسٹرلنگ کے ہمراہ اس کی رہائش گاہ روانہ ہوگیا۔ تاکہ شیرف کو لینے کے لیے جاسکے۔ میں نے وسیع وعریض لان عبور کیا اور اس دلدلی زمین میں داخل ہوگیا جو جھیل کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔
میں جوں جوں آگے بڑھتا جارہا تھا کانٹے دار نچلی جھاڑیاں میرے پاؤں پر چرکے لگارہی تھیں۔ یہ جھاڑیاں اونچی ہوتی جارہی ہیں حتیٰ کہ میرے سر سے بھی بلند ہوگئیں۔ اب یہ میرے چہرے اور ہاتھوں کو زخمی کررہی تھیں۔ ایک

لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ جھاڑیاں اور پودوں کی شاخیں جس طرح ڈول رہی ہیں یہ زندہ ہیں۔ پام کے درختوں کے بڑے پتے آپس کی رگڑ سے ایسی آوازیں پیدا کررہے تھے جیسے دیوہیکل چھپکلیاں کسی دیوار پر آڑھی ترچھی رینگ رہی ہوں۔

اتنے میں میری پیشانی پر بارش کا ایک چھینٹا پڑا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا، بادل تیزی سے اکٹھے ہورہے تھے اور سورج کو ڈھانپ رہے تھے۔ میں تیز تیز قدموں سے ان درختوں کی سمت چل دیا جو جھیل کے آخری سرے پر دکھائی دے رہے تھے۔

پھر جوں ہی میں اس مقام تک پہنچا طوفان پھٹ پڑا۔ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ میں پام کے ایک بڑے درخت کے پاس رک گیا جو جھیل کے کنارے گرا ہوا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا غار دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس غار میں رینگ گیا۔

جھیل کا پانی غار کے سامنے کے حصے میں ہلکورے لے رہا تھا۔ لیکن غار کے اندر کا حصہ خشک تھا۔ میں اس خشک حصے میں دُبک گیا۔ میں ایک گھنٹے تک غار میں دبکا طوفان تھمنے کا انتظار کرتا رہا۔ اپنی اس بے آرام پوزیشن کے باوجود بارش کی مسلسل جھڑی کی آواز سے میں اونگھنے لگا۔ میری آنکھیں غار میں پانی کے چھوٹے سے تالاب پر جمی ہوئی تھیں۔ بارش سے اس تالاب کی سطح چاندی کے مانند جھلملا رہی تھی۔

یہ ٹراپیکل طوفان جس طرح اچانک آیا تھا اسی طرح اچانک رک گیا۔ جھیل کا لرزتا پانی جو کچھ دیر پہلے تک جھلملا رہا تھا اب پُرسکون ہورہا تھا۔ غار کے جس چھوٹے سے تالاب پر میں نے نظریں جمائی ہوئی تھیں وہ اب آئینے کی طرح شفاف ہوگیا تھا۔

جب میں باہر نکلنے کے لیے غار کے منہ کی جانب رینگ رہا تھا تو پانی کے چھوٹے تالاب کی تہ میں کسی چمکدار شے پر میری نگاہ اٹک گئی۔ میں نے اپنی آستین چڑھائی اور پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ جب میں نے جھک کر وہ شے اٹھائی تو وہ ایک سکہ تھا۔

میں نے اسے پانی سے باہر نکالا اور غور سے جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ اسپینی دور کا ایک قدیم سنہری سکہ تھا۔

اور تب وہی جنونی بڑبڑاہٹ پھر سنائی دی۔ پہلے یہ آواز دھیمی تھی اور دھیرے دھیرے بلند ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ایک چیخ میں بدل گئی جو میرے کانوں میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

پانی کے تالاب میں مجھے اس عفریت کا عکس دکھائی دیا۔ وہ مجھ پر جھکا ہوا تھا اور اس کا منہ کھل بند ہورہا تھا۔ میں نے کروٹ لینے اور اپنی گن نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ عفریت مجھ پر جھپٹ پڑا اور مجھے تالاب میں ڈبو دیا۔ میرا سر کسی پتھر سے ٹکرا گیا۔ پام کے درخت اور پتھر گھومتے دکھائی دیے۔ میرے نتھنوں سے سڑے ہوئے گوشت کی بو ٹکرائی اور پنجے نما ہاتھوں نے میری گردن دبوچ لی۔ پھر پانی مجھ پر حاوی ہوگیا اور میں ہوش میں نہیں رہا۔

☆☆☆

میں دھیرے دھیرے بیدار ہوا تو سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پھر مجھے ہلکی سی سرسراہٹ دکھائی دی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔

''کچھ بہتر محسوس کررہے ہو؟'' ایک دھیمی آواز اُبھری۔

میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مقامی لڑکی لیزا میرے سرہانے کھڑی تھی۔ کمرا نیم روشن تھا اور اس میں دیہی انداز کا گھریلو ساختہ فرنیچر دکھائی دے رہا تھا۔ میں ایک بستر پر تھا اور میرے اوپر بہت سے کمبل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔

میرے حرکت کرنے پر لیزا نے جھک کر اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ ''اطمینان سے لیٹے رہو۔ تم اس وقت ماما اور میرے کیبن میں ہو۔ یہ لو'' اس نے میری جانب تاڑی کا ایک گلاس بڑھا دیا جس سے بخارات اٹھ رہے تھے۔

میں نے سعادت مندی سے وہ مشروب پی لیا۔ ساتھ ہی اس لڑکی لیزا کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے وہ سادہ سوتی لباس تبدیل کرلیا تھا جو اس وقت پہنے ہوئے تھی جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایک جینز اور مردانہ قمیص میں تھی۔

میں نے مشروب پینے کے بعد گلاس فرش پر رکھ دیا۔

''میں یہاں کس طرح پہنچا ہوں، لیزا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں یہاں لائی تھی۔'' اس نے تیزی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے تمہیں کیبن کے عین باہر راستے پر پڑے ہوئے پایا تھا۔ تمہارے سر میں گومڑ پڑا ہوا تھا اور تم پانی میں تربتر تھے!''

مشروب پینے سے میرے جسم میں حرارت پیدا ہوگئی تھی اور میرے سر کی سنسناہٹ میں بھی کمی آگئی تھی۔ پھر

میرے ذہن میں جھیل، بارش، سونے کا سکہ، عفریت کی جنونی بڑبڑاہٹ، گوشت کے سڑنے کی بو۔ سب ہی کچھ گردش کرنے لگا۔

میں نے ایک گہرا سانس لیا تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ سڑاند اس کیبن میں بھی بسی ہوئی ہے..... یا شاید میرا تصور تھا۔

میں نے اپنے اوپر پڑے ہوئے کمبل ایک طرف اچھال دیے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیزا نے بتایا تھا کہ میں اسے کیبن کے باہر راستے پر پڑا ہوا ملا تھا۔ میں کھڑکی کے پاس چلا گیا اور ٹاٹ کا پردہ ایک طرف کھسکا دیا۔ کیبن کے اطراف میں خودرو پودے اور جھاڑ جھنکاڑ دکھائی دیے۔

میں لیزا کی جانب پلٹ گیا۔ ”یہ جگہ جھیل سے کتنی دوری پر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تقریباً آدھے میل کا فاصلہ ہوگا۔ تمہارے سر کے گومڑ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تم بھٹکتے ہوئے ادھر آ نکلے تھے اور پھر یہاں پہنچ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ یہ راستہ جھیل کی جانب سے آتا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ کچن کی جانب گھوم گئی۔ ”میں نے تمہاری جیکٹ اسٹور کے پاس سوکھنے کے لیے لٹکا دی تھی۔ میں وہ لے کر آتی ہوں۔“

لیزا جوں ہی دروازے سے غائب ہوئی، میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیسے پتا چلا کہ میں جھیل کی جانب سے آیا تھا۔ پھر حیرانی کی بات یہ تھی کہ اس نے میرے سر کے گومڑ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا کہ یہ چوٹ کس طرح لگی تھی؟ اس وقت تو وہ مورگن کی حویلی میں تھی! بظاہر یہ لگ رہا تھا کہ طوفان کی آمد پر وہ حویلی سے نکل کر اپنے کیبن میں آ گئی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنا لباس بھی تبدیل کیا ہوا تھا۔

میں نے ایک بار پھر بیزاری کا اظہار کیا کیونکہ گوشت کی سڑاند اب بھی کیبن میں موجود تھی۔ پھر میں نے کمرے میں چاروں طرف طائرانہ نگاہ ڈالی۔ کمرے کے آخری کونے میں ایک پیکنگ کیس کا خاکہ دکھائی دیا۔ ایک بکس کے اوپر ایک خستہ حال گھڑی رکھی تھی۔ اس کی سوئیوں کی ٹک ٹک بھی سنائی دی۔ میں اس گھڑی کی جانب بڑھ گیا۔ اس گھڑی میں چار بج رہے تھے۔

مجھے یاد آ گیا کہ وہ صبح کا وقت تھا جب اس غار میں عفریت نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اگر یہ گھڑی درست تھی تو اس کا مطلب تھا کہ میں کئی گھنٹوں تک بے ہوش رہا تھا۔

مجھ پر دوبارہ غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے اپنے ہاتھ اپنے چہرے پر رگڑے اور آنکھوں کا مساج کرنے لگا۔

جب میری آنکھوں کی دھندلاہٹ ختم ہو گئی تو میری نظریں اس پیکنگ کیس پر مرکوز ہو گئیں جو کمرے کے گوشے میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے سائڈ میں اسٹیل کے حروف سے یہ لکھا ہوا تھا۔

”میرین ایکوپمنٹ سالویج کمپنی، کی ویسٹ“۔

میں سوچنے لگا کہ کیا اس پیکنگ کیس میں کسی موٹر بوٹ کے اسپیئر پارٹس ہیں؟ لیکن پھر یاد آیا کہ جھیل میں چپوؤں سے چلنے والی چھوٹی کشتیوں کے سوا کوئی بوٹ تو موجود ہی نہیں تھی۔

لیزا کی آمد نے میرے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے ایک ہاتھ میں میری جیکٹ اٹھائی ہوئی تھی اور اس کے دوسرے ہاتھ میں کھولتی ہوئی تاڑی کا گلاس تھا۔ جب وہ کچن کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اسی سڑاند کا ایک تیز جھونکا بھی اندر کیبن میں آ گیا۔

اتنے میں باہر کی جانب سے اونچے جھاڑ جھنکاڑ میں سرسراہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی ان جھاڑیوں میں چل رہا ہو۔ لیزا کی آنکھیں پھٹ پڑیں اور اس نے گھبرا کر کھڑکی کی طرف دیکھا تو اس کا ہاتھ کانپ گیا اور کھولتا ہوا مشروب اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ ساتھ ہی گلاس بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا اور فرش پر گر کر کرچی کرچی ہو گیا۔

لیزا پاگلوں کی طرح پلٹی اور لپک کر کچن میں جا گھسی۔ اس نے ایک جھٹکے سے کچن کا دروازہ بند کر دیا اور میرے کانوں میں اندر سے دروازے کا کھٹکا بند کرنے کی آواز سنائی دی۔

میں کھڑکی کے پاس چلا گیا اور سننے لگا۔ کوئی جھاڑیوں میں سے اسی طرف آ رہا تھا۔ جھاڑیوں کے چٹخنے اور سرسراہٹ کی آوازیں دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھیں۔ لیکن جو کوئی بھی شے تھی وہ ان گھنی جھاڑیوں کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں نے لپک کر اپنی جیکٹ اٹھالی جو لیزا گرا چکی تھی۔ میں نے تیزی سے اس کی جیبیں ٹٹولیں تاکہ اپنا ریوالور نکال سکوں۔ ریوالور جیکٹ میں موجود نہیں تھا!

پھر میری نگاہ راکھ کریدنے والی وزنی لوہے کی سلاخ پر پڑی جو مٹی کے آتش دان کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً وہ سلاخ اٹھائی اور کیبن کے دروازے کے پاس دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اور چوکنا اس شے کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

باہر پورچ پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو میں تیار ہوگیا۔ پھر کسی نے دروازے کی ناب آہستہ سے گھمائی تو میں نے آہنی سلاخ بلند کرلی۔

''لیزا؟'' یہ جینی مورگن کی آواز تھی جو میں نے فوراً پہچان لی۔ میں نے سلاخ نیچے کرلی اور دروازہ مکمل کھول دیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی جینی کے پریشان چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھر آئے۔ ''ٹام! تھینک گاڈ! مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم اس عفریت کی بھینٹ تو نہیں چڑھ گئے!''

میں نے اپنی پیشانی پر بندھی پٹی پر ہاتھ پھیرا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔

جینی کی نظروں نے کیبن کا جائزہ لیا۔ پھر وہ بولی۔ ''کیا لیزا یہیں پر ہے؟ تمہارے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ حویلی سے نکل گئی تھی۔ میں سمجھی کہ وہ اپنی ماما کے پاس ادھر کیبن میں چلی آئی ہوگی۔''

لیزا یہ سن کر خاموشی سے کمرے میں آگئی اور کچن کے دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں جینی مورگن کو گھور رہی تھیں اور ان سے نفرت جھلک رہی تھی۔ ''اگر تم شہری لوگ ادھر کا رخ نہ کرتے تو شاید......'' یہ کہتے ہوئے وہ رک گئی۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلانے لگے۔

''شاید کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں'' وہ بڑبڑائی اور افسردہ سی ہوگئی۔

میں جینی کی جانب پلٹ گیا۔ ''کیا جیک میڈلن شیرف کو لے کر آگیا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں تبھی تو میں اتنی پریشان ہوں۔ نہ وہ اور نہ ہی اسٹرلنگ واپس آئے ہیں۔ مجھے خدشہ ہے کہ شاید وہ لوگ طوفان میں پھنس گئے ہیں۔ فرنڈیل روڈ سے آتے ہوئے راستے میں ایک ندی پڑتی ہے۔ شاید اس میں سیلاب آگیا ہو۔''

میں نے اپنی جیکٹ پہن لی۔ معاملہ کچھ سلجھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے جینی کا بازو پکڑا اور بولا۔ ''آؤ چلیں۔ ہم واپس حویلی جائیں گے۔ یہ مگرمچھ کا عفریت ابھی بھی آزاد پھر رہا ہے اور کچھ نہیں پتا کہ اس کا اگلا نشانہ کون ہوگا۔ اس کے علاوہ میں اندھیرا پھیلنے سے قبل کچھ سوئمنگ بھی کرنا چاہتا ہوں۔''

جینی نے ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اس سے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ ''سوئمنگ؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں اس کی وضاحت بعد میں کروں گا۔ یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے پاس حویلی میں کوئی گن ہے؟'' میں نے کیبن سے باہر آنے کے بعد پوچھا۔ اب ہم جھاڑ جھنکاڑ کے راستے میں داخل ہورہے تھے۔

''ہاں۔ بل ڈریک کے پاس ایک گن ہے۔ جب ہم یہاں پہنچے تھے تو پہلے دن ہم نے اس گن سے ٹین کے خالی ڈبوں پر نشانہ بازی کی مشق کی تھی۔''

جب ہم تینوں حویلی واپس پہنچے تو اس وقت شام کا دھندلکا پھیلنے کو تھا۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے اپنا سوئمنگ کا لباس پہنا اور نچلی منزل پر آگیا۔ اس دوران جینی بل ڈریک کو گن کے بارے میں کہہ چکی تھی۔ بل ڈریک نے اپنی گن مجھے تھمادی اور ساتھ ہی مجھ سے سوالات کرنے لگا۔ لیکن میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اسے راستے سے ہٹا دیا کیونکہ اندھیرا پھیلنے والا تھا۔

مجھے دن کی روشنی درکار تھی اور میرے لیے ہر ایک منٹ اہمیت رکھتا تھا۔ میں نے دوڑتے ہوئے حویلی کا وسیع و عریض لان عبور کیا اور پھر اپنی رفتار کم کرتے ہوئے محتاط قدموں سے دلدلی زمین میں اگی جھاڑیوں کے راستے جھیل کے گہرے حصے کی جانب بڑھنے لگا۔

یہ راستہ حویلی کے نگہبان جیک میڈلن کی کٹیا سے گھوم کر آگے جاتا تھا اور تقریباً بیس منٹ کی مسافت پر تھا۔ کٹیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

بالآخر میں جھیل کے آخری سرے پر پہنچ گیا اور پام کے اس گرے ہوئے درخت کے پاس پہنچ کر رک گیا جہاں چند گھنٹوں قبل میری اس عفریت سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔

میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے کہیں زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ ہر طرف پُراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھر اچانک کسی مینڈک کے ٹرانے کی آواز نے میری اس بات کی تصدیق کردی کہ میں یہاں تنہا ہوں۔

سورج تیزی سے ڈوب رہا تھا لیکن جھیل کا پانی ساکت اور شفاف نظر آرہا تھا۔ مجھے جھیل کی تہ میں ریت بھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور پانی میں ڈبکی لگا دی۔

جھیل کی گہرائی نے مجھے دھوکا دیا تھا۔ میں پانی میں نیچے اور نیچے جاتا گیا لیکن تہ تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ میرے پھیپھڑوں میں تکلیف شروع ہوگئی۔ میرے سر کے گومڑ نے میرے دماغ پر ہتھوڑے سے برسانا شروع کردیے۔ لیکن میں تہ تک پہنچنے کی جدوجہد کرتا رہا۔

بالآخر میری انگلیاں ریت کو محسوس کرنے لگیں۔ میں تہ تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے دیوانہ وار دونوں ہاتھوں میں ریت بھرلی اور ریت کو اپنے سینے سے چمٹاتے ہوئے تیزی سے پیر چلاتے ہوئے جھیل کی سطح کی جانب واپسی کا سفر شروع کردیا۔

پانی سے سر ابھارتے ہی میں لمبی لمبی سانس لینے لگا۔ جب میرے اوسان بحال ہوگئے تو میں نے اپنے ہاتھوں میں موجود ریت پر نگاہ ڈالی۔

مجھے اس ریت میں تین سنہری سکے دکھائی دیے۔ یہ سکے بالکل اسی سنہری سکے کے مانند تھے جو میں نے طوفان کے بعد غار میں پانی کے چھوٹے سے تالاب میں پایا تھا۔

یہ بات اب صاف عیاں تھی کہ جھیل کے اس مقام پر پانی کی تہ میں کسی قدیم خزانے کے سکے بکھرے پڑے تھے۔ جھیل میں ہلکی سی ہوا چل رہی تھی لیکن مجھے اس ہوا میں نہ جانے کیوں موت کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔ جھیل کے کنارے پر موجود خشک پتے ہوا میں سرسرا رہے تھے۔ تب مجھے وہی بڑبڑاہٹ سنائی دینے لگی جو میں نے حویلی میں اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر سنی تھی۔

میں نے فوراً ہی پانی میں ڈبکی لگادی اور سکوت کے ساتھ نیچے ہی نیچے تیرتے ہوئے اس چٹان کی جانب بڑھنا شروع کردیا جس کا چھجا پانی کے اوپر آگے کو نکلا ہوا تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے پانی سے باہر سر نکالا تو دیکھا کہ غار کے عین اوپر جہاں میں نے اپنی تولیا بچھا کر اس پر گن کا وزن رکھا تھا، وہی مگرمچھ نما عفریت موجود تھا۔ اس کا سر یونہی گردش کر رہا تھا جیسے کسی محور پر رکھا ہوا ہو اور اس کا لمبوترا جبڑا کھل بند ہو رہا تھا۔

میں نے دوبارہ پانی میں ڈبکی لگادی۔ میں ایک بار پھر پانی میں نیچے ہی نیچے تیرتا ہوا غار سے پچاس فٹ کے فاصلے تک پہنچ گیا۔ پھر میں پانی سے نکل کر دبے پاؤں اس راستے پر آگیا جس پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ یہ راستہ اب تاریکی میں تھا اور تقریباً چھپا ہوا تھا۔

میں ہاتھوں کے بل رینگتا ہوا اس اندھیرے راستے پر اس عفریت کی جانب بڑھنے لگا۔ تب اچانک مجھے ایک وحشیانہ چیخ سنائی دی۔ یہ ایک نسوانی چیخ تھی!

میں جھٹکے سے اٹھا اور غار کی جانب دوڑ لگادی۔ جھیل کے پانی کے کنارے اس عفریت کے چنگل میں لیزا تھی جو خود کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ اس عفریت کے پنجے نما ہاتھوں نے لیزا کے حلق کو دبوچا ہوا تھا اور لیزا خود کو بچانے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

میں تقریباً اڑتا ہوا غار کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اسی دوران اس عفریت کی نگاہ مجھ پر پڑگئی۔ اس نے لیزا کو نیچے گرادیا۔ میں اس وقت تک غار کے سامنے بچھائے ہوئے اپنے تولیے تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے پیٹ کے بل تولیا پر چھلانگ لگائی اور گن کو اپنے ہاتھوں میں دبوچتے ہوئے پہلو کے بل کروٹیں لیتا ہوا آگے نکل گیا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

دوسرے لمحے میں نے اعشاریہ تین دو کی گن اس عفریت پر تان لی اور اس کے پیٹ کو نشانے کی زد میں لیتے ہوئے بولا۔ ”رک جاؤ ورنہ میں تمہارے پرخچے اڑا دوں گا!“

اس عفریت کے حلق سے ایک وحشیانہ چیخ بلند ہوئی اور اس نے مجھ پر قلانچ بھردی۔ ابھی وہ مجھ سے نصف فاصلے پر ہی تھا کہ میں نے یکے بعد دیگرے چار گولیاں اس عفریت کے پیٹ میں اتاردیں۔

وہ عفریت لڑکھڑاتا ہوا نیچے گر پڑا۔ ساتھ ہی اس کے حلق سے انسانی غرغراہٹ نما کھانسی کی آوازیں نکلنے لگیں۔ اس کا بدہیئت ماسک جو عفریت کا سر تھا ادھر ادھر ڈولنے لگا اور پھر چند لمحوں کے بعد ساکت ہوگیا۔

میں نے ایک جھٹکے سے وہ ماسک اتار دیا۔ میرے سامنے جینی مورگن کی حویلی کے نگہبان جیک میڈلن کا چہرہ تھا! اس کی شعلہ اگلتی آنکھوں میں ابھی روشنی کی چمک باقی تھی۔ اور وہ میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ان آنکھوں میں میرے لیے نفرت بھی عیاں ہو رہی تھی۔ اس کے منہ سے خون کا ایک بلبلہ سا بلند ہوا۔ پھر اس نے ایک ڈکاری لی اور اس کے منہ سے خون ابلنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بے نور ہوگئیں۔

میں چند لمحوں تک جیک میڈلن کے ساکت وجود کو دیکھتا رہا، پھر لیزا کی جانب پلٹ گیا جو کمزوری کی حالت میں کھڑا ہونے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیتے ہوئے کھڑا ہونے میں مدد کی اور پوچھا۔ ”تمہیں کوئی گزند تو نہیں پہنچی؟“

”نہیں“۔ اس نے جواب دیا اور پھر بے ہوش ہوگئی۔

میں بے ہوش لیزا کو اپنے کاندھے پر ڈال کر حویلی کی جانب بڑھا۔ آدھے راستے میں مجھے جینی اور بل ڈریک مل گئے۔ انہوں نے فائر کی آوازیں سن لی تھیں اور میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔

حویلی پہنچ کر ہم نے لیزا کے حلق میں زبردستی برانڈی انڈیلی تو اسے ہوش آگیا۔ وہ پاگلوں کے مانند چاروں طرف دیکھنے لگی۔

”کیا جیک مر چکا ہے“ اس نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تھینک گاڈ!“ اس نے اطمینان کا ایک لمبا سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے تمہیں معلوم تھا کہ جیک میڈلن ہی وہ عفریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں“ لیزا نے جواب دیا۔ ”دراصل جیک میڈلن کو ڈھیر سارا سونا مل گیا تھا۔ وہ اسپینی خزانہ تھا جو لوگ برسوں سے یہاں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ خزانہ پام کے ایک درخت کے نیچے دبا ہوا تھا۔ جب پچھلی بار طوفان آیا تو پام کا یہ درخت جڑ سے اکھڑ کر گر گیا تھا۔ درخت کے اکھڑنے سے بہت سا سونا اچھل کر جھیل کے گہرے پانی میں چلا گیا تھا اور تہ میں بیٹھ گیا تھا۔ جیک نے یہ سونا تلاش کر لیا تھا اور مجھے اس بارے میں بتا بھی دیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں نے اس خزانے کے بارے میں کسی کو کچھ بتایا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ جھیل کی تہ سے سونا نکالنے کے لیے اس نے غوطہ خوری کا لباس بھی خرید لیا تھا۔ لیکن جس روز وہ غوطہ خوری کا لباس لے کر آیا، اسی روز مس جینی مورگن اور ان کے مہمان بھی یہاں آگئے۔

”سونے کو حاصل کرنے کی طمع نے جیک کو پاگل کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ تم سب لوگ اس سے سونا چھیننے کے لیے یہاں آئے ہو۔ اس نے غوطہ خوری کے لباس پر ایک مگرمچھ کا پرانا سر منڈھ لیا اور لباس پر مگرمچھ کی کھال چڑھا لی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تمہیں ڈرا کر یہاں سے بھاگ جانے پر مجبور کر دے گا یا تم سب کو مار ڈالے گا۔!“

میں نے لیزا کی بات کاٹی اور بولا ”لیزا، کیا تمہارے کیبن میں ریکون کی کھالیں موجود ہیں؟“

”ہاں، کچن کے باہر میخیں ٹھونک کر لٹکائی ہوئی ہیں۔“ لیزا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”اوکے۔“ میں نے کہا۔

اب میری سمجھ میں آگیا تھا کہ گوشت کی وہ سڑاند کہاں سے آتی تھی۔ فلوریڈا کی تیز دھوپ میں سکھائی جانے والی کھالوں سے گلاب کے عطر کی خوشبو تو آنے سے رہی۔

”تم اپنی کہانی جاری رکھو۔“ میں نے لیزا سے کہا۔

”مجھے خوف تھا کہ جیک سونا حاصل کرنے کے بعد مجھے مار ڈالے گا۔“ لیزا نے بتایا۔ ”گزشتہ روز اس نے مس برتھا ولیمز کو مارنے کی کوشش کی تھی۔“

یہ سن کر برتھا ولیمز کانپ گئی اور بل ڈریک سے چمٹ گئی۔ بل ڈریک نے اسے دلاسا دیتے ہوئے تھپکی دی۔

”مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں تم سب خوفزدہ ہو کر یہاں سے چلے نہ جاؤ۔“ لیزا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”لہٰذا میں نے تمام گاڑیوں کے اسپارک پلگ ناکارہ کر دیے تھے۔“ پھر وہ چور نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

میں جواباً مسکرا دیا۔

"وہ گزشتہ شب میں اور ماما جیک کے گھر گئے تھے۔ اس نے ماما کو سونے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ تب ماما نے اس سے کہا کہ وہ اس بارے میں مسٹر مورگن کو تحریراً مطلع کردے۔"

"تو اس بات پر اس نے ماما کو قتل کر دیا تھا؟" میں نے اس آخری کڑی کو ملاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" لیزا نے کہا "یہ سن کر جیک پاگل ہو گیا تھا۔ ہم اپنے کیبن کے لیے وہاں سے نکل کھڑے ہوئے تھے لیکن وہ یقیناً دوڑتا ہوا ہم سے آگے نکل کر کسی جگہ راستے میں چھپ گیا تھا۔ اس نے مجھے اور ماما کو اندھیرے میں ڈرا دیا اور ہم دوڑتے ہوئے واپس اس کی کٹیا میں آگئے۔ چند منٹ بعد وہ بھی آگیا۔ اور یوں اداکاری کرنے لگا جیسے اس پر کچھ دیر پہلے جنون سوار ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے کہا ہم رات اس کی کٹیا میں بسر کر سکتے ہیں۔ آج صبح وہ چوری چھپے اپنی کٹیا میں داخل ہوا۔ مگرمچھ کا لباس پہنا اور ماما کو قتل کر دیا۔ عینی شاہد ہونے کے باوجود میں کسی کو یہ بات بتانے سے ڈر رہی تھی کہ جیک میرے ساتھ بھی یہی سلوک کر سکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے تھوڑا توقف کیا۔

پھر دوبارہ گویا ہوئی۔ "جب تم آج صبح یہاں سے روانہ ہوئے تو میں جان گئی کہ وہ تمہارا پیچھا کرے گا۔ شیرف کے پاس جانے کے بہانے اس کا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں ماما کے پاس جانا چاہ رہی ہوں۔ میں نے جیک کا تعاقب کیا اور اسے اس وقت جالیا جب وہ غار میں تمہارا گلا گھونٹ رہا تھا۔ میں نے اس سے بات کی کہ وہ تمہیں قتل نہ کرے۔ اس سے کہا کہ اس طرح قانون یہاں آن پہنچے گا۔ پھر وہ کبھی بھی اپنا سونا حاصل نہیں کر سکے گا۔ سو ہم تمہیں اٹھا کر کیبن میں لے آئے۔"

"آج رات جب تم نے کہا کہ تم سوئمنگ کرنے جا رہے ہو تو میں سمجھ گئی کہ تم خزانے تک پہنچ گئے ہو۔ اور میں یہ بھی سمجھ گئی کہ اگر جیک نے تمہیں خزانے کے قریب دیکھ لیا تو وہ یقیناً تمہیں مار ڈالے گا۔ لہٰذا تم جب کیبن سے روانہ ہوئے تو میں بھی چوری چھپے تمہارے پیچھے چل پڑی۔ جیک کے جھیل پر پہنچنے کے بعد میں بھی وہاں جا پہنچی۔ اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے میری ایک نہیں سنی۔ وہ کہتا رہا کہ میں نے تمہیں اس خزانے اور اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ سو وہ مجھے مارنے پر تل گیا۔ اتنے میں تم بھی وہاں آگئے اور تم نے اسے شوٹ کر دیا۔"

اسی اثنا میں شیرف بھی وہاں آگیا۔ جون اسٹرلنگ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ جیک میڈلن نے اس کے گھر پہنچتے پر اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اور اسے مردہ سمجھ کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اسے کئی گھنٹوں بعد ہوش آیا تو وہ شیرف کو لینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

میں نے پوری داستان شیرف کے گوش گزار کر دی۔ وہ اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم نے خزانہ کس طرح دریافت کیا تھا۔"

"میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا" جب میں طوفانی بارش کے دوران میں پناہ لینے کے لیے ایک غار میں رینگ کر داخل ہوا تھا تو وہاں مجھے ایک سنہری اسپینی سکہ پڑا ہوا ملا تھا۔ اس سکے کو دیکھنے کے بعد گمشدہ خزانے کی کہانی یاد آگئی جو میں میامی میں سن چکا تھا۔ پھر بعد میں لیزا کے کیبن میں جب میں نے ایک میرین کمپنی کا کھلا ہوا لیکس نیا بکس رکھا ہوا دیکھا تو میرا دھیان غوطہ خوری کے لباس کی جانب چلا گیا۔ سو میں نے دو اور دو چار کیے تو یہی نتیجہ اخذ کیا کہ جھیل کی تہ میں مزید سونے کے سکے بھی موجود ہوں گے اور کسی نہ کسی کو ان کے بارے میں آگاہی ہے!۔

"جب جینی نے مجھے بتایا کہ جیک میڈلن واپس نہیں لوٹا ہے تو میں سمجھ گیا کہ لازمی یہ جیک میڈلن ہی ہے جو اس خزانے کے راز سے واقف ہے۔"

"میں جھیل پر گیا اور اس کی تہ میں غوطہ لگایا تو وہاں تہ کی ریت میں یہ خزانہ بکھرا ہوا تھا۔ اتنے میں جیک میڈلن بھی اپنے مگرمچھ والے عفریت کے لباس میں وہاں آگیا اور اس نے لیزا پر حملہ کر دیا۔ مجھے اسے شوٹ کرنا پڑا۔ بس یہ مکمل داستان ہے۔"

شیرف نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں، میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ بس مجھے جیک میڈلن کی لاش مطلوب ہے۔ کیا وہ بدستور اپنے اسی مگرمچھ نما عفریت کے حلیے میں ہے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"مجھے اس مقام تک لے چلو جہاں اس کی لاش موجود ہے۔" شیرف نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں ایک بار پھر اسی دلدلی زمین پر جھاڑ جھنکار میں راستہ بناتا ہوا شیرف کی رہنمائی کر رہا تھا۔ لیکن اب مجھے کسی عفریت کا خوف نہیں تھا جو اندھیرے میں دبک کر اپنے شکار کی تاک میں بیٹھا ہوا ہو۔

رومانوی فضا میں سرمستی اور سوز کی کیفیت میں ڈوبا دل پذیر فسانہ

دوسرا چہرہ

منظر امام

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اظہار مشکل ہوتا ہے... ان کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے... کچھ لوگوں کے پاس اظہار کی دولت ہوتی ہے... وہ اپنے ہر جذبے کو بیان کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی اس صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف اظہارِ ذات کرسکتے ہیں بلکہ دوسروں کے دل کی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ لوگ بولتے چہروں کے تو مالک ہوتے ہیں مگر اظہارِ خیال میں کنجوس ہوتے ہیں، عکس در عکس پھیلی کہانی کی تحیر انگیزی اور پراسراریت کے انوکھے لبادے...

سہیل ابھی اُس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اُس نے ایک جست لگائی اور دیوار پھلانگ کر دوسری طرف نکل گئی۔

سہیل نے اپنا پستول نکال لیا۔ "اے رکو۔ رک جاؤ۔"

لیکن وہ اتنی دیر میں نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

سہیل نے خود بھی دیوار پر چڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس دوران میں اس کے سپاہی وغیرہ اس کے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ دیوار سے نیچے اتر آیا۔ اس وقت وہ بری طرح جھلّایا ہوا تھا۔

"کیا ہوا صاحب؟" انسپکٹر بشیر نے پوچھا۔

"نکل گئی۔" سہیل نے بتایا۔ "دیوار پھلانگ کر نکل گئی۔"

"اسی لیے تو ہم لوگ اس کو بجلی کہتے ہیں۔" ایک دوسرے پولیس والے نے کہا۔ "بلا کی پھرتی ہے اس میں۔"

"صاحب جی میں نے سلطانہ ڈاکو کا نام سنا ہے۔ شاید یہ اسی ٹائپ کی چیز ہے۔" کسی نے کہا۔

سہیل کوئی جواب دیے بغیر اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔ وہ اس علاقے کا ایس پی تھا۔ قانون کی مدد کرنے کا جذبہ اسے پولیس ڈپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔ اسے جہاں تعینات کیا گیا تھا۔ وہاں کچھ دنوں سے بجلی کی حکمرانی تھی۔ اس لڑکی نے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ اس کا ایک گروپ تھا۔ وہ عام طور پر گاڑی والوں کو لوٹا کرتی۔ اب تک اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکا تھا۔ ایک ریکارڈ یہ بھی تھا کہ اس نے اب تک کسی کو زخمی بھی نہیں کیا تھا۔ گاڑی والے دہشت زدہ ہو کر سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے تھے۔ وہ

عام طور پر نقاب میں رہتی تھی۔ کسی نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس سے لٹنے والے جب اس کی رپورٹ درج کروانے آتے تو ان کا بیان یہی ہوتا تھا کہ وہ جوان لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی آواز بہت اچھی ہے۔

پولیس کی کوششوں سے پچھلے دنوں اس کے گروپ کا ایک آدمی ہاتھ آ گیا تھا۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ بجلی گروپ کا کوئی آدمی پولیس کے ہاتھ آیا ہو۔ اس کو فوری طور پر سہیل کے پاس پہنچا دیا گیا تھا..... وہ تیس سال کی عمر کا تھا۔ اس نے اپنا نام بالے بتایا تھا۔

''بتا کون ہے یہ بجلی؟'' سہیل نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا سر۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب، کیوں نہیں جانتا۔''

''ہم میں سے کسی نے بھی آج تک اُس کا چہرہ نہیں دیکھا۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ ہمارے سامنے نقاب باندھ کر آتی ہے۔''

''تو تم لوگ اس کے چکر میں کیسے پھنس گئے؟'' سہیل نے پوچھا۔

''مجبوری کی وجہ سے سر۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ اسی سے گھر کا گزارا ہوتا تھا۔ ایک دن پتا چلا کہ فیکٹری سے نکال دیا گیا ہوں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ بہت پریشان ہو کر ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ایک لڑکی میرے پاس آئی۔ یہ بجلی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اسے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی ہے۔ جوان لڑکی تھی صاحب۔ میں بھی چکرا گیا کہ وہ مجھ سے کیا بات کرے گی۔''

''تم نے اُس کا چہرہ تو دیکھا ہوگا؟''

''نہیں صاحب۔ برقع میں تھی۔ چہرہ بھی چھپا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں پریشان ہوں۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا تعلق کسی این جی او سے ہے۔ اور وہ غریبوں کی مدد کیا کرتی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں بے روزگار ہو گیا ہوں۔

''اس نے اسی وقت مجھے دو ہزار دیے اور کہا کہ وہ اپنی این جی او سے کہے گی کہ تمہاری مدد کر دے۔ اب کیا بتاؤں صاحب۔ اس دو ہزار سے میرے کتنے کام نکل سکتے تھے۔ اس نے کہا کہ میں اس سے کل اسی جگہ ملوں۔ وہ میرے لیے کوئی کام نکال کر رکھے گی۔ میں دوسرے دن اس سے ملا۔ اس نے کہا کہ دیکھو اس وقت تو کوئی کام نہیں ہے لیکن ایک راستہ ہے اور پھر اس نے راستہ بتا دیا۔''

''وہی راستہ نا۔ لوگوں کو لوٹنے کا؟'' سہیل نے پوچھا۔

''جی صاحب' اس نے کہا کہ اس دور میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ اسی لیے اگر کوئی دیتا نہیں ہے تو اس سے چھین لو۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہمارے ہاتھوں کسی کا نقصان نہیں ہونا چاہیے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''صاحب اس نے کہا تھا کہ کبھی کسی کو مارنا نہیں۔ کبھی گولی نہیں چلانا۔ کبھی کوئی زیادتی نہیں کرنا۔ اس نے ایک پستول بھی دیا تھا۔ لیکن اس میں گولیاں نہیں ہوتی تھیں۔ ویسے بھی وہ کھلونا پستول تھا۔ اس نے کہا تھا کہ پستول کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ لوگ اتنے ڈرے ہوئے ہیں کہ نقلی پستول سے ڈر جائیں گے۔ اور یہی ہوتا ہے صاحب۔ لوگ فوراً اپنا سب کچھ حوالے کر دیتے ہیں۔''

''کتنے لوگ ہیں اس کے ساتھ؟'' سہیل نے پوچھا۔

''صرف تین آدمی ہیں۔ ایک وہ خود ہے۔''

''دوسرے لوگ کہاں سے آئے؟''

''وہ خود ہی لائی تھی سر۔ اب کہاں سے لائی یہ میں نہیں جانتا۔'' اس نے بتایا۔

''اُن دو کے نام کیا ہیں؟''

''یہ بھی میں نہیں جانتا صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''بکواس مت کر۔ ساتھ کام کرتا ہے اور نام نہیں جانتا۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں صاحب۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی کا نام نہیں جانتا۔ میں نمبر ایک ہوں۔ دوسرا نمبر دو ہے۔ اور تیسرا نمبر تین ہے۔ اس نے ہم سے قسم لی تھی کہ ہم میں سے کوئی کسی کا نام نہیں معلوم کرے گا۔ اور نہ ہی یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ وہ رہتا کہاں ہے۔ صاحب اگر آپ میری کھال بھی اتار دیں تو میں ان دونوں کے نام اور ٹھکانے نہیں بتا سکوں گا۔ مجھے تو خود اس لڑکی کا نام بھی نہیں معلوم۔ بجلی کہلاتی ہے۔ اب یہ اس کا نام تو نہیں ہو سکتا۔''

''کیا تم لوگوں نے کبھی اس کی اصلیت جاننے کی کوشش نہیں کی؟

''میں نے کی تھی صاحب۔'' اس نے بتایا۔ ''ایک بار میں نے اس کا پیچھا کیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''کیا بتاؤں صاحب۔ اس کو پتا چل گیا کہ میں اس کے پیچھے ہوں۔ اس وقت ایک میدان سے گزر رہی تھی۔

میدان سنسان تھا صاحب۔ وہ آگے آگے تھی۔ ایک جگہ وہ اچانک رک گئی۔ اس نے مڑ کر مجھے آواز دی۔ اس کو پتا چل گیا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر جناب اس نے مجھے مارنا شروع کردیا۔''

''کیا؟'' سہیل نے حیرت سے پوچھا۔ ''مارنا شروع کردیا؟''

''جی صاحب۔ اب کیا بتاؤں، وہ کیا چیز ہے۔ وہ جوڈو کراٹے سب جانتی ہے۔ اس کے بدن میں بجلی بھری ہے صاحب۔ میں خود کو بہت طرم خان سمجھتا صاحب لیکن اس نے ذرا سی دیر میں ڈھیر کردیا تھا۔ ایسی بے عزتی ہوئی تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ اگر میں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تو میرا اور بھی بُرا حال کردے گی۔''

''کمال ہے۔''

''جی صاحب۔ میں ہی نہیں، وہ دونوں بھی اس سے بُری طرح مار کھا چکے ہیں۔''

''اگر ایسا ہے تو تم لوگ اُس کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''وہ بہت چالاک ہے صاحب۔ ہر واردات کے وقت وہ ہماری ویڈیو بنالیتی ہے۔ خود تو کچھ فاصلے پر کھڑی رہتی ہے۔ ہم وارداتیں کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ ویڈیو بناتی رہتی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا ہاتھ میں آنا مشکل ہے۔''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب۔ ہوسکتا ہے کہ کبھی پھنس جائے۔''

''کبھی تو اس کی صورت دیکھی ہوگی۔''

''بس ایک بار اس کا نقاب ذرا سا ہٹ گیا تھا۔ صاحب۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ اس کی آنکھیں بھی بہت خوبصورت ہیں۔''

''تم لوگ ملتے کس طرح ہو؟''

''ہر واردات کے بعد وہ دن اور وقت بتادیتی ہے کہ فلاں پارک میں آجانا۔ ہم پہنچ جاتے ہیں اور وہ خود بھی آجاتی ہے۔ ہاں ایک بات اور بھی صاحب۔ واردات میں جو کچھ بھی ملتا ہے۔ وہ سب ہم میں بانٹ دیتی ہے۔ خود ایک پیسا بھی نہیں رکھتی۔ سب کچھ دے دیتی ہے۔''

''یہ لیں صاحب جی۔'' ایک پولیس والا بول پڑا ''یہ تو ایک نئی بات پتا چلی۔''

صوفی

ڈاکٹر۔ ''آپ کون سا آئل استعمال کرتے ہیں؟''
شیخ۔ ''صوفی کا۔''
ڈاکٹر۔ ''صابن کون سا استعمال کرتے ہیں؟''
شیخ۔ ''صوفی کا۔''
ڈاکٹر۔ ''اور ٹوتھ پیسٹ؟''
شیخ۔ ''وہ بھی صوفی کا۔''
ڈاکٹر۔ ''اچھا، کیا صوفی بہت اچھی کمپنی ہے کیا؟''
شیخ۔ ''نہیں، صوفی میرا روم میٹ ہے، ہم دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے ہیں۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی جواب دہی

''جب وہ سب کچھ بانٹ دیتی ہے۔ اپنے پاس کچھ نہیں رکھتی تو پھر وہ یہ سب کیوں کررہی ہے؟'' سہیل نے پوچھا۔

''یہ تو خود ہماری سمجھ میں نہیں آتا صاحب۔'' اس نے کہا۔

اس شخص سے جو بھی معلوم ہوا تھا، وہ حیرت انگیز تھا۔ بجلی ایک پُر اسرار ہستی کی طرح سامنے آئی تھی۔ وہ یہ سب کیوں کررہی تھی۔ کیا صرف ایڈونچر کے لیے۔ لیکن یہ کیسا ایڈونچر تھا۔

پولیس افسران کی میٹنگ میں کئی باتوں پر غور ہوتا رہا تھا۔ اس گروپ کی وارداتیں بڑھتی جارہی تھیں۔ تین آدمی تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ایک کی گرفتاری کے بعد گروپ اپنی وارداتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے یا نہیں۔

دوسرا سوال یہ تھا کہ اس کا تعلق کس طبقے سے تھا۔ وہ مارشل آرٹ جانتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ ورنہ عام طور پر غریب گھروں کی لڑکیوں کے پاس نہ تو اتنی فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے پاس اتنے پیسے ہوتے ہیں کہ وہ اس قسم کے ہنر سیکھ سکیں۔

وہ لوٹ کے پیسوں سے اپنا کوئی حصہ بھی نہیں رکھتی تھی۔ یعنی اس کو پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس پر ہاتھ کیسے ڈالا جائے۔ نہ تو اس کی کوئی تصویر تھی اور نہ ہی اس کے ٹھکانے کا علم تھا۔ اس کے ساتھیوں کے

بارے میں بھی کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔

"صاحب جی وہ تو کسی کہانی کا کردار بن کر رہ گئی ہے۔" ایک پولیس والے نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن کب تک۔ ایک نہ ایک دن قانون کی گرفت میں آ ہی جائے گی۔"

اور پھر ایک رات وہ سہیل کی گرفت میں آتے آتے رہ گئی۔ ایک بار پھر وارداتیں شروع ہو گئی تھیں۔ جس بندے کو پکڑا گیا تھا، وہ پولیس کی تحویل میں تھا۔ اس کے باوجود وارداتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا۔

اس گروپ کے ہاتھوں لٹنے والے ایک ہی طرح کی کہانی سناتے تھے۔ ان کو سنسان راستوں میں گھیر لیا گیا تھا۔ تین آدمی تھے۔ اور ایک لڑکی یا عورت برقع میں ہوا کرتی تھی۔ جو ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو جاتی۔ اور وہ تینوں گاڑی والوں سے لوٹ مار میں مصروف ہو جاتے۔ ان کا یہ کہنا ہوتا تھا کہ وہ تینوں نقاب میں ہوا کرتے تھے۔

یہ طریقہ کار بجلی گروپ ہی کا تھا۔

پولیس کی تحویل میں آنے والے بالے نے بتایا کہ ہو سکتا ہے کہ بجلی نے اس کی جگہ کسی اور کو گروپ میں شامل کر لیا ہو۔

بالے سے پوچھا گیا کہ وہ لوگ ایک عورت کی حاکمیت کیوں برداشت کرتے تھے۔ اس نے جواب دیا۔ "صاحب جی، پہلی بات تو یہی تھی کہ وہ دل کھول کر پیسے دیتی تھی۔"

"کیا مطلب ہوا اس کا؟ کیا وہ لوٹ کی رقم کے علاوہ بھی کچھ دیتی تھی؟"

"جی صاحب۔ وہ اپنی طرف سے بھی کچھ دیتی تھی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے لاتی تھی۔ اور ہم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اسی لیے ہم اس کا ساتھ دے رہے ہیں اور دوسری بات یہ تھی کہ وہ.... ایک جوان لڑکی ہے۔ وہ ہم تینوں سے مہربانی کا سلوک کرتی ہے۔ شاید ہم اسی چکر میں ہوں کہ وہ ہم میں سے کسی پر مہربان ہو جائے۔ لیکن اس نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا کہ ہم اس کے لیے کچھ ادھر ادھر کی بات کر سکیں۔ وہ ہمیشہ کھلی جگہ ملاقات کرتی تھی۔ کبھی کسی پارک میں اور کبھی کسی ہوٹل میں۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی کہ ہماری ویڈیو اس کے پاس ہوتی تھی۔ ہم اسی ڈر سے اس کا ساتھ دیتے رہے۔"

سہیل جانتا تھا کہ اس قسم کے کسی مجرم کو پکڑنا بہت مشکل ہو سکتا ہے۔ جس کا کوئی ریکارڈ نہ ہو۔ جس کی کوئی شناخت نہ ہو۔ اگر وہ اپنا کام چھوڑ دے تو ساری زندگی اس کا سراغ نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی ایک ایسی پرابلم تھی جس کو حل کرنے کی کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

☆☆☆

جمیلہ ایک خوف زدہ رہنے والی لڑکی تھی۔

اس نے اپنا بچپن اسی خوف کے انداز میں گزارا تھا۔ اس کا باپ ایک نام نہاد مولوی تھا۔ انتہائی سخت گیر۔ جس نے سونے کا نوالہ تو چاہے نہ کھلایا ہو لیکن شیر جیسی نگاہ ضرور رکھی تھی۔ وہ نہ صرف اپنی بیوی کے لیے عذاب تھا بلکہ اپنی بیٹی جمیلہ کے لیے بھی اس کا یہی رویہ تھا۔

جمیلہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت بال۔ لانبا قد۔ غلافی آنکھیں۔ کھنکتی ہوئی آواز۔ سب کچھ تھا اس کے پاس۔ لیکن اس کے باپ نے اس کی شخصیت مسخ کر کے رکھ دی تھی۔ باپ جب گھر آتا تو ایسا لگتا جیسے گھر والوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب خاموش ہو جاتے۔

جمیلہ کو تعلیم حاصل کرنے کا بھی شوق تھا۔ لیکن اس کے باپ کو لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اس کی ماں نے ہمت کی۔ وہ اپنے شوہر کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو گئی تھی۔

خاندان کے بھی کچھ لوگوں نے جمیلہ کے باپ کو سمجھایا تھا کہ یہ زمانہ کچھ اور ہے۔ اگر جمیلہ نے تعلیم حاصل نہیں کی تو اس کے رشتے میں بہت دشواری ہو جائے گی۔ تب جا کر اس نے تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی تھی .... لیکن اپنی شرائط کے ساتھ۔

ایک شرط یہ تھی کہ جمیلہ برقع پہنے گی۔ دوسری شرط یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنی دوست نہیں بنائے گی۔ اگر کوئی ہوئی بھی تو وہ اس کے گھر نہیں جائے گی جبکہ وہ دوست اس کے گھر آ سکتی ہے۔ وہ بھی پڑھنے پڑھانے کے حوالے سے۔

اس گھر میں کسی کزن وغیرہ کا آنا منع تھا۔ اگر کوئی آ بھی جاتا تو اسے ڈرائنگ روم سے آگے نہیں لایا جاتا تھا۔ جمیلہ کی ماں اس سے جا کر مل سکتی تھی۔ اگر جمیلہ کا ملنا ضروری ہوتا تو۔ وہ نقاب باندھ کر اس کے سامنے جاتی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے تمام کزنز نے اس کے گھر آنا.... چھوڑ دیا تھا۔

اس کی زندگی میں محبت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ نرم جذبہ جو کسی کی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے یہاں ناپید تھا۔ وہ جب کالج جاتی اور کالج کی لڑکیاں اس کے سامنے

اپنی اپنی محبت کی کہانی سناتیں تو اسے کچھ عجیب سا لگتا۔ کیا زندگی میں یہ سب بھی ہوتا ہے۔ کیا کوئی اور ایسا بھی رشتہ ہوتا ہے جو بظاہر کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ پھر بھی سب سے قریب ہو جاتا ہے۔ جو کہ رشتے میں کچھ نہیں ہوتے۔ ان سے رشتہ بلا کا ہوتا ہے۔

اس کے دور و نزدیک تک ایسے کسی رشتے کا کوئی گمان بھی نہیں تھا۔

لیکن ایک دن نہ جانے کس طرح ایسا ایک رشتہ ہوا کے کسی خوش گوار جھونکے کی طرح اس کے پاس آ ہی گیا۔

اس دن کالج سے واپسی میں کسی بات پر ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا۔ بسیں بند ہو گئیں۔ دکانیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔ پتا چلا کہ کسی کا مرڈر ہو گیا ہے۔ جس کے لیے احتجاج ہو رہا ہے۔ احتجاج کرنے والوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ ان کی اس حرکت سے کتنی پریشانی ہو رہی ہے۔ جمیلہ عام طور پر بس سے آیا جایا کرتی تھی۔ اس کے باپ نے وین لگوانے سے انکار کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں بھی اس کے پاس ایک دلیل تھی۔ ''نہیں۔ یہ وین والے لڑکیوں سے دوستی کر لیتے ہیں۔ ان سے گپ شپ کرتے ہیں۔ اگر موقع ملے تو اپنی وین میں گھمانے لے جاتے ہیں۔ اسی لیے جمیلہ عام بس میں جائے گی۔ وہاں ایسی بات نہیں ہوتی۔''

جمیلہ کی ماں اور خود جمیلہ یہ سب سن کر سر پکڑ کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ بس بہت ہو گئی پڑھائی۔ لڑکی کو گھر بیٹھا دو۔

تو اس دن اس راستے کی بسیں بھی نہیں چل رہی تھیں۔ جو گاڑیاں گزرتیں ان پر پتھراؤ ہونے لگتا تھا۔ جمیلہ کی دوسری سہیلیاں کسی طرح گھروں کی طرف جا چکی تھیں۔ اس افراتفری کے عالم میں جمیلہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف جائے۔ وہ پیدل ہی ایک طرف چل پڑی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس نے کچھ لوگوں کو دیکھا۔ اسی دوران کسی طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ اس کے ساتھ جو لوگ چل رہے تھے، وہ اب دوڑنے لگے تھے۔

جمیلہ نے بھی دوڑنا شروع کر دیا۔ اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ کس طرف جا رہی ہے۔ بے پناہ خوف نے اس کے اعصاب جکڑ لیے تھے۔ اسی وقت کسی گاڑی کی آواز آئی۔ جو اس کے پاس آ کر رک گئی تھی۔ جمیلہ اچھل پڑی۔

عورت

ایک عمر رسیدہ دیہاتی جوڑا پہلی بار شہر آیا۔ ایک فیشن ایبل علاقے سے گزرتے وقت بڑے میاں سرِراہ چلتی عورت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ آخر بڑی بی نے ٹھوکا دیا۔

''خیر دین! شرم کرو کچھ، کوئی دیکھے گا تو کیا سوچے گا شاید یہی کہ تم نے زندگی میں کبھی عورت نہیں دیکھی۔''

بڑے میاں ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''کوئی اور تو کیا سوچے گا، میں تو خود اس وقت یہی سوچ رہا ہوں۔''

مرحا گل، ورابن

تہذیب

پاکستانی لڑکا: ''ہم 8 بھائی اور 2 بہنیں ہیں۔ آپ کے کتنے ہیں؟''

امریکن لڑکی: ''میرے بھائی، بہنیں نہیں لیکن پہلی امی سے 4 ابو اور پہلے ابو سے 6 امیاں ہیں۔''

فیمیل

ٹیچر: فٹ بال MALE ہے یا FEMALE ہے؟''

اسٹوڈنٹ: ''جس کے پیچھے 22 لڑکے بھاگتے ہوں۔ وہ FEMALE ہی ہوئی نا۔''

محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

ایک بڑی سی گاڑی اس کے پاس آ کر رکی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ ''پریشان نہ ہوں۔ میں ایک ذمے دار پولس آفیسر ہوں۔ آپ مجھ پر اعتماد کر کے بیٹھ جائیں۔ ورنہ بری طرح پھنس جائیں گی۔ ہنگامہ بڑھتا جا رہا ہے۔''

جمیلہ اس وقت رو رہی تھی۔ اس وقت اسے یہ سہارا بہت غنیمت محسوس ہوا۔ وہ اس شخص کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ کسی غیر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اگر اس کے باپ کو پتا چل جاتا تو کیا ہوتا۔

''آپ بتا دیں، کہاں جانا ہے آپ کو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں پاپوش میں رہتی ہوں۔'' جمیلہ نے بتایا۔ ''لیکن مجھے کہیں بھی اتار دیں۔ میں بس پکڑ کر نکل جاؤں

گی۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

جمیلہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس پولیس آفیسر کے لہجے میں کچھ ایسی اپنائیت اور ذمے داری تھی کہ وہ خاموش رہی۔ راستے میں اس نے جمیلہ کی طرف ایک کارڈ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "محترمہ میں ایس پی ہوں۔ سہیل نام ہے میرا۔ اس کارڈ کو سنبھال کر رکھیں۔ کبھی ضرورت ہو تو بلا تکلف فون کر دیجیے گا۔"

"جی اچھا۔" جمیلہ نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا۔ اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ اس کو لفٹ دینے والا اتنا بڑا پولیس آفیسر تھا اور اتنا مہذب۔ جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کارڈ لیتے ہوئے۔ بس ایک لمحے کے لیے اس کا نقاب ایک طرف ہٹ گیا تھا۔ وہ پولیس آفیسر اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ جمیلہ نے جلدی سے نقاب برابر کر لیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ سب ہی کچھ تو پہلی بار ہو رہا تھا۔ اس نے تو تصور بھی نہیں کیا ہو گا کہ کوئی اجنبی اس طرح اس کو اپنا کارڈ دے گا۔ اس کو اس وقت سہارا دے گا جب وہ پریشانی کے عالم میں بھٹک رہی ہو گی۔

اس کی منزل قریب آ گئی تھی۔ اس نے اس پولیس والے سے کہا۔ "پلیز۔ آپ مجھے یہیں اتار دیں۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"نہیں۔ اب تو میں اتنی آسانی سے جانے نہیں دوں گا۔" اس نے کہا۔

"کیا؟ جمیلہ دھک سی رہ گئی۔ "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"گھبرا گئیں؟" وہ ہنس پڑا۔ "محترمہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اپنا نام بتائے بغیر آپ نہیں جا سکتیں۔"

"اوہ......" اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

"میرا نام جمیلہ ہے۔"

"یاد رکھوں گا۔" اس نے کہا۔

جمیلہ کے کہنے پر اس نے جمیلہ کو ایک جگہ اتار دیا۔ پھر وہ اپنی گاڑی میں آگے بڑھ گیا۔ گھر کی طرف چلتے ہوئے جمیلہ کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ ایک عجیب سی سرشاری کی کیفیت تھی۔ اس نے اس کا دیا ہوا کارڈ بہت احتیاط سے رکھ لیا تھا۔

وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ پولیس کا ایک بڑا عہدے دار تھا۔ ایک شائستہ انسان تھا۔ اس کی گفتگو کتنی دھیمی تھی۔ کتنا اچھا لہجہ تھا اس کا۔ وہ گھر پہنچی تو اس کی ماں پریشانی کے عالم میں دروازے پر کھڑی تھی۔ اس تک ہنگامے کی خبر پہنچ چکی تھی۔

جمیلہ کو واپس آتے دیکھ کر اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ "خدا کا شکر ہے بیٹا کہ تو خیریت سے واپس آ گئی۔ تیرے باپ نے تو عذاب بنا کر رکھ دیا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ یہی کہہ رہے تھے کہ اسی لیے لڑکیوں کے گھر سے باہر جانے کے خلاف ہیں۔ نہ جانے کیا ہو جائے۔"

"اماں۔ یہ سب روز روز تو نہیں ہوتا ہے نا۔ بس ایک بار ہو گیا ہو۔"

"اب ان کو کون سمجھائے؟"

"وہ ہیں کہاں؟"

"نماز کے لیے گئے ہیں۔" ماں نے بتایا۔ "لیکن تو آئی کیسے؟"

"بڑی مشکلوں سے ایک بس مل گئی تھی۔ اس نے پہنچا دیا۔" جمیلہ نے بتایا۔ اس نے اس پولیس آفیسر کا ذکر نہیں کیا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ بہت دیر تک اس کے دیے ہوئے کارڈ کو دیکھتی رہی۔ اس کارڈ پر پولیس کا مخصوص مونو گرام بنا ہوا تھا۔ کارڈ دیکھ کر اس نے اسے اپنی الماری میں رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

جو کچھ ہوا، وہ ایک خوبصورت حادثہ ہی تو تھا۔

سہیل کی زندگی میں ابھی تک کوئی ایسی لڑکی نہیں آ سکی تھی جو اس کے ہوش و حواس پر غالب آ سکتی۔ اس کا تعلق جس محکمے سے تھا، اس محکمے میں عورتیں ہوا کرتی تھیں۔ اسٹاف میں بھی اور باہر کی بھی۔

مجرموں کی ٹولیوں سے تعلق رکھنے والی خبیث صورت عورتیں۔ رشوت کے طور پر خود کو پیش کرنے والی عورتیں یا لڑکیاں۔ ان میں سے کسی میں شادابی اور معصومیت نہیں ہوا کرتی تھی لیکن یہ لڑکی تازہ پھول کی طرح تھی۔ جو ایک عام سے محلے میں کھلا ہوا تھا۔

اس نے بڑی محنت کی زندگی گزاری تھی۔ اسی لیے کوئی لڑکی سیریس ہو کر اس کی زندگی میں نہیں آ سکی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہی ہوا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ دو بہنیں تھیں۔ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ ان کی ذمے داریاں تھیں۔ اس کی قسمت اور اس کی تعلیم نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ چونکہ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔ اس کی

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کارکردگی شاندار رہی تھی۔ اس کے مزاج میں بے خوفی اور جرم سے نفرت شامل رہی تھی۔ اسی لیے اس کی ترقی ہوتی چلی گئی۔

وہ اب ایس پی تھا۔ اعلیٰ حکام کو اس پر بہت بھروسا تھا۔ عام طور پر خطرناک قسم کے معاملات اس کے حوالے کر دیے جاتے تھے۔ اس بار اس کے پاس بجلی کا کیس آیا تھا۔ وہ گروہ اچانک ہی سامنے آیا تھا۔ اس کی وارداتیں بہت زیادہ ہونے لگیں۔ وہ رات میں گاڑیاں روک کر سواریوں کو لوٹ لیا کرتا۔

اس گروہ کی سربراہ ایک لڑکی تھی۔ جو حیرت کی بات تھی۔ دو چار پولیس والوں سے اس کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ ان کا بیان تھا کہ وہ بلا کی دلیر اور پھرتیلی ہے۔

ایک بار وہ لڑکی اس کے ہاتھ آتے آتے رہ گئی تھی۔ اس کے خیال میں بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی لڑکی اتنی دلیر اور پھرتیلی ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک جھٹکے سے سہیل سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا تھا اور ایک دیوار پھلانگ کر بھاگ نکلی تھی۔ سہیل اس کو خبردار ہی کرتا رہ گیا تھا۔

وہ سوچتا ہی رہ گیا۔ ایک یہ لڑکی تھی جو جرم کی راہ پر چل نکلی تھی۔ اور ایک وہ تھی جس کو اس نے لفٹ دی تھی۔ دونوں میں کتنا فرق تھا۔ ایک نے نہ جانے کس ماحول میں پرورش پائی ہوگی اور دوسری ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ جنس دونوں کی ایک ہی تھی لیکن دونوں میں کتنا فرق تھا۔

ایک دن سہیل کو جیلہ کا فون آ ہی گیا۔ وہ اس کی آواز سن کر لپک اٹھا تھا۔ ”میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید تم مجھے فون نہیں کرو گی۔“

”ارے نہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا مجھے۔“

”شکریہ تو تم نے اسی دن ادا کر دیا تھا اور دوسری بات یہ ہے کہ شکریہ اس طرح ادا نہیں ہوتا۔“

”تو پھر کس طرح ادا ہوتا ہے؟“

”سامنے بیٹھ کر۔“

”ہائے اللہ۔“ جیلہ نے کہا۔ اس کے بعد گہری خاموشی۔ کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی یا اس نے فون بند کر دیا تھا۔

”ہیلو، کیا بات ہو گئی۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“ سہیل نے پوچھا۔

”میں یہ سوچ رہی ہوں کیا کہوں آپ سے؟“

”مرضی ہے تمہاری۔ میں نے تو شکریہ ادا کرنے کا طریقہ بتا دیا ہے۔“

”اچھا۔ میں آپ سے پھر بات کروں گی۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

سہیل کو یقین تھا کہ جیلہ اسے پھر فون کرے گی۔ اس نے جیلہ کے بارے میں اپنی ماں کو بھی بتا دیا تھا۔ ”امی وہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ ایسی لڑکی جس کو ابھی زمانے کی ہوا نہیں لگی ہے۔ معصوم سی ہے۔ میرا تو واسطہ پچاس قسم کی لڑکیوں سے پڑتا رہتا ہے۔ پولیس میں آنے کے بعد بہت تجربہ ہو گیا ہے کہ کون کس مزاج کا ہے۔ کس کا کردار کیسا ہے۔ وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔“

”خدا کا شکر ہے کہ تمہیں کوئی لڑکی پسند تو آئی ہے۔“ ماں نے کہا۔

”بھائی آپ نے اس کا گھر دیکھا ہے۔“ بہن نے پوچھا۔

”نہیں۔ حالانکہ میں اگر چاہوں تو اپنے آدمیوں کے ذریعے ایک دن میں اس کے گھر کا پتا چلا لوں۔ لیکن میں اس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔ اس نے جس نمبر سے فون کیا تھا۔ وہ نمبر بھی ٹریس ہو سکتا ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا۔ وہ خود بتا دے تو اچھا ہوگا۔“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ دوبارہ فون کرے گی؟“

”ہاں یقین ہے مجھے۔“ اس نے کہا۔

دو دن بعد جیلہ کا پھر فون آ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے میں ملوں گی آپ سے۔ آپ کا شکریہ ادا کرنے لیکن صرف دس منٹ کے لیے......“

”چلو منظور ہے۔ میرے لیے دس منٹ ہی بہت ہوں گے۔“

دونوں کی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ جیلہ تو کسی ہوٹل میں جانے کے لیے راضی نہیں تھی لیکن سہیل اسے لے آیا تھا۔ سہیل کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کسی اچھے ہوٹل میں پہلی بار داخل ہوئی ہے۔ اس کی باڈی لینگویج یہ بتا رہی تھی۔ اس نے جو کھانے منگوائے تھے۔ وہ بھی جیلہ کے لیے اجنبی سے تھے۔ وہ بار بار حیرت کا اظہار کرتی رہی تھی۔

سہیل نے اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ جیلہ کے پاس اسے بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے اپنے باپ کی سختیوں کے۔

”اب سمجھا۔ شاید اسی لیے تمہاری پرسنالٹی کچل کر رہ گئی ہے۔“

"ہاں۔ میں اپنے گھر میں سانس لینے میں بھی گھٹن محسوس کرتی ہوں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میرے بہت سے کزنز ہیں۔ لیکن میں کسی کو نہیں جانتی۔ کیوں کہ مجھے کسی کے سامنے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ میرے یہاں آسکتے ہیں۔ ابا نے پڑھنے کی اجازت بھی اتنی مشکل سے دی ہے۔ میں تو اپنے گھر کے دروازے پر بھی نہیں آسکتی۔ صرف ایک دوست ہے میری نورین۔ اس سے ملنے کی اجازت ہے۔

"کیوں کہ وہ پہلے میرے ہی محلے میں رہتی تھی۔ اب کچھ دور چلی گئی ہے اور اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ بس دو بہنیں ہیں۔ اسی لیے ابا اس کے گھر بھیج کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ میں عام طور پر اس کے پاس چلی جاتی ہوں۔ راتوں کو بھی رہ جاتی ہوں۔ ابا کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی بیٹی اس گھر میں بالکل سیف ہے۔"

جمیلہ ہنس پڑی تھی۔ بہت بے بسی کی ہنسی تھی اس کی۔

سہیل کو اس پر افسوس ہو رہا تھا۔ اسی شہر میں کتنی متضاد مزاج، کردار اور ماحول کی لڑکیاں تھیں۔

"تم نے مجھے جو فون کیا تھا۔ وہ کس کا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"میری اسی دوست کا۔ میں نے اسے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک ہی تو دوست ہے میری۔ میں اس سے کچھ نہیں چھپاتی۔ اسی سے اپنے دل کا حال کہہ کر صبر کر لیتی ہوں۔"

گفتگو کے دوران اس نے اپنا نقاب الٹ دیا تھا۔ پہلی بار اس کا خوبصورت چہرہ بھرپور انداز میں سہیل کے سامنے آیا تھا۔ بلا کی معصومیت۔ بلا کا بھول پن اور بلا کی محرومیاں اس کے چہرے پر نقش ہو کر رہ گئی تھیں۔

اس وقت سہیل نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنانے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ یہ اس قابل تھی۔ یہ اس کے مزاج کے عین مطابق تھی۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جمیلہ نے جانے کی اجازت چاہی۔ "اب میں چلوں گی..... میں سب کچھ بتا چکی ہوں کہ میرے گھر کے حالات کیسے ہیں۔"

"کیا میں اس بات کی امید رکھوں کہ تم دوبارہ ملو گی؟"

"کیوں نہیں؟" جمیلہ نے شرما کر گردن جھکالی۔

"اب تمہیں میری ایک اور بات ماننی ہوگی۔" سہیل نے کہا۔

"کون سی بات؟" جمیلہ چونک گئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ بہت عام سی بات ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں سے تمہارا ذکر کیا ہے۔ میری امی اور بہنیں تم سے ملنا چاہتی ہیں۔"

جمیلہ مسکرادی۔ "اگر میں نہ جانا چاہوں تو......"

"میں تمہیں ہتھکڑی ڈال کر لے جاؤں گا۔ یاد رکھو کہ میں ایک پولیس والا ہوں۔"

"اسی لیے اتنی آسانی سے قید بھی کر لیا ہے۔" جمیلہ نہ جانے کس طرح یہ بول گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے شرما کر اپنی گردن جھکالی تھی۔

یہ ایک خوب صورت زندگی کا آغاز تھا۔ دونوں کے لیے۔ جمیلہ کو زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کے جبر کی دنیا سے باہر نکل کر ایک نئی دنیا میں قدم رکھنے کا تجربہ ہو رہا تھا۔ وہ دنیا جس کے بارے میں اس کے کالج کی سہیلیاں بتایا کرتی تھیں۔ جو بہت سوفٹ، مہربان اور خوش گوار تھی۔ جس دنیا کو پالینے کے بعد اس کے پورے وجود میں سرشاری کی ایسی کیفیت شامل ہو گئی تھی جس کو وہ بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے اس راز میں اپنی دوست نورین کو شامل کر لیا تھا۔ محبت کی اتنی بڑی خبر وہ چھپا نہیں سکی تھی۔

نورین یہ سب سن کر حیرت زدہ رہ گئی تھی۔ "یار تجھ پر تو رشک آرہا ہے۔ پولیس کا اتنا بڑا آفیسر تجھ سے پیار کرنے لگا ہے۔ یہ تو کمال ہی ہو گیا۔"

"نورین، میں پہلے خوف زدہ سی تھی کہ کسی کا کیا بھروسا۔ لیکن اب اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ ایسا انسان ہے جس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے گھر والوں نے بھی مجھے پسند کر لیا ہے۔ اس کی بہنوں سے تو میری دوستی بھی ہو گئی ہے۔"

"خدا تجھے مبارک کرے۔ اب تم دیر نہیں لگانا۔ ورنہ ایسا موقع بار بار ہاتھ نہیں آتا۔"

"نورین، میں تجھے ایک بات بتاؤں۔ اب مجھے بار بار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خدا نے مجھے سہیل کی صورت میں بہت کچھ دے دیا ہے۔ بس اس کی سلامتی کی دعا کرتی رہو۔ وہ پولیس کا ایک بڑا آفیسر ہے۔ ہر وقت خطرناک قسم کے مجرموں سے واسطہ رہتا ہے۔ نہ جانے اس کے کتنے دشمن ہوں گے۔"

☆☆☆

اس کے ذہن پر ہر وقت ایک دھندی سی چھائی رہتی تھی۔

نہ جانے ایسا کیوں تھا۔ حالانکہ اس کا کام چل رہا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی اس کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار رہتے تھے۔ اور وہ ان سے کام بھی لیا کرتی تھی۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے ذہن میں یہ سارے منصوبے کس طرح آتے ہیں۔ کون اس کو راستہ بتاتا ہے۔ اس میں اتنی طاقت کہاں سے آتی ہے۔ اور وہ خود کون ہے۔ اس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ بجلی ہے۔ اب یہ بھی نہیں معلوم کہ نام کس نے رکھا تھا۔ کیا خود اسی نے اپنا نام بجلی رکھ لیا تھا یا کسی نے بتایا تھا۔

حالانکہ اس پر ہر وقت دھندسی چھائی رہتی لیکن جب وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کسی کارروائی کے لیے نکلتی تو اس کے سارے حواس بیدار ہو جاتے تھے۔ وہ انتہائی پھرتیلی، بے حس اور خطرناک ہو جاتی۔ نہ جانے کون تھا جس نے اسے یہ بتایا تھا کہ خود کو کبھی ظاہر نہ ہونے دے۔ ہر وقت نقاب میں رہے اور کسی کو بھی اپنا پتا نہ دے۔

لیکن اس کا پتا تھا کیا، یہ تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ اس کے سامنے تو دور تک پھیلی ہوئی ایک رہ گزر تھی جس پر گہری دھند تھی۔ اور وہ اسی رہ گزر پر چلی جا رہی تھی۔ نہ جانے کہاں، اس کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ اسے کہاں جانا ہے اور کیوں جانا ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ جب اپنے ساتھیوں کے سامنے کوئی پلاننگ رکھ رہی ہوتی تو اچانک دھند کی ایک گہری چادر اس کے ذہن پر چھانے لگتی تھی۔

اس چادر میں سے ہلکی ہلکی سی چنگاریاں دکھائی دیتیں جیسے دھند چھٹنے والی ہو۔ لیکن یہ کیفیت ذرا سی دیر کی ہوتی۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے ساتھیوں کے درمیان ہوتی۔ اور کوئی پلاننگ اس کے سامنے ہوتی۔

آج ان لوگوں کو ایک بڑی پارٹی پر ہاتھ ڈالنا تھا۔

ان دونوں میں سے ایک نے اطلاع دی تھی کہ ایک بروکر بینک سے کافی بڑی رقم نکلوا کر اس راستے سے گزرنے والا ہے۔ جس راستے پر وہ اکثر گھات لگائے بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو ایک بار پھر وہی ہدایات دیں .... جو ہمیشہ دیا کرتی تھی۔ ”دیکھو، کسی کا جانی نقصان نہ ہو۔ کھلونا پستول اسی لیے دیا گیا ہے کہ اوروں کو خوف زدہ کر سکو۔ تیسری بات یہ ہے کہ کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ ہو۔

ایک بار ایک بہت ہی نازک سچویشن ہو گئی تھی۔

ایک گاڑی والے نے اچانک اپنا پستول نکال لیا تھا۔ بجلی اس وقت کچھ فاصلے پر کھڑی ہو کر اس آپریشن کی نگرانی کر رہی تھی۔ اس وقت اس کی پھرتی اور دلیری کام آئی تھی۔ وہ اس وقت بجلی ہی بن کر گاڑی والے سے اس کا پستول اچک کر لے گئی تھی۔

اس کے بعد ان لوگوں نے اس گاڑی والے کو کنگال کر دیا تھا۔ اس کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ سارا ہنر اس کے پاس کہاں سے آ گیا۔ وہ جب بھی سوچنے لگتی، ایک دھندسی اس کے ذہن پر منڈلانے لگتی تھی۔

بروکر کو اس وقت گھیر لیا گیا جب وہ اپنی گاڑی ایک ذیلی راستے سے شاہراہ فیصل کی طرف موڑ رہا تھا۔

واردات کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ نمبر دو گاڑی کے سلو ہوتے ہی اچانک پستول نکال کر سامنے آ جاتا۔ گاڑی کو سلو اس لیے کرنا پڑتا تھا کہ جس جگہ وہ کھڑے ہوتے تھے، اس جگہ اسپیڈ بریکر ضرور ہوتا تھا۔ اس کے بعد بجلی ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو جاتی اور نمبر تین چوکس ہو کر گاڑی سے دو چار قدم پیچھے ہو جاتا۔ اس کے بعد نمبر ایک گاڑی سے لوٹا ہوا مال لے کر ایک شاپر میں ڈالتا جاتا۔ اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ ذرا سی دیر کی کارروائی ہوتی اور وہ مختلف راستوں کی طرف فرار ہو جاتے۔

شاپرز بجلی کے حوالے کر دیے جاتے تھے جو ایک پارک میں ان کے انتظار میں بیٹھی ہوتی۔ جب یہ پہنچتے تو سارا سامان وہ ان تینوں میں تقسیم کر دیتی۔

لیکن وہ دن ان کے لیے مناسب نہیں تھا۔ بروکر نے گاڑی بھی روک لی تھی۔ سارا کام پلاننگ کے تحت ہو رہا تھا کہ اچانک کچھ پولیس والے ان پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی قیادت سہیل کر رہا تھا۔ انہیں ہاتھ پاؤں چلانے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔

سہیل نے سب سے پہلے بجلی کو گرفت میں لیا تھا۔ اس موقع پر اس نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی لیکن سہیل کی گرفت ایسی تھی کہ وہ پھنس کر رہ گئی تھی۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ جس لڑکی نے مہینوں سے پولیس کے محکمے کو پاگل بنا کر رکھ دیا تھا، آخر کار وہ گرفت میں آ ہی گئی تھی۔ ”صاحب جی، ذرا اس کا نقاب ہٹا کر تو دیکھیں کون ہے؟“ ایک انسپکٹر نے کہا۔

”نہیں یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ سہیل نے کہا۔ ”کم از کم یہاں نہیں۔“

سب کو گاڑیوں میں بٹھا دیا گیا۔ اس بروکر کو جانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ اس کو ایک اسکیم کے تحت

پلانٹ کیا گیا تھا۔ وہ سہیل ہی کی حکمتِ عملی تھی جو کام آ گئی تھی۔

بجلی کے ساتھیوں کو موبائل میں بیٹھایا گیا تھا۔ جبکہ اس لڑکی کو خود سہیل نے اپنی گاڑی میں بٹھالیا تھا۔

بجلی بالکل خاموش تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔

''خاموش کیوں ہو؟'' سہیل نے پوچھا۔ ''چلو اپنا نام بتاؤ۔ بجلی تو تمہارا نام نہیں ہوسکتا۔ اپنا اصل نام بتاؤ۔''

وہ خاموش رہی۔ سہیل نے ایک دو اور باتیں کیں لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' سہیل ہنس کر بولا۔ ''اب تم سے تھانے چل کر ہی بات ہوگی۔''

اس کے کمرے سے باہر پریس والے بھی بیٹھے تھے۔ یہ خبر پھیل چکی تھی کہ کئی مہینوں سے پولیس کو چکما دینے والی بجلی گرفتار ہو چکی ہے۔ وہ سب بریکنگ نیوز کی تلاش میں آئے تھے۔ اس لڑکی کو سہیل کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔

''دیکھیں، اس وقت میں آپ لوگوں کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکوں گا کہ ہم نے اس لڑکی اور اس کے گروہ کو پکڑ لیا ہے۔ اب مزید باتیں تفتیش کے بعد پتا چلیں گی۔ اس کے بعد میڈیا کو سب کچھ بتا دیا جائے گا۔''

''ہم نے تو سنا ہے کہ وہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

سہیل کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ اس سوال کا مفہوم کیا ہے۔ کیا آپ لوگوں کو یہ خدشہ ہے کہ اس کی جوانی اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر قانون اس کے ساتھ رعایت کر دے گا یا میں اس کو جانے کی اجازت دے دوں گا؟''

سہیل اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ لڑکی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ سہیل اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ''محترمہ، یہ نقاب تو ہٹاؤ۔''

لڑکی خاموش رہی۔ سہیل نے ایک جھٹکے سے اس کا نقاب ایک طرف کر دیا۔ اور خود اس طرح پیچھے ہٹ گیا جیسے سانپ نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ لڑکی جمیلہ تھی۔ اس کی محبوبہ جس کو وہ اپنا بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ جو اس کے دل اور دماغ کے قریب تھی۔ جو اس کی زندگی بن گئی تھی۔ جس کی پاکیزگی کی وہ قسمیں کھا سکتا تھا۔ وہ بجلی وہی اس کی جمیلہ تھی۔

وہ دہشت زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جمیلہ نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔

''جمیلہ کیا ہے یہ سب'' اس نے پوچھا۔ ''تم اور ایک کرمنل۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایک ایسی لڑکی ہو جو پولیس کو مطلوب ہوگی۔ تمہارا کیا کیریکٹر تھا اور کیسی ہو تم؟''

''کیا بتاؤں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''میں جمیلہ نہیں ہوں۔''

''بکواس کرتی ہو۔'' وہ دہاڑا۔ ''کیا میں اندھا ہوں؟ کیا تمہیں پہچان نہیں سکتا؟ بتاؤ۔ کب سے یہ کام کر رہی ہو اور کیوں؟''

''میں نے کہا نا کہ میں جمیلہ نہیں ہوں اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میں کب سے یہ کام کر رہی ہوں۔ اور تم لوگ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو؟''

سہیل گڑبڑا کر رہ گیا۔ اس کے لہجے میں اتنا اعتماد تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ وہ جمیلہ نہیں تھی۔ سہیل کو اتنا تو اندازہ تھا کہ سچ اور جھوٹ کی پہچان کر سکتا ہے تو پھر یہ کون تھی۔ بالکل جمیلہ کی طرح۔ کوئی فرق نہیں تھا۔ وہی آنکھیں۔ وہی لہجہ وہی چہرہ وہی آواز۔ وہی سب کچھ۔ ایسا کیسے ممکن تھا۔ کیا شکلیں اس حد تک بھی مل سکتی ہیں۔

''میں ابھی تمہارے گھر والوں کو بلاتا ہوں۔'' وہ غرایا۔ ''ابھی پتا چل جائے گا کہ تم کون ہو؟''

''گھر والے؟'' اس کے لہجے میں عجب بے چارگی تھی۔ ''میرا تو کوئی گھر والا نہیں ہے۔ کوئی گھر نہیں ہے میرا۔''

''ابھی پتا چل جائے گا۔''

کئی ملاقاتوں کے بعد جمیلہ نے اُسے اپنا ایڈریس بتا دیا تھا۔ اپنے بارے میں، اپنی ماں کے بارے میں، اپنے گھر کے حالات سب کچھ بتا چکی تھی۔

سہیل نے ایک پولیس والے کو اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ وہ آ کر اٹینشن ہو گیا۔ ''یس سر۔''

''میں تمہیں ایک ایڈریس دے رہا ہوں۔ تم اس پر جا کر اس لڑکی کے والدین کو لے آؤ'' اس نے کہا۔ ''اور اس کے لیے کچھ کھانے کو بھیج دو۔''

جمیلہ بالکل خاموش تھی۔ جیسے اپنے اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو۔ یہاں جو کچھ بھی ہو رہا ہو، وہ کسی اور کے لیے ہو رہا ہو۔ اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس کی آنکھوں کی لاتعلقی دیکھ کر سہیل کو حیرت ہو رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ جمیلہ ایسی ہوگی۔۔۔۔ وہ ایک مجرمہ ہوگی اور وہ بھی اتنی خطرناک

اور شاطر کہ جس کی پلاننگ ہی اتنی کامیاب ہوتی تھی کہ اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے زندگی میں ایک ہی محبت کی تھی۔ اور اس محبت کا کیسا چہرہ اس کے سامنے آیا تھا؟

جمیلہ کے لیے چائے اور بسکٹ آگئے تھے۔ اس نے صرف چائے لی تھی۔

''جمیلہ خدا کے لیے بتا دو۔ کیا ہے یہ سب؟'' اس نے پھر پوچھا۔ ''یہ تمہارا کون سا روپ سامنے آیا ہے؟ ایسی مجرمانہ ذہنیت تم میں کہاں سے آگئی۔ تم نے مجرم بننے کی ٹریننگ کہاں سے لی۔ کون لوگ ہیں، تم جن کے اشاروں پر کام کر رہی ہو۔ میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔ بتاؤ مجھے۔ خدا کے لیے بتا دو۔ ورنہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

''میں کیسے یقین دلاؤں کہ میں جمیلہ نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں بجلی ہوں۔''

''اچھا چلو۔ بجلی سہی۔ اب یہ بتا دو کہ تمہارے گروپ میں کتنے آدمی ہوتے ہیں؟''

''صرف تین۔'' اس نے جواب دیا۔

اس کا یہ جواب صحیح تھا۔ پکڑے جانے والے نے بھی یہی بتایا تھا۔

''اب یہ بتاؤ کہ ایک طرف تو تم جمیلہ ہو۔ دوسری طرف بجلی ہو۔ پھر دونوں کو سنبھالتی کیسے ہو؟''

''میں نہیں جانتی کہ آپ بار بار مجھے جمیلہ کیوں کہے جا رہے ہیں۔ میں جمیلہ نہیں ہوں۔ بجلی ہوں۔''

سہیل خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

انٹرکام پر اطلاع دی گئی کہ جمیلہ کے ماں اور باپ آچکے ہیں۔ ''انہیں اندر بھیج دو'' اس نے کہا۔

دونوں اندر داخل ہوئے۔ جمیلہ کا باپ شور کرتا ہوا اندر آیا تھا۔ ''کیا مذاق ہے۔ کیا ہم مجرم ہیں؟''

''کیا آپ اس لڑکی کو پہچانتے ہیں؟''

ان دونوں کی نگاہ اب جمیلہ پر تھی... جو ایک دیوار کی طرف چہرہ کیے کھڑی تھی۔ ''ہائے! میری جمیلہ۔'' اس کی ماں نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ ''کیا ہو گیا ہے تجھے۔ تو یہاں کیوں آگئی ہے۔ کیا جرم کیا ہے تو نے؟''

''آپ بتائیں کون ہے یہ؟'' سہیل نے اس کے باپ سے پوچھا۔

''یہ بدبخت میری بیٹی ہے۔'' اس کے باپ نے کہا۔

''کیا اس کو پہچاننے میں غلطی تو نہیں کر رہے؟''

قانون مکڑی کا وہ جالا ہے جس میں چھوٹے حشرات ہی پھنستے ہیں۔ بڑے جانور اس کو پھاڑ کر نکل جاتے ہیں۔

☆☆☆

کسی دانا کا قول ہے کہ ہر روز اپنے ضمیر میں جھانک کر اپنی خطاؤں کو درست کر لیا کرو...... اگر تم اپنے اس فرض میں ناکام رہے تو اپنی عقل اور علم کے ساتھ دغا کرو گے۔

☆☆☆

وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں کیونکہ اکثر وقت پر سمجھ نہیں ہوتی اور سمجھ آنے تک وقت نہیں رہتا۔

سجاد علی شگری کا تعاون، گلگت بلتستان سے

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' اس نے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی شکل کی کوئی اور ہو؟'' سہیل نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس کی ماں نے کہا۔ ''بچپن میں ایک بار یہ گر گئی تھی۔ دیکھیں اس کے دائیں کان کے پاس ایک نشان ہے۔ وہ اسی چوٹ کا نشان ہے لیکن معاملہ کیا ہے۔ کیا کیا ہے اس نے؟''

''بہت ہی عجیب معاملہ ہے۔'' سہیل نے ایک گہری سانس لی۔ آپ دونوں بیٹھ جائیں۔ میں بتاتا ہوں کہ اس کو یہاں کیوں لایا گیا ہے۔''

دونوں بیٹھ گئے۔ جمیلہ ابھی تک ان دونوں سے لاتعلق دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے انہیں پہچانتی ہی نہ ہو۔

''یہ لڑکی ایک بہت بڑی مجرمہ ہے۔ آپ لوگوں نے بجلی گروپ کے بارے میں تو سنا ہی ہوگا۔''

''ہاں، ہاں سنا ہے۔'' جمیلہ کے باپ نے کہا۔

''تو بجلی یہی لڑکی ہے۔'' سہیل نے بتایا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میری بچی تو اپنے گھر سے بھی نہیں نکلتی۔ اس کی تو کوئی دوست بھی نہیں ہے۔''

''آپ ذرا اس سے معلوم تو کریں۔ یہ آپ لوگوں کو جانتی بھی ہے یا نہیں؟''

''ارے کیسے نہیں جانے گی؟'' جمیلہ کا باپ دہاڑ اٹھا۔ ''ہم ماں باپ ہیں اس کے۔''

''آپ ایسا کریں۔ یہ اپنی جس سہیلی کے پاس جاتی

ہے۔ اس کو بلالیں۔'' سہیل نے کہا۔ ''دیکھیں اصل بات یہ ہے کہ میں کسی وجہ سے اس کیس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ ورنہ ایک مجرمہ گرفت میں آئی ہے۔ اس کو اٹھا کر عدالت میں پیش کر دینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میرا فرض بھی یہی ہے۔ لیکن خود مجھے اس معاملے میں کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ اسی لیے میں معاملے کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس کی سہیلی کو بلائیں۔ بہت کچھ جو والدین کو معلوم نہیں ہو پاتا، وہ دوستوں کو معلوم ہوتا ہے۔''

''لعنت ہو اس لڑکی پر۔'' جمیلہ کا باپ غصے سے بول رہا تھا۔ ''اسی لیے میں اس کو تعلیم دلانے کے خلاف تھا۔''

''محترم، آپ یہ بتائیں، آپ کے خاندان میں یا دوستوں میں سے کسی کی لڑکی کالج تو جاتی ہو گی؟'' سہیل نے پوچھا۔

''کیوں نہیں، بہت سی ہیں۔''

''تو اُن کے بارے میں آپ نے زیادہ سے زیادہ یہ سنا ہوگا کہ کسی لڑکے سے چکر چل رہا ہے یا ہوٹنگ کر رہی ہیں لیکن ایسا شاید نہیں سنا ہو کہ کوئی باقاعدہ گروپ بنا کر وارداتیں کر رہی ہو۔''

''نہیں، میں نے یہ نہیں سنا۔''

''اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ کوئی عام کیس نہیں ہے۔ اس کی جڑیں کہیں اور ہیں۔ مجھے اس تک پہنچنا ہے۔ ورنہ میرا کیا ہے۔ میں ابھی اس کے خلاف چالان بنا کر پیش کر دوں گا۔''

جمیلہ کی ماں نے نورین کا پتا دے دیا تھا۔ سہیل نے سادہ لباس میں لیڈی کانسٹبل بھیج دی تھی۔ اب ان لوگوں کو اس کے آنے کا انتظار تھا۔

اس دوران میں جمیلہ کی ماں نے جمیلہ کو کریدنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن جمیلہ نے چپ سادھ رکھی تھی۔ وہ کبھی کبھی ماں کی طرف اس طرح دیکھ لیتی جیسے وہ اس کے لیے اجنبی ہو۔ جبکہ اس کا باپ اس کو مسلسل برا بھلا کہے جا رہا تھا۔

جمیلہ کی سہیلی نورین آ گئی تھی۔

اس کے ساتھ اس کا باپ بھی آیا تھا۔ وہ بھی جمیلہ کو دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

جمیلہ ایک بار اس کو دیکھ کر چونکی تھی۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات منجمد سے ہو گئے تھے۔

''کیا تم اس لڑکی کو جانتی ہو؟'' سہیل نے جمیلہ کی طرف اشارہ کیا۔

''جی ہاں، یہ جمیلہ ہے۔'' نورین نے بتایا۔

''لیکن ہم نے تو اس کو بجلی کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے۔'' سہیل نے بتایا۔

''جی ہاں۔ یہ بجلی بھی ہے۔'' اس نے بتایا۔

سب کے سب چونک پڑے تھے۔ ''کیا کہہ رہی ہو تم۔ ایک بیان دو۔'' سہیل نے کہا۔

نورین نے سب کی طرف دیکھ کر سہیل کو اشارہ کیا کہ وہ اس سے الگ میں کچھ کہنا چاہتی ہے۔ سہیل اسے لے کر ایک طرف آ گیا تھا۔ ''ہاں اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے۔''

''پہلے یہ بتائیں۔ آپ وہی سہیل ہیں نا جس کی جمیلہ سے دوستی ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ میں وہی ہوں لیکن تمہاری سہیلی کیا کرتی پھر رہی ہے۔''

''اب میں جو کچھ بتاؤں گی، وہ شاید آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔'' اس نے کہا۔

☆☆☆

نورین نے ایک تفصیلی بیان ریکارڈ کروایا تھا۔

''میں اور جمیلہ ایک دوسرے کے گہرے دوست ہیں۔ جمیلہ ایک انتہائی معصوم اور بھولی بھالی لڑکی ہے۔ شاید میں ہی اس کی ایک ایسی دوست ہوں جس کے یہاں اس کا آنا جانا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ میرے یہاں رک بھی جاتی ہے۔ اس کے سخت مزاج باپ نے اس کو اجازت دے رکھی ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میں ایک انڈین فلم دیکھ رہی تھی۔ جمیلہ کے گھر میں فلم وغیرہ کا تو کوئی تصور نہیں ہے۔ جمیلہ بھی میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کی ہیروئین کا نام بجلی ہے۔ وہ ایک مجرمہ ہے۔ ڈاکے ڈالتی ہے۔ پولیس والوں کو چکمے دیا کرتی ہے اور بہت کچھ کرتی ہے۔ اس کے بعد ہوا یہ کہ جمیلہ جب بھی میرے پاس آتی، وہ اسی فلم کی فرمائش کرتی۔ اس کا رویہ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا کرتا۔ وہ مجھ سے اسی بجلی کی باتیں کیا کرتی۔ پھر یہ ہوا کہ اس نے مارشل آرٹس کی ٹریننگ لینی شروع کر دی۔ اس کا انکشاف بھی مجھے اچانک ہوا تھا۔

''میں نے جب وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ کالج سے گھر اکیلی آیا کرتی ہے۔ اسی لیے اپنے تحفظ کے لیے اس نے مارشل آرٹس سیکھنا شروع کیا ہے۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ یہ بات میں اس کے گھر والوں کو نہ بتاؤں۔ ایک رات اس نے ایک عجیب بات کی۔ جب وہ میرے پاس آتی تو ہم ایک ہی کمرے میں سویا کرتے

تھے۔ ایک رات وہ شاید پانی پینے اٹھی تھی کہ میں نے اسے آواز دی۔ ''جمیلہ، کہاں جا رہی ہو؟''

وہ لپک کر میرے پاس آگئی۔ ''اوہ خدا۔ میں بھول نہیں سکتی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدلے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ جمیلہ نہیں ہے۔ بجلی ہے۔ بہ ظاہر وہ بالکل نارمل تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس بہت پیسے آنے والے ہیں۔ بس وہ موقع کے انتظار میں ہے۔ اس نے اپنا ایک گروپ بنا لیا ہے۔ وہ مجھے نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ بتاتی رہی کہ اس نے اپنے گروپ کے ساتھ مل کر کیا کیا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھی۔ کیوں کہ وہ جب بھی کسی واردات کے بارے میں بتاتی۔ دوسرے دن کے اخبارات میں اس کی تفصیل آجاتی تھی۔''

''تم عجیب بات بتا رہی ہو۔''

''جی سہیل صاحب۔ میں نہیں جانتی کہ یہ سب کیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے۔'' نورین نے کہا۔ ''اس کی شخصیت کے دو روپ ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہی سیدھی سادھی، بھولی بھالی معصوم جمیلہ کا ہے۔ جو اصل میں وہ ہے۔ اور دوسرا روپ ایک چالاک مجرمہ کا ہے۔ جس کو آپ پکڑ کے لے آئے ہیں۔ میں نے اسی لیے کہا ہے یہ جمیلہ بھی ہے اور بجلی بھی ہے۔ خدا کے لیے اس کو بچانے کی کوشش کریں۔ میری سہیلی ایک معصوم لڑکی ہے اور وہ بجلی کیوں ہو گئی ہے۔ یہ میں نہیں جانتی۔''

''خدایا یہ تو بہت عجیب کہانی ہے۔ ایک بار مجھے وہ فلم دیکھنی ہوگی۔ اس سے بہت کچھ پتا چل جائے گا۔ لیکن تم بے فکر رہو۔ میں نے جمیلہ سے محبت کی ہے۔ میں اس کے بھید تک پہنچ کر رہوں گا۔''

''تو کیا آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے؟'' نورین نے پوچھا۔

''نہیں نورین۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔'' سہیل نے بتایا ''میں کسی ماہرِ نفسیات کی خدمات حاصل کروں گا۔ جو عدالت میں اس مرض کے بارے میں بتائے گا۔ پھر جو عدالت کی مرضی ہو۔ ویسے یہ اپنی نوعیت کا منفرد کیس ہے۔''

☆☆☆

اس کیس نے پریس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی۔

یہ ایک پیچیدہ کیس تھا۔ جمیلہ اب بجلی نہیں تھی۔ اسے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ پولیس کی تحویل میں کیوں ہے۔ سہیل اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔ اس کے ماں اور باپ پولیس اسٹیشن میں کیوں آتے ہیں۔ اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے تو اسے یاد کیوں نہیں آتا۔ کیا کیا ہے اس نے۔ اس کے گھر والے اتنے پریشان کیوں ہیں۔ بے شمار سوالات تھے جن کا کوئی جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

ایک بار اس کی دوست نورین بھی اس سے ملنے آئی تھی۔

وہ نورین کے گلے لگ کر دیر تک روتی رہی تھی۔

''خدا کے لیے نورین تم ہی بتاؤ۔ کیا ہو رہا ہے یہ سب۔ کیا میں پاگل ہو گئی ہوں۔ یا یہ سب پاگل ہیں۔ یہ اخبار والے کیا معلوم کرنے میرے پاس آتے ہیں؟''

''گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نورین اسے تسلی دے رہی تھی۔

''آخر کیا ٹھیک ہو جائے گا؟ کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ اگر کیا ہے تو مجھے یاد کیوں نہیں آتا؟ اور یہ سہیل کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے تو اس سے محبت کی تھی۔ اس نے مجھے گرفتار کیوں کر رکھا ہے؟''

''میری جان۔ سہیل نے تم کو نہیں بجلی کو پکڑا ہے۔''

''کون ہے یہ بجلی؟''

''تم اپنے ذہن کو مت تھکاؤ۔ کل عدالت میں تمہارا کیس پیش ہونے جا رہا ہے۔ وکیل اور ماہرِ نفسیات مل کر تمہیں بری کروا دیں گے۔''

''خدایا۔'' جمیلہ نے اپنا سر تھام لیا۔ ''میں تو بالکل بے گناہ ہوں۔''

''ہاں تم بے گناہ ہو لیکن معاملہ ایسا ہے کہ بے چارہ سہیل بھی فی الحال کچھ نہیں کر سکتا۔''

عدالت میں اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی کیس تھا۔ مخالف وکیل نے جمیلہ کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ اس کے دلائل بہت مضبوط تھے۔ اس شخص نے بھی جمیلہ کو پہچان لیا تھا جو اس کے گروپ میں شامل تھا۔ وہ ایک بار جمیلہ کو بغیر نقاب کے دیکھ چکا تھا۔

عدالت میں ان تمام لوگوں کی فہرست پیش کر دی گئی جو بجلی گروپ سے نقصان اٹھا چکے تھے۔ انہوں نے جمیلہ کو دیکھا تو نہیں تھا لیکن اس کی قامت اور اس کی آواز سے شناخت کر سکتے تھے۔ سارے ثبوت جمیلہ کے خلاف جا رہے تھے۔

عدالت نے سوال کیا "کیا مجرمہ کے حق میں کوئی گواہی ہے؟"

"جی ہاں جناب والا" وکیل نے کہا۔ "پروفیسر شیرازی۔ ماہرِ نفسیات ہیں جو بتائیں گے کہ میری موکلہ بے گناہ ہے۔"

عدالت کے حکم سے پروفیسر شیرازی کو پیش کیا گیا۔ وہ ایک مستند عالم تھا۔ اس نے بتایا۔ "جناب! جمیلہ کا میں سائیکو انالیسز کر چکا ہوں۔ یہ کوئی مجرمہ نہیں ہے بلکہ مریضہ ہے۔ بیمار ہے۔"

"پروفیسر صاحب، یہ ایک حیرت انگیز بات ہے۔ کیا اس کے بارے میں تفصیل سے بتائیں گے؟"

"جی جناب عالی، میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ اس لڑکی کے ساتھ ساتھ اس مرض سے واقفیت نہ رکھنے والے وہ لوگ بھی بے گناہ ثابت ہو سکیں جن کو نہ جانے کیا سمجھ لیا جاتا ہے۔

"اس کو تفارقی شناختی اضطراب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ایک شخص ایک سے زیادہ چہرے رکھتا ہے۔ یورپ میں تو ایک ایک شخص کے چار چار چہرے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک میں اس کی شخصیت ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ اس کا رویہ الگ ہوتا ہے۔ پسند ناپسند الگ ہوتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ آواز تک بدل جاتی ہے۔ ہمارے یہاں عام طور پر لڑکیوں میں اس قسم کے کیسز کو ہسٹریا کا نام دے دیا جاتا ہے۔

"جعلی پیروں اور فقیروں کی مدد لی جاتی ہے۔ کسی سائیکاٹرسٹ سے رجوع نہیں کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور خودکشی تک کی نوبت آجاتی ہے۔ اس ملک میں اس قسم کے مریضوں پر کام کرنے کی بہت ضرورت ہے۔"

"اور پروفیسر صاحب، اس کی وجوہات کیا ہوتی ہیں؟"

"کسی بھی شخصیت سے اس طرح متاثر ہو جانا کہ ہر وقت اسی کو اپنے ذہن میں رکھنا۔ اسی کے نقشِ قدم پر چلنا۔ وہی رویہ اپنانا جو اس شخصیت کا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے اس لڑکی نے انڈیا کی ایک فلم بہت بار دیکھی ہے۔ اس فلم کی ہیروئن بالکل ویسی ہے جس کو اس لڑکی نے لاشعوری طور پر کاپی کیا ہے یا کرتی رہی ہے۔ اور پھر یہ اسی کے روپ میں ڈھل گئی۔"

"اور اس کا علاج کیا ہے؟"

"جناب عالی! ہمارا ٹریٹمنٹ یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک ایک کر کے چھلکے اتارتے رہتے ہیں۔ اس کو اس طرح سمجھ لیں کہ ایک شخص نے ایک سے زیادہ لباس پہن رکھے ہیں۔ ماہرِ نفسیات اس لباس کو اتارتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس کی اصل شخصیت سامنے آجاتی ہے۔ اس کے لیے ہپناسز کا پروسس ہوتا ہے۔ سائیکو تھراپی ہوتی ہے۔ اب یہ آپ پر ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ کس کو سزا دیتے ہیں۔ جمیلہ کو یا بجلی کو۔ کیوں کہ اس وقت یہ لڑکی بجلی نہیں، جمیلہ ہے۔"

"آپ یہ بتائیں کیا ایک سیدھے سادھے گھرانے کی لڑکی اس قسم کے شاطرانہ منصوبے بنا سکتی ہے؟"

جی ہاں۔ کیوں کہ اس وقت وہ لڑکی سیدھے سادھے گھرانے والی لڑکی نہیں ہوتی۔ وہ کچھ اور ہو جاتی ہے۔ وہ اسی کو کاپی کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسے اس فلم میں ہیروئن نے مارشل آرٹس کی ٹریننگ لی تھی۔ اس نے بھی جا کر لی۔ کیوں کہ یہ جمیلہ نہیں تھی، بجلی تھی۔ اس نے فلم میں اپنا ایک گروپ بنایا تھا۔ اس نے بھی بنا لیا۔ یعنی سب کچھ وہی کرتی رہی جو اس نے کیا تھا۔ اس مرض میں مبتلا لوگ دوسروں کی شخصیت اوڑھ کر بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ نفسیات کی تاریخ میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔"

"پروفیسر صاحب، اب یہ بھی بتا دیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

"اس کی بے شمار وجوہات ہیں جناب والا۔ اور سب سے بڑی وجہ گھر کا ماحول ہے۔ بے جا سختیاں اور پابندیاں کبھی کبھی ایسا گل کھلا دیتی ہیں۔ میں تو یہ کہوں گا کہ اس میں دخل گھر کی سختیوں کا ہے۔"

عدالت نے اپنا فیصلہ ایک دن کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔

دوسرے دن عدالت لگی تو عدالت کے کمرے میں بہت بھیڑ تھی۔

عدالت نے جمیلہ کو بری کر دیا تھا لیکن اس تاکید کے ساتھ کہ اسے اس وقت تک زیرِ علاج رکھا جائے گا۔ جب تک کہ وہ مکمل صحت مند نہیں ہو جاتی۔ اس کے علاوہ عدالت نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس لڑکی کی وجہ سے کسی کو جانی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ اور نہ ہی کوئی زخمی ہوا ہے اسی لیے یہ رعایت دی جاتی ہے۔

جمیلہ بری ہو گئی۔ لیکن بری کہاں ہوئی۔ اسے سہیل نے گرفتار کر کے اپنے گھر پہنچا دیا تھا۔ جہاں سے انہیں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا۔'' سراغ رساں سینڈی کونرز نے کہا۔ ''مکان میں ڈاکا پڑا ہے اور تمہارے پاس اس واردات کا ایک عینی گواہ بھی موجود ہے پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''میں اس کی وضاحت عینی گواہ کی زبان سے کروانا چاہتا ہوں۔'' سارجنٹ جوزف ولبائی نے جواب دیا۔ ''تم خود دیکھ لوگی یہ اتنا آسان معاملہ نہیں ہے۔''

سارجنٹ جوزف سراغ رساں سینڈی کو اپنے ہمراہ

ہم شکل

جمال دستی

کچھ لوگ فکری جولانیوں اور تخلیقی ذہانت سے مالا مال ہوتے ہیں... غیر معمولی صلاحیت کے مالک دور ہی سے اپنی پہچان کرا دیتے ہیں... فن کوئی بھی... مسلسل محنت... باریک بینی... اور مشاہداتی عادت اسے ماہرِ فن بنا دیتی ہے... ایک ماہر سراغ رساں کا بروقت... برمحل اور درست تجزیہ...

چوری کی واردات اور چور کی مختصر پرواز کا دورانیہ

ایک شخص کے پاس لے گیا جس نے ایک گندی سی جینز اور فلالین کی چیک دار قمیص پہنی ہوئی تھی۔

''یہ سام ہاکنز ہے۔'' سارجنٹ نے اس شخص کا تعارف کراتے ہوئے کہا پھر سام سے مخاطب ہوا۔ ''سراغ رساں سینڈی کونرز کو وہ سب کچھ بتا دو جو تم نے مجھے بتایا ہے۔''

سام ہاکنز اپنے خاکستری بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''جی... ہم جہاں موجود ہیں یہ ایڈنا لوگن کا مکان ہے۔ وہ اپنے مکان کے باغیچے کے کاموں کے لیے میری خدمات مستعار لیتی ہے۔ ہر ہفتے منگل کے دن میں اس کے لان کی گھاس تراشنے اور پھولوں کی کیاریوں کی دیکھ بھال کے لیے یہاں آتا ہوں۔ مسز لوگن ہر منگل کو برج کھیلنے جاتی ہے۔ وہ اپنے مکان کا عقبی دروازہ میرے لیے کھلا چھوڑ جاتی ہے اور میرے معاوضے کی رقم کچن کی میز پر رکھ جاتی ہے۔

''آج یہاں پہنچنے کے بعد میں نے معمول کے مطابق عقبی لان کی گھاس تراشنا شروع کر دی۔ پھر میں داخلی لان میں آ گیا۔ میں نے گھاس تراشنے کا کام نمٹاتے ہی اپنی گھاس کاٹنے والی مشین اپنے ٹرک میں رکھ دی اور اپنا بیلچہ تھما کھرپا لے کر پھولوں کی کیاریاں ٹھیک کرنے کے ارادے سے واپس مکان کے عقبی لان کی جانب چل دیا۔ تب میں نے ایک شخص کو مکان کے عقبی دروازے سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ عقبی صحن کو عبور کر رہا تھا اور اس کی مٹھی میں ڈھیر سارے نوٹ دبے ہوئے تھے۔

''میں سیدھا کچن میں چلا گیا تو دیکھا کہ میرے معاوضے کی رقم جو مسز لوگن کچن کی میز پر رکھ جاتی تھی، وہ غائب تھی اور مسز لوگن کا بسکٹوں کا مرتبان بھی نیچے گرا پڑا تھا اور اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔''

''اب مجھے یہ مت بتانا کہ مسز لوگن اپنی تمام جمع پونجی اسی مرتبان میں چھپا کر رکھتی تھی۔'' سینڈی کونرز نے کہا۔

سام ہاکنز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''وہ اپنی سوشل سیکیورٹی کی تمام رقم اسی مرتبان میں رکھتی تھی۔ وہ بینکوں پر اعتبار نہیں کرتی ہے۔ پڑوس کے تمام لوگوں کو اس بارے میں علم ہے۔''

سراغ رساں سینڈی کونرز نے یہ سن کر ایک گہرا سانس لیا۔ ''مجھے اس شخص کے بارے میں بتاؤ جسے تم نے گھر سے نکل کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''وہ نوجوان دراز قامت اور ایتھلیٹ جسم کا مالک تھا اور مکمل سفید پوش تھا۔ اس نے سفید رنگ کی نیکر، سفید قمیص اور نرم تلے کے سفید کرمچ کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔'' سام ہاکنز نے بتایا۔

''وہ بھاگتا ہوا کس طرف گیا تھا؟''

''وہاں اس مکان میں۔'' سام ہاکنز نے اشارے سے بتاتے ہوئے کہا۔

سراغ رساں سینڈی نے اپنے ساتھی سارجنٹ جوزف کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''میں پھر دہرا رہی ہوں: اب مسئلہ کیا ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ، میں دکھاتا ہوں۔''

سارجنٹ جوزف، سراغ رساں سینڈی کو اس مکان کے دروازے تک لے گیا جس کی جانب ہاکنز نے اشارہ کیا تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ ایک نوجوان نے کھولا جس کا حلیہ اور لباس من و عن ویسا ہی تھا جیسا کہ سام نے بیان کیا تھا۔

''میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟'' اس نوجوان نے کہا پھر سارجنٹ پر نگاہ پڑتے ہی بولا۔ ''اوہ، تم تو پہلے بھی یہاں آ چکے ہو۔''

''ہاں۔'' سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں ایک مرتبہ پھر تم سے اور تمہارے بھائیوں سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں، پلیز۔''

''بھائیوں سے؟'' سراغ رساں سینڈی نے قدرے چونکتے ہوئے کہا۔

سارجنٹ جوزف نے گردن ہلا دی۔ ''ہاں، یہ تین بھائی ہیں اور تینوں جڑواں اور ہمشکل ہیں اور ان کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ یہ تینوں ہر روز بالکل ایک جیسا لباس پہنتے ہیں۔''

اس نوجوان نے سراغ رساں اور سارجنٹ کو اندر کمرے میں بلا لیا۔ اتنے میں دو دراز قامت نوجوان جن کے جسم ایتھلیٹ کے مانند تھے، کمرے میں پہلے سے موجود اپنے بھائی کے برابر میں آن کر کھڑے ہو گئے۔ ان تینوں نے سفید رنگ کی پولو شرٹس، سفید رنگ کی نیکرز اور سفید رنگ کے نرم تلے کے کرمچ کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔

''اب مسئلہ دیکھ رہی ہیں؟'' سارجنٹ جوزف نے سینڈی کونرز سے کہا۔ ''یہ تینوں لوکس، لیری اور لینی ہیں۔''

''چونکہ سارجنٹ جوزف یہاں پہلے ہو کر جا چکے ہیں اس لیے میرے خیال میں تم لوگ سمجھ گئے ہو گے کہ معاملہ کیا ہے۔''

ان تینوں نوجوانوں نے ایک ساتھ اثبات میں گردنیں ہلا دیں۔

''میں جاننا چاہوں گی کہ تم میں سے کون، کون ہے اور آج صبح کہاں پر تھا؟'' سراغ رساں سینڈی نے کہا۔

''میں لوئس ہوں۔'' بائیں جانب کھڑے ہوئے نوجوان نے بتایا۔ ''میں اپنے چھوٹے کمرے میں ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا۔ اسپورٹس چینل گزشتہ شب کے بیس بال گیم کو نشر مکرر کرتا ہے۔ میں اپنی پسندیدہ ٹیموں جائنٹس اور پیڈریز کا میچ دیکھ رہا تھا۔''

''میں لینی ہوں۔'' درمیان میں موجود نوجوان نے کہا۔ ''میں آفس میں تھا اور اپنے کمپیوٹر پر ایک ریسرچ ورک کر رہا تھا۔ میں ایک رائٹر ہوں اور قدیم یونانی ظروف سازی سے متعلق معلومات تلاش کر رہا تھا جس کے بارے میں، میں ایک آرٹیکل لکھ رہا ہوں۔''

''میں لیری ہوں۔'' تیسرے نوجوان نے بتایا۔ ''میں لیونگ روم میں سی ڈیز سن رہا تھا۔ جب میں سنتا ہوں تو ایک جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر آنکھوں پر ماسک چڑھا لیتا ہوں تاکہ مجھے کوئی روشنی نظر نہ آئے اور میرا مکمل دھیان موسیقی سننے پر مرکوز رہے۔''

''میرے خیال میں تم تینوں کو اس بات کا بخوبی علم ہوگا کہ مسز لوگن اپنی رقم اپنے بسکٹوں کے مرتبان میں رکھتی ہیں۔'' سراغ رساں نے کہا۔

''اس بوڑھی عورت نے ان سب کو یہ بات بتا رکھی ہے جس سے اس کی شناسائی ہے۔'' لوئس نے کہا۔ ''یہ کوئی راز نہیں ہے۔''

''کیا تم میں سے کوئی آج گھر سے باہر نکلا تھا؟''

ان تینوں نوجوانوں نے نفی میں سر ہلا دیے۔

''کیا تم میں کوئی بھی ایک دوسرے کی اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے؟'' سراغ رساں سینڈی نے پوچھا۔

''میرے خیال میں ناشتے کے بعد ہم تینوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔'' لینی نے کہا۔ ''ناشتے کے بعد ہم سب اپنی اپنی راہ ہو لیے تھے۔''

''دیکھا، میرے کہنے کا مطلب تھا۔'' سارجنٹ جوزف نے سراغ رساں سے کہا۔ ''یہ معاملہ اتنا سہل نہیں جتنا کہ دکھائی دیتا ہے۔''

''یقیناً ایسا ہی ہے۔'' سراغ رساں سینڈی نے کہا پھر سارجنٹ کو کمرے کے گوشے میں لے گئی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ ''لیکن میں تمہیں عین اسی لمحے یہ بتا سکتی ہوں کہ مسز لوگن کے گھر ان میں سے کس نوجوان نے چوری کی ہے۔''

یہ سن کر سارجنٹ جوزف کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

''چونکہ سام ہاکنز نے مسز لوگن کے عقبی لان کی گھاس اسی وقت تراشی تھی اور چور اسی تازہ کٹی ہوئی گھاس پر سے دوڑتا ہوا اپنے گھر میں گیا تھا، اس لیے ان تینوں جڑواں بھائیوں کے جوتے چیک کرو اور جس کے جوتوں اور اس کے تلے پر گھاس کے تراشے موجود پاؤ، اسے حراست میں لے لو۔''

26 سال کا بوڑھا

اپنی کمپنی کے سامان کو بیچنے والا سیل مین ایک بار چھوٹے سے گاؤں سے گزر رہا تھا کہ اس نے ایک مکان کے برآمدے میں چھوٹے سے قد کے بڑے میاں کو جھولے والی کرسی پر بیٹھے دیکھا جو کرسی کو آہستہ آہستہ ہلا رہے تھے۔ اس کو اس حال میں دیکھ کر سیل مین اپنے آپ کو روک نہیں سکا۔ اس نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''آپ کے طور طریقے سے محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو کسی چیز کی پروا نہیں ہے آپ اپنے آپ میں خوش ہیں، یہ کیا راز ہے آپ کی مطمئن زندگی کا؟''

جس پر بڑے میاں نے سیل مین کو جواب دیا۔ ''میں 24 گھنٹے میں چھ ڈبے سگریٹ کے پیتا ہوں اور شراب کو پانی کی طرح استعمال کرتا ہوں اور نہ تو نہاتا ہوں، نہ دانت صاف کرتا ہوں، اس کے علاوہ روزانہ میں الگ الگ عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتا ہوں اور اپنی زندگی کا مزہ لیتا ہوں۔''

سیل مین نے حیرت سے کہا۔ ''جناب آپ نے تو مجھے حیرت میں ڈال دیا، اتنی عمر میں پہنچنے کے بعد بھی یہ ساری چیزیں روز کرتے ہیں اس وقت آپ کی عمر کتنی ہوگی؟''

بڑے میاں نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''26 سال کا جوان ہوں میں۔''

افتخار اعوان کا آزاد کشمیر سے جواب

آوارہ گرد

قسط:32

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحریر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیرِ نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف ککل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال ان کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ ککل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کمیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو، شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کمیل دادا، شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، لئیق شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ وزیر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ ''اسپیکٹرم'' کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہزی کو اعزازی طور پر بھرتی کرلیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پاور کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں اس میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پاور کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش، شہزی کا دشمن بن چکا ہے، وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ، ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیائے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ، شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا، لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت سمجھتا ہے، ایک نوولتیا سیٹھ توید ساتھ والا مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا ٹاؤٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطن عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیو ٹنسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیو ٹنسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کمیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کمیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کو ہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، بشام جھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی، اور مسٹر ڈی کارلو اس کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ بشام اسے پاکستان میں موئن جودڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لولوش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کو ہارا کی بوٹ میں بلیو ٹنسی کے چند رتھ، شیام اور کوریلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیو ٹنسی کے ہیڈ کوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیو ٹنسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محبِ وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے

مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور اول خیر وغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب، سے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھومک کو بے بس کر دیتا ہے۔ سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جونکوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے سمیت جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک مسیح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اس اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی مستقل پُرفریبوں کے باوجود وہ اس چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ سوہن اور ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر ٹائپ لڑکے ایک رینا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ رینا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں رینا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ کے ایل ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔ ابھی شہزی اس انکشاف کے زیرِ اثر تھا کہ رینا کا سیل فون بج اٹھتا ہے۔ کال سنتے ہی رینا خوف زدہ نگاہوں سے شہزی کی طرف دیکھتی ہے اور قریب کھڑے بلراج سنگھ سے چلا کر کہتی ہے، یہ پاکستانی دہشت گرد ہے۔ پھر جیسے پل کے پل کا یا کلپ ہو جاتی ہے۔ مگر شہزی چالاکی سے بلراج کو قابو کر لیتا ہے اور رینا کو اپنے پاکستانی ہونے اور اپنے مقاصد کے بارے میں بتا کر قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ رینا، شہزی کی مدد کرتی ہے اور وہ اپنے ٹارگٹ بلیو تکسی تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں کی سیکیورٹی سے مقابلے کے بعد بلیو تکسی کے ہیڈ کوارٹر میں تباہی مچا دیتا ہے اور سی جی بجوانی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ شہزی نے ایک بوڑھے کا روپ دھارا ہوا تھا۔ سی جی بجوانی، شہزی کی گن کے نشانے پر تھا مگر اسے مار نہیں سکتا کہ شہزی کے ساتھی اول خیر، شکیلہ اور گھیل داد اس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام سن کر شہزی گنگ رہ جاتا ہے کیونکہ وہاں سے جانا ناممکنات میں تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے سی جی بجوانی کو ٹارچر کرتا ہے۔ بجوانی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس اثنا میں کورنیلا فون پر بتاتی ہے کہ تینوں کو "کلی منجارو" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام سن کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج سنگھ حملہ آور ہوتا ہے۔ مقابلے میں سی جی بجوانی مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناناشکور سے ہوتی ہے، جو ممبئی کا ایک بڑا اسمگلر تھا۔ ناناشکور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشیلا اور ناناشکور کے ہمراہ کلی منجارو کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناناشکور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ جھاڑی کے گھنے دلدلی جنگل کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ ناناشکور کے گارڈ اور ڈرائیور مارے جاتے ہیں۔ سوشیلا کے پیر میں تیر لگ جاتا ہے اور وہ زخمی ہو جاتی ہے۔ شہزی اپنی گن سے جوابی فائرنگ کر کے کچھ جنگلی وحشیوں کو ختم کر دیتا ہے۔ پھر وہ وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر تاریکی کی وجہ سے ناناشکور دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے اس سناٹے میں اب شہزی اور زخمی سوشیلا کا سفر جاری تھا کہ کورنیلا اور سے جی کوہارا سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

چیخ کی یہ آواز سوشیلا کی تھی اور اس نے میرا نام لے کر مجھے غالباً مدد کے لیے پکارا تھا۔

وہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس نے یوں میرا نام لے کر چیخ مارتے ہوئے ایک نئی مصیبت کو پکار لیا تھا۔ میرے اعصاب یکلخت تن گئے۔ میں دہری اور خطرناک سچویشن کا شکار ہو گیا تھا۔ ایک طرف کوہارا جیسا سفاک اور رذیل دشمن چونک گیا تھا دوسرے سوشیلا کو نجانے کس مصیبت نے آن گھیرا تھا۔

میں نے پل کے پل ایک فیصلہ کیا اور ایک آخری نظر ان پر ڈالنے کے بعد میں تیزی سے پلٹا اور دوڑتا ہوا اس طرف لپکا جدھر میں نے سوشیلا کو چھوڑا تھا۔ وہاں پہنچا تو بُری طرح ٹھٹک کر رکا۔ سامنے کا منظر دیکھتے ہی میرے پورے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔

سوشیلا جس چھتنار کے موٹے تنے والے درخت سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھی تھی اس کی جھکی ہوئی شاخوں سے ایک موٹا اژدھا اپنا غار سا منہ پھاڑے جھول رہا تھا۔

مجھے اعتراف تھا کہ میں نے آج تک صرف فلموں میں ہی ایسا خوفناک اور بڑا اژدھا دیکھا تھا مگر آج حقیقت میں اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں سنسنی آمیز پھریری دوڑ گئی تھی۔

اژدھا درخت کی کسی موٹی شاخ سے لپٹا ہوا نصف نیچے کی طرف جھول رہا تھا...... اور اس کا خوف ناک منہ

سوشیلا کے چہرے سے صرف ایک ڈیڑھ فٹ کے فاصلے پر ہوگا۔ کھلے ہوئے منہ سے دو بڑے نکیلے اور زہرناک دانت صاف جھانک رہے تھے۔ اس کی دوشاخہ زبان باہر کو لپلپا رہی تھی اور وہ جیسے سوشیلا کو نگلنے کے لیے پر تولے ہوئے تھا جبکہ سوشیلا کا چہرہ خوف و دہشت کے مارے پیلا پڑ چکا تھا۔

اژدھے کی پھنکاریں بڑی خوفناک اور سنسناتی ہوئی تھیں۔ میرے پاس اسلحہ نام کی کوئی شے نہ تھی، میں نے قریب جا کر یونہی اژدھے کو ذرا ہشکارا تو وہ سوشیلا کی طرف سے رخ پھیر کر ایک خوف ناک پھنکار کے ساتھ میری طرف متوجہ ہوا.... میں نے سوشیلا کو ہاتھ کا اشارہ کیا اور اس نے بھی ذرا ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنی زخمی ٹانگ کے باوجود خود کو ایک طرف دھیرے دھیرے سرکانا شروع کردیا۔

میں نے ایک ٹہنی اٹھالی تھی اور اس سے بار بار اژدھے کو ہشکار رہا تھا، مقصد میرا یہی تھا کہ وہ سوشیلا کی طرف سے ہٹ جائے اور ایسا ہوا بھی تھا، مگر اب یہ موذی مصیبت میرے گلے پڑ گئی تھی۔ وہ درخت سے اتر کر زمین پر آ گیا تھا اور میری طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے کوہارا وغیرہ کی طرف سے بھی پریشانی لاحق تھی، کیونکہ چیخ کی آواز انہوں نے بھی سن لی تھی بلکہ انہوں نے تو سوشیلا کو میرا نام لیتے ہوئے بھی یقیناً سن لیا ہوگا۔ میں اب دہری پریشانی کا شکار ہوگیا تھا۔

لیکن ابھی تو میں اژدھے کی طرف سے ہی اپنی توجہ نہیں ہٹا پا رہا تھا کہ دوسری پریشانی کی طرف دھیان دیتا۔ البتہ سوشیلا اپنی جگہ سے کہیں غائب ہوگئی تھی، شاید قریب جھاڑیوں میں جادبکی تھی۔

اژدھا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ بلاشبہ اس کی لمبائی اور موٹائی غیر معمولی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ بہ آسانی کسی بھی حیوان کو زندہ نگل جانے کی پوری استعداد رکھتا تھا اور وہ شاید یہی کچھ کرنے کے لیے میری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ میں بھی اسی پر نظریں جمائے الٹے پیروں پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس موذی کی مقناطیسی آنکھوں نے مجھ پر عمل تنویم کردیا ہو، میں اس کی طرف سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ تب ہی اچانک مجھے ٹھوکر لگی، شاید میرا پاؤں رپٹا تھا۔ میں کمر کے بل زمین پر جا گرا اور وہ قوی ہیکل اژدھا تیزی سے رینگتا ہوا میرے بالکل نزدیک پہنچ گیا اور اس نے میری گردن کی طرف اپنے لمبے تیز نکیلے دانت بھی بڑھائے۔

وہ مجھے.... نگلنے کے لیے بالکل باعزم تھا کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور میں نے اژدھے کے چہرے کا دوسرا خوفناک منظر دیکھا۔ اس کا منہ گولیوں سے چھلنی ہوکر اور بھی بھیانک دکھائی دینے لگا تھا۔

وہ میرے بالکل قریب گرا اور تڑپنے لگا۔ میں جلدی سے تھوڑا مزید پیچھے کھسک کر اٹھ کھڑا ہوا تو پستول کی سرد نال میری گدی سے آن لگی اور ساتھ ہی غراتی ہوئی آواز بھی ابھری۔

''شہزی! اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا، ورنہ تمہارا حشر بھی اس اژدھے سے مختلف نہ ہوگا۔''

اس بے رحم اور سفاک آواز کو میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ سے جی کوہارا کی آواز تھی۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید مجھے اس نے اپنی طرف گھومنے کا موقع دیا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی اور کورنیلا اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ اس کے کسی ساتھی نے.... اژدھے پر برسٹ چلایا ہوگا اور ظاہر ہے اس میں کوہارا کی ہی ہدایت شامل ہوسکتی تھی، کیونکہ میں اژدھے کا نہیں اس کا شکار تھا۔

اژدھا ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ سوشیلا غائب تھی۔ مجھے اس کی طرف سے کچھ تسلی ہوئی تھی۔ ورنہ اس بے رحم کوہارا سے کوئی توقع نہ تھی کہ وہ سوشیلا کو دیکھتے ہی اسے بھی برسٹ مار کر ہلاک کرسکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہم دونوں میں سے ایک شکار کو مردہ اور دوسرے کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔

''مجھے بالکل بھی امید نہ تھی کہ میرا دیرینہ دشمن اور شکار.... کلی منجارو کی سرزمین پر میرے سامنے ہوگا۔'' کوہارا نے پرغرور لہجے میں کہا۔

میں نے اپنے شکستہ پڑتے اعصاب کو ایک گہری سانس لے کر پرسکون کیا اور کوہارا کی طرف دیکھ کر بے خوفی سے بولا۔

''تم نے الٹ کہا کوہارا......! اصل میں یہی الفاظ میرے کہنے کے تھے۔'' میری اس جوابی لفظی کارروائی نے اس کے غرور کی جیسے دھجیاں بکھیر دیں، اس کے مکروہ گینڈے جیسے چہرے کے تاثرات بگڑتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

''تم تو پھر بھی شاید مجھ سے مایوس ہوگئے تھے اور یہاں کم از کم میری تلاش میں تو نہیں آئے تھے مگر میں ضرور تمہاری تلاش میں تھا۔ اپنے ہم وطن ساتھی بشام چھلگری کو تم نے جس بیدردی سے ہلاک کیا تھا، اس کا تمہیں حساب اپنی جان دے کر ہی چکتا کرنا ہے کوہارا......''

میری بات سن کر وہ غضب آلود انداز میں دہاڑا اور عالم طیش میں اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول سے فائر کر دیا۔ یہ ہوائی فائر تھا جو اس خبیث نے اپنے اندر کا غبار نکالنے کے لیے کیا تھا۔

''تم اب مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے شہزی! نہیں جانتے کہ تم نے یہاں آکر میرا کام کس قدر آسان کر دیا ہے۔''

ٹھیک اسی وقت ایک زوردار پھنکار نما خراٹے کی آواز ابھری اور ہم سب بُری طرح ٹھٹکے۔ دوسرے ہی لمحے کوہارا کے ایک ساتھی کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔ اس کے عقب سے ایک اور اژدھے نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ شاید پہلے والے اژدھے کا جوڑی دار نر یا مادہ تھا۔ کہیں قریب موجود اس نے اپنے ساتھی کا ان کے ہاتھوں حشر دیکھ لیا تھا اور موقع پاتے ہی اس نے سب سے پہلے کوہارا کے مسلح ساتھی پر حملہ کیا تھا۔

بالخصوص سانپ کی نسل سے تعلق رکھنے والے جانور اپنے اندر انتقام کا پورا پورا مادہ رکھتے ہیں۔

اس اژدھے نے اچانک ہی جھنڈ دار درختوں سے نکل کر کوہارا کے ساتھی پر حملہ کیا تھا اور اس کی گردن پر کاٹ لیا تھا۔ جبکہ دوسرے کو اپنی موٹے رسے جیسی دم میں گھیر لیا تھا اور اس پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ... گن ہونے کے باوجود وہ فائر نہ کر سکا تھا اور گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔

اسے دبوچ کر اژدھے نے پرے اچھال دیا۔ میں نے کوہارا کے اس دوسرے ساتھی کو ہوا میں اڑتے ہوئے کہیں دور جنگلی جھاڑیوں میں گرتے دیکھا تھا۔

میں محتاط تھا، جبکہ کوہارا نے اپنے پستول کا رخ اژدھے کی طرف کر دیا اور اس پر تلے اوپر فائر جھونک مارے۔ میرے لیے اتنا ہی موقع کافی تھا۔ میں نے ایک طرف جھاڑیوں میں جست بھری اور اندر ہی اندر دور تک نکلتا چلا گیا، وہاں سوشیلا کو میں نے ایک جگہ جنگلی گھاس پر پڑے سسکتے ہوئے پایا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ رو پڑی اور روتے ہوئے بولی۔

''ہے بھگوان! تم زندہ ہو...... شکر ہے...... میں تو سمجھی تھی...... لل...... لیکن یہ فائرنگ کی آوازیں...... اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے وقت ضائع کیے بغیر اسے تسلی دی اور ہانپتے ہوئے کہا۔

''سوشی! حالات اس سے بھی زیادہ نازک اور خطرناک ہو گئے ہیں۔ کوہارا اور کوریلا یہاں آچکے ہیں اور یہ فائرنگ کی آواز انہی کے ساتھیوں کی تھی۔'' پھر میں نے اسے مختصراً بتایا کہ معاملہ کیا تھا۔

کوہارا کی یہاں موجودگی کا سن کر سوشیلا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اپنے دشمنوں میں دو افراد سے سب سے زیادہ خار کھاتی تھی۔ ایک بلراج سنگھ دوسرا سے جی کوہارا......

''ان کی اس طرف جیپ کھڑی ہے، ہمت کرو، یہی موقع ہے، ورنہ پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا ہمارے پاس......'' میری بات اور پیش آمدہ صورتِ حال نے اسے یوں بھی پہلے ہی سے بہت کچھ باور کرا دیا تھا۔ لہٰذا اس نے سہارا لینے کے لیے میرا ہاتھ تھام لیا اور میں نے اسے اٹھا لیا۔

اس کی ٹانگ کا زخم کافی بھر گیا تھا، مگر اب بھی بہرحال وہ بغیر سہارے کے چلنے سے قاصر تھی۔ میں نے بھی وقت ضائع نہیں کیا تھا، اسے کاندھے پر ڈال کر چل پڑا اور جیپ کے پاس آکر ہی دم لیا۔ میں نے سوشیلا کو جیپ میں سوار کرایا اور ابھی میں سوار ہونے ہی والا تھا کہ اچانک سوشیلا چیخی۔

''شہزی...... بچو!''

مگر تب تک کوئی عقب سے مجھ پر چھلانگ لگا چکا تھا، جس پر سوشیلا کی اچانک ہی نگاہ پڑی تھی۔ مجھ پر جست بھرنے والے نے بیک وقت مجھے ٹھوکر بھی رسید کر دی تھی۔ میں جیپ سے ٹکرا کر نیچے گرا اور میری پیشانی جیپ کے کسی لوہے سے ٹکرائی، ایک لمحے کے لیے تو میرا دماغ ہی جھنجھنا سا گیا اور آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سر کو جھٹکا اور تاریکی سے نجات حاصل کرنا چاہی تھی کہ ایک لات میرے چہرے سے ٹکرائی، تب تک دھندی میری آنکھوں سے چھٹ چکی تھی اور میں نے کوریلا کو خود پر حملہ آور ہوتے دیکھا۔ وہ بڑی مکاری سے کوہارا اور اس کے ساتھیوں کو اژدھے سے الجھا چھوڑ کر میرے تعاقب میں چلی آئی تھی۔

اسے عین آخری لمحات میں اپنا راستہ کھوٹا کرنے پر میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی مگر اسی لمحے سوشیلا نے زخمی ہونے کے باوجود اسے مجھ پر یوں پل پڑتے دیکھ کر جنونی انداز میں چیختے ہوئے اس پر چھلانگ لگا دی اور اسے لیتی ہوئی نیچے آ رہی۔ کوریلا نے اس کے پیٹ پر اپنا گھٹنا رسید کر دیا، سوشیلا کرب ناک آواز سے چیخی، اسی وقت میں نے کوریلا کی لیشت پر ایک زوردار لات رسید کر دی۔ وہ

کراہتی ہوئی خاصی دور جا گری۔ میں نے پیٹ پکڑے تڑپتی سوشیلا کو سنبھال کر دوبارہ جیپ میں ڈالا اور خود بھی سوار ہو گیا۔

توقع کے عین مطابق اگنیشن سوئچ میں چابی لگی ہوئی تھی۔

چابی گھماتے ہی غراہٹ کے ساتھ جیپ کا طاقت ور انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

اسی وقت کوریلا ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی جیپ کی طرف دوڑی۔ اس کی آخری حد تک کوشش یہی تھی کہ مجھے جیپ لے کر نکلنے نہ دے۔ مقابلہ میں بھی ان کا کرنا چاہتا تھا، مگر ابھی میرے سر پہ صرف اپنے ساتھیوں کو اس وحشی قبیلے سے بچانے کی دھن سوار تھی، کیونکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی جانیں خطرے میں پڑتی جا رہی تھیں، نیز وہ کس حال میں تھے، یہ بھی میں نہیں جانتا تھا اور پھر زخمی سوشیلا بھی میرے ساتھ تھی، وہ کسی بھی وقت میری کمزوری بن سکتی تھی۔

میں نے بجلی کی پھرتی کے ساتھ جیپ کو گیئر ڈالا اور ایکسلیٹر پورا دبا دیا۔ ٹھیک اسی وقت جب جیپ کمان سے نکلے تیر کی طرح چھوٹی تھی، کوریلا اس پر لانگ جمپ لگا چکی تھی۔ وہ سیدھی جیپ کے عقبی حصے میں گری۔ میں نے جیپ روکی نہیں تھی مگر کوریلا کی مصیبت گلے پڑ چکی تھی۔ میں جیپ کو بدستور دوڑائے چلا جا رہا تھا اور منتظر تھا کہ کوریلا مجھے قابو کرنے کی نیت سے میرے قریب آئے تو میں اسے اس ”مہم جوئی“ کا مزہ چکھاؤں، مگر وہ مکار لومڑی ثابت ہوئی اور اس نے بجائے مجھ پر حملہ کرنے کے عقب کی سیٹ پر لیٹی سوشیلا پر ہلا بول دیا۔ اور اس کی گردن دبوچ لی۔ سوشیلا کی گھٹی گھٹی آواز سن کر میرا دماغ گرم ہو گیا اور میں نے جیپ کو بریک لگا دیے۔ جیپ ایک جھٹکے سے رکی اور میں نے پلٹ کر کوریلا کو دبوچنا چاہا تھا کہ اس نے تاک کر میرے چہرے پر گھونسا جڑ دیا۔ وہ بھی ایک تربیت یافتہ ایجنٹ تھی، لیکن اس وقت وہ میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے نکلنے نہ دے اور تب تک کوہارایہاں ٹپک پڑے۔

میں نے اس کے گھونسے کی پروا کیے بغیر ایک ہاتھ سے اس کے بالوں کو مٹھی میں دبوچ کر زوردار جھٹکا دیا۔ اس کے حلق سے چیخ خارج ہوئی اور اس نے سوشیلا کی گردن چھوڑ دی، مگر بعد میں مجھے ادراک ہوا کہ اس میں سوشیلا کی اپنی کوشش کا بھی دخل تھا۔ اس نے اپنی دوسری ٹانگ اس کے پیٹ میں جڑ دی تھی۔

بہرحال کوریلا ذرا دیر کو ڈھے سی گئی اور پھر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ میں چاہتا تو اس کی نازک اندام گردن پر ایک زوردار مخصوص چپ رسید کر کے اس کا منکا توڑ ڈالتا، مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور اس کا چہرہ دبوچ کر اسے جیپ سے نیچے دھکیل دیا۔ وہ چیخ مار کر گری اور ذرا دور تک لڑھکتی چلی گئی، میں نے فوراً جیپ آگے بڑھا دی اور کوریلا اپنا ہاتھ ملتی رہ گئی۔

”تم ٹھیک تو ہو ناں...... سوشی؟“ میں نے سامنے نظریں رکھتے ہوئے سوشیلا سے پوچھا، وہ.... دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا سہلا رہی تھی، وہ پھنسی پھنسی آواز سے بولی۔

”میں...... ٹھ...... ٹھیک ہوں، تم گاڑی چلاتے رہو۔“

میں جیپ کو دوڑاتا چلا گیا۔ ناہموار راستوں پر جیپ زبردست ہچکولے کھانے لگی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو میں کوہارا سے بھی دو دو ہاتھ کر کے اس سے اپنا پرانا حساب چکتا کر لیتا۔

اگرچہ نانا شکور نے مجھے باقی کے راستے کا ادراک کروا دیا تھا، لیکن بہرحال اس کی بات کچھ اور تھی، وہ ساتھ ہوتا تو منزل تک پہنچنے کی مجھے کچھ زیادہ فکر نہ ہوتی، مگر اب اس کے بغیر مجھے منزل کا باقی ماندہ سفر کٹھن ہی محسوس ہو رہا تھا۔

اب اس نئی افراتفری میں تو مجھے آگے کی منزل کا ادراک کرنا مشکل ہی نظر آ رہا تھا، کیونکہ اس میں راستہ بھٹکنے کا احتمال بھی اپنی جگہ موجود تھا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری تھی، یہاں رکنا بھی نہیں تھا۔

کوہارا یا کوریلا سے میں خوف زدہ نہیں تھا، مگر وہ میرا بہت وقت ضائع کر سکتے تھے اور میں جلد سے جلد اپنے ساتھیوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جیپ کی رفتار میں نے کم کر دی تھی۔ جیپ کو زیادہ دیر تک میں استعمال میں نہیں لا سکتا تھا۔ کیونکہ آگے کا جو دشوار گزار راستہ تھا وہ کم از کم ”وہیکل ڈرائیو“ کا بالکل بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

جب مجھے اس بات کی اچھی طرح تسلی ہو گئی کہ میں کوہارا وغیرہ سے بہت دور نکل آیا تھا تو میں نے ایک مقام پر جیپ روک دی۔

سیاہ چٹانی سلسلہ اور ڈھلوانی جنگل بتدریج گنجان ہوتا

ناسور

ایک ایسے نوجوان کی داستان جس کی زندگی خالی قبر کی طرح تھی جو اندھیروں کی راہ گزر پر روشن لمحوں کی آس لیے اپاہج راستوں پر گامزن تھا۔

سماج کے رستے ہوئے ناسوروں کو وہ بے نقاب کرنے نکلا اور پھر ہر دن، ہر پل اس کا ارضی ناخداؤں سے برسرپیکار رہنے میں بیتنے لگا۔

ایک ایسی طویل داستان جس کی ہر قسط آپ کو چونکا دے گی

بہت جلد

ماہنامہ سرگزشت کے صفحات پر ملاحظہ کریں

چلا گیا تھا۔ نانا شکور نے مجھے یہی بتایا تھا کہ قربِ منزل کی ایک اہم نشانی یہ بھی تھی کہ ایک تو پہاڑی سلسلہ، جو پہلے ذرا دور دور دکھتا تھا، وہ قریب ہو کر گنجان ہوتا چلا جائے گا، جبکہ جھائی کا گھنا جنگل رفتہ رفتہ اپنی باقیات کے ساتھ ختم ہو کر ٹنڈ منڈ خشک اور کانٹے دار ببول کی جھاڑیوں میں بدل کر نیم صحرائی علاقے میں بدل جائے گا۔

میں جیپ ایک چٹانی راستے کے درمیانی تنگ اور پتھریلے راستے پر روک کر نیچے اتر آیا تھا۔ سوشیلا ابھی جیپ میں ہی سوار تھی۔

میں اطراف میں نظریں دوڑانے لگا۔ میرے سامنے بھی پتھریلا تنگ راستہ بل کھاتا ہوا دور تک جا رہا تھا۔ چٹانوں کی ڈھلوان پر جنگل ناپید ہونے لگا تھا، کہیں کہیں سوکھی ٹہنیوں والے ٹنڈ منڈ سے درخت نظر آتے تھے، یا پھر جھاڑیوں کی بہتات تھی، زمین ریتیلی محسوس ہوتی تھی۔ یہاں گرمی اور حبس کے علاوہ سیاہ چٹانوں کی تپتی سنگلاخ سطح سے بادِ سموم سر ٹکرا رہی تھی۔ دن نکل آیا تھا اور سورج چٹانی افق سے کافی اُبھر آیا تھا۔ مجھے گرمی اور پسینے کا احساس ہونے لگا۔

وہ نیم صحرائی علاقہ قریب لگتا تھا۔

درحقیقت میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ آیا اس مقام پر مجھے جیپ چھوڑ دینی چاہیے تھی یا ابھی اسے استعمال میں لاتے ہوئے باقی کا کسی حد تک سفر آسان کیا جا سکتا تھا۔

”ہم منزل کے کتنے قریب ہیں شہزی؟“ مجھے کافی دیر اطراف کا جائزہ لیتے اور سوچتے پا کر سوشیلا نے پوچھا۔

”منزل تو اب شاید زیادہ دور نہیں ہے مگر...... سمجھ میں نہیں آ رہا کہ باقی کا سفر پیدل طے کیا جائے یا پھر جیپ میں......؟“

”اس بلا کی گرمی اور سنگلاخ چٹانی راستوں میں فی الحال تو یہ جیپ ہمارے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی ثابت ہو سکتی ہے۔“ وہ بولی۔

”یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔“ میں نے کہا اور ایک ہاتھ اپنی پیشانی پر پھیرا تو وہ مجھے پسینے سے تر محسوس ہوئی۔ پیاس کی شدت بڑھنے لگی تھی۔ کچھ سوچ کر میں چند قدم چلتا ہوا جیپ کے عقبی حصے کی طرف چلا آیا، جہاں مقدور بھر کیمپنگ وغیرہ کا سامان لدا ہوا تھا۔ میں اوپر چڑھ گیا اور سامان کی اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی، سوشیلا مجھے مالِ غنیمت کا جائزہ لیتے ہوئے خاموشی سے دیکھنے لگی۔

سامان میں مجھے خیمہ زنی کے علاوہ کچھ خشک خوراک کے ڈبے، پانی کی دو چھاگلیں، کافی، چائے بنانے کا تھوڑا بہت سامان، چھوٹے موٹے برتن، ماچس لائٹر سب پڑے ملے۔ ان میں دو ٹارچ بھی تھیں، سگریٹ کا ایک ادھ کھلا بنڈل، کسی شکار کیے گئے پرندے کا بچا کھچا گوشت، جو کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، اس کے علاوہ جس اصل شے کی مجھے تلاش تھی وہ اسلحہ تھا، جو ایک کھلے پڑے چرمی بیگ میں بکھرا بکھرا سا پڑا تھا، صاف نظر آتا تھا کہ اس میں کافی سے زیادہ اسلحہ استعمال کیا جا چکا تھا۔

تاہم جو بھی بہ طور ’غنیمت‘ باقی بچا تھا اس میں دو پستول تھے۔ فاضل راؤنڈ کے گتے کے دو ڈبے تھے، اس کے علاوہ ایک رائفل تھی اور ایک لمبے پھل والا چاقو اور موٹے دستے والا خنجر بھی رکھا ملا۔

اسلحہ تھوڑا سا ہی مگر میری آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

میں نے جلدی جلدی فوری کام میں لانے والی اشیا کو یکجا کیا۔ پستول بھرے ہوئے تھے، چھوٹا میں نے سوشیلا کو تھما دیا اور دوسرا میں نے اپنی پینٹ کی بیلٹ میں اڑس لیا۔ جبکہ رائفل ڈرائیونگ سیٹ کے برابر والی نشست پر ٹکا دی۔ فاضل راؤنڈ کے ڈبے بھی میں نے جیپ کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیے۔

اس سب سے فارغ ہو کر سوشیلا اور میں نے باری باری پانی پیا اور کچھ زادِ راہ کے طور پر سنبھالے رکھا۔ اس کے بعد میں ڈرائیونگ ...... سیٹ پر آ بیٹھا۔

”تم کیا جیپ چھوڑنا چاہتے تھے؟ مگر کیوں......؟“ سوشیلا نے پوچھا۔

”ہاں! ارادہ تو پہلے میرا یہی تھا۔“ میں نے خشک خوراک کا ایک ڈبا کھول کر سوشیلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن...... اب ارادہ بدل لیا ہے۔“ کہتے ہوئے میں نے دوسرا ڈبا اپنے لیے کھولا۔

تھوڑا بہت کھا پی لینے کے بعد میں نے یونہی ایک نگاہ گرد و پیش میں ڈالی پھر سوشیلا سے بولا۔ ”تم ادھر محتاط ہو کر بیٹھو، میں ذرا کسی قریبی پہاڑی پر چڑھ کر منزل کے راستوں کا تعین کر کے آتا ہوں۔“ میری بات پر سوشیلا نے اپنے سر کو ہولے سے اثباتی جنبش دی تھی۔

میں نے مسکرا کر اس کے چہرے کی نرماہٹ بھرے گال کو تھپتھپایا اور پھر چھلانگ مار کر جیپ سے نیچے اترا۔

ایک قریبی پہاڑی کا رخ کیا تو وہ سورج کی تمازت سے بری طرح تپ رہی تھی۔ اس قدر کہ میرے جوتے تک گرم ہونے لگے، مگر میں اس کی پروا کیے بغیر اوپر چڑھتا

رہا۔

سورج میرے عین سر پر چمک رہا تھا اور میں پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ قدرے بلندی پر پہنچ کر میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

میرے سامنے اب حدِ نگاہ تک صحرا اور کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہیں کہیں صحرا میں ٹیلوں اور ٹبوں کی ڈھلوانوں پر کیکٹس اگے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس کے پار مجھے ایک موٹی سیاہ رنگ کی پٹی سی دکھائی دی اور میرا دل ایک عجیب سے جوش تلے یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا۔

مجھے نانا شکور نے اسی گاڑھی اور کالی پٹی کے بارے میں بتایا تھا اس کے دکھائی دے جانے کا مطلب یہی تھا کہ ہم منزل پر پہنچ چکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میں اپنی منزل کے قریب پہنچ چکا تھا مگر یہ جتنی قریب دکھائی دے رہی تھی اتنی تھی نہیں۔

جس طرح حدِ نگاہ پھیلے ہوئے ریگ زار میں سراب انسان کو بھٹکا دیتا ہے، بالکل اسی طرح کسی بلند پہاڑی سے کوئی عمارت یا ایسی ہی کوئی شے دکھائی دے جائے تو وہ اتنی قریب ہوتی نہیں ہے جتنی کہ نظر آتی ہے، ایسی سراب زدہ منزل تک پہنچنے کے لیے بڑے صبر اور استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہرکیف میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اچانک بُری طرح ٹھٹک کر رک گیا اور پھر جیسے میرے اوسان خطا ہو گئے......

☆☆☆

وہ بڑا دہشت ناک منظر تھا...... منظر کیا تھا بلکہ ایک رینگتی ہوئی بڑی زہریلی مصیبت تھی۔ یہ تو شکر تھا کہ میں بروقت پلٹا تھا، اگر مجھے پلٹتے ہوئے ذرا بھی دیر ہو جاتی تو میرے عقب میں اور دائیں بائیں پھیلے ہوئے قطار اندر قطار رینگتے ہوئے سیاہ موٹے بچھو میری ٹانگوں اور بعد میں جسم سے چمٹ چکے ہوتے۔ اُف...... یہ بچھو تھے یا موٹی نسل کے چوہے۔ ان کا سائز ایسا ہی تھا۔ کالے سیاہ رنگ کے موٹے اور بڑے ڈنک والے یہ سیاہ پہاڑی بچھو، جن کی بدہیئت شبیہ ہی بتا رہی تھی کہ یہ کس قدر زہریلے اور ڈنک مارنے کے حامل ہو سکتے تھے۔

ان کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ یہ خاصے جوش میں نظر آتے تھے۔ لگتا تھا بڑے عرصے بعد ان کے ہاتھوں (میری صورت میں) کوئی شکار لگا تھا۔ ایک روایت کے طور پر میں نے سن رکھا تھا کہ اگر کسی بچھو کو کافی عرصے تک ڈنک مارنے کے لیے کوئی ”شکار“ نہ ملے تو یہ خود کو ہی ڈنک مار مار کر ختم کر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا ڈنک انسان یا کسی بھی حیوان کو پاگل کر سکتا تھا۔

عموماً یہ راتوں میں ہی نکلتے ہیں لیکن شاید ان کی حد سے بڑھی ہوئی اشتہا نے انہیں دن میں بھی نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں نے پل کے پل اپنا رخ بدلا اور جیپ کی طرف دوڑ لگا دی، ساتھ ہی اپنی گردن بھی پیچھے موڑ کر دیکھتا جاتا۔ وہ سب اسی طرح گھوم کر میرے پیچھے لپکے تھے۔ اس منظر نے چونکہ میرے پورے وجود میں پھریری سی دوڑا دی تھی، دوسرے میں ڈھلوان سے دوڑتے ہوئے نیچے اتر رہا تھا اسی لیے میرا پاؤں رپٹ گیا اور میں منہ کے بل نیچے آرہا۔ میری پیشانی کسی ابھرے ہوئے چٹانی پتھر سے ٹکرائی اور میری آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا۔

میں اوندھے منہ سخت پتھریلی سطح پر گرا تھا، جو پہلے ہی دھوپ کی تمازت اور شدت سے تپ رہی تھی۔ اس پر مستزاد سر کی چوٹ سے میرے رہے سہے اوسان خطا ہونے لگے تھے اور میری نیم باز آنکھیں تیزی سے اپنی جانب بڑھتے ان کالے بچھوؤں کو بے بسی سے تکے جا رہی تھیں۔

برماتی ہوئی دھوپ اور گرمی نے پہلے ہی مجھے ہلکان کر رکھا تھا۔ بس! جاتے ہوئے اور کسی دیے کی طرح بجھتے ہوئے حواس تھے میرے جو دم توڑنے کے قریب تھے اور تاریک پڑتے ذہن میں کوئی چلا رہا تھا۔

”نہیں شہزی! آنکھیں کھول دو...... تم تو بہت ہمت والے تھے، اٹھو، دوڑو، ورنہ اگر ایک بار تم ان جہنمی بلاؤں کے نرغے میں آگئے تو بس پھر گئے...... اور میں شاید جا ہی رہا تھا۔ میں نے اس آواز پر اپنے وجود کو غیر ارادی طور پر ہلانے جلانے کی کوشش بھی چاہی تھی اور تھوڑی جنبش بھی شاید ہوئی تھی مگر سر میں لگنے والی اس نکیلے پہاڑی پتھر کی چوٹ نے مجھے اندھیاروں کی طرف دھکیلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ ٹھیک اسی وقت جب میری آنکھیں بالکل ہی بند ہونے لگی تھیں اور میں ہوش و حواس سے بے خود ہونے لگا تھا، مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم پر اَن گنت رینگتے ہوئے کیڑے سوار ہونے لگے ہوں، ٹھیک اسی وقت ایک تڑپا دینے والا ڈنک مجھے لگا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

زندگی کیا ہے...... پانی کا بلبلہ اور موت...... اس بلبلے کو آنِ واحد میں ہڑپ کر جانے والی ایک اَن دیکھی

عفریت، جو جیتی جاگتی زندگی کو پل بھر میں نامانوس اور اسرار بھرے اندھیاروں میں لے جاتی ہے، ایسے اندھیارے جو ازل سے پُراسراریت کی دبیز تہ میں چھپے ہوئے ہیں، قرن ہا قرن سے ایک سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے، اور جو ہوتا ہے وہ صرف مرنے کے بعد ہی ہوتا ہے اور وہ صرف مرنے والا ہی جانتا ہے۔ شاید اسی لیے کہتے ہیں کہ ''قبر کا حال مردہ ہی جانتا ہے۔''

سنا ہے کہ جب انسان مرنے والا ہوتا ہے تو صرف چند پل پہلے ہی اسے موت کے فرشتے کی جھلک یا اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہوتی ہے۔ پھر جب ملک الموت انسان کی روح قبض کر رہا ہوتا ہے تو مرنے والے کے لاشعور میں شاید آخری بار...... اس کے اپنوں اور پیاروں کی صورتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

میری آنکھیں بھی یہی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ ماں کا چہرہ، باپ کی صورت، عابدہ کی صاعقہ بار جھلک اور پھر زہرہ بانو اور میرے قریبی دوستوں کی شبیہیں...... باری باری میری آنکھوں کے سامنے رقص کناں ہونے لگی تھیں۔ ان کے پس منظر میں تاریکی تھی، ایک دھند آمیز موت کی سی تاریکی۔

عجیب بات تھی کہ مجھے ہوش کا ادراک بھی تھا اور مدہوشی کا ادغام بھی۔ ہوش اور مدہوشی کے اس اسرار بھرے سنگم میں مجھ پر رفتہ رفتہ یہ بھی باور ہونے لگا تھا کہ میرے ساتھ بیتی کیا تھی!

یہ حقیقت ہے کہ جب انسان اپنے حواس چھوڑ بیٹھتا ہے تو ہوش آنے یا آنکھیں کھلنے پر اس کے ذہن میں وہی واقعہ ثبت ہوتا ہے، جو آخر میں اس کے ساتھ بیتا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ذرا عقل و خرد کا یارا ہوتے ہی مجھے یاد پڑا کہ میں کیوں اس حال کو پہنچا تھا اور میرے ساتھ کیا بیتی تھی!

''اف......! تو کیا میں مر چکا تھا؟ شاید اسی لیے یہ سب مجھے نظر آرہا تھا...... دھند دھندلی سی تھی، تاریکی اور یہ بدہیئت شکلیں......؟ یہ سب کیا تھا؟

کیا میں مر چکا تھا؟ بھلا بچ بھی کیسے سکتا تھا؟ نیم صحرائی اور جلتی بلکتی پہاڑی پر میرے بے سدھ وجود پر اتنی تعداد میں چھوٹے بڑے کالے اور زہریلے بچھوؤں نے ہلابول دیا...... تو بھلا میں بچا ہوں گا......؟

مجھے اپنے پورے بدن میں اینٹھن کا بھی احساس ہونے لگا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے آگ بھر دی ہو......

مجھ پر ایک بار پھر غشی طاری ہونے لگی لیکن میں نے اپنے سر کو دو تین بار جھٹکے دیے۔ دھند چھٹی تو میری آنکھوں کے آگے اندھیروں کی جگہ روشنی نے لے لی۔

وہ عجیب و غریب صورتیں بھی نظر آنا بند ہو گئیں۔ پہلی بار مجھے کچھ زندگی کا احساس ہونے لگا۔ سماعتوں سے کچھ آوازیں بھی ٹکرانے لگیں۔ میں نے ان آوازوں پر غور کیا تو ٹھٹکا...... یہ آبی پرندوں کی مخصوص ''قیں...... قیں......'' کی آوازیں تھیں جس کے سنگم میں سمندری لہروں کا شور بھی تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں ساحل کے قریب تھا۔ اس بات نے مجھے تفکر میں مبتلا کر دیا۔ تو کیا میں لبِ بام اپنی منزل سے دور کر دیا گیا تھا؟

سب سے پہلے میں نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکا کہ میں مر چکا تھا یا میری آنکھ عالم بالا میں کھلی تھی، کیونکہ مجھے درد اور دُکھن کے احساس کے ساتھ ہی کچھ زندگی نما آثار محسوس ہونے لگے تھے، مگر ذہن میں اب بھی سوالیہ نشان تھا کہ میں اس قدر خطرناک اور یقینی موت کے چُنگل سے کیونکر بچ نکلا؟

بے شک زندگی اور موت میرے اللہ کے ہاتھ میں تھی اور جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، ضرور کوئی میرے ساتھ عین آخری لمحات میں معجزہ ہوا تھا۔ اللہ کو شاید ابھی میری زندگی منظور تھی۔

حواس پوری طرح جاگے تو میں نے اپنے گرد و پیش میں نظریں دوڑائیں اور ساتھ ہی اپنا بھی جائزہ لیا تو چونک پڑا۔ میں نیم برہنہ حالت میں تھا۔ نیچے صرف ایک جانگیا تھا۔ میرا کسرتی بدن تانبے کی طرح چمک رہا تھا مگر اس میں بھی اینٹھن کا احساس ہوتا تو بھی ایک ٹھنڈک پڑتی محسوس ہوتی۔ میری ٹانگ میں پنڈلی اور ران کی طرف کوئی لیپ لگا ہوا تھا، یہ شاید مرہم تھا، اسی طرح سینے اور پیٹ کے مقام پر بھی یہی مرہم ملا ہوا تھا۔ اسی میں سے کبھی اینٹھن اور کبھی ٹھنڈک محسوس ہونے لگتی تھی۔

میرا ذہن اب تیزی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کے لائق ہو چلا تھا۔ جب میں نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میں کسی چوبی دیواروں والے خاصے کشادہ کیبن میں تھا۔ یہ کون سی جگہ ہو سکتی تھی اور مجھے لانے یا بالفاظِ دیگر مجھے موت کے منہ سے نکال لانے والے کون لوگ تھے، یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔

میں زمین پر بچھے کسی کھال نما بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ عجیب سی بُو کا مجھے احساس ہونے لگا۔ میرے اردگرد فرش پر

جانے کیا کیا الابلا بکھری ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیبن کی ایک دیوار سے جھروکا سا بنا ہوا تھا، قریب اس کے دروازہ بنا ہوا تھا، دروازہ کیا تھا، بس ایک چوکھٹ نما راہ گزر تھی اور اس پر سوکھی کھال کا ٹاٹ سا جھول رہا تھا، وہ آوازیں اسی کے پیچھے سے آرہی تھیں اور روشنی بھی۔ میں وقت کا اندازہ نہیں کر پایا تھا، تاہم روشنی کے انعکاس سے کچھ اندازہ تو ہوتا تھا کہ یہ شام کا وقت ہو سکتا تھا۔

''سوشیلا'' ......

معاً ہی میرے ذہن میں اُبھرا...... وہ نجانے کہاں تھی؟ مجھے فکر و تشویش نے آلیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ مجھے چکر سا آیا۔ لیکن جلد ہی میں سنبھل گیا۔ میرے کانوں سے مسلسل شور کی آوازیں آرہی تھیں، جو بتدریج واضح ہوتی جا رہی تھیں۔ لہروں کا شور، لوگوں کے بولنے کی آوازیں، اٹھا پٹاخ، ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ جیسے بار برداری اور بھاری سامان لادا جا رہا ہو۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہلکا سا چکر آیا، لیکن میں سنبھل کر چند ثانیے کے لیے کھڑا رہا۔ اس کے بعد دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے پیروں میں جوتیاں نہیں تھیں۔ میں نے ٹاٹ ہٹایا اور چوبی کیبن سے باہر آیا تو دنگ رہ گیا۔

سامنے ایک گودی کا منظر تھا جبکہ اس کے پس منظر میں گہرا نیلا سمندر تھا، اس کے پار قوس کی شکل میں ساحل کے ساتھ ساتھ بنا ایک پورا شہر آباد تھا، جہاں سفید رنگ کی عمارتیں اور نیلے پیلے رنگ کے مکان اور کاٹیج نظر آرہے تھے۔ وہاں کہیں کہیں بتیاں ٹمٹماتی نظر آرہی تھیں، گویا ایک جدید شہر کا منظر نظر آرہا تھا۔ آسمان پر ڈوبتے سورج کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا خنک چل رہی تھی۔ کچھ لمبی اور زرد چونچوں والے آبی پرندے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے، کچھ پانی میں ڈبکی لگانے اور چھوٹی مچھلیوں کے شکار میں مگن تھے۔

سمندر میں چھوٹی بڑی لانچیں اور ایک دو بڑے شپ لنگر انداز نظر آرہے تھے۔ میں جس کاٹیج میں تھا، یہ اس گودی کے چوبی اور تختہ دار پلیٹ فارم یا ''وارف'' پر بنا ہوا تھا اور سامنے ایک اسی طرح کی پانچ فٹ چوڑی چوبی روش، تقریباً چالیس پچاس گز تک سمندر میں چلی گئی تھی، جہاں ایک بڑی سی کارگو لانچ پلیٹ فارم سے لگی کھڑی تھی۔ اس کے مستول پر پھڑ پھڑاتے ہوئے پھریرے کو دیکھ کر میں چونکا تھا...... جس پر اینکر اور ایک شپ کا مخصوص مونوگرام بنا ہوا تھا...... یہی نہیں، ایسے ہی مونوگرام والی اور بھی لانچیں

بہادری

ایک عورت ایک ڈینٹسٹ کے کمرے میں داخل ہوئی اور محبت سے بولی۔ ''مجھے بہت جلدی ہے ڈاکٹر صاحب! آپ کو ایک دانت فوراً نکالنا ہے، براہ کرم اپنی فیس بتا دیں۔''

ڈاکٹر نے فیس بتائی تو عورت نے کہا۔ ''یہ تو بہت زیادہ ہے۔''

ڈاکٹر: ''اس میں میری فیس کے علاوہ جلد کو سن کرنے والی ادویات کی قیمت بھی شامل ہے۔''

عورت: ''آپ ادویات کو چھوڑیں اور یونہی دانت نکال دیں۔''

ڈاکٹر حیرت سے: ''آپ جیسی بہادر عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی۔''

عورت: ''دانت میرا نہیں میرے شوہر کا نکالنا ہے وہ باہر بیٹھا ہوا ہے۔''

انتخاب: ولید بلال، کراچی

وہاں لنگر انداز تھیں، ایک بڑے شپ کی باڈی پر بھی یہ مونوگرام کندہ دکھائی دیا تھا مجھے۔ اس مونوگرام کو دیکھ کر میرا ذہن جھٹکے کھانے لگا۔

یہ مونوگرام میرے لیے غیر شناسا نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سردہ بابا کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق، ان کے عائلی وکیل ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی صاحب نے اڈیسہ کمپنی (جہاز راں کمپنی) کے شیئرز میرے نام کرتے ہوئے، حوالے کیے تھے تو میں نے سرسری سا ان کا جائزہ لیا تھا، ان پر ہی میں نے اس طرح کا بنا ہوا مونوگرام دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ذہن میں فوراً اڈیسہ کمپنی کا تصور ابھرا تھا۔

''تو کیا یہ لانچ اڈیسہ کمپنی کی تھی...... جس کے صرف دو ہی مالک تھے، ایک میں اور ایک برازیلین نژاد لولوش۔

یہ سوچتے ہی مجھے اپنے اندر ایک عجیب سی سنسنی کا احساس ہوا۔ میں نے ایک بار پھر بڑے غور سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا، میرے سیدھے ہاتھ پر سفید ریت پر مشتمل ساحلی میدان سا تھا، جہاں ٹرک اور کچھ چھوٹی بڑی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میرے بائیں جانب دو تین اور بھی ایسے ہی مگر نسبتاً بڑے کاٹیج بنے ہوئے تھے، جن کے دروازوں کے سامنے لکڑی کے تختہ دار فرش پر فولڈنگ چیئرز اور میزیں دھری...... تھیں، وہیں کچھ لوگ موجود کھانے

پینے اور پائپ سگریٹ پینے میں مشغول تھے۔ ان میں کچھ مقامی اور کچھ غیر مقامی بھی نظر آتے تھے، یہ غیر ملکی سیاح بھی ہو سکتے تھے۔

''ہیلو......!''

ایک مترنم سی آواز پر میں چونکا...... اور آواز کی سمت میں نے گردن موڑ کر دیکھا، میرے بائیں جانب جہاں اور بھی چند لکڑی کے کیبن نما کاٹیج بنے ہوئے تھے، اس رخ پر ایک طرح دار حسینہ کھڑی نظر آئی۔ چپٹی ناک مگر دل فریب نقوش اور سیب جیسے گالوں والی ایک گوری چٹی لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کا قد درمیانہ تھا اور عمر انیس، بیس کے پیٹے میں ہی نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے کی جلد بہت ملائم اور شفاف محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سیاہ ریشمی رنگ کا بڑا چست ٹراؤزر پہن رکھا تھا جو صرف اس کی گوری اور سڈول پنڈلیوں تک ہی گویا پھنسا ہوا تھا، نیچے ہائی ہیل کے گولڈن بلیک سینڈل تھے جبکہ شرٹ اس کی کھلی ڈلی مگر شارٹ ہی تھی، اس کا رنگ گلابی تھا۔

مجھے یہ پہلی ہی نگاہ میں کوئی بری حسینہ معلوم ہوئی تھی...... وہ ''ہیلو'' کہنے کے بعد اب بڑی گہری۔۔ نگاہوں سے میرے نیم برہنہ اور توانا کسرتی جسم کو تکے جا رہی تھی۔

''ہم...... ہائی!'' میرے ہونٹوں سے بے اختیار برآمد ہوا تو وہ اسی طرح دل موہ لینے والی مسکراہٹ لیے چند قدم مزید میرے قریب آگئی اور ایک نگاہ میرے زخموں پہ ڈالنے کے بعد اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھاتے ہوئے اسی مترنم سی آواز میں بولی۔

''میرا نام سونگ کھلا...... ہے، میں ریٹائرڈ میجر کیم کھلا کی بیٹی ہوں...... تم اب کیسے ہو؟''

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں بہت سی باتیں، خدشات اور احتیاطی روش سے متعلق خیالات گردش کرنے لگے اور میں نے فوراً اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیا۔

''تمہارے زخم اب کچھ بہتر لگ رہے ہیں......'' وہ نغمہ بکھیرتی آواز میں بولی۔

''لگتا ہے تم بھی کالے بچھوؤں کا شکار کرنے چھائی اور کلی منجارو کی خطرناک سرزمین کی طرف قسمت آزمائی کے لیے نکلے تھے۔''

''ہاں...... ہاں، شاید کچھ ایسا ہی تھا...... لل...... لیکن یہ میری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے؟ مم...... مجھے کچھ ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا ہے......'' میں نے بھولنے کی اداکاری کی۔

''اوہو...... لگتا ہے، بچھوؤں کے زہر نے شاید تمہارے سینٹرل نروس سسٹم پر افیکٹ کیا ہے......'' وہ قدرے تشویش زدہ سے لہجے میں بولی۔

''ہاں......! شش...... شاید ایسا ہی کچھ ہوا ہے میرے ساتھ......'' میں نے اداکاری کے طور پر اپنی پیشانی کو ہاتھ سے چھوا تھا۔

''اینی وے! ڈونٹ وری، تم ٹھیک ہو جاؤ گے...... آؤ میرے ساتھ۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی اور اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا اور میں اس کے ہمراہ چل دیا۔

وہ مجھے جس کیبن میں لائی تھی اس کی شان و شوکت دیکھ کر ہی میں حیران رہ گیا۔ یہ کیبن آرام دہ اور ہر قسم کی اشیا اور فرنیچر سے مزین نظر آتا تھا۔ اس نے مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بٹھا دیا تھا اور خود میرے سامنے ایک کاؤچ پر بیٹھ گئی۔

''سوری! تمہیں اس بے کار سے کیبن میں رکھنا میری مجبوری تھی بلکہ میری نہیں یہ تمہارے علاج کے سلسلے میں مجبوری سمجھو...... لیکن اب تم بہتر ہو، میرا خیال ہے جوشم نے تمہارا صحیح علاج کیا ہے، میں اسے بلاتی ہوں تاکہ وہ ایک بار پھر تمہارا تفصیلی معائنہ کر لے۔''

اس نے لاسلکی والا ڈیوائس نما آلہ نکال کر برمی زبان میں کسی سے بات کی۔

تھوڑی دیر میں ہی کیبن کے دروازے پر دستک ہوئی اور ایک موٹا سا گنجے سر والا ادھیڑ عمر آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے جسم پر دھوتی نما کپڑا لپٹا ہوا تھا اور اوپری جسم میں شلوکا ٹائپ کا کچھ پہن رکھا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سونگ کھلا کو تعظیم پیش کی اور اپنا سر جھکا دیا۔

سونگ کھلا نے اس سے برمی زبان میں تحکمانہ کچھ کہا اور پھر وہ، جو بلاشبہ جوشم ہی تھا، میری طرف اپنی چھوٹی اور گول گول آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

''تم اس طرف آکر ذرا لیٹ جاؤ......'' سونگ کھلا نے قریب پڑے ایک آرام دہ بستر کی طرف اشارہ کیا۔ میں خاموشی سے اٹھ کر وہاں دراز ہو گیا۔ جوشم میری طرف بڑھا اور پھر جھک کر میرے زخموں کا بڑے غور سے معائنہ کرنے لگا۔

ذرا دیر بعد وہ سیدھا ہوا اور پھر باادب ہو کر سونگ کھلا سے برمی زبان میں کچھ کہنے لگا۔

سونگ کھلا بھی اس سے بارعب لہجے میں کچھ پوچھتی رہی۔ اس کے بعد جوشم نے جھک کر اسے تعظیم پیش کی اور

واپس دروازے کی طرف لوٹ گیا مگر جاتے وقت جب وہ دروازہ بند کرنے لگا تو میری طرف اس نے اپنی چندی چندی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے ہی، لیکن اس ایک لمحے میں اس کی میری جانب اٹھتی نظروں نے جانے کیوں میرے اندر ایک بے چینی کی نہ معلوم سی لہر دوڑا دی تھی۔ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا، ایسا کیوں ہوا تھا؟

”تم اب بالکل ٹھیک ہو......“

جوشم کے جانے کے بعد سونگ کھلا نے میری طرف دل فریب مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جوشم کہہ رہا تھا کہ تمہیں تین کالے بچھوؤں نے ڈنک مارا تھا۔ ان سیاہ پہاڑی بچھوؤں کا زہر بڑا خطرناک ہوتا ہے جو انسان کو پہلے دیوانہ، پاگل اور جنونی بنا ڈالتا ہے اس کے بعد انسان مر جاتا ہے۔“

”میں آپ کا شکریہ ادا کرنا بھول گیا مس سونگ کھلا......!“ میں نے کسی خیال کے تحت اس سے کہا اور بڑے محتاط طریقے سے اصل موضوع کی طرف آنے لگا۔

”اگر آپ لوگ میری مدد نہ کرتے تو آج میری لاش وہاں پہاڑی صحرا میں پڑی سڑ رہی ہوتی۔“

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں کسی خفتہ جذبے کی چمک ابھری اور گلاب سے لبوں پہ اس کی بھیدوں بھری مسکراہٹ نے لے لی اور وہ بتانے لگی۔

”میں اسے تمہاری خوش قسمتی ہی کہوں گی کہ اس وقت میں اپنی پوری شکاری ٹیم کے ساتھ وہاں موجود تھی جس وقت میں اور میرے ساتھی ان نایاب کالے بچھوؤں کا شکار کرنے آئے تھے۔ حالانکہ اس نسل کے بچھو دھوپ اور گرمی سے گھبراتے ہیں، لیکن شاید انہیں کافی عرصے سے کوئی شکار نہیں ملا تھا اور وہ تمہاری وجہ سے اپنے بلوں سے نکلنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہم نے وہاں پہلے سے ہی ٹریپنگ کر رکھی تھی۔ جوشم ہمارے ساتھ ہی ہوتا ہے، ہم اکثر زہریلے بچھوؤں کا شکار ہوتے رہتے ہیں، اسی لیے وہ ہمارا وید اور ڈاکٹر ہے۔“

وہ خاموش ہوئی تو میں نے سوچنے اور اپنے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ کچھ یاد آ رہا ہے کہ یہ بچھو اچانک ہی نجانے کہاں سے نمودار ہوئے تھے، اور ہاں...... میرے ساتھ میری ایک ساتھی (سوشیلا) بھی تھی، کیا وہ تم لوگوں کو نہیں ملی وہاں؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کر لیں۔

”نہیں، ہمیں وہاں تمہارے سوا اور کوئی نظر نہیں آیا تھا، سوائے تمہاری جیپ کے۔“

”او...... شاید میں اب بھی کچھ بھول رہا ہوں...... میں اکیلا ہی تھا۔“ میں نے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے کہا۔

”ویسے تم ہو کون؟ اور وہاں اتنے خطرناک علاقے میں کیا کر رہے تھے؟“ سونگ کھلا نے اچانک میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔ مجھے اس سے اس سوال کی پہلے سے امید تھی اور میں کسی وجہ سے اپنے بارے میں اسے سچ بتانے سے گریزاں تھا لہٰذا اس کے سوال پر میں نے ایک بار پھر اپنا سر پکڑ لیا۔

مجھے ابھی تک اس کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکی تھی تو میں اس پر کیسے اتنی جلدی بھروسا کر لیتا، جبکہ یہ لڑکی تھی بھی بری، تاہم اس نے میری جان بچائی تھی۔

”اوکے...... اوکے، اپنے ذہن پر بوجھ مت لو ابھی...... آہستہ آہستہ تمہیں سب یاد آ ہی جائے گا۔ اس بات کی تسلی مجھے جوشم نے بھی دی تھی۔“ وہ مجھے پریشان اور فکرمند سا دیکھتے ہوئے بولی اور یوں اس کا سوال گول ہوتے ہی میں نے چالاکی سے اس کے بارے میں پوچھنے کا موقع ڈھونڈ نکالا۔

”سرداریاں“

سردار بوٹا سنگھ کی بیوی بیاہ کے تیسرے دن انہیں چھوڑ کر اپنے میکے جا بیٹھی۔ ان تین دنوں میں اس نے آنے جانے والوں کو اپنے شوہر کی بہت سی برائیاں بتائیں جو اس کے جاتے ہی پورے محلے میں گونجنے لگیں۔

”یار! تو بڑا ظالم ہے۔“ ایک بے تکلف دوست نے سردار جی کو راستے میں روک کر شکایت کی۔ ”نئی نویلی دلہن کو اتنا ستایا کہ بے چاری تنگ آ کر گھر سے بھاگ گئی۔“

”گرو کی قسم، یہ سب جھوٹ ہے۔ ستانا کیا، میں نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا... اسے بالکل اپنی بہن کی طرح گھر میں رکھا...“ سردار بوٹا سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں اپنی صفائی پیش کی۔

سردار جوگیندر سنگھ نے بے روزگاری سے تنگ آ کر اپنے ایک ساتھی کی مدد سے ایک بچے کو اسکول سے واپسی پر اغوا کر لیا اور اس سے کہا کہ وہ اپنے باپ سے پانچ لاکھ روپے لے کر آئے ورنہ وہ اسے مار ڈالیں گے۔

بچے کے جانے کے بعد یکا یک وہ فکرمند ہو گئے کہ بچہ رقم لانے کے بجائے گھر میں بیٹھ گیا تو ساری مہم جوئی غارت ہو جائے گی، کوڑی بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ان کے ساتھی نے تسلی دی کہ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بچہ بھی ایک سردار کا پوت ہے، اس کا باپ اسے رقم دے کر ضرور بھیجے گا۔

یہی ہوا۔ دو گھنٹے بعد بچے نے پوری رقم لا کر ان کے حوالے کر دی۔

محمد کاشف کی سوغات، صادق آباد سے

"آپ لوگ کون ہو؟ اور کیا کرتے ہو...... اور یہ جو باہر لانچیں لنگر انداز ہیں کیا یہ آپ کی ہیں؟"

اس نے میرے سوال پر ایک گہری سانس لی اور بتانے لگی۔ "ہم بچھوؤں کے بیوپاری ہیں...... فی زمانہ یہ بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔ ان بچھوؤں سے خاص قسم کی منشیات بھی تیار کی جاتی ہے جو جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ اب مغربی ممالک میں بھی بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔ لیکن بچھوؤں کا زہر زیادہ تر ادویات بنانے اور کینسر کی دوا بنانے کے کام آتا ہے۔"

"بچھوؤں کا زہر تو واقعی دواؤں میں کام آتا ہے، مگر یہ بچھوؤں کا نشہ کرنا، اس کی معلومات میری صفر ہیں، یہ نشے اور منشیات کے طور پر کیسے کام آتا ہے؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ میرے سوال پر وہ اسرار بھری مسکراہٹ...... سے بولی۔

"کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں، جو بار بار بچھوؤں کے کاٹنے کا شکار ہوتے رہیں تو انہیں اس کے زہر کی عادت ہو جاتی ہے اور پھر وہ ایک بچھو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس پال لیتے ہیں، وہ ان سے خود کو کٹواتے رہتے ہیں۔ دوسرے نشے کی لت۔ اس کی دم سے ڈنک نکال کر اسے سوکھایا جاتا ہے اور پھر اسے پیس کر چرس اور ہیروئن میں ڈال کر پیا جاتا ہے، کچھ لوگ بہت سارے بچھوؤں کو جلا کر اس کے گرد بیٹھ جاتے ہیں اور اس کا دھواں سونگھتے ہیں اور سرور میں جھومتے ہیں اور کچھ......؟"

وہ ایک ادا سے میری طرف دیکھ کر بولی تو اس کی نگاہوں میں خمار اترا ہوا میں نے صاف محسوس کیا تھا۔ یہی نہیں اس کے شفاف گلاب جیسے گالوں میں بھی مخصوص قسم کی سرخی دوڑ گئی تھی، لہجہ مدہوشی میں مدغم ہوتا جا رہا تھا۔

"میں...... آپ کی بات سن رہا ہوں۔"

"ہم رنگون کے مضافات یا کہیں میں رہتے ہیں، ہم سے مراد میں اور میرے پاپا، ہم دونوں باپ بیٹی کا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ پاپا مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میں بھی ان سے بے حد پیار کرتی ہوں۔ رنگون میں ہمارا اپنا گھر ہے جو زیادہ بڑا تو نہیں لیکن بہت خوبصورت اور آرام دہ ہے...... میرے پاپا آرمی میں لیفٹیننٹ بھرتی ہوئے تھے، پھر ترقی کرتے ہوئے کیپٹن اور میجر بنے۔ پتا نہیں وہ آرمی میں کیسے چلے گئے، ورنہ تو ان کا رجحان کاروبار وغیرہ اور سیر سپاٹے کرنے کا زیادہ تھا۔ میں خود بھی اپنے پاپا کی طرح سیلانی اور ایڈونچر طبیعت کی مالک ہوں۔

کسی غلطی کی پاداش میں میرے پاپا کو قبل از وقت ریٹائرڈ کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار شروع کرنے کی ٹھانی اور ایک دوست کے مشورے پر انہوں نے بچھوؤں...... کی سوداگری شروع کر دی۔ اس سے اس قدر منافع ہوا کہ ہم امیرانہ شان و شوکت سے رہنے لگے، ہمارا چھوٹا گھر عالیشان حویلی میں بدل گیا، نوکر چاکر گاڑیاں، اب کیا کچھ نہیں ہے ہمارے پاس۔ پہلے ہم صرف دونوں باپ بیٹی بچھوؤں کا شکار کرتے تھے، اب ہمارے ساتھ غلاموں اور خادموں کی پوری پلٹن ہوتی، اس کام میں ہمیں بڑا مزہ آتا ہے، خاص کر مجھے تو بہت ہی ایڈونچر لگتا ہے۔"

وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے اپنی امارات سے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اس کی اور اس کے "پاپا" کی تعریف کی پھر باتوں باتوں میں دھڑکتے دل سے مگر محتاط انداز میں اصل بات کی طرف آیا اور بظاہر سرسری انداز میں بولا۔

"یہ لانچیں اور جو دو شپ دور سمندر میں لنگر انداز ہیں وہ سب آپ کی، میرا مطلب ہے آپ کے پاپا میجر کیم کھلا کی ہی ملکیت ہیں؟" میں نے یہ کہتے ہوئے اپنے لہجے میں مرعوب آمیز حیرت بھی سمو لی تھی۔

"نہیں، ہماری تو نہیں ہیں مگر یہ سب ہمارے ہی اختیار میں ہوتی ہیں......" اس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں غرور کی جھلک تھی۔

"اچھا!" میں نے یونہی گومگو سے لہجے میں کہا۔

حسبِ توقع وہ پھر رطب اللسان ہو کر بولی۔

"بس! یونہی سمجھو کہ یہ ہماری ہی ہیں......"

میری تسلی نہیں ہوئی، تاہم میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! یہ تو ہے...... آپ کے زیرِ استعمال ہیں تو یقینا ایک طرح سے آپ ہی کی ہوئیں...... ویسے مجھے ان کے پھریروں میں لگا ہوا جو مخصوص مونوگرام ہے، وہ مجھے بھلا معلوم ہوتا ہے، شاید یہ کسی کمپنی کا ہے؟"

"ہاں! اڈیسہ کمپنی کا ہے یہ مونوگرام......" اس نے کہا اور میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا......

"اس کے ساتھ ہماری پرانی ٹھیکے داری ہے۔ ہمیں جتنے شپ اور لانچیں درکار ہوتی ہیں وہ ہمیں بلا تاخیر کرائے پر ہائر کر دی جاتی ہیں لیکن......" وہ کہتے کہتے رکی تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''لیکن کیا......؟ مس سونگ کھلا؟''

فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مجھے اتنی غیر معمولی دلچسپی کا اور اتنی بے چینی سے اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا، یہ کہہ چکنے کے بعد اگر میں فوراً ہی کوئی تاویل پیش کرنے کی کوشش کرتا تو یہ مزید اسے چونکا دینے والا عمل کہلاتا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر یہ دونوں بری باپ بیٹی کسی نہ کسی حوالے سے لولوش (اور میری) اس کمپنی سے منسلک تھے تو میرا ابھی ذکر، چاہے سرسری سہی لولوش یا اس کے کسی خاص گماشتے کے لیے چونکا دینے کا باعث بنتا، جبکہ میں نے اب ان دونوں باپ بیٹی کو لولوش کے گلے کا پھندا بنانے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس بات کی فکر بھی تھی کہ مجھے اپنے تینوں ساتھیوں کے لیے بھی کچھ کرنا تھا۔

''خیر چھوڑو یہ باتیں، تم بلاوجہ بور ہو گے......تم اب اپنے بارے میں مجھے نہیں بتاؤ گے کہ تم کون ہو، کس ملک سے تعلق رکھتے ہو؟ اور وہاں اس قدر خطرناک اور جزیرے کے بعید ترین دور دراز علاقے میں کیا خاک چھانتے پھر رہے تھے؟'' اس نے بدستور میٹھی میٹھی نگاہوں سے میرا اور میرے چہرے کا طواف کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ میرے توانا اور کسرتی نیم برہنہ جسم کو عجیب عجیب سی نگاہوں سے تکتی بھی جاتی تھی۔

میں نے بھی اس کی بات کو سردست آئی گئی کرتے ہوئے خود کو سمجھایا کہ......''شہزی میاں! حلوا ٹھنڈا کر کے کھاؤ......ورنہ منہ جل جائے گا......تقدیر نے تمہیں اپنے سب سے بڑے دشمن کی شہ رگ تک پہنچنے کا جو سنہرا موقع دیا ہے، اسے مناسب وقت پر ہی استعمال میں لانا......''

میں نے سر جھٹک کر موضوع بدلا جواباً اس سے بولا۔ ''سچی بات بتاؤں تو مجھے اپنے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں آرہا ہے، یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو دماغ میں دھندی چھانے لگتی ہے......کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے میں اور میرے کچھ ساتھی کسی وحشی اور آدم خور قبیلے کے نرغے میں آ گئے تھے، اور سب مارے گئے تھے، میں بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا تھا، پھر میری چشم تصور میں ایک چھوٹے جہاز کا تصور ابھرتا ہے، جو کسی ٹیکنیکل خرابی کے باعث کہیں گر کر تباہ ہو گیا تھا، اور......اور......آہ، میرا سر......درد سے پھٹا جا رہا ہے......''

میں نے کمال اداکاری کے ساتھ اپنا سر تھام لیا اور صوفے پر نیم دراز سا ہو گیا، یوں، جیسے بے ہوش ہونے لگا ہوں، یا میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا ہو۔

میری توقع کے عین کے مطابق سونگ کھلا کے حسین چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہو گئے اور وہ تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور میری جانب بڑھی۔

وہ میرے بالکل قریب صوفے پر بیٹھ گئی اور میری پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میں اس کے جوان رعنا وجود کی قربت سے گھبرا سا گیا، مگر مجبوری تھی کہ ایسے ہی بے سدھ سا پڑا رہا، تاہم ہولے سے کراہنے کے انداز میں بولا۔

''مس کھلا! کیا تم اپنے وید جوشم سے میرا علاج نہیں کروا سکتیں؟ کم از کم میری یادداشت تو ٹھیک ہو جائے، مجھے پتا تو چلے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں؟'' کہتے ہوئے میں نے اپنے لب و لہجے میں بے بسی اور مایوسی سمو لی تھی، وہ بڑے رسان کے ساتھ میرے اور قریب آ گئی، اس قدر کہ مجھے اس کی گرم سانسوں کی بھبک اپنے چہرے پہ محسوس ہونے لگی اور بہت دھیرے دھیرے سے میرے بالوں بھرے فراخ سینے پر اپنے ہاتھوں کی نرم گرم سی انگلیاں پھیرتے ہوئی بولی گی۔

''تم میرے ہوتے ہوئے کسی بات کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم میرے ساتھ......چلو، اٹھو، باہر کھلی فضا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ بہت اچھا موسم ہو رہا ہے باہر کا، تم نے تو شاید ابھی تک کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہو گا۔''

اس کی بات صحیح تھی۔ میری نیند تو گویا بے ہوشی کے عالم میں ہی پوری ہو چکی تھی، مگر بھوک کا احساس بڑھ گیا تھا۔ میں ایک ہاتھ سے اسے بہ آہستگی دور کرتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ وہ بھیدوں بھرے انداز میں مسکرائی۔ کیونکہ جب میں اٹھا تو میرا وجود اس کے بدن کو چھونے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فرینگی سی اتر آئی تھی وہ ''لوزر'' سی ہو رہی تھی اور میں بھی ابھی دانستہ اسے اسی میں جتلا رکھنا چاہتا تھا، اس لیے جب اس نے یونہی مجھے سہارا سا دیا تو میں تقریباً اس کے شباب آفریں بدن سے لپٹ ہی گیا تھا، میں نے اس کے دہن سے دبی دبی سسکاری کی مدھر آواز سنی تھی......اور جب وہ پوری طرح اس قربت سے حظ اٹھانے کے مخمور سے موڈ میں نظر آنے لگی تو میں دانستہ تھوڑا لڑکھڑایا اور اسی بہانے خود کو اس کے آتشی اور دہکتے ہوئے بدن سے دور کر دیا۔

''مجھے کپڑوں کی ضرورت ہے......باہر میرا یوں نیم برہنہ حالت میں تمہارے ساتھ بیٹھنا کچھ اچھا نہ لگے گا۔''

میری بات پر وہ ایک دم ہی کھلکھلا کر ہنسی تھی اور میری ناک کی پھنگی کو وہ بڑے دُلار سے چٹکی لیتے ہوئے کھنکتے لہجے میں بولی۔

”بہت شرمیلے ہو تم...... ورنہ تو تمہارے جیسے جوان اور بھرپور توانا ورزشی جسم کے مالک مرد اسی طرح رہنا پسند کرتے ہیں......“

”پلیز، مجھے میرے ہی کپڑے دلا دو۔“ میں نے اس کی معنی خیز گفتگو کا کوئی نوٹس لیے بغیر اس سے پھر گزارش کی تو وہ اثبات میں اپنے سر کو ہلاتے ہوئے بولی۔

”کپڑے مل جائیں گے...... مگر تمہارے نہیں، تمہارے سائز کے کپڑے منگوا دوں گی، وہ کپڑے تو بالکل بھی پہننے کے قابل نہیں رہے۔“

”ویسے ہم ہیں کہاں؟ میرا مطلب ہے......“

”یہ پورٹ بلیئر کا علاقہ ہے جو انڈیمان کا صدر مقام بھی کہلاتا ہے۔ آؤ......“ اس نے جواب کہا۔

ہم باہر آگئے...... رات سمندر میں جھک آئی تھی۔ خنک خرام ہوا میں آبی نباتات کی بو رچی ہوئی تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ کبھی کسی بگلے کی الساتی ہوئی آواز ابھرتی تو فضا ہولے سے تھرک جاتی۔ گودی میں روشنیاں چمکنے لگی تھیں۔ دو لانچیں سمندر کی وسعتوں کی طرف دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھیں۔ لکڑی کی جو روش سمندر کے کافی آگے تک بنائی گئی تھی اور جہاں وہ شپ لنگر انداز تھے، اب وہاں ایک ہی نظر آرہا تھا جبکہ دوسرے کی دور جاتی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ سمندری لہریں چوبی پلیٹ فارم کے ستونوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

”یہ جگہ وہاں سے کتنی دور ہوگی جہاں میں تھا......؟“

ہمارے کیبن کے سامنے سمندری لہروں کے اوپر آگے کو نکلے ہوئے تختے پر تین چار فولڈنگ چیئرز بچھادی گئی تھیں اور درمیان میں اسی طرح کی ٹیبل بھی دھری پڑی تھی۔ وہاں براجمان ہوتے ہی میں نے سونگ کھلا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

اسی وقت دو افراد وہاں آن دھمکے، یہ بھی بری تھے۔ سرسری نگاہ مجھ پر ڈال کر ان میں سے ایک نے سونگ کھلا کے سامنے سر کو جھکانے کے انداز میں جنبش دی تو اس نے اس سے کچھ کہا۔ ایک تو چلا گیا دوسرا وہیں کھڑا رہا۔ مجھے جانے کیوں اس سے کوفت ہونے لگی۔ میں خاموش رہا۔

”ہم اس وقت پورٹ بلیئر کے مقام پر فش روک کے جزیرے میں موجود ہیں اور یہ انڈیمان کا صدر مقام یعنی ساؤتھ انڈیمان کہلاتا ہے...... اس کے پیچھے لٹل انڈیمان ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”جبکہ تم آج تپتی دوپہر میں نارتھ انڈیمان میں کالے بچھوؤں کا شکار ہونے والے تھے۔“

”اوہ......“ میرے منہ سے نکلا۔

میں نے ایک بار پھر قریب تنے کھڑے اس آدمی کی طرف دیکھا تھا۔

سونگ کھلا نے اپنے اس آدمی کو مخصوص اشارہ کیا جس کی موجودگی مجھے کوفت میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ اسے سونگ کھلا نے شاید جانے کا اشارہ کیا تھا، وہ سر کو تعظیمی جنبش دے کر خاموشی سے چلا گیا۔

”یہ کیوں کھڑا ہو گیا تھا؟“ میں نے ایک نظر اس جاتے ہوئے آدمی کی طرف دیکھا۔

”یہ ہمارے باڈی گارڈز میں سے ایک تھا۔“

”باڈی گارڈز......؟“ میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں!“ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پہ ایکا ایکی ایک گہری متانت سی کھنڈ آئی۔ پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کا بھنور چکراتا سا محسوس ہوا جس نے مجھے اندر سے کچھ ٹھٹکا دیا۔

”میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ...... ہماری کچھ لوگوں سے دشمنی چلی آرہی ہے......“ بالآخر وہ بولی۔

”کون لوگ ہیں وہ......؟ اور دشمنی کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو سب سے بڑی مشکل ہے کہ...... دشمن خود کو ظاہر نہیں کر رہا ہمارے سامنے...... وہ چھپ کر ہم پر وار کر چکا ہے۔ ہمارا ذاتی شپ تھا، میں اور پاپا اس میں اپنے لیبر کے عملے سمیت سوار تھے، اس میں بم لگا دیے گئے تھے، وہ تباہ ہو گیا، ہمارے بہت سے خلاصی مارے گئے، خود میں اور پاپا مشکلوں سے سمندر میں چھلانگ لگا کر لائف جیکٹوں کے سہارے ساحل تک پہنچے تھے۔“

”او...... اسکیرنگ......“ میں نے مختصراً تبصرہ کیا۔

”دو بار میرے پاپا پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا، مجھے بھی ایک بار اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بدھا کی مہربانی سے ہم دونوں باپ بیٹی بچے رہے......“

”پھر تو بڑے خطرناک حالات سے تم دونوں باپ بیٹی گزر رہے ہو......“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہ ہیں کون لوگ؟

آخر تم لوگوں نے پتا چلانے کی کوشش تو کی ہی ہوگی؟'' میں نے اسے کریدنے کی کوشش چاہی۔

''ظاہر دشمن سے چھپا ہوا دشمن زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔

اسی وقت دو افراد کھانوں کی بڑی بڑی دوٹرے اٹھا لائے۔ ان کی اشتہا انگیز خوشبو سے میری بھوک دوچند ہو گئی۔ کھانا بہت لذیذ اور نت نئی ڈشز پر مشتمل تھا۔ زیادہ تر ''سی فوڈ'' تھا۔ وائٹ رائس، بھنا ہوا گوشت، کباب اور فش فرائی تھی۔ موٹی موٹی نان کی طرح کی روٹیاں تھیں۔ سوئٹ ڈش میں پڈنگ اور رسیلے پھل تھے۔

''پاپا بھی آرہے ہیں......'' معاً میرے کانوں میں سونگ کھلا کی آواز ابھری۔ میں تھوڑا چونک سا گیا۔ میں تقریباً کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔

''پاپا......'' سونگ کھلا کہہ کر مسکرائی۔ میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے گھومنے کے انداز میں پلٹا تو دو افراد کو قریب آتے دیکھا۔ ان میں سے ایک درمیانے قد کا سونٹڈ بونٹڈ آدمی تھا۔ اس نے شارک اسکن کا بیش قیمت کوٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا چہرہ گول اور سر کے بال ہلکے گرنیلگوں مائل سفید ہو رہے تھے۔ ہونٹ پتلے اور کاندھے ڈھلکے ہوئے سے لگتے تھے۔ اس کی صورت میں مجھے سونگ کھلا کی شبیہہ نظر آتی تھی اور اسی سبب میرا اس کے بارے میں فوری اندازہ یہی تھا کہ یہ سونگ کھلا کا باپ میجر کیم کھلا ہی ہوسکتا تھا جبکہ ساتھ اس کے ایک لمبا تڑنگا اور گنجے سر والا آدمی مجھے اس کا باڈی گارڈ ہی محسوس ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر کرخت سی سنجیدگی تھی اور بغل سے ہولسٹر جھول رہا تھا۔ وہ بڑی برماتی نظروں سے میری طرف ہی گھور رہا تھا۔

''یہ میرے پاپا میجر کیم کھلا ہیں......'' سونگ کھلا نے ان کے قریب آکر رکتے ہوئے تعارفاً مجھ سے کہا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہونے پر میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسکراتے ہوئے کیم کھلا کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا، مجھے اس کے انداز سے یوں لگا جیسے اس نے چاروناچار ہی مجھ سے مصافحہ کرنے کی زحمت گوارا کی ہو...... پھر جب میں نے اس کرخت صورت کی طرف بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ صرف مجھے گھورتا رہا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ مجھے ہلکی سی خجالت کا احساس ہوا اور میں نے اپنا خالی ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

کیم کھلا نے مجھے فوراً نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بیٹی سے کچھ کہا تھا۔ سونگ کھلا مسکرا مسکرا کر اپنے پاپا سے باتیں کر رہی تھی، دونوں باپ بیٹی کے درمیان برمی زبان میں مختصر سی گفتگو ہوتی رہی...... پھر وہ وہاں بیٹھے بغیر واپس لوٹ گیا، مگر جاتے جاتے ایک برماتی ہوئی نظر اس نے میرے چہرے پر ڈالی تھی۔

اس کے جانے کے بعد سونگ کھلا کچھ خفیف سی ہو کر مجھ سے بولی۔ ''پاپا آج کل اسی مسئلے کی وجہ سے کچھ پریشان سے ہیں، اسی لیے وہ تم سے کوئی بات نہ کر پائے تھے۔''

اس نے بھی شاید میرے ساتھ اپنے باپ کی بے رخی محسوس کرلی تھی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کوئی بات نہیں، میں یہ بات سمجھ رہا تھا...... ویسے کیا کہہ رہے تھے میرے بارے میں؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں نے یہی بتایا کہ تم ابھی تک ایک شاک کی کیفیات سے گزر رہے ہو، اسی لیے تم اپنے بارے میں ابھی کچھ بتانے سے قاصر ہو۔''

میں نے محسوس کیا کہ یہاں سوائے سونگ کھلا کے کوئی مجھ پر اتنی آسانی سے بھروسا نہیں کر رہا، مجھے اب اپنی یادداشت کھونے کا یہ ڈراما زیادہ دیر نہیں چلانا چاہیے۔ اگر ان کا کسی نہ کسی حوالے سے لولوش سے تعلق تھا بھی تو ایک اجنبی اور گمنام آدمی کی حیثیت سے میری خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچ سکتی تھی، لہٰذا اب یہی بہتر تھا کہ میں اب یہ ڈراما موقوف کر کے اپنی کوئی جعلی شناخت کے حوالے سے اپنا تعارف کرواہی دوں۔

''نہیں سونگ! میرا خیال ہے میری یادداشت اب دھیرے دھیرے بحال ہونے لگی ہے۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں شاید اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک چھوٹے دو انجنوں والے جہاز میں تھا، کسی خرابی کے باعث وہ گر کر تباہ ہو گیا اور خوش قسمتی سے میں بچ نکلا۔ پھر مجھے...... ہاں! میرے ساتھ ایک ساتھی بھی تھا۔ مجھے اسی کی تلاش تھی۔ یہاں پہنچ کر میں رکا اور ذہن پر زور دینے لگا۔ پھر بولا۔

''ہاں! مجھے کچھ لوگ جیپ میں ملے تھے، وہ شاید کوئی شکاری تھے یا پھر پتا نہیں کون تھے، ان پر وحشیوں نے حملہ کر دیا تھا، وہاں سے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اپنی اور اس کی جان بچا کر بھاگ نکلا تھا، میرا ساتھی وجے اچانک کہیں گم ہو گیا، میں اس کی تلاش میں اس بنجر پہاڑی اور نیم صحرائی علاقے میں کالے بچھوؤں کے نرغے میں جا

پھنسا......اور......اور مائی گاڈ! مجھے سب یاد آرہا ہے......''

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ سونگ کھلا متحیرانہ انداز میں میرا چہرہ تکے جارہی تھی۔

''م...... میرا نام...... ررر...... راج کمار ہے اور میں...... ممبئی میں رہتا تھا، اپنے ماں باپ کا اکلوتا تھا، مگر کسی پرانے خاندانی تنازع میں میرے ماں باپ کو قتل کر دیا گیا اور مجھے ایک پرانا خاندانی نوکر اپنے ساتھ لے گیا تھا، میں وہیں رہنے لگا تھا۔ اس کا ایک میری ہی عمر کا بیٹا بھی تھا، ہم دونوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ وہ ایک فلائنگ کلب جوائن میں چھوٹی موٹی ملازمت کیا کرتا تھا، مجھے بھی اس نے وہیں لگوالیا...... وہاں میں چھوٹا موٹا کام کرلیا کرتا تھا۔ پھر ایک دن اسٹاف کے طور پر ہم دونوں ایک جہاز پر رنگون جانے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔

''تھینکس گوتمابدھا! تمہیں سب یاد آگیا...... یقین جانو مجھے بے حد خوشی ہورہی ہے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''تو تمہارا نام راج ہے...... راج کمار! ہاؤ سوئٹ نیم، بالکل رومانی سا نام ہے...... اور شہزادوں جیسا بھی...... تمہیں تو ہندی (اُردو) بھی آتی ہوگی، میں بھی یہ تھوڑا بہت بول لیتی ہوں۔''

میں جواب میں مسکرادیا۔ میں جانتا تھا کہ برما میں ہندی اور اردو بھی بولی جاتی تھی، وہاں کافی تعداد میں مسلم گھرانے بھی آباد تھے۔ تاہم میں نے فوراً ہی اپنے چہرے پہ فکرو پریشانی کے آثار بھی طاری کرلیے۔

''کیا ہوا؟ تم ایک دم پریشان سے ہوگئے؟'' وہ اس بار اردو میں بولی۔

''وجے نجانے کس حال میں ہوگا، میں اس کے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا، وہ میرا محسن بھی تھا۔ مم...... مجھے واپس جانا ہوگا، اسی علاقے میں، میں اپنے محسن کے بیٹے وجے کو بے یارومددگار وہیں چھوڑ آیا...... آہ! میں کتنا خود غرض ہوں...... نہیں، مس سونگ کھلا مجھے دوبارہ وہاں جانا ہوگا......''

میں نے ایک فرضی کہانی بنائی تاکہ وہاں دوبارہ جا کر اپنے تینوں ساتھیوں اور سوشیلا کو تلاش کرسکوں...... جبکہ سوشیلا بے چاری پر تو مجھے رہ رہ کر ترس آرہا تھا، وہ پہلے ہی زخمی تھی اور نجانے بے چاری اب کس حال میں تھی اور کہاں تھی۔ مجھے یہ سوچ کر بھی بے حد دکھ محسوس ہونے لگا کہ وہ میرے بغیر اس خطرناک وحشیوں کے علاقے میں کس قدر ہراساں اور پریشان ہورہی ہوگی۔

تاہم میری ڈرامائی بے قراری اور تفکر آمیز بے چینی (جو ایک طرح سے حقیقی بھی تھی) پر سونگ کھلا پریشان سی ہوگئی۔

اس نے فوراً میرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ازراہِ تشفی بولی۔ ''تم فکر مت کرو...... ہمارے پاس لانچوں اور تیز رفتار موٹر بوٹس کی کیا کمی ہے! ہم اسے تلاشنے کی پوری کوشش کریں گے۔ یوں بھی ہمیں کالے بچھوؤں کے شکار کے لیے دوبارہ اس علاقے کا رخ کرنا پڑے گا۔''

اس کی بات پر میں اندر سے چونکا تھا۔ سونگ کھلا میرے بہت کام آسکتی تھی مگر اس کے ساتھی اور باپ کیم کھلا سے مجھے ''بنتی'' نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر سونگ کھلا بھی میں سمجھتا تھا کہ کم نہیں تھی میرے لیے، اپنے آدمیوں پر اس کا حکم بھی چلتا تھا، رہا اس کا باپ تو وہ اپنے باپ کی اکلوتی اور لاڈلی اولاد تھی۔

یہ بدھ مذہب کے پیروکار تھے اور ہندوؤں کی طرح ان کے دلوں میں بھی مسلمانوں کے لیے تعصب اور نفرت کا جذبہ موجود ہوسکتا تھا، اگرچہ میرا ابھی انہیں پتا نہیں چلا تھا کہ میں الحمد للہ ایک مسلمان ہی تھا، میں بتانا بھی نہیں چاہتا تھا، اسی لیے مصلحتاً خود کو انڈین ہندو ہی ظاہر کیا تھا۔

مجھے امید تھی کہ اب شاید میری شناخت کے بعد میں ان کی رکھائی اور بے رخی کا زیادہ شکار نہ بنوں۔

تاہم میں نے سونگ کھلا کے تسلی دینے پر...... خوش ہو کر اس سے کہا۔ ''کیا واقعی؟ تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گی؟ لیکن...... آئی تھنک، تمہارے پاپا یہ کب چاہیں گے کہ......''

''ان کی تم فکر مت کرو......'' وہ بولی۔ ''دراصل وہ ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ کسی نئے اور اجنبی آدمی پر کم ہی اعتبار کررہے ہیں، مگر اب تم نے اپنے بارے میں بتادیا ہے تو مجھے امید ہے اب ان کی تمہاری طرف سے کافی تسلی ہوجائے گی۔''

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک کام کرو...... تم جا کر کپڑے بدلو، تمہارے سائز کے کپڑے میں نے نکلوا دیے ہیں، میں تب تک پاپا سے مل کر آتی ہوں...... اینڈ ڈونٹ وری...... پاپا اچھے آدمی ہیں......''

وہ یہ کہہ کر وارف کے چوبی تختے پر چلتی ہوئی سیدھی چلی گئی، جدھر اور بھی کیبن بنے ہوئے تھے۔ میں اسی پرتعیش کیبن میں آگیا۔ وہاں میں نے کپڑے پہنے جو بس میرے جسم پر فٹ ہی آئے تھے۔ بوٹ بھی تھے۔ ڈریس آرام دہ

اور اچھا تھا۔ نئے کپڑے پہن کر مجھے تازگی کا احساس ہوا۔ میں اب خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں کیبن سے نکلا اور دوبارہ وارف پر آگیا۔ اس کی ریلنگ پر ٹک کر میں سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔

مختلف لانچوں کی اس وقت بھی آمد و رفت جاری تھی۔ ان میں لکڑی کے بکسوں اور چھوٹے کنٹینروں میں سامان بھی لادا جا رہا تھا۔ میں ریلنگ کے سہارے یہ سارا نظارہ کرتا رہا۔ مجھے درحقیقت سونگ کھلا کی واپسی کا انتظار تھا، میں اس کے ذریعے امریکا آنسہ خالدہ کو فون کرنا چاہتا تھا اور زہرہ بانو کو بھی، عابدہ تو میرے لیے ایک خواب کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میں اس کے پاس جانے کے لیے جتنی بھی تگ و دو کرتا اتنا ہی اس سے دور ہوتا جاتا تھا، گویا میں ایک متلاطم خیز سمندر میں غوطہ زن تھا اور عابدہ ایک خوفناک بھنور میں پھنسی ہوئی تھی، میں جس قدر طوفانی موجوں کا مقابلہ کرتا اسے بھنور میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے اس کی طرف بڑھتا، مگر جیسے کوئی تند اور دیوہیکل لہر مجھے پھر اس سے پرے...... اور دور پٹخ دیتی، نجانے وہ بے چاری وہاں امریکا کے کون سے قید خانے میں پُرمصائب شب و روز گزار رہی تھی، کچھ پتا نہیں تھا مجھے، مگر آنسہ خالدہ اس کے لیے اپنی سی کوششوں میں مصروف بھی تھی اور مجھے اس سے متعلق پل پل کی خبریں بھی دیتی رہتی تھی، موہن کے گھر میں بھی میں نے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر نہیں کر سکا تھا، جبکہ زہرہ بانو سے پھر بھی بات ہوگئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ اگر میں کسی طرح لولوش پر کامیابی سے ہاتھ ڈال دیتا تو عابدہ کی بازیابی وغیرہ کے سلسلے میں کچھ مثبت راہ نکل سکتی تھی، کیونکہ آفٹر آل...... لولوش اس خبیث اور متعصب یہودی نژاد امریکی سی آئی اے کے عہدے دار باسکل ہولارڈ کا چہیتا داماد تھا۔ پھر اس کی بیوی انجیلا ہولارڈ بھی باسکل ہولارڈ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ میں برما میں رہتے ہوئے ان کے ذریعے باسکل ہولارڈ پر عابدہ کے سلسلے میں خاطر خواہ دباؤ ڈال سکتا تھا۔

درحقیقت یہ میری نہیں بلکہ اول خیر کی ''پری پلاننگ'' تھی اور میں اسی پر کاربند رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سونگ کھلا کی صورت میں مجھے یہ پلانڈ منصوبہ بندی اب کسی کنارے لگتی نظر آ رہی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا کی طرف سے بھی تشویش و پریشانی لاحق تھی، سوشیلا کو بھی تلاشنا تھا اور یہ سب مجھے موجودہ نئی صورتِ حالات میں کچھ ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مجھے وہاں ریلنگ کے سہارے کھڑے کھڑے کافی دیر ہوگئی، مگر سونگ کھلا نہیں آئی۔ میں اپنے کیبن میں آگیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ کچھ دیر اور بیت چلی تھی، باہر ہر سو سناٹا چھانے لگا تھا۔ ایک دھڑکا دینے والی خاموشی تھی۔ آرام دہ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے نیند سی آنے لگی اور پھر نجانے کس پہر جب میری آنکھ لگنے کے قریب ہی تھی کہ ایک کھٹکے سے میں چونک پڑا۔

یہ آواز میرے کیبن کے دروازے کے بالکل قریب سے ہی آئی تھی۔ میں آہستگی سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کے قریب آیا اور اس کی جھری سے ذرا باہر جھانکا تو مجھے دو سائے متحرک نظر آئے۔ وہ میرے کیبن کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے...... پھر وہ شاید آپس میں کوئی بات کر کے آگے بڑھے۔ اپنی حرکات و سکنات سے مجھے مشکوک ہی لگے تھے۔

نجانے پھر میرے جی میں کیا آئی کہ میں ان کے آگے بڑھتے ہی بے آواز دروازہ کھولے باہر آگیا اور کیبن کی دیوار سے چپکے ہوئے ان کے پیچھے دبے پاؤں بڑھنے لگا۔

آگے جا کر اس وارف کا چوبی فرش دائیں جانب کو گھوم رہا تھا۔ وہ دونوں جو تاریکی کا ہی حصہ معلوم ہونے لگے تھے، فقط ان کے متحرک ہیولے ہی نظر آتے تھے، اسی طرف کو مڑے، میں بھی اسی طرف کو گھوم گیا۔

سامنے بائیں جانب ایک اور وارف سمندر کے اندر تک جاتا ہوا نظر آیا وہاں مجھے ایک بڑا سا کیبن دکھائی دیا۔ ان کا رخ اسی طرف تھا مگر وہ رک گئے، اس وقت میری رگوں میں دوڑتے لہو کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبے پھل والا چھرا نظر آنے لگا جبکہ دوسرے نے سیاہ نال والا پستول نکال لیا تھا۔

ان کے یوں یکدم رکنے اور اسلحہ نکالنے کی وجہ بھی مجھے سمجھ میں آگئی۔ کیونکہ مذکورہ کیبن کے سامنے دو مسلح آدمی پہرے پر کھڑے نظر آئے، ان میں سے ایک سگریٹ پی رہا تھا دوسرا گرد و پیش میں نظر ڈالے ہوئے تھا۔ پھر پہلے والے نے اپنا سگریٹ ساتھی کی طرف بڑھایا، اب وہ اس کے گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

اسی وقت میں نے ان دونوں مشکوک آدمیوں کی طرف دیکھنا چاہا تھا کہ چونک پڑا۔ وہاں کوئی نہ تھا، نجانے

وہ دونوں یوں اچانک کہاں غائب ہو گئے تھے؟ میں نے اِدھر اُدھر گردنیں گھما کر دیکھا بھی، مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیے، تب ہی اچانک جب میں نے اس طرف دیکھا جہاں وہ دونوں مسلح پہرے دار کھڑے تھے تو بری طرح ٹھٹکا۔

ان پر وہی دونوں مشکوک افراد بڑی خاموشی کے ساتھ پل پڑے تھے۔ ایک نے چھرا گھونپ دیا اور دوسرے نے اپنے شکار کو دونوں ہاتھوں کا داؤ آزما کر اس کی گردن کا منکا توڑ ڈالا، پھر ان کی لاشیں سمندر برد کرنے کے بعد وہ کیبن کے دروازے کی طرف بڑھے۔

انہیں کیبن کے دروازے کا رخ کرتے دیکھ کر یکلخت میرے اعصاب تن گئے اور میں بلا تاخیر مگر محتاط روی کے ساتھ اس طرف کو لپکا، وہ جب تک نجانے کیا طریقہ آزما کر اندر داخل ہو گئے۔ میں بھی اسی جانب کو تیزی سے لپکا۔ دروازہ اب بھڑا ہوا تھا، میں آہستگی سے اندر داخل ہوا تو بُری طرح ٹھٹکا۔

اندر ہلکی روشنی تھی۔ سامنے فولادی پائیوں والے دو آرام دہ بیڈ بچھے ہوئے تھے، ان پر کوئی لحاف اوڑھے لیٹا ہوا تھا جبکہ ایک شخص قریب ایزی چیئر پر اونگھ رہا تھا، اس کی گود میں پستول رکھا ہوا تھا، یہ سونگ کھلا کے باپ کا وہی باڈی گارڈ تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب یہ دونوں اپنے پستول نکال کر ان کا نشانہ لینے کے لیے پَر تول رہے تھے، میں پیچھے سے ان پر اپنے دونوں بازو پھیلائے جا پڑا۔

وہ دونوں دھڑام سے گرے۔ میرا حملہ ان کی توقع کے برخلاف تھا۔ میں ان سمیت نیچے آن پڑا اور ساتھ ہی شور مچا دیا۔

سب سے پہلے اس لمبے تڑنگے باڈی گارڈ کی آنکھ کھلی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھا، مگر اس کا پستول گود سے گر پڑا، پھر بستروں پر دراز دونوں افراد جاگے، ایک بیڈ پر میجر کیم کھلا اور دوسرے پر اس کی بیٹی سونگ کھلا تھی، سونگ کھلا نے چیخ ماری تھی۔

میں نے ایک حملہ آور کو چھاپ لیا تھا جبکہ دوسرا صورتِ حال بگڑنے پر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔

''اس کے پیچھے جاؤ...... یہ اسی کا ساتھی ہے، یہ یہاں میجر صاحب کو ہلاک کرنے کی نیت سے آئے تھے۔'' میں اس بوکھلائے ہوئے باڈی گارڈ کی طرف دیکھ کر چلایا، وہ فوراً اپنا پستول تھامے باہر کو لپکا۔ میجر کیم کھلا نے بھی اپنے تکیے کے نیچے سے پستول نکال لیا تھا۔

حملہ آور خود کو میری گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی عمر مجھ سے آٹھ دس سال بڑی ہی لگتی تھی، جسم توانا تھا مگر میں نے کھڑی ہتھیلی کا ایک وار کر کے اسے ادھ موا کر دیا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد باڈی گارڈ خالی ہاتھ ملتا ہوا آ گیا۔ اس کے بعد میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ باڈی گارڈ نے کمرے کی ساری روشنیاں آن کر دی تھیں۔ ان کے کچھ اور مزید ساتھی بھی آ گئے تھے۔ اچھی خاصی ہلچل مچ گئی تھی وہاں......

سونگ کھلا خوش تھی اور میجر کیم کھلا نے ایک تھپڑ پہلے تو اپنے اس لمبے چوڑے وجود رکھنے والے باڈی گارڈ کو جڑا اس کے بعد اس نے اسے کوئی درشت حکم دیا۔ وہ اس بے سدھ پڑے حملہ آور کی مشکیں کسنے لگا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ مسٹر......'' میجر کیم کھلا مجھ سے مخاطب ہو کر توصیفی لہجے میں بولا اور پھر اپنی لاڈلی بیٹی سونگ کھلا کی طرف دیکھ کر انگریزی ہی میں پوچھا۔ ''کیا نام بتایا تھا تم نے اس نوجوان کا......؟''

''راج کمار۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔

''ہاں مسٹر راج کمار! تم نے ہماری جان بچا کر ثابت کر دیا کہ تمہارے بارے میں ہمارا خیال غلط تھا مگر یہ حقیقت بھی ہے کہ ہم پچھلے کئی دنوں سے کچھ ایسی صورتِ حال سے دوچار تھے کہ ہمیں اپنے سائے پر بھی شبہ کرنا پڑ رہا تھا۔''

''اس بھروسے کے لیے میں آپ کا مشکور ہوں میجر کیم کھلا صاحب!'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ بھی اپنی جگہ بالکل صحیح تھے، لیکن ایک بات میں آپ سے بھی ضرور کہوں گا کہ آپ نے ان خطرناک حالات میں اپنی حفاظت کا کچھ خاص بندوبست نہیں کیا ہے، ورنہ آپ کے چھپے ہوئے دشمن اتنی آسانی سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تھے، وہ بہت چالاک اور ہوشیار تھے۔''

''اب یہ چھپے ہوئے نہیں رہیں گے۔ ان کا ساتھی تم نے پکڑ کے ہم پر دوسرا بڑا احسان کیا ہے، اب یہ سب اگل دے گا۔'' میجر کیم کھلا نے فرش پر جکڑ بندوں میں پڑے اس حملہ آور کی طرف خوفناک نظروں سے دیکھا۔

''ذلیل کتے! ظالم وحشی! تیرے ہاتھ نجانے کتنے بے گناہ برمی مسلمانوں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں...... تو نے ان امن پسند مسلمانوں کی بستیوں کی بستیاں اجاڑ ڈالیں، تو زندہ نہیں بچے گا ...... اور میں مر جاؤں گا مگر

تیرے جیسے سفاک اور ظالم انسان کو اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا......''

جکڑ بند میں فرش پر پڑا وہ حملہ آور بلا خوف اور غضب ناک لہجے میں برمی میجر کیم کھلا کو للکارتے ہوئے بولا تھا۔ اس نے یہ الفاظ اردو میں ہی ادا کیے تھے جنہوں نے میرے کانوں میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ گھول کر رکھ دیا تھا۔ میرے پورے وجود میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ اعصاب چٹخنے لگے اور میرا دھڑکتا دل جیسے ایکا ایکی رک گیا تھا، اس بہادر مسلم شخص کی گرجدار آواز نے میرے اندر ہلچل سی مچادی تھی۔ مجھ سے نادانستگی میں ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ہی ایک مسلم بھائی کو ایک ایسے برمی آرمی آفیسر کے سپرد کر ڈالا تھا جس کے ہاتھ پہلے ہی برمی مسلمانوں کے بے گناہ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ میرا دل سخت پچھتاوے اور دکھ سے بھر گیا تھا مگر میں نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپائے رکھتے ہوئے دل ہی دل میں یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اب چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے، میں اس بہادر مسلم مجاہد کی زندگی بچا کر رہوں گا۔

میرے دل میں اب بدھ مت کے اس پیروکار برمی میجر کیم کھلا کے خلاف نفرت سی بھرنے لگی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے ''دشمن'' کون ہو سکتے تھے اور کیوں اس کی جان لینے کے درپے تھے۔

میجر کیم کھلا کا وہ باڈی گارڈ طیش بھرے انداز میں اپنے دانت پیستا ہوا اس کی طرف بڑھا اور نفرت سے اپنے ہونٹ بھینچ کر اس برمی مسلم کے چہرے پر اپنے بھاری بوٹ کی ٹو رسید کر ڈالی۔ برمی مسلم کے حلق سے اذیت کے مارے کراہ خارج ہوگئی، میں نے دیکھا اس غریب کے منہ سے خون کی لکیر سی بہہ نکلی تھی۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا، شاید ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔ میرے تن بدن میں آگ سی بھر گئی۔ بڑی مشکلوں سے میں نے اپنے اندر کے طوفانی ابال پر قابو پائے رکھا تھا۔ مجھے اس وحشی برمی باڈی گارڈ پر بے حد طیش آیا تھا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس ظالم کا گلا دبوچ ڈالوں، مگر میں ابھی بے بس تھا۔

''اسے میرے حوالے کر دو...... میں اس کے منہ سے سب کچھ اگلوا لوں گا......'' میں نے فوراً میجر کیم کھلا کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ بہت بہتر رہے گا پاپا!'' سونگ کھلا فوراً میری تائید میں بولی۔ ''یہ بہادری کا کام مسٹر راج کمار نے ہی انجام دیا ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ یہی اس کے منہ سے بہ آسانی اس کے دوسرے ساتھیوں کے بارے میں بھی سب اگلوانے میں کامیاب رہے گا۔''

''تم ان مسلم برمیوں کو نہیں جانتی ہو بیٹی!'' میجر کیم کھلا نے کہا۔ ''یہ بہت ڈھیٹ ہوتے ہیں، اپنا مقصد کبھی عیاں نہیں کرتے، جان دینا زیادہ پسند کریں گے۔ میں اسے ہوگرالی کے حوالے کروں گا۔ تشدد کے نت نئے حربے ایجاد کرنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔'' میجر کیم کھلا نے کہا۔ پھر پاس کھڑے اپنے اسی قسائی صورت لحیم شحیم باڈی گارڈ کو اشارہ کیا۔ اس کے درندہ صفت انسان کی آنکھوں میں، میں نے خاص چمک سی ابھرتے دیکھی تھی۔ ہوگرالی...... شاید اسی کا ہی نام تھا۔ میں بے چین ہو گیا۔

اس برمی مسلم کا ہوگرالی جیسے قصاب کے ہتھے چڑھنے کا مطلب یقیناً اذیت ناک موت ہی ہو سکتا تھا۔

اس کی جیسے مراد بر آئی تھی۔ میں اندر سے پریشان سا ہو گیا۔ ہوگرالی اسے ٹانگ سے پکڑ کر کسی جانور کی طرح بیدردی سے گھسیٹتا ہوا کیبن سے باہر لے گیا۔

میں جانتا تھا کہ برمی مسلم اپنی جان دے دے گا مگر اپنے ساتھیوں کے نام نہیں بتائے گا۔ میں بے بسی اور دکھ کے مارے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں کھول بھینچ رہا تھا، لیکن میں نے اپنی یہ کیفیات ظاہر نہیں ہونے دی تھیں، میں نہیں جانتا تھا کہ اس رذیل میجر کا اعتبار حاصل کرنے کے لیے مجھے اپنے ضمیر کا قیدی بننا پڑے گا، تاہم یہ سب کچھ میری لاعلمی میں ہوا تھا اور میں اس کا فوراً ازالہ کرنا چاہتا تھا۔

میجر کیم کھلا مسکراتے ہوئے میری طرف بڑھا اور دوستانہ انداز میں میرا شانہ ہولے سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ ''مسٹر راج! ہماری بیٹی نے تمہارے بارے میں ہمیں سب بتایا تھا، تم واقعی دلیر اور جاں نثار آدمی ہو، مگر مجھ میں نہیں آتا کہ جو کام میرے تربیت یافتہ باڈی گارڈز نہ کر سکے اب تک، وہ تم نے کر دکھایا! یہ سب تم نے کہاں سے اور کیسے سیکھا؟''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں کون تھا اور کیا کیا تربیت اور کیسی کیسی لڑائیاں لڑ چکا تھا، تاہم بولا۔ ''میجر صاحب! شاید آپ کی بیٹی سونگ کھلا نے یہ نہیں بتایا کہ میں ایک انڈین فلائنگ کلب میں کام کرتا تھا۔ وہاں فائٹنگ کلب بھی تھا، مجھے اس کا شوق تھا، بس جو بھی تھوڑا بہت ہے، وہیں سے سیکھا تھا۔''

''گڈ!'' میجر کیم کھلا خوش ہو کر بولا۔

''میں نے پاپا کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔'' سونگ کھلا قدرے چہک کر بولی۔ میری اس کامیابی اور اپنے باپ کا اعتبار جیت لینے کے بعد وہ خاصی خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی، میرا دھیان بار بار اس قیدی کی طرف جارہا تھا۔ وہ قسائی صفت برمی ہوگرالی نجانے اس غریب کے ساتھ کیسا انسانیت سوز سلوک کررہا ہوگا۔ لیکن مجھے جو بھی کرنا تھا وہ نہایت رازداری، محتاط روی اور صبر واستقامت سے کرنے کا متقاضی تھا۔ لہٰذا سونگ کھلا کی طرف دیکھ کر میں مسکرا کر رہ گیا۔

''آؤ نوجوان! بیٹھو ہمارے ساتھ...... ہم قدر شناس ہیں اور ہیرے کی قدر جانتے ہیں، تم چاہو تو ہمارے ساتھ مستقل رہ سکتے ہو۔''

وہ یہ کہتا ہوا مجھے لے کر ایک طرف بچھے صوفہ سیٹ کی طرف بڑھا اور ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔

میں نے اس کی بات پر دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی کہ یہ منافق شخص منہ پر ہی کتنا جھوٹ بول رہا ہے۔ اس نے تو پہلے مجھ سے سیدھے منہ بات بھی کرنا پسند نہیں کیا تھا...... اور اب بات کررہا تھا قدر شناسی کی...... بہر کیف میں صوفے پر براجمان ہوگیا تھا اور وہ بھی میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے نفیس قسم کا سلیپنگ گاؤن پہن رکھا تھا اور سونگ کھلا بھی ایسا ہی کچھ ڈھیلا ڈھالا سا ریشمی لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔

میجر کیم نے اس سے کچھ کہا تھا، وہ قریب ایک دیوار گیر کیبنٹ کی طرف بڑھ گئی اور ذرا دیر میں وہ شراب کی بوتل اور تین بلوریں پیگ اٹھالائی۔ شراب کو دیکھ کر ہی میری طبیعت مکدر سی ہونے لگی۔ یہ بڑی معصیت کی بات ہوتی تھی میرے لیے کہ بیرونِ وطن مجھے اس خرافات سے جان چھڑانی نہ صرف مشکل بلکہ میرے لیے اور میری شناخت کو مخفی رکھنے کے حوالے سے ''خطرے'' میں بھی پڑنے لگتی تھی۔

میں دل ہی میں وہ بہانہ تلاشنے لگا جس سے بغیر کسی شک وشبہے کے یہ بلا ٹلتی رہے۔

''سونگ بیٹی بتا رہی تھی کہ تمہیں اپنے ساؤتھ انڈیمان میں اپنے کسی ساتھی کی تلاش ہے؟'' میجر کیم نے فوراً میرے مقصد کی بات کر ڈالی تو میں نے بھی بلا تامل اس سے کہا۔

''جی ہاں! وجے میرا دوست ہی نہیں بلکہ میرے محسن کا بیٹا بھی ہے، ان دونوں باپ بیٹے کے مجھ پر بہت احسانات ہیں......''

''ہاں! مجھے معلوم ہوا سونگ سے کہ اس کے باپ نے تمہاری خاندانی دشمنوں سے جان بچائی تھی اور اپنے ہاں لے گیا تھا۔''

''جی ہاں! یہی بات ہے۔''

''تم واقعی ایک سچے انسان ہو کہ اپنے محسن کو نہیں بھولے...... خیر! تم فکر نہ کرو، ہم تمہاری اس سلسلے میں ترنت مدد کریں گے۔''

''بے حد شکریہ آپ کا میجر صاحب! میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔''

اپنے بارے میں انڈین بتانے کے بعد وہ مجھ سے شستہ اردو ہندی میں ہی باتیں کررہا تھا۔ سونگ نے بھی اردو میں بولنا شروع کردیا تھا۔

''یہ لیں......'' اس نے تینوں پیگ بھرنے کے بعد ایک میری طرف بڑھایا تو میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''بے آرامی کی وجہ سے میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے، اس کے پینے سے بڑھ جایا کرتا ہے، پلیز، پھر بھی کبھی، ابھی موڈ نہیں......''

''اوکے...... نو پرابلم......'' وہ دل نشیں انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر دونوں باپ بیٹی نے اپنے اپنے پیگ سے ایک گھونٹ بھرا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے بارہا چاہا کہ اس خبیث اور متعصب مسلم دشمن کو کریدوں کہ وہ برما میں ایک عرصے سے مقیم مسلمانوں کے لیے کیوں موذی جاں بنا ہوا تھا، مگر کچھ سوچ کر خاموش رہا۔ تاہم اس مختصری گفتگو میں میجر کیم کھلا کا لب لباب یہی رہا کہ میں ان کا ساتھی بالفاظ دیگر ان کا غلام بن کر رہوں...... جبکہ سونگ کھلا تو یوں بھی یہی چاہتی تھی کہ میں وہاں سے اب کہیں نہیں جاؤں، جبکہ میں بار بار چالاکی سے اپنے کسی فرضی ساتھی اور محسن، وجے کی تلاش کے سلسلے میں اپنی پریشانی کو ظاہر کرتا رہا۔

اس کے بعد میں وہاں سے رخصت ہوگیا۔ ساتھ ساتھ میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ کم از کم اس وقت سونگ کھلا میرے گلے کا ہار نہ بنے کیونکہ میں ہوگرالی کو تلاش کرنا چاہتا تھا۔

میں وارف پر چلتا ہوا بظاہر اپنے کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک کیبن کے قریب سے گزرتے ہوئے میری سماعتوں میں کسی کی گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ سی سنائی

دی۔ میں ٹھٹک کر رکا، اسی وقت دو برمی اس طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک لوہے کی بالٹی اور زنجیر تھی۔

وہ دونوں اسی کیبن کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں ایک طرف کو کیبن کی چوبی آڑ میں ہوگیا۔ وہ دونوں ہنستے، باتیں کرتے ہوئے کیبن کے پاس آئے اور دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔

میں آہستگی سے آگے بڑھا۔ کیبن کی چھت سے ایک چھجا جھول رہا تھا، وہاں پانی ٹپک کر نیچے بہہ رہا تھا۔ پورے وارف پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہیں سے جگنو جیسی روشنی پھوٹتی نظر آرہی تھی۔ میں نے اطراف میں ایک نظر ڈالی اور پھر دبے پاؤں کیبن کے دروازے کی طرف بڑھا، ابھی بہ مشکل چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ اچانک دروازے پر کھڑبڑ کی آواز ابھری مگر میرے پاس اب اتنا وقت نہیں تھا کہ میں پلٹتا اس لیے وہیں ٹھہر گیا۔

دروازہ کھلا اور وہی دونوں افراد باہر نکلے، پھر مجھے دیکھ کر چونک پڑے۔ تاہم مجھے پہچان کر ایک نے مسکرا کر کہا۔

”کیا تم بھی اندر جا کر اس مسلے کا حشر دیکھنا چاہتے ہو؟ جاؤ، چلے جاؤ...... تمہارا ہی شکار تھا وہ......“

”نہیں، میں دراصل اپنے کیبن میں آرام کرنے جا رہا تھا۔ اپنے کیبن کا راستہ شاید بھول رہا تھا۔“ میں نے بھی دوستانہ مسکراہٹ سے کہا۔ ”میجر صاحب نے اسے یوں بھی میرے حوالے کرنے کے بجائے ہوگرالی کے حوالے کر دیا ہے۔“

وہ دونوں سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

میں بھی انہیں دکھانے کے لیے تھوڑا پلٹا تھا اور دیوار کی آڑ میں ذرا دیر کو ٹھہر گیا تھا۔

وہ دونوں آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرتے ہوئے جہاں سے آئے تھے اسی طرف کو چلے گئے۔ پھر ایک موڑ کاٹتے وقت ان دونوں میں سے ایک نے اپنی ذرا گردن گھما کر میری طرف دیکھا تھا، میں ایک دم آڑ میں ہوگیا۔

دوبارہ اُبھرا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر دبے پاؤں مطلوبہ کیبن کی طرف بڑھا اور دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی جھری سے ذرا اندر جھانکا تو میرا خون کھول اٹھا۔ اندر کا منظر بڑا دردانگیز تھا۔

وہ درندہ صفت ہوگرالی اس مسلم برمی کو ایک آہنی شکنجے میں کسے ہوئے تھا اور اسے فولادی زنجیروں سے باندھ کر چھت سے الٹا لٹکایا ہوا تھا، جبکہ فرش پر عین اس کے سر کے بالکل نیچے پانی کی بھری ہوئی بالٹی تھی جس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ پانی یقیناً کھولتا ہوا تھا۔ ایک چرخی کی مدد سے وہ مردود ہوگرالی اس بدنصیب قیدی کو نیچے لاتا اور اس کا سر کھولتے پانی کی بالٹی میں ڈبو کر ایک دم باہر نکالتا، قیدی کی کرب ناک چیخیں بڑی دل دہلا دینے والی ہوتی تھیں۔

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اسی وقت اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کا نقاب بنایا اور چہرے پر چڑھا لیا۔ میں نہتا تھا اور اسی طرح دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔

ہوگرالی نے دروازے کی کھڑبڑ پر کوئی توجہ نہ دی تھی، وہ شاید یہی سمجھا تھا کہ اس کا کوئی ساتھی ہوگا۔ میں نے جب دیکھا کہ اس نے چرخی روک دی ہے اور اب آگے بڑھ کر وہ اس بدنصیب قیدی کے بالوں کو مٹھی میں دبوچ کر اس سے کچھ پوچھ رہا تھا تو میں دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے عقب میں جا پہنچا، اسی وقت اسے بھی کچھ شک گزرا، وہ تیزی سے میری طرف پلٹا اور تب ہی میرے ہاتھ کا ایک زوردار پنچ اس کے بھاری جبڑے پر پڑا۔ اس کے حلق سے کراہتی ہوئی ”اوغ“ جیسی آواز خارج ہوئی اور وہ کئی قدم پیچھے لڑکھڑا کر دیوار سے جا لگا۔

وہ خاصا سخت جان تھا اس نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اس نے پستول نکالنا چاہا، میں نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے لانگ جمپ لگائی اور اس کے پیٹ پر اپنی دائیں ٹانگ کا گھٹنا رسید کر دیا، وہ رکوع کے بل جھکتا چلا گیا مگر گینڈے جیسی طاقت اور برداشت کا مالک ہوگرالی، ایک خوفناک غراہٹ کے ساتھ تڑپا اور اس نے اپنے گنجے سر کی ٹکر میرے پیٹ میں رسید کر ڈالی، اس کا یہ وار اچانک ہی تھا، کیونکہ اس کے پیٹ میں اپنا گھٹنا رسید کرنے کے بعد میں یہی سمجھا تھا کہ اب تب میں یہ ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے گا اس لیے میں نے ذرا تساہل برتا اور یہی میری غلطی بن گیا۔

اس کے سر کی ٹکر کسی گینڈے کی ٹکر سے کم نہ تھی جس نے مجھے دھکیل دیا تھا، یہی نہیں وہ مجھے اسی ٹکر پر لگائے ہوئے دیوار سے جا لگا، میں نے سنبھلتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کی تالی اس کی کنپٹیوں پر بجا دی۔ میرے اس ڈبل کلیپنگ پنچ نے اس کا دماغ جھنجھنا کر رکھ دیا اور وہ کھڑے کھڑے بار بار اپنے سر کو جھٹکے دینے لگا، تب ہی میں نے موقع تاک کر اس کی رگِ حساس مسل ڈالی۔ وہ تیورا کر

گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک میرے اس پے در پے جاں کش وار پر کب کا ڈھیر ہو چکا ہوتا..... مگر ہو گرائی خلاف توقع سخت جان ہی نہیں بے پناہ قوتِ برداشت کا حامل ثابت ہوا تھا، اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مر چکا تھا یا صرف بے ہوش تھا، تاہم میرے پاس وقت نہیں تھا، یہاں کوئی بھی آسکتا تھا اور پھر سارا کھیل بگڑ جاتا مجھے یقین تھا ہو گرائی نقاب کے باعث مجھے پہچان نہیں سکا ہوگا۔

میں نے پھر ایک لمحے کی بھی دیر لگائے بغیر سر کے بل معلق اس بدنصیب قیدی کو نیچے اتارا اور پھر اس کے آہنی جکڑ بند کھول ڈالے۔ وہ بھی ابھی تک مجھے نہیں پہچان پایا تھا تاہم وہ شاید سمجھا یہی تھا کہ میں اس کا کوئی ''سرفروش'' ساتھی ہی ہوں۔

''جلدی نکلو، آؤ میرے پیچھے.....''

میں نے اس سے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

غیر انسانی تشدد کے باعث اس بے چارے کی حالت غیر سی ہو رہی تھی۔ میں نے اسے سہارا دیا تو اس نے بھی ذرا ہمت سے کام لیا۔ میں نے پہلے آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وارف دور تک ویران تھا..... پھر میں اسے لیے باہر آگیا اور اپنے کیبن کی طرف بڑھا۔

اگلے چند سیکنڈوں بعد میں اسے لیے اپنے کیبن میں آچکا تھا۔ میں نے دروازہ اچھی طرح بند کرلیا۔

''تم اکرام ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''پھر کون ہو تم؟''

''بتاتا ہوں، پہلے ذرا تمہاری مرہم پٹی کردوں۔'' میں نے کہا۔

کیبن میں اس قسم کا فرسٹ ایڈ موجود تھا جس میں مرہم پٹی وغیرہ کا سامان رکھا ہوتا تھا، میں نے بہت کم عرصے میں یہ کام نمٹایا۔ وہ جلد باز ثابت ہوا۔ یا پھر تجسس کے ہاتھوں مجبور تھا کہ اس نے اچانک اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر میرے چہرے سے رومال کا نقاب کھینچ لیا۔

''تم.....!'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت حیرت اور غیظ ناک تاثرات اُبھرے تھے۔

میں بے اختیار ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''ہاں! میں.....'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرا نام راج کمار نہیں، شہزاد احمد خان ہے..... اور میں الحمدللہ ایک مسلمان ہوں اور پاکستان کا باشندہ ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم کون ہو..... پتا تب چلا جب اس مردود میجر کیم کھلا کے کمرے میں، تمہیں اس کے حوالے کیا اور تب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، مگر میں نے بھی اسی وقت اپنے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ اب تمہاری ان برمی کتوں سے جان بچانا بھی میرے ذمے ہے.....''

میری بات سن کر وہ بے حد متاثر اور خوش ہوا۔ اس نے بے اختیار میری پیشانی پر بوسہ دے ڈالا اور توصیفی لہجے میں بولا۔ ''نوجوان! بے شک تم نے پہلے میرے ساتھ جو کچھ کیا وہ لاعلمی میں کیا، لیکن میری حقیقت کا پتا چلتے ہی تم نے وہی قدم اٹھایا جو ایک سچے مسلمان کو اپنے مسلم بھائی کے لیے اٹھانا چاہیے..... لیکن دوست! یہ بھی حقیقت ہے کہ برما کے متعصب بدھ بھکشوؤں کی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیزی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی ہے، حالانکہ یہ لوگ خود کو بدھا کا پیروکار تو کہتے ہیں مگر اس کی نیک تعلیمات پر ذرا بھی عمل نہیں کرتے، بدھا نے تو امن آشتی، محبت انسانیت اور بھائی چارے کا درس دیا ہے مگر یہ لوگ برما میں ایک عرصے سے مقیم امن پسند مسلمانوں کو برداشت نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمین پر صرف برمیوں کا حق ہے، مسلمانوں کا نہیں، کتنے ہی گھرانے وہاں انہوں نے بے خانماں کرڈالے۔ عالمی سطح پر بھی بے حسیانہ خاموشی چھائی ہوئی ہے، کوئی ہماری مدد کو آگے نہیں بڑھ رہا..... اب تو برما کی آرمی بھی ان کا ساتھ دے رہی ہے۔

''میانمار اور روہنگیا کے مسلمانوں پر ان متعصب بدھ بھکشوؤں کے غنڈوں، برمی سیکیورٹی فورسز اور آرمی کے افسروں نے ظلم اور ہلاکت خیزی کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں، خواتین کی بے حرمتی کی گئی.....

''ظلم کی حد تو یہ ہے کہ جو بے چارے مسلم برمی اپنے طور پر کشتیاں کروا کر دریائے ایراوتی کے راستے، ظلم وستم کی اس بستی سے نکلنے لگے تو انہیں دھوکے سے تھائی لینڈ اسمگل کر دیا گیا، جہاں خواتین کو جسم فروشی پر مجبور کیا گیا اور ان کے بچوں اور مردوں کو وہاں کے امراء نے اپنے محلات میں غلام اور نوکر بنا لیا گیا ذرا تصور کرو میرے مسلم بھائی شہزاد احمد خان..... ان بے چاروں کے دل کی کیا حالت ہو گی..... یہی کتا میجر کیم کھلا تھا، اس نے برمی مسلمانوں پر بڑا ظلم کیا ہے اور صلے میں اسے بدھ بھکشوؤں نے بڑے انعامات سے نوازا..... میرے کئی عزیز واقارب اس کے

ہاتھوں مارے گئے۔“
کہتے کہتے وہ بے چارہ رو پڑا..... جبر و ظلم کی یہ داستانِ الم سن کر میرا اپنا جگر اجذبات تلے چھلنی ہو گیا۔ میں نے اسے تسلی دی تو اس نے کہا۔
”لیکن نوجوان! تم بھی مجھے کسی ایسے ہی نیک کاز میں مصروف نظر آتے ہو۔ تمہاری لڑائی بھڑائی کے انداز سے مجھے تو یہی ظاہر ہوا کہ تم تم بھی نہیں ہو..... میرا نام محمود الحسن ہے..... “ یہ کہتے ہوئے اس نے آخر میں اپنا نام بھی بتا دیا۔
”ہاں محمود بھائی! تمہاری بات غلط نہیں ہے۔ ایک مجبوری کے تحت میں ان کے ساتھ ہوں، بس یوں سمجھو، لوہے کو لوہے سے کاٹ رہا ہوں......“
پھر ایک ثانیے ٹھہرنے کے بعد میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے تمہیں اب زیادہ دیر یہاں نہیں رکنا چاہیے۔ یہاں کوئی بھی آسکتا ہے اور پھر کہیں تمہاری وجہ سے میرا بھی منصوبہ فیل نہ ہو جائے۔“
”میں واقعی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“ وہ بولا۔ ”لیکن، بھائی! میں نے اس برمی میجر کو زندہ نہیں چھوڑنا ہے، آج یا کل اسے جہنم واصل کر کے ہی رہوں گا۔ تم صرف مجھے اتنا ہی بتا دو کہ تمہارا آئندہ کا کیا منصوبہ ہے؟ میرا مطلب ہے کہیں اس سے تمہارے منصوبے کو تو فرق نہیں پڑے گا؟“
”تم نے اچھی بات کہی محمود بھائی! ابھی اس مردود برمی میجر کیم کھلا کا زندہ رہنا میرے مفاد میں بہتر ہوگا۔ مگر تم اس کی فکر نہ کرو، بس، مجھے تھوڑا وقت دے دو، جب تک تم کوئی اور اہم مشن نمٹا سکتے ہو۔ یوں بھی تمہارا کاز اب میرا مشن بھی بن چکا ہے بلکہ یہ ہر سچے مسلمان کا کاز ہے کہ اسلام دشمنی کرنے والوں اور نہتے بے گناہ مسلم بھائیوں کا خون بہانے والوں کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچانا چاہیے..... میجر کیم کھلا سے ابھی میں نے بہت سے کام لینے ہیں، اس کے بعد میں ہی اسے جہنم واصل کر دوں گا..... یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“
محمود الحسن نے ایک بار پھر مجھے بڑی گرمجوشی سے اپنے گلے لگایا اور پھر رخصت ہوتے وقت اس نے بڑے رنجور، بڑی بے بسی اور بے چارگی سے مجھ سے ایک درخواست کرتے ہوئے آخر میں کہا۔
”میرے دوست..... میرے مسلم پاکستانی بھائی! تم سے ایک گزارش کرتا جاؤں گا..... برما کے نہتے، مظلوم اور بے خانماں مسلمانوں کے لیے کچھ کر سکو تو ایسا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا..... میرا مطلب تھا یہ میجر کیم کھلا اور اس کا گماشتہ ہوگرالی وہاں برما میں مسلم دشمنوں کے سب سے بڑے سپورٹرز ہیں..... اور صلے میں انہیں بہت دولت اور مراعات حاصل ہیں، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں جتنے بھی مسلم دشمن غنڈے ہیں ان سب کی پشت پناہی بھی یہی رذیل میجر کیم کھلا کرتا ہے۔ اس کے جہنم واصل ہو جانے کے بعد ان بدمعاشوں کی کافی حد تک کمر ٹوٹ جائے گی......“
”تم اس کی فکر نہ کرو دوست! میجر کیم کھلا کو میں اس کے گماشتے ہوگرالی سمیت ختم کر دوں گا۔“ میں نے اس کا ہاتھ بڑی گرمجوشی کے ساتھ دبا کر پورے عزم سے کہا اور پھر وہ رخصت ہو گیا۔ ابھی اسے نکلے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اچانک گولی چلنے کی آواز ابھری۔ میں ٹھٹکا، پھر دوسری گولی چلی اور کسی کے چھپاکے سے پانی میں گرنے کی آواز ابھری۔ میں تڑپ کر اپنے کیبن سے باہر آیا تو دیکھا دو مسلح برمی وارف کی ریلنگ سے لگے کھڑے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ سامنے پانی کی سطح پر کسی کی لاش تیر رہی تھی۔
ان میں سے ایک برمی نے مجھے اشتباہ انگیز مگر تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”یہ قیدی تمہارے کیبن سے کیوں نکلا تھا؟ یہ ہوگرالی کو......“ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ پل کے پل ہی میں نے حالات کی کایا کلپنے کا ادراک کرتے ہی اس کی تھوڑی پر زوردار گھونسا رسید کر دیا تھا۔ وہ اچھل کر پانی میں جا گرا..... دوسرے نے مجھ پر اپنے پستول کی نال کا رخ کرنا چاہا تھا، مگر میرے پورے وجود میں تو جیسے پارا دوڑا ہوا تھا، میں نے کسی چیتے کی طرح اس کے پستول پر اپنے ایک ہاتھ کا جھپٹا مارا اور پستول ہاتھ میں آتے ہی میں نے اس کی پیشانی کا نشانہ لے کر لبلبی دبا دی۔ دھماکا ہوا اور اس کی پیشانی میں سرخ روشندان بن گیا۔
وہ چند ثانیے اسی طرح کھڑا رہ گیا اور پھر پیچھے کی طرف گرا، ریلنگ سے ٹکرایا اور پانی میں ایک زوردار چھپاکے ..... سے جا گرا۔ میں نے دوسرے برمی کو تاڑا۔ جو تیرتا ہوا وارف کی چوبی سیڑھیوں کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اوپر سے ہی اس کا نشانہ لے کر تلے اوپر دو تین فائر جھونک دیے، پھر رات کے سناٹے میں اس کی کریہہ انگیز چیخ ابھری اور اس کا نامراد وجود پانی کی سطح پر تیرتا نظر آنے لگا......

☆☆☆

صبح ہو چکی تھی، پانی سے تینوں کی نعشیں نکال لی گئی

تھیں، جو دارف کے چوبی اور گیلے فرش پر رکھ دی گئی تھیں۔ اس کے گرد میں، میجر کیم کھلا، اس کی بیٹی سونگ کھلا اور ہوگرالی کے علاوہ چند دیگر لوگ بھی کھڑے تھے۔

ان تینوں میں سے دو لاشیں انہی برمیوں کی تھیں جو میرے ہاتھوں ہی جہنم واصل ہوئے تھے، جبکہ تیسری نعش...... محمود الحسن کی تھی۔ وہ بدقسمتی سے رات کو میرے کیبن سے نکلتا ہوا مارا گیا تھا اور جنہوں نے مارا تھا، انہیں میں نے بھی رازداری سے محمود کی موت کا بدلہ لیتے ہوئے ختم کر ڈالا تھا۔ مجھے محمود کے مرنے کا بے حد افسوس تھا۔

میں نے چالاکی اور زیرک دماغی سے کام لیتے ہوئے یہی بتایا تھا کہ میں آرام کرنے کے لیے جب اپنے کیبن میں آکر لیٹا تو اس کے تھوڑی دیر بعد ہی میں نے فائرنگ کی آواز سنی۔ باہر نکلا تو اپنے ساتھیوں کو (میجر کے ساتھیوں کا) قیدی کے ساتھیوں سے جنگ کرتے ہوئے پایا۔

چونکہ میں خود نہتا تھا اسی لیے اندر ہی چھپا رہا۔ شاید قیدی کو اس کے ساتھی چھڑا لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر ہمارے ان دو ساتھیوں کی بروقت ان پر نگاہ پڑ گئی اور انہوں نے ''بے جگری'' سے ان کے ساتھ مقابلہ کیا، نتیجے میں، قیدی بھی مارا گیا، مگر اس کے فرار ہوتے ساتھیوں نے ان دونوں کو بھی مار ڈالا...... وغیرہ۔

میری یہ جھوٹی کہانی تیر بہدف تھی...... کسی کو بھی شبہ نہیں ہوسکا تھا، ماسوائے ہوگرالی کے۔

اس نے مجھ سے سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی تھی اور میں بظاہر بے فکری سے اس کے سوالوں کے جوابات دیتا رہا تھا، یوں بھی میجر کیم کھلا کی جان میں نے ہی اس قیدی (محمود) کے ہاتھوں بچائی تھی بلکہ اسے پکڑوایا بھی تھا، اسی لیے کسی کو یوں بھی مجھ پر شبہ نہ ہوسکا تھا، مگر یہ مردود ہوگرالی مجھ سے مطمئن نہیں ہو پا رہا تھا، یہ تو سونگ کھلا کی مہربانی تھی کہ اس نے ڈھل انداز ہو کر ہوگرالی کو ڈانٹ پلا دی کہ وہ مجھ پر بلاوجہ شک کر رہا ہے اور اپنی نااہلی کو چھپا رہا ہے، نتیجے میں ہوگرالی کو میجر کیم کھلا کی بھی سخت اور بے نقط سننا پڑی تھی کہ وہ قیدی سے نہ کچھ اگلوا سکا تھا نہ ہی اس کو قید میں رکھ سکا۔

جب ہوگرالی کی اچھی خاصی دھلائی ہو گئی تب جا کر اس بدبخت نے میری جان چھوڑی...... لیکن باوصف اس کے مجھے نہیں لگتا تھا کہ وہ مجھ سے پوری طرح مطمئن ہوا ہو گا، مجھے اس سے بہرحال ازحد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد نعشوں کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ پیدا ہوا۔

پولیس کو یہ اطلاع نہیں دے سکتے تھے۔ بہ قول میجر کیم کھلا کے غیر ملک میں ہونے کی وجہ سے یہ لوگ کئی قسم کی قانونی پیچیدگیوں میں پڑ سکتے تھے، ایک اور بات کی بھی مجھے بھنک ملی تھی کہ ان لوگوں کے پاس کالے بچھوؤں کا بہت سا ذخیرہ موجود تھا، جو یہاں کے (انڈیا کے) قانون کے مطابق غیر قانونی تھا، کیونکہ ایک تو یہ ذخیرہ اسمگل کیا جانے والا تھا، دوسرے ان کالے بچھوؤں کی نایابی و کمیابی کی وجہ سے اس کے شکار پر نہ صرف بڑی سخت قسم کی پابندی عائد تھی بلکہ بھاری جرمانے کے ساتھ قید بامشقت بھی تھی۔

کالے بچھوؤں کے شکار پر اس قدر کڑی پابندی اور کڑی سزا کا ایک ہی مطلب تھا کہ بھارت اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس پر مقامی اور قبائلی لوگوں کا زیادہ حق تھا۔

لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا یہی سہل طریقہ سوچا گیا کہ انہیں سمندر برد کر دیا جائے...... اور یہی کیا گیا۔

میرا دل و دماغ بوجھل سا تھا...... ایک تو برما کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی پتا نے مجھے اداس سا کر دیا تھا دوسرے محمود کے اس طرح اچانک غیر متوقع انداز میں مارے جانے نے مجھے دکھی اور رنجیدہ خاطر سا کر دیا تھا۔

لاشوں کو رازداری سے سمندر برد کرنے کے لیے انہیں پہلے کپڑے میں لپیٹا تھا اور پھر بھاری پتھر باندھ کر تہ آب کرنا تھا، اس لیے ابھی تینوں کی نعشوں کو خالی کیبن میں رکھوا دیا گیا تھا۔

یہ وہی کیبن تھا جہاں جوشم نامی وید نے میرے زخموں کا علاج کیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہ تھا، میں نے موقع پا کر وہاں کا رخ کیا۔

تینوں لاشیں کیبن کے سیلن زدہ فرش پر رکھی ہوئی تھیں۔ برمی کتوں کی لاشیں چھوڑ کر۔ میں محمود کی لاش کے قریب آیا اور جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا پھر پُرعزم لہجے میں اس کے سینے پر اپنا دایاں ہاتھ رکھتے ہوئے جذبات سے لرزتی آواز میں بولا۔

''اے دوست! میرے مسلم بھائی! آفرین ہے تجھ پر اور تیری شہادت پر...... تو اپنا آرام و سکون چھوڑ کر اپنے مسلم بھائیوں کو ان برمی کتوں کے ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوشاں رہا اور اپنی جان کی بھی پروا نہ کی مگر میں نے بھی تجھ سے وعدہ کر رکھا تھا کہ تیرا ادھورا مشن میں پورا کروں گا، یعنی میجر کیم کھلا اور اس کے درندہ صفت گماشتے ہوگرالی کو

واصل جہنم کر کے رہوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد ان کی لاشیں کپڑے میں لپیٹ کر ایک بھاری پتھر سے باندھ کر ذرا دور گہرے سمندر میں لے جا کر پھینک دی گئیں۔

''کیا ہوا......؟ راج! تم خاصے دکھی نظر آ رہے ہو؟''

میں واپس پلٹا ہی تھا کہ معاً ایک مترنم سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی جس نے مجھے بری طرح ٹھٹکا دیا۔ یہ سونگ کھلا تھی۔ جو نجانے کب سے میرے عقب میں آن کھڑی ہوئی تھی۔

''نن...... نہیں، بس! ایسے ہی مجھے اپنا محسن دوست وجے یاد آ رہا تھا، نجانے وہ بے چارہ اب تک کس حال میں ہوگا...... سوچتا ہوں، اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں اس کے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''او...... ڈونٹ وری، راج......!'' وہ بڑی محبت بھری ملائمت سے بولی۔ ''میں نے تم سے وعدہ کیا ہے راج......! اور پاپا کا تو تم دل بھی جیت چکے ہو......''

''میں جلد سے جلد نکلنا چاہتا ہوں...... لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ مجھے اب دوبارہ اس علاقے تک جانے کا کوئی اندازہ بھی نہ رہا ہے...... میں کیسے دوبارہ وہاں تک پہنچوں گا......؟''

میں نے تشویش آمیز تفکر سے کہا اور یہ حقیقت بھی تھی کہ وہاں تک نانا شکور نے ہی مجھے پہنچایا تھا، نہ صرف یہ بلکہ اس بے چارے نے مرنے سے پہلے بھی مجھے آگے کی منزل کا پتا ازبر کرا دیا تھا، لیکن یہاں پورٹ بلیئر سے ساؤتھ انڈیمان روانہ ہونا میرے لیے مشکل ہی نظر آتا تھا۔ لیکن سونگ کھلا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ انڈیمان کے یہ سارے جزائر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے اور ان میں زیادہ دوری نہیں تھی۔

''مس سونگ کھلا! میں اپنا سفر وہیں سے ہی شروع کرنا چاہتا ہوں جہاں سے منقطع ہوا تھا مگر۔'' میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بڑے دل فریب انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

''اس راستے پر تو میں تمہیں آنکھ بند کر کے پہنچا دوں گی، تم کیوں فکر کرتے ہو؟''

''بس پھر مس سونگ کھلا! آپ یہ کام جلد از جلد کر ہی ڈالیں......''

''میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کہ ہمارے پاس تیز رفتار لانچوں اور موٹر بوٹس کی کوئی کمی نہیں ہے، میں آج ہی تمہاری روانگی کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔ ہوگرالی تمہارے ساتھ جائے گا۔ وہ ہر معاملے کا ایکسپرٹ ہے، پاپا نے اسے ہر طرح کی تربیت دلوا رکھی ہے۔ تاہم نقشہ اس کے پاس بھی ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے ہماری پوری ٹیم کا بھی وہاں دوبارہ کالے بچھوؤں کا شکار کرنے کا پروگرام بن جائے۔''

ہوگرالی کے ذکر پر میری طبیعت منغص سی ہونے لگی۔ میں نے کہا۔ ''ہوگرالی کے بجائے اگر کوئی اور آدمی روانہ کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ جو صرف اتنا کر دے کہ مجھے اس علاقے تک چھوڑ کر خود لوٹ آئے......''

''اپنے ساتھی وجے کو تلاش کرنے کے بعد تم واپس یہاں کیسے لوٹو گے؟ اور ہمیں کیسے پتا چلے گا کہ تم نے اپنے ساتھی کو ڈھونڈ لیا ہے؟ نہیں، ہمارا ساتھی وہیں رہے گا، تمہارے ساتھ، تم کسی بڑے مشن پر نہیں جا رہے ہو جو تمہیں وہاں اتنی دیر لگے گی۔''

اس کا کہنا صحیح تھا مگر وہ اس کی اپنی حد تک، جبکہ حقیقت صرف میں ہی جانتا تھا کہ میرے لیے یہ مہم کتنی مختصر یا طویل ثابت ہو سکتی تھی اور وہ بھی انتہائی رازداری کی متحمل بھی۔

میں اپنے ساتھ اس مہم میں کم از کم ہوگرالی تو کیا سونگ کھلا کے کسی بھی آدمی کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ پھر وہیں اٹکتا تھا، میں تنہا اس علاقے تک نہیں جا سکتا تھا، نہ ہی مجھے یہاں سے اس کا اندازہ بھی تھا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز آئی، وہ میں نے اس کے ساتھ شیئر کرتے ہوئے کہا۔

''ایک کام ہو سکتا ہے...... مس سونگ! آپ اپنے کسی بھی ایک آدمی کو میرے ساتھ روانہ کر دیں اور جو مجھے ساؤتھ انڈیمان کے اس ساحل کے قریب اُتار دے، جو مذکورہ علاقے سے قریب ہو، اس کے بعد میں......''

''نہیں......'' سونگ نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میں تمہیں اس پُرخطر علاقے میں یوں اکیلا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی...... بس! میں نے فیصلہ کر لیا ہے، ہوگرالی ادھر ہی ہوگا اور ہم پانچ افراد کی ٹیم تیار کر کے تمہارے ساتھ ہی روانہ ہو جائیں گے...... اور مل کر تمہاری اس مہم کو سرانجام دینے کی کوشش کریں گے۔''

میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی دوسرا آپشن نہیں تھا، لہٰذا کچھ سوچ کر میں نے بھی چپ سادھ لی۔

اس دوران میرے دل میں خیال آیا کہ اس سے اڈیسہ کمپنی کے حوالے سے بھی کچھ کرید کروں...... لیکن

لولوش میرا اس قدر خطرناک دشمن تھا کہ مجھے محتاط رہنے کی ازحد ضرورت تھی۔ ذرا سی بھی جلد بازی کم از کم ہوگرالی کو ضرور میری طرف سے بدکا سکتی تھی۔

سونگ کا معاملہ اور تھا، میں دراصل جاننا چاہ رہا تھا کہ اڈیسہ کمپنی کے ان کے ساتھ کس حد تک اور کس نوعیت کے کاروباری مراسم تھے۔ نیز یہ لوگ لولوش کے بھی کس قدر قریب تھے۔ ابھی تو میں ان کے لیے عمومی حیثیت کا ہی حامل شخص تھا یا کم از کم اس کے باپ کی نظروں میں میری اتنی کوئی خاص حامل کی حیثیت نہ تھی، یوں کہہ لیں ایک عام سے ملازم یا تعلق دار کو اتنا ایکسپوز نہیں کرسکتا تھا...... مگر میں جانتا تھا کہ آنے والے دنوں میں ایسا زیادہ نہیں چل سکتا تھا۔ جلد یا بدیر مجھے سونگ کھلا سے اڈیسہ کمپنی کے بارے میں ان کے کاروباری مناسبت کی ''نہج'' کا پتا چلانا ازبس ضروری ہوتا۔

کلی منجاروالی مہم کے بعد مجھے اور بھی بہت سی مہمات نمٹانا تھیں۔ لیکن پھر مسئلہ وہی تھا کہ واپسی میں میرے ہمراہ اول خیر وغیرہ بھی ہوسکتے تھے۔ یہ بھی چلو کوئی مسئلہ نہ تھا...... واپسی میں، میں ان کا کوئی اور دوسرا بندوبست کرسکتا تھا۔ لیکن مجھے واپس تو بہرحال آنا ہی تھا۔

ایک تو رنگون (برما) جا کر لولوش سے دو دو ہاتھ کرنا تھا، جو ان دونوں باپ بیٹی کے ذریعے بہ آسانی ہوسکتا تھا، دوسرے جنرل کے ایل ایڈوانی کے قبضے سے وہ طلسم نور ہیرا بھی برآمد کرنا تھا، اس کے لیے اس کی لاڈلی پوتی رینا میرے لیے مددگار کے طور پر موجود تھی۔

میں نے اپنے دشمنوں کے خلاف گویا شطرنج کی بساط بچھانی شروع کردی تھی، اور اب بس سوچ سمجھ کر ''ٹائمنگ'' کے ساتھ انہیں آگے پیچھے سرکانا باقی تھا۔

یوں لگتا تھا کہ مجھے اپنے مشن کا ''بیس کیمپ'' اب اسی جگہ کو بنانا پڑے گا۔

جبکہ سونگ کھلا کی باتوں...... بلکہ اب تو کافی حد تک اس کے انداز واطوار اور ''حرکات وسکنات'' سے لگتا تھا کہ وہ مجھ سے اب باقاعدہ پینگیں بڑھانے کی طرف مائل ہونے لگی تھی۔

اس کے باپ میجر کیم کھلا کا دل جیتنے کے بعد سے تو وہ مجھے اشاروں کنایوں میں یہ بھی جتا چکی تھی کہ اب میں مستقل ان کے ساتھ رہ سکتا ہوں اور ان کے کاروبار میں بھی ان کا ہاتھ بٹا سکتا ہوں، وہ مجھے اشاروں کنایوں میں یہ بھی باور کروانے لگی تھی کہ میری ان کے ساتھ (سونگ کھلا کے ساتھ) آئندہ کی زندگی بڑی اچھی اور پرسکون گزر سکتی تھی اور مجھے یہاں سے کہیں بھی واپس پلٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے ابھی اسے ''آرے'' سے لگا رکھا تھا جب تک کہ اپنی مہمات کو سر نہ کرلیتا یا آگے نہ بڑھا لیتا۔

لنچ ہم نے اکٹھے وارف پر ہی کیا تھا جو خاصا پرتکلف تھا۔ موسم کے تیور بھی بدلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ سونگ کھلا نے بتایا تھا کہ بارانی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں اکثر و بیشتر بارشیں ہوتی رہتی تھیں۔

پھر وہی ہوا...... مطلع ایکا ایکی ہی ابرآلود ہوگیا تھا۔ آسمان پر ایک دم ہی کالے بادل امڈے چلے آئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہر سو طوفانی بارش کی دھندسی چھانے لگی......

ہم تب تک لنچ ختم کرچکے تھے۔ ایک خادم نے وہاں فوراً بڑا سا چھاتا لگا دیا تھا۔

ہم تھوڑی دیر تک سمندر پر برستے آسمان کا یہ دلکش نظارہ کرتے رہے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

اسی دوران اچانک میری نگاہ سامنے کیبن پر پڑی جہاں ہوگرالی اور جوشم...... میری طرف دیکھ دیکھ کر آپس میں کھسر پسر میں مصروف تھے۔ انہیں میرا شاید سونگ کھلا کے ساتھ اس قدر زیادہ گھلنا ملنا شروع ہی سے نہیں بھا رہا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کس ''جوڑتوڑ'' میں لگے ہوئے تھے، یہ الگ بات تھی کہ یہ دونوں میرے لیے خطرے کی گھنٹی بجا سکتے تھے، کیونکہ یہاں شاید یہی دو افراد تھے جنہوں نے مجھے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

ہوگرالی کو تو مجھ پر پورا پورا شبہ تھا ہی اور وہ کسی موقع کا منتظر نظر آتا تھا کہ کسی طرح میرا چہرہ بے نقاب کرڈالے یا کوئی ایسی میری کمزوری اس کے ہاتھ آجائے تو وہ میجر کیم کھلا سمیت سونگ کھلا سے بھی مجھے بدظن کرسکے۔

میں نے ان کی طرف سے توجہ ہٹالی اور اپنے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے کام لیتے ہوئے، اپنے سامنے بیٹھی، میرے ساتھ مستقبل کے سپنے بنتی سونگ کھلا سے کہا۔

''مجھے ایک سیل فون کی ضرورت تھی...... عارضی طور پر ہی، بعد میں لوٹا دوں گا، میرا تو کہیں کھو گیا تھا۔ میں انڈیا میں مقیم اپنے کچھ عزیزوں سے بات کرکے انہیں اپنی خیر خیریت دینا چاہتا ہوں......''

''عارضی طور پر کیوں؟ میں تمہیں مستقل طور پر اپنے ہی نام کی سم والی ایک ہینڈی (موبائل فون) دیے دیتی ہوں......''

"شکریہ۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

اسی وقت اس نے اپنے خادم کو آواز دی جو تیر کی طرح اس کی طرف بڑھا۔ وہ بارش کے پانی میں بھیگا ہوا تھا، تاہم اس نے برساتی نما کوئی شے اپنے اوپر ڈال رکھی تھی۔

سونگ کھلا نے اس سے کچھ کہا تھا، وہ سر کو اثباتی جنبش دے کر چلا گیا، میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے ہوگرالی اور جوشم کھڑے آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے، اب وہ دونوں غائب تھے۔

لنچ کرنے کے بعد ہم دونوں اسی آرام دہ کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ ابھی ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری ہو گی کہ وہی آدمی... وارد ہوا، جسے شاید سونگ نے "ہینڈی" لانے کا کہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیل فون تھا جو اس نے بڑے ادب سے سونگ کی طرف بڑھا دیا۔

یہ بظاہر ایک عام سا سیل فون تھا۔ وہ اس سے لینے کے بعد سونگ نے اسے جانے کا اشارہ کیا اور میری طرف سیٹ بڑھاتے ہوئے ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔

"یہ رکھ لو...... اور جس سے جی چاہے باتیں کرلو، اس میں بیلنس پورے پیکج کے ساتھ موجود ہے۔"

"تھینک یو مس سونگ!"

"ناٹ مینشنڈ۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں بھی ہولے سے ہنس دیا۔

چند لمحات دھڑکتی خاموشی میں بیت گئے، میں چاہ رہا تھا کہ مجھے ذرا تنہائی ملے تو میں کچھ ضروری رابطے کرسکوں۔

باہر بدستور شراٹے دار طوفانی بارش کا شور وشغب جاری تھا اور رہ رہ کر کڑکتی بجلی کے بم جیسی دل دہلا دینے والی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

"راج!" معاً سونگ نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے مگر گہرے لہجے میں کہا۔

"جی؟" میں نے اس کے سجیلے سے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" اس نے کہا۔ میرے لیے اب کا یہ سوال اچانک نہیں تھا اور نہ ہی غیر متوقع بھی۔ میں نے ہنسی والے انداز میں مختصراً کہا۔

"نہیں۔"

میرے اس جھوٹ پر اس کی گہری آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک ابھری تھی۔ "کمال ہے، اتنے خوب رو اور اسمارٹ جوان کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے؟"

وہ جس آزاد معاشرے کی پروردہ تھی، اس میں یقینا یہ حیرت کی بات ہوسکتی تھی، تاہم میں نے اپنے چہرے پہ فوراً ایک اداس سی متانت سموتے ہوئے کہا۔

"مس سونگ! سچی بات کہوں تو میں نے کبھی آج تک کسی کو ایسی نظروں سے دیکھا ہی نہیں، یا کہہ لیں کہ مجھے میرے حالات نے کبھی ایسی فرصت ہی نہیں دی۔ آنکھ ایسے گھرانے میں کھولی جہاں پہلے ہی دشمنیاں پروان چڑھی ہوئی تھیں جس نے بالآخر مجھے تنہا کردیا، اس کے بعد بس زندگی میری اب تک بھاگ دوڑ میں ہی گزری ہے۔ اب یہاں آپ کے پاس خود کو ذرا آزاد سا محسوس کرنے لگا ہوں تو دل میں اب ایک خلا کا سا احساس ہوتا ہے......"

بڑی چالاکی سے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میں نے ایک یاس زدہ سی ہنکاری خارج کی تھی اور سونگ کھلا کا چہرہ کسی اندرونی جذبات کی امید برآوری تلے چمکنے لگا۔ جس نے اسے بے اختیار سا کردیا اور اس نے بڑی اپنائیت اور پیار سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے چونکنے اور حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کی تو وہ جیسے مخمور سے لہجے میں بولی۔

"راج! بالکل ایسا ہی ایک خلا ایک عرصے سے میں بھی اپنے اندر محسوس کرتی آئی ہوں۔"

"ارے......" میں نے بھی اسی حیرت کا اظہار کیا جو اس نے میرے سلسلے میں کیا تھا اور معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ "آپ بھی تو خاصی خوب صورت ہیں، بھلا آپ پر کون عاشق نہ ہوا ہوگا؟"

وہ پھیکے پن سے مسکرائی اور دکھی دکھی سے لہجے میں بولی۔ "ہاں! مجھ سے کسی نے محبت کا دعویٰ کیا تھا...... مگر وہ بے وفا نکلا...... بہت جلدی بدل گیا...... میں نے بھی اسے بھلا دیا۔ لیکن جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا اور جس حال میں زخمی دیکھا، یقین کرو تم مجھے زخمی نہیں بلکہ مجھے اپنے اندر کے زخموں کی مرہم کی صورت میں نظر آئے...... ہاں، راج! یہی سچ ہے کہ میں تمہیں چاہنے لگی ہوں۔ آؤ ہم ایک دوسرے کا خلا بھر دیں، یک قلب دو جاں ہوجائیں...... ہماری بہت اچھی زندگی گزرے گی اور تمہیں میری صورت میں ہر طرح کا عیش و آرام بھی ملے گا، مجھ سے شادی کے بعد تمہیں ایسی زندگی ملے گی جس کا صرف خواب ہی دیکھا جا سکتا ہے......"

اس کے ہاتھ کی جسارت اس کے لب و لہجے کی طرح آوارہ سی ہونے لگی تو میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس سے چھڑایا اور خوف زدہ سی ایکٹنگ کرنے کے انداز میں اس سے بولا۔

''مس...... سونگ کھلاجی...... اِی ی...... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں تو ایک غریب سا آدمی ہوں...... کہاں آپ اور کہاں میں۔ آپ کے پاپا نے یہ سنا تو وہ کھڑے کھڑے مجھے گولی ماردیں گے، یا پھر اس قصاب کی نسل ...... ہوگرالی کے سپرد تو ضرور ہی کردیں گے......''

میں نے اس کے اور اپنے بیچ ایک روایتی تفاوت کا ''جعلی'' نقشہ کھینچتے ہوئے خوف کا تاثر دیا۔ ظاہر ہے میں اسے جعلی ہی کہوں گا...... اب اسے کیا پتا کہ میں کون تھا کیا تھا اور نیز جس کمپنی کی انہوں نے بوتس وغیرہ ٹھیکے پر لی ہیں اس کمپنی کا نصف کا مالک میں خود ہی ہوں۔

''ارے...... نہیں، نہیں، پاپا ایسے ہرگز نہیں ہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔'' وہ بڑے رسان سے بولی۔ ''انہوں نے میری زندگی کے اس اہم فیصلے میں مجھے خودمختار کررکھا ہے۔ اس سلسلے میں جو چاہے میں فیصلہ کروں انہیں کوئی انکار نہ ہوگا...... اور پھر تم کیوں پاپا سے ڈر رہے ہو؟ وہ تو تمہیں ایک بہادر اور جاں نثار انسان کی حیثیت سے پسند کرنے لگے ہیں......''

''تھوڑی سی تصحیح کرلیں مس سونگ کھلا!'' میں نے کہا۔ ''وہ مجھے بہرحال ایک داماد کے روپ میں کبھی دیکھنا نہیں چاہیں گے، ہاں ایک وفادار ملازم کی الگ بات ہے۔''

''ہرگز نہیں وہ تمہیں ملازم نہیں سمجھیں گے، میں اشاروں کنایوں میں پہلے ان پر یہ باور کروادوں گی کہ تم میری پسند ہو...... اس کے بعد برملا اپنی پسند ان سے کہہ ڈالوں گی۔''

مجھے خود پر شہزادہ گلفام ہونے کی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ کوئی خوبصورت لڑکی مجھ سے ملے اور مجھ پر فریفتہ ہو جائے...... تاہم اس میں کوئی شک بھی نہ تھا کہ اگر میں خوبرو اور بنا بنایا ایک مردانہ وجاہت کا حامل تھا تو یہ بھی اللہ ہی کی دین تھی لیکن سونگ کھلا کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ میں کون تھا اور کیا تھا؟ اگر پتا چل جاتا تو وہ مجھے کھڑے کھڑے شوٹ کر دیتی، نہ بھی کرتی تو کم ازکم میں اس کے ''پاپا'' کو تو شوٹ کرنے کا ارادہ کرہی چکا تھا...... لیکن میرا ضمیر بہرحال یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ میں اسے کسی جھوٹی محبت کا جھانسا دے کر اپنا مطلب نکالتا رہوں۔ اگر وہ مجھے پسند کررہی تھی تو کرتی رہے میں کسی کو روک تو نہیں سکتا تھا مگر اپنی طرف سے میں اس کی کسی بھی قسم کی حوصلہ افزائی تک کو بھی معیوب سمجھتا تھا، میں اسے جو تاثر دینا چاہتا تھا وہ دے چکا تھا...... اور وہ بھی یہی سمجھے ہوئے تھی کہ میں

اپنی "کم مائیگی" اور اس کی شان وشوکت تلے ایک نفسیاتی نوعیت کے اندیشے میں مبتلا ہوں اور وہ میری یہ "جھجک" ختم کرنا چاہتی تھی، مگر باوصف اس کے میں اسے ایسی کسی قسم کا "گرین سگنل" بھی دینے کے موڈ میں نہ تھا لہٰذا محتاط لہجے میں گہری متانت سے بولا۔

"مس سونگ کھلا! میرا خیال ہے میں اس وقت کسی ایسے بڑے اور اہم فیصلے کے موڈ میں نہیں ہوں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل اور ذہن پر ایک بوجھ ہے، ایک فرض کا بوجھ...... وہ میں پہلے اتارنا چاہتا ہوں۔"

پھر ایک ذرا توقف کے بعد میں نے اس موضوع سے ہی پہلوتہی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے سونگ...... اگر آپ برا نہ منائیں تو......"

"ارے نہیں...... نہیں، میں بھلا تمہاری کسی بات کا کیوں برا مناؤں گی، پوچھو......؟" وہ دل نشیں انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر بولی۔

"آپ نے اپنے جن نامعلوم دشمنوں کا ذکر کیا تھا، میرا خیال ہے وہ اب کل والے واقعے کے بعد نامعلوم نہیں رہے ہیں...... کیونکہ آپ بھی اسی کمرے میں تھیں جب میں نے آپ کے ایک دشمن کو پکڑا تھا، اس کی باتوں سے تو اس روز مجھے بھی لگا تھا کہ یہ دشمنی کوئی عام نوعیت کی نہیں ہے، یہ تو پوری قوم سے تم لوگوں نے...... یا یوں کہہ لیں، تمہارے پاپا نے ٹکر لے رکھی ہے اور وہ یہاں تک تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ تھا میرا...... کہ آخر تمہارے پاپا کو ضرورت ہی کیا پڑی تھی ایسی آگ میں کودنے کی...... یا پھر وہ واقعی برما میں مقیم مسلمان کمیونٹی سے نفرت کرتے ہیں؟ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اپنے تئیں بڑا حساس معاملہ چھیڑا تھا...... لیکن میرے لیے یہ ضروری تھا کہ میں اس نازک اور حساس معاملے میں کم ازکم سونگ کھلا کا بھی پوائنٹ آف ویو لینے کی کوشش کروں۔ آخر اس کے نظریے کا بھی تو کچھ پتا چل سکے......

میں نے یہ اہم اور نازک سوال کرنے کے بعد بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا کہ آیا اسے میرے اس سوال پر کسی قسم کی تشکیک کا احساس ہوا تھا یا اسے برا لگا تھا، مگر اس کے چہرے پر عام سے ہی تاثرات طاری رہے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولی۔

"ہاں! یہ معاملہ پاپا کے لیے گمبھیر ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی بنتا جا رہا ہے پتا نہیں کیوں پاپا نے اس معاملے میں اب تک اپنی ٹانگ پھنسا رکھی ہے۔"

"اب تک سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"پاپا جب آرمی میں تھے تب ان کی یہ مجبوری تھی کہ وہ (متعصب) بدھ بھکشوؤں کے دباؤ پر برما میں آباد مسلم کمیونٹی کی بے خانمائی میں ان کی مدد کریں اور پاپا کو ایسا بہ حالت مجبوری کرنا پڑا...... مگر باوجود اس کے وہ مسلم آبادیوں کے خلاف اتنے سرگرم نہیں تھے، لیکن جب انہیں برما سیکیورٹی فورسز کا فارمیشن انچارج بنایا گیا تو انہیں اپنی مرضی کے خلاف ایک بار پھر مجبوری کی بنا پر بدھ بھکشوؤں کی ماننا پڑی۔

برما میں اس مذہبی گروہ کا بڑا اثر ورسوخ چلتا ہے۔ مگر جلد ہی پاپا اس خون خرابے سے اکتا گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ گھبرا گئے۔ انہوں نے دوبارہ آرمی جوائن کر لی، مگر اس پاداش میں بدھ بھکشوؤں نے انہیں آرمی سے قبل از وقت ہی ریٹائر کروا دیا...... حالانکہ پاپا کرنل کے رینک تک کی پوزیشن میں جا چکے تھے، یعنی صرف چند ماہ اور آرمی میں رہتے تو انہیں کرنل کا عہدہ مل جاتا...... مگر انہوں نے نہتے اور بے گناہ مسلم کمیونٹی کے خون سے مزید اپنے ہاتھ رنگنا مناسب خیال نہ کیا اور ان کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی۔ اب تم دیکھ ہی رہے ہو کہ پاپا نے اپنے کاروبار کی بنیاد ڈال لی، جو ان کی ہی نہیں میری بھی ایڈونچرز فطرت کے عین مطابق ہے۔"

"حیرت ہے...... جبکہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ برما میں مقیم مسلمان بے گناہ ہیں، پھر بھی ان پر وہاں یہ ظلم وستم کیا جاتا رہا؟ آخر مسلمانوں سے ایسی نفرت کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے تھی...... جبکہ انسان سے نفرت کا درس تو کوئی بھی مذہب نہیں دیتا، پھر بدھا تو بذات خود محبت انسانی کا درس دیتے رہے ہیں۔ آخر تمہارے یہ بدھ بھکشو مذہبی انتہا پسندی اور منافرت کی طرف کیوں اچانک مائل ہوئے؟"

"میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں راج؟ شاید اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے......"

میں خاموش ہو گیا۔

سونگ کھلا نے اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس پر مجھے ایک فیصد بھی یقین نہیں آیا تھا۔ صاف لگا تھا کہ وہ اپنے باپ کی اس بربریت اور سفاکی سے خود بھی شرمندہ تھی، یہ الگ بات تھی اس کی یہ "شرمندگی" میرے اور اس کے بیچ "تعلقات" کی وجہ سے تھی، یعنی خود کو

میرے سامنے شرمندہ ہونے سے بچانا اس کا مقصود تھا یا پھر اس کا خود اپنا ضمیر ملامت کر رہا تھا۔

میں نے دانستہ اس موضوع کو طول نہیں دیا، کیونکہ جو میں جاننا چاہتا تھا وہ جان چکا تھا۔ اس کا باپ متعصب بھکشوؤں کا آلۂ کار بن چکا تھا۔ یہ ممکن تھا اسے اس سلسلے میں ان کی ''فنانشل سپورٹ'' بھی حاصل رہی ہو...... جو مراعات اور اثر و رسوخ کی صورت میں بھی ہوسکتی تھی۔ تاہم یہ بات طے تھی کہ میجر کیم کھلا، برمی مسلمانوں کے ساتھ اس ظلم و ستم میں بدھ بھکشوؤں کا آلۂ کار بنا ہوا تھا اور اس کی لاڈلی بیٹی کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ اس کا باپ بے گناہ انسانوں کے ساتھ کیا ظلم کر رہا تھا۔ اسے بس اپنی پر آسائش زندگی سے غرض تھی اور بس...... فقط میرے سامنے اس نے اس کی محض دکھاوے کی حد تک مذمت کی تھی۔

''میں درحقیقت اس طرح کی سچویشن سے گھبراتا ہوں۔ اسی لیے میں نے تم سے اس کے بارے میں ذرا تفصیلی انداز میں گفتگو کی ضرورت محسوس کی تھی، کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہمارے درمیان کسی قسم کی بھی تعلق داری میں کوئی ذرا سا بھی ابہام ہو...... جو کیا خبر کب میرے لیے یا ہم دونوں کے درمیان کسی مصیبت کا باعث بنے، کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کی اور میری اس دوستی کو ہوگرالی اور آپ کا یہ ویدنما بھکشو جو شم سخت ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں......''

میں نے چالاکی سے بات بنائی تو وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ''مائی فٹ! یہ دونوں کون ہوتے ہیں ہماری دوستی کو ناپسند کرنے والے...... یہ دونوں ہمارے نوکر ہیں۔''

''مگر یہ دونوں نوکر بہت سے لوگوں کو میرے خلاف بھڑکا سکتے ہیں...... جس طرح بھکشوؤں نے برما میں مقیم مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا اور وہ اس میں نہ صرف عوامی سطح پر بلکہ حکومتی سطح پر بھی کامیاب ہوتے نظر آرہے ہیں، کیونکہ برما میں مسلمانوں کے خلاف اس ظلم پر کسی طبقے نے ابھی تک کوئی آوازِ حق بلند نہیں کی ہے۔''

''تم گفتگو کو کس نہج پر لے جا رہے ہو راج؟'' معاً سونگ کھلا میری طرف دیکھ کر قدرے عجیب سے لہجے میں بولی اور مجھے اندر سے کھٹکنا پڑا، بات بناتے ہوئے اپنے چہرے پر تفکر سمو کر بولا۔

''میرا خیال ہے کہ گفتگو کی یہ نہج آپوں آپ نہیں آئی بلکہ موجودہ حالات کا تقاضا اس کی اصل وجہ ہے۔ خیر چھوڑیں پھر اس موضوع کو، بس یونہی یہاں ان دو افراد کی چبھتی نظروں نے مجھے شاید تھوڑا سا وہمی بنا دیا تھا۔''

''وہم کرنا بھی سائیکی کی ایک قسم ہوتی ہے اور مجھے سائیکی قسم کے لوگ پسند نہیں ہیں۔''

وہ اچانک اس بار بدلے ہوئے سے لہجے میں بولی، جس نے مجھے...... چونکا دیا، مگر میں نے اس کی بات جیسے سنی ان سنی کر دی۔ مصلحت کوشی آڑے آتی تھی، ورنہ تو میں اسے اس بات کا ایسا جواب دیتا کہ یہ برملا تو نہیں البتہ اندر سے خود سمیت اپنے پاپا، اور اپنے تعصبی بدھوں کو ہی نفسیاتی مریض ماننے پر مجبور ہو جاتی...... پھر یہ الگ بات ہوتی کہ اس کے بعد جیسے...... چراغوں میں تیل نہ رہا یعنی پھر میری اور اس کی یہ دوستی یقینی طور پر عداوت میں بدل جاتی۔

بحث کسی بھی نوعیت کی ہو، بڑھتی ہے تو اس میں تلخی عود کر آتی ہے۔ تاہم اب بھی سچ اور حق کہنے سے میں پیچھے نہیں ہٹا تھا، باتوں باتوں میں، اسے میں یہ جتانے اور باور کرانے میں کامیاب رہا تھا کہ ان کے دیس میں جو کچھ مسلم کمیونٹی کے ساتھ ہو رہا تھا وہ ٹھیک نہیں ہو رہا تھا، میرے اتنے ہی کہنے پر اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔ بٹ...... آئی ڈونٹ کیئر...... شہزاد احمد خان شہزی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ مصلحت اندیشی بھی ایک حد تک ہوتی ہے۔ میں سچ کو ایسی کسی مفاداتی سولی پر چڑھا کر اسے مسخ نہیں کرسکتا تھا۔ میرا ایمان تھا کہ اللہ اگر ایک در بند کرتا ہے تو سو در کھولتا ہے......

''یوں بھی تمہیں اس موضوع کو سیریس نہیں لینا چاہیے تھا، یہ ہمارا اور ہمارے ملک کا داخلی معاملہ ہے...... وہ جانے ان کا کام۔ کیا تمہارے دل میں مسلمانوں کا درد سمویا ہوا ہے؟'' یہ کہتے ہوئے وہ مجھے کچھ شاکی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

اب تک چند دنوں کی اچھی خاصی ''تعلق داری'' جو اس کی طرف سے کسی حد تک ''قلب داری'' کی جانب بڑھ رہی تھی اس میں ہلکی سی مجھے دراڑ پڑتی محسوس ہو رہی تھی...... تاہم اس کی بات پر میرا دماغ گھوم گیا، اپنی طبیعت ہی ایسی تھی...... گویا یہ کہہ کر اس نے اس بات کا اعتراف کرلیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی ناجائز کریں، وہ درست ہے اور کسی کو اس میں دخل انداز ہونے کی ضرورت نہیں، اس سے اس کی ذہنی سطح کا اندازہ ہونے لگا۔ برمی مسلمانوں کے خلاف اس کے اندر کا بغض ظاہر کرنے میں بے شک مجھے بڑی قیمت چکانی پڑ رہی تھی شاید...... لیکن میں نے بھی تلخی سے کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے آپ کی نگاہوں میں انسانی حقوق اور جبر کی کوئی اہمیت نہیں......''

''تم تو خود ہندو ہو اور میں ان کی مذہبی تاریخی اور

سیاسی ادوار سے اچھی طرح واقف ہوں، انہوں نے کبھی مسلمانوں کو اپنا دوست نہیں سمجھا ہے...... پھر تمہیں کیوں ان کا اس قدر غم کھائے جا رہا ہے؟"

"میں نے تو آپ سے عام سی بات کہی تھی کہ آپ کی نظروں میں جائز کیا ہے اور ناجائز کیا...... اور ساتھ ہی اپنے ایک خوف کا اظہار کیا تھا...... کہ دشمنی کہیں کوئی بڑا گل نہ کھلا دے......" میں نے مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

میری بات پر وہ چند ثانیوں تک پرسوچ انداز میں بہ غور میرا چہرہ تکتی رہی اس کے بعد وہ بھی یک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی پھر بولی۔ "تمہارا خوف بے جا ہے...... تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میرے ساتھ مستقبل میں کسی پنپنے والے تعلق سے کہیں یہی مصیبت تمہارے گلے بھی نہ پڑ جائے جو اس وقت میرے اور پاپا کے گلے کا ہار بنی ہوئی ہے۔"

"گفتگو کی غایت کو اب آپ سمجھی ہیں میڈم!" میں نے بھی چل سو چل، جیسا وہ سمجھتی تھی ایسا ہی تاثر قائم رکھتے ہوئے ہنس کر کہا تو اس کی آنکھوں سے معنی خیز شگوفے سے پھوٹتے محسوس ہوئے۔

میں جو چاہ رہا تھا وہی وہ سمجھ رہی تھی میں اس کا "ٹریک" تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اچانک وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔ "روانگی کا کیا پروگرام ہے؟"

"ابھی بتاتی ہوں تھوڑی دیر میں......" وہ یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے انداز میں مجھے رکھائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ میں وہیں بیٹھا سوچتا رہ گیا۔

باہر بارش بدستور جاری تھی، زور کچھ ٹوٹا ہوا لگتا تھا، مگر اب بھی وقفے وقفے سے بجلی کی کڑکتی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

میں پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کچھ سوچ کر کیبن کے دروازے کے پاس آکر ذرا ٹھہرا اور اس کی جھری سے باہر جھانکا تو سونگ کھلا کو چند ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑا پایا...... وہ بھکشو (وید) جوشم اور ہوگرالی سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ دونوں اس کی ہر بات پر بار بار اپنے سر کو فدویانہ انداز میں تفہیمی جنبش دے رہے تھے اور گاہے بہ گاہے گردن ذرا موڑ کر کیبن کی طرف دیکھ لیتے تھے، جس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں چنداں دیر نہ لگی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہونے چلا تھا۔

سونگ کھلا شاید میرے ہی سلسلے میں اپنے ان دونوں گماشتوں کو کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ اس کے بعد وہ وارف پر تیز تیز آگے بڑھ گئی......

ہوگرالی اور جوشم چند ثانیے وہیں کھڑے رہے اور ایک دوسرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور معنی خیز انداز میں اپنے سروں کو جنبش بھی دیتے جاتے تھے۔ میرا دل کسی مخفی خطرے کے پیش نظر تیزی سے دھڑکنے لگا۔

میں پلٹ آیا اور سوچنے لگا کہ سونگ کھلا کے رویے میں تبدیلی آنے کے بعد مجھے فوری طور پر کون سا قدم پہلے اٹھانا چاہیے تھا؟

پہلا خیال میرے ذہن میں یہی ابھرا تھا کہ سونگ کھلا کو اب زیادہ آزمانا بے وقوفی ہی نہیں بلکہ خطرے کو دعوت دینے کے مترادف ہو سکتا تھا۔ اگر اس کی نیت میں کوئی نئی فتور در آیا تھا تو اس کا مجھے آج ہی آج میں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا اور اس کے لیے سونگ کھلا کا آج میری یہاں سے روانگی کا بندوبست کرنے یا نہ کرنے کا انحصار تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے اپنا کوئی علیحدہ لائحہ عمل تیار کر لینا چاہیے تھا۔

میں نے سیل فون پر اسی وقت آنسہ خالدہ سے رابطہ کیا۔ پچھلی بار میری صرف زہرہ بانو سے بات ہو سکی تھی مگر...... آنسہ خالدہ سے رابطہ ممکن نہ ہو سکا تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے اسی سے رابطہ کیا تھا۔

دوسری طرف رنگ جا رہی تھی...... اور میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا، چوتھی رنگ کے بعد دوسری طرف سے کسی نے کال ریسیو کی اور 'ہیلو' کہا۔

اس نسوانی آواز پر میں بری طرح چونکا تھا۔ ابھی میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ کی بھیانک آواز گونجی...... میں بری طرح ٹھٹکا۔ دوسری جانب سے فون پر...... ہیلو...... ہیلو...... کہا جاتا رہا۔

دوسرے ہی لمحے ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور مجھے پورا کیبن لرزتا ہوا محسوس ہوا۔ دھماکا اس قدر شدید تھا کہ میں کانپ گیا تھا اور سیل فون بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ میں ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ دوسرا دھماکا میرے کیبن کے بالکل سامنے ہوا اور دروازہ ٹوٹ کر اندر آن گرا۔ دھوئیں اور بارود کا بگولا سا اندر در آیا تھا جس نے ماحول میں کثافت پھیلا دی تھی اور مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا......

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

میرا سایہ

سرور اکرام

شادی لڑکی کی ہو یا لڑکے کی... فی زمانہ دونوں کے رشتوں کی دستیابی مسئلہ فیثاغورث بنتا جارہا ہے... دونوں فریقین کے درمیان مصالحت کرانا... اور ان کے ملاپ کی کڑیوں کو جوڑنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں... اسی تناظر میں بُنی گئی تحریر کے تحیر انگیز تانے بانے...

لبوں پر تبسم ریزیاں بکھیر دینے والا شگفتہ وفرحت آفریں سایہ

میں ایک عام سے ہوٹل میں ایک عام سی چائے پی رہا تھا کہ وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔

تنی ہوئی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھوں والا وہ بندہ مجھے کچھ پُراسرار سا دکھائی دیا تھا۔ میں نے چائے کی پیالی اپنی طرف کھسکا لی اور اسی وقت اس نے مجھے مخاطب کیا۔

''تمہارا نام عارف ہے نا؟''

''جی ہاں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میں عارف ہوں لیکن آپ، آپ کون ہیں؟''

"میں اپنا تعارف کرانا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم عارف ہو۔"

اس سے پہلے کہ میں اُس سے کچھ کہہ سکتا یا اس کے بارے میں جان سکتا، وہ کھڑا ہوا اس نے میرے شانے پر تھپکی دی اور ہوٹل سے باہر چلا گیا۔

میں ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ کیا رویہ تھا اس کا۔ حیرت انگیز بلکہ خوف زدہ کرنے والا۔ پُراسرار۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ خدا خیر کرے۔ آج کل حالات ویسے ہی خطرناک ہوتے جارہے ہیں۔

ہر آدمی شک کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔ یہ کہیں کسی ایجنسی کا آدمی تو نہیں تھا۔ ان کا انداز بھی ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ الجھا دینے والا جس طرح اس نے مجھے الجھا دیا تھا۔

اس کو میرا نام بھی معلوم تھا اور اس نے جس انداز سے میرے شانے پر تھپکی دی تھی۔ اس سے یہ بات محسوس ہورہی تھی کہ کوئی بات نہیں بچہ، تجھ سے ہم بعد میں نمٹیں گے۔ ابھی آرام سے چائے پی لے۔ لیکن اب آرام سے چائے کون پی سکتا تھا۔ وہ تو دہلا کر چلا گیا تھا۔

میں چائے کے پیسے دے کر ہوٹل سے باہر آگیا۔

کچھ عجیب طرح کی بے چینی ہوگئی تھی۔ ایسا میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا۔ بہرحال میں اسی عالم میں خوف زدہ سا گھر جارہا تھا۔

میں شہر کے ایک مضافاتی علاقے کے ایک چھوٹے سے مکان میں کرائے پر رہتا تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ ایک جگہ رشتے کی بات چل رہی تھی۔ وہ لوگ بھی میری طرح سفید پوش ہی تھے۔ اس لیے ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کرلیا تھا۔

میں لڑکی کو بھی دیکھ چکا تھا۔ اچھی لڑکی تھی جس طرح ہمارے یہاں کی سیدھی سادی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اب میرے والدین کے پنجاب سے آنے کے بعد رشتے کی بات آگے بڑھائی جاسکتی تھی۔

بہرحال میں اپنی گلی میں داخل ہوا اور وہ آدمی پھر دکھائی دے گیا۔

جی ہاں، وہی آدمی...... اپنے پُراسرار انداز میں پان سگریٹ کے کیبن کے پاس کھڑا ہوا تھا۔ یہ کیبن گلی کے کونے پر تھا۔

مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پُراسراری سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی جبکہ میں اسے دیکھ کر پلٹا گیا تھا۔

وہ آدمی یہ بھی جانتا تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں اسی لیے وہ میرے محلے اور میری گلی میں موجود تھا۔ اس نے میرے دیکھتے دیکھتے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی، اس پر کچھ لکھا اور تیز قدموں سے ایک طرف چلا گیا۔ وہ میرے مخالف سمت گیا تھا۔

میرا یہ حال تھا کہ میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا تھا۔ طرح طرح کے اندیشوں اور واہموں نے گھیر لیا تھا۔ کون تھا وہ، کیا چاہتا تھا۔ اگر اس کا تعلق کسی ایجنسی سے تھا تو پھر اسے مجھ سے کھل کر بات کرلینا چاہیے لیکن کیوں؟ میں نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا کہ کوئی ایجنسی مجھ میں اس حد تک دلچسپی لے۔

اپنی گلی میں تو آگیا لیکن گھر جانے کے بجائے وہیں سے واپس ہوگیا۔ میں اپنے ایک دوست سلطان کے پاس جارہا تھا۔

ایسے موقع پر دوستوں سے مشورہ کرلینا بہتر ہوتا ہے۔ سلطان سمجھ دار آدمی تھا اس لیے میں نے اس کے پاس جاکر یہ سچویشن اس کے سامنے رکھ دی۔

"ہوں۔" اس نے ایک ہنکاری بھری۔ "عارف! یہ بات تو کنفرم ہے کہ تمہاری نگرانی ہورہی ہے۔"

"لیکن کیوں؟" میں تقریباً چلا اٹھا۔ "کیوں نگرانی ہورہی ہے۔ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے؟"

"یہ تمہیں خود سوچنا ہوگا۔" سلطان نے کہا۔ "یاد کرنا ہوگا، اچھا یہ بتاؤ تمہارے دفتر کے معاملات کیسے جارہے ہیں؟"

"وہ تو سب ٹھیک ہیں۔"

"میرا مطلب ہے دفتر میں کوئی مشکوک سرگرمی تو نہیں ہوتی۔"

"نہیں بھائی، سیدھا سادہ دفتر ہے۔ سب لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔"

"تمہاری کسی سے دشمنی؟"

"یہ تو تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔"

"اوہ، تو پھر ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تمہارا حلقۂ احباب، تم جن لوگوں کے درمیان اٹھتے بیٹھتے ہو اُن میں کوئی خرابی ہوسکتی ہے۔"

"یار دفتر سے گھر جانے کے بعد محلے کے ایک ہوٹل

میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''وہیں پر محلے کے کچھ حضرات بھی آجاتے ہیں۔ ان سے گپ شپ رہتی ہے۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔''

''کیا تم ان سبھوں کے بیک گراؤنڈ اور ان کے کردار سے واقف ہو؟'' سلطان نے پوچھا۔

''نہیں، بس روزانہ کی بیٹھک ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''بس، ان ہی میں سے کوئی ایسا ہے جو ایجنسی کی نظر میں مشکوک ہے۔ چونکہ تم بھی اس کے ساتھ دیکھے جاتے ہو اسی لیے تمہاری نگرانی بھی ہو رہی ہے۔''

''یار! یہ تو بہت بڑی پرابلم ہے، اب کیا کروں؟''

''یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ نظر انداز کرو۔'' سلطان نے کہا۔ ''ہوٹل میں بیٹھنا ترک کر دو۔ چھوڑ دو سب کو۔ اور اگر چھوڑ نہیں سکتے تو کم از کم اتنا کرو کہ اُن سے کم ملو۔ یا بس سلام دعا کر کے نکل لو۔ اپنی مصروفیت کا بہانہ کر لو یا ایسی ہی کوئی بات کر کے اپنی جان چھڑا لو۔ ورنہ بہت عذاب میں پھنس جاؤ گے۔''

سلطان نے بہت معقول مشورہ دیا تھا۔

یہ گفتگو اس کے گھر میں ہی ہو رہی تھی۔ اندر سے چائے آگئی۔ اس کی والدہ جانتی تھیں کہ مجھے ان کے ہاتھ کے پکوڑے بہت پسند ہیں اسی لیے بے چاری نے چائے کے ساتھ پکوڑے بھی بنا کر بھیج دیے تھے لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے کسی چیز میں مزہ ہی نہیں آرہا تھا۔

بہر حال میں پریشان سا سلطان کے گھر سے باہر آگیا۔

اور باہر آتے ہی پھر ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ پُراسرار آدمی سلطان کے گھر کے سامنے بھی کھڑا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ میرا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوگا۔

مجھے دیکھ کر وہ اپنے اسی پُراسرار انداز میں مسکرایا اور تیزی سے ایک طرف بڑھ گیا۔ یہ ہرگز کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کم بخت میرے ہی پیچھے تھا۔ میں اس کا ٹارگٹ تھا لیکن کیوں؟

اب یہی ہو سکتا تھا کہ میں محلے کے دوستوں سے کنارہ کشی اختیار کر لوں۔ سلطان ٹھیک ہی کہتا تھا۔ مجھے کسی کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں کیا معلوم تھا۔

نہ جانے کون کس قسم کی سرگرمی میں مصروف ہو۔ کس کے روابط کن لوگوں سے ہوں۔ پورے شہر سے مشکوک قسم کے لوگ اٹھائے جارہے تھے۔

ٹی وی میں ایسی خبریں ہر وقت آیا کرتی تھیں لیکن اس شخص نے اب میرے اعصاب کا امتحان لینا شروع کر دیا تھا۔

دشمن اگر کھل کر سامنے آجائے تو اس سے نمٹنے کی ترکیب بھی سوچی جا سکتی ہے مگر وہ اس طرح چھپ چھپ کر پریشان کرتا رہے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے۔

اس شام میں ہوٹل کی طرف بھی نہیں گیا۔ سلطان کی بات یاد آرہی تھی کہ مجھے ان دوستوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ نہ جانے ان میں سے کون کس مزاج کا ہو، کس کردار کا ہو۔

وہ شام میں نے گھر پر ہی کتابیں پڑھتے ہوئے گزاری تھی۔

دس بجے کے قریب میرے موبائل پر کسی کا فون آگیا۔ کسی کال سینٹر کا نمبر تھا۔ یعنی جو بھی تھا، اس نے مجھے اپنے نمبر سے فون نہیں کیا تھا۔

''عارف سلیم سے بات کرنی ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''جی، میں عارف سلیم ہی بول رہا ہوں۔''

''تم گھر پر ہی ہونا؟'' پوچھا گیا۔

''جی ہاں، میں گھر پر ہی ہوں، لیکن آپ کون ہیں؟''

''ٹھیک ہے۔ تم گھر پر ہی رہنا۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

اب تو میرے اوسان واقعی خطا ہو چکے تھے۔ اس شخص کو اس بات سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں ہوں۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ ٹھیک ہے۔ تم گھر پر ہی رہنا۔ صورتِ حال کو اور بھی پُراسرار اور خطرناک بنا رہا تھا۔ میں نے اس سے کہہ تو دیا تھا کہ میں گھر پر ہی ہوں اور اس کے ساتھ اس کا یہ مشورہ کہ میں گھر پر ہی رہوں، اس کے بعد مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں گھر پر رہ سکتا۔

میں نے اسی وقت اپنی ضرورت کی دو چار چیزیں لیں۔ پھر سلطان کے گھر پہنچ گیا۔ وہ دوبارہ رات کے وقت مجھے اپنے گھر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''یار! اب تو واقعی معاملہ سیریس ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اچھا ہوا تم نے رات اپنے گھر نہیں گزاری۔ ورنہ خدا جانے کیا ہونے والا تھا۔''

"یار سلطان، خدا کے لیے بتاؤ مجھے میں کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو تم کو ہراساں کیا جارہا ہے۔" اس نے کہا۔ "ابھی تک کھل کر کوئی بات سامنے نہیں آئی ہے۔ تم ایسا کرو پولیس میں رپورٹ کروادو۔"

"لیکن کیا رپورٹ کرواؤں۔ اس نے اب تک کوئی نقصان بھی تو نہیں پہنچایا ہے۔"

"کیا یہ نقصان کم ہے کہ تم رات اپنے گھر میں نہیں گزار رہے۔ اس سے خوف زدہ ہو کر کہیں دور آگئے ہو۔" سلطان نے کہا۔ "اس کے علاوہ نفسیاتی مریض بھی بنتے جارہے ہو؟"

"وہ تو میں ہو ہی گیا ہوں۔ پاگل بنا کر رکھ دیا ہے اس آدمی نے۔ لیکن میں ایک دو دن اور دیکھ لوں۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ ایجنسی کا آدمی ہے تو پولیس اس کا کیا بگاڑ لے گی؟ وہ تو خود اس کا ساتھ دے گی۔"

"یہ تو ہے۔ تو پھر ایسا کرو، ہمت کر کے اس سے بھڑ جاؤ۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس سے پوچھ لو کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ کیا چاہتا ہے؟ کیوں پریشان کررہا ہے؟ جو بھی ہوگا، وہ سامنے آجائے گا۔"

"ہاں یار، اب تو یہ کرنا ہی ہوگا۔"

مجھے سلطان کے گھر میں ہی رہنا پڑا تھا۔ ظاہر ہے اس رات میں گھر تو نہیں جاسکتا تھا۔ دوسری صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر دفتر جانے کے بجائے اپنے گھر آگیا۔

کونے پر جو پان سگریٹ والوں کی کیبن تھی، وہ کھلی ہوئی تھی۔ اس کے مالک رشید نے مجھے دیکھ کر آواز لگائی۔ "عارف بھائی، ذرا اِدھر آنا۔"

میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ "ہاں رشید بھائی، خیریت تو ہے؟"

"عارف بھائی، تم کہیں کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

میرا دل دھڑک اٹھا۔ زبان خشک ہوگئی۔ "نہیں تو رشید بھائی، میں ایسا آدمی نہیں ہوں، تم تو جانتے ہو لیکن بات کیا ہے؟"

"بھائی، تمہارے لیے انکوائری ہورہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "ایک پُراسرار سا بندہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اس نے ایک دو بندوں سے اور بھی بات کی ہے۔ میری مانو میاں تو کچھ دنوں کے لیے اِدھر اُدھر ہوجاؤ۔"

"رشید بھائی، جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں ہے تو پھر مجھے کس بات کا ڈر ہے۔" میں نے کہا۔

"بھائی، میں نے تمہاری بھلائی کی بات کی ہے۔"

"بہت بہت شکریہ رشید بھائی، میں احتیاط کروں گا۔"

گھر کی طرف جاتے ہوئے میرے پاؤں لرز رہے تھے۔ خطرہ بڑھتا جارہا تھا اور خطرہ بھی بالکل انجانا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے واقعی کچھ دنوں کے لیے کہیں چلا جانا چاہیے تھا لیکن کہاں جاتا، اس شہر میں تو میرا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا جو مجھے کچھ دنوں کے لیے پناہ دے سکتا۔

ایک بات یہ بھی تھی کہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں اس شخص سے بھاگ نہیں سکتا۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ سائے کی طرح میرے تعاقب میں رہے گا۔

اسی لیے میں نے ایک بہت بڑا اور جرأت مندانہ فیصلہ کرلیا۔ میں نے یہ سوچ لیا کہ اب میں اس سے بھڑ ہی جاؤں گا۔ ورنہ یہ چوہے بلی کا کھیل مجھے پاگل کر کے رکھ دے گا۔

نہ جانے کیوں یہ فیصلہ کرتے ہی مجھ میں ایک طرح کی توانائی سی آگئی تھی۔ ایک حوصلہ سا ہونے لگا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ اگر مجھ پر کوئی الزام ہے یا مجھ پر کسی قسم کا کوئی شک ہے تو وہ سامنے آجائے گا اور کیا ہوگا؟

ایک بات یہ بھی تھی کہ میرا اس طرح بھاگتے رہنا مجھے خوامخواہ مشکوک بنا رہا تھا۔ اسی لیے بہتر یہی تھا کہ اس کا سامنا کرلیا جائے۔

میں شام تک اپنے گھر ہی میں رہا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ لیکن شام کے وقت دروازے پر ہونے والی دستک نے پریشان کردیا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو پڑوس کے مجید صاحب تھے۔ ان سے بس رسمی سی سلام دعا تھی۔ شریف آدمی تھے۔ کئی بیٹیوں کے باپ تھے اور کسی سرکاری اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔

اس وقت مجید صاحب کچھ ناگوار تاثرات لیے کھڑے تھے۔

"تشریف لائیں جناب۔" میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"عارف صاحب، کیا آپ کو اندازہ ہے کہ آپ ایک

اکیلے انسان ہیں۔‘‘
’’جی جناب، خود مجھ سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہوگا۔‘‘ میں نے کہا۔
’’آپ کے ساتھ کوئی فیملی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہم محلے والوں نے آپ کو ایک مکان کرائے پر دے دیا۔ کیونکہ آپ ایک شریف انسان دکھائی دیے تھے۔‘‘
’’جی جناب، لیکن بات کیا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ اس محلے میں مشکوک لوگوں کا آنا جانا ہو۔‘‘ مجید صاحب نے کہا۔
’’مشکوک لوگوں سے کیا مراد ہے آپ کی؟‘‘
’’ایجنسی کے لوگ آپ کے بارے میں چھان بین کرتے پھر رہے ہیں۔‘‘ انہوں نے بتایا۔ ’’ان کا ایک بندہ دوپہر کو آکر آپ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا۔‘‘
’’پھر جناب، آپ نے کیا کہا؟‘‘
’’وہی جو ہمیں کہنا چاہیے تھا۔ یعنی ہم آپ کے بارے میں زیادہ نہیں بتا سکتے کیونکہ آپ کچھ ہی دنوں پہلے اس محلے میں آئے ہیں۔ بظاہر تو شریف دکھائی دیتے ہیں اب اندر کا حال خدا ہی جانتا ہے۔‘‘
’’مجید صاحب! ایک بات بتائیں۔ اگر کوئی شخص میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہا تھا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔ ’’اور اس بات سے آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں کوئی مجرم ہوں؟‘‘
’’عارف صاحب! ایجنسی کے لوگ یونہی شوقیہ کسی کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کرتے۔‘‘
’’آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اس کا تعلق ایجنسی سے ہے۔ کیا اُس نے آپ کو بتایا تھا؟‘‘
’’کیوں بحث کر رہے ہیں بھائی، ایسے لوگ اپنے بارے میں اعلان نہیں کرتے، اس کا اسٹائل یہ بتا رہا تھا اس کا حلیہ یہ بتا رہا تھا۔‘‘
اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ مجید صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ میرا بھی تو یہی خیال تھا۔ پہلی نظر ہی میں وہ خفیہ پولیس کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔
’’چلیں، اب بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’صرف میں نہیں چاہتا بھائی، پورا محلہ یہی چاہتا ہے کہ آپ یہ مکان خالی کر دیں۔‘‘ مجید صاحب نے کہا۔ ’’میں تو سب کی طرف سے نمائندگی کرنے آیا ہوں۔‘‘
’’ٹھیک ہے مجید صاحب۔‘‘ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ’’آپ لوگوں کی یہی مرضی ہے تو خالی کر دوں گا۔‘‘
اب اُس آدمی کے لیے میرے دل میں لاوا پک کر تیار ہو چکا تھا۔ کچھ بھی ہو، اب مجھے اس سے نمٹنا تھا۔ ایسی کشمکش میں کب تک رہا جا سکتا تھا۔ آر یا پار ہو جائے تو زیادہ بہتر تھا۔
شام کے بعد میں گھر سے نکل کر ہوٹل کی طرف آ گیا۔ ہوٹل میں میرے ساتھ روز کی بیٹھک کرنے والے میرے دوست موجود تھے۔ میں روزانہ کی طرح ایک کرسی کھینچ کر خود بھی بیٹھ گیا۔
وہ لوگ شاید کسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے لیکن میرے بیٹھتے ہی خاموش ہو گئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایک ایک کر کے اٹھ کر جانے لگے۔
ان کا یہ رویہ بہت توہین آمیز تھا۔ میں نے اُن میں سے ایک کا ہاتھ تھام لیا۔ ’’کیا بات ہے، کیا ہوا ہے تم لوگوں کو، مجھے دیکھتے ہی کہاں جا رہے ہو؟‘‘
’’عارف صاحب! سچ بات یہ ہے کہ ہم آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے۔‘‘ اس نے کہا۔
’’کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔
’’دیکھیں، ہم بیوی بچوں والے لوگ ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ہم نہیں چاہتے کہ آپ کے چکر میں ہم بھی ایجنسی کی نگاہوں میں آجائیں اور کسی دن اٹھا لیے جائیں۔ اس لیے پلیز برا مت مانیے گا عارف صاحب، یا تو آپ اس ہوٹل میں نہ آیا کریں اگر آئیں تو ہم سے دور بیٹھیں۔‘‘
اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سوری کہہ کر ہوٹل سے باہر چلا گیا۔
اس وقت میری یہ کیفیت تھی کہ اگر وہ شخص سامنے ہوتا تو میں اسے جان سے مار دیتا۔ بعد میں چاہے جو بھی ہو۔ اس کی وجہ سے میں پورے معاشرے سے کٹتا جا رہا تھا۔ محلے والوں نے محلہ چھوڑنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ دوست خوف سے میرے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مجھے اب یقین ہو گیا تھا کہ میں اس کے چکر میں کسی دن اپنے دفتر سے بھی فارغ کر دیا جاؤں گا۔
کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں ہوٹل سے گھر واپس آگیا۔ اس رات پھر کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ سوائے مجید صاحب کی وارننگ کے اور ہوٹل کے دوستوں کے بائیکاٹ کے علاوہ۔

لیکن دوسری صبح وہ کم بخت مجھے اپنے دفتر کی سیڑھیوں پر کھڑا مل گیا۔ وہ شاید میرے دفتر ہی کی طرف جا رہا تھا۔

میں غصے اور خوف کی ملی جلی کیفیت میں تھا۔ اس کو دیکھ کر ایک جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ میں نے اچانک اس پر جھپٹا مارا اور اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑھکتا ہوا سیڑھیوں سے نیچے چلا گیا۔ اس کی چیخ انتہائی زوردار اور انتہائی مکروہ تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے لوگ جمع ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے مجھے اُسے دھکا دے کر گراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔

میرے دفتر والے بھی نیچے آگئے۔ میں اس وقت بھی اسے برا بھلا کہے چلا جا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں پولیس بھی آگئی اور مجھے پکڑ کر تھانے لے آئی جبکہ اس شخص کو ایمبولینس کے ذریعے اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔

تھانے میں مجھ سے سوال کیا گیا۔ ”ہاں بھئی، کیوں گرایا تھا اس شخص کو؟“

”اس لیے کہ اس شخص نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔“ میں نے بتایا۔

”کیا دشمنی ہے اُس سے؟“

”کوئی دشمنی نہیں ہے بلکہ میں تو اس کو جانتا بھی نہیں ہوں۔“

جب میں نے تھانے دار کو سارا چکر بتایا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔ ”کمال ہے، کون ہے وہ بندہ۔ ایجنسی والے تو ایسا نہیں کرتے۔“

”خدا کے لیے اس سے پوچھ کر بتا دیں صاحب، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

تھانے دار بھلا آدمی تھا۔ اس نے میری پرابلم سمجھ لی تھی۔ ”اچھا میرے ساتھ اسپتال چلو، دیکھتے ہیں کیا چکر ہے۔“

وہ مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے آیا۔ یہاں پتا چلا کہ اس شخص کو ہوش آگیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے بستر کے پاس لڑکی والے بھی موجود تھے۔

یعنی اس گھر کے لوگ جس گھر کی لڑکی سے میرے رشتے کی بات چل رہی تھی۔

”ارے میاں، یہ تم نے شگن بھائی کے ساتھ کیا کیا؟“ لڑکی کے باپ نے پوچھا۔

”کون شگن بھائی؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہی تو ہیں شگن بھائی۔ ہم نے ان سے کہا تھا کہ لڑکی کا رشتہ لگ رہا ہے۔ آپ ذرا لڑکے کے بارے میں چھان بین کر کے بتا دیں۔“

”او خدا! تو یہ آدمی رشتے کے چکر میں میری چھان بین پر مامور کیا گیا تھا؟“

”تم نے شگن بھائی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟“ لڑکی کی ماں نے پوچھا۔

”آپ لوگ ذرا خود اپنے شگن بھائی سے پوچھ لیں کہ انہوں نے میرے ساتھ کیا تماشا کیا ہے۔“ میں نے پوری تفصیل سے شگن بھائی کی پوری کہانی سنا دی۔

وہ سب ہنسنے لگے۔ لڑکی کے ایک رشتے دار نے جل کر کہا۔ ”ارے یہ ان کی عادت ہے۔ یاد نہیں آپ لوگوں کو، انہوں نے میرے رشتے کے چکر میں مجھے کتنا پریشان کیا تھا۔ میں تو ان کو جان سے مارنے والا تھا۔“

تھانے دار بھی یہ سب سن کر ہنس پڑا۔ ”اب آپ لوگ آپس میں فیصلہ کر لیں مجرم کے ساتھ کیا کرنا ہے؟“

”کرنا کیا ہے چھوڑ دیں اِن کو۔“ میرے ہونے والے سسر نے کہا۔

”میں چھوڑ تو رہا ہوں لیکن آپ لوگوں کے لیے میرا مشورہ ہے کہ آئندہ سے کسی رشتے کے چکر میں اپنے شگن بھائی کو نہ ڈالیں ورنہ کوئی نہ کوئی ان کو مار ہی دے گا۔“

اب وہ لڑکی میری بیوی ہے۔ آرام کی زندگی گزر رہی ہے لیکن شگن بھائی کبھی کبھی جب ہمارے یہاں آتے ہیں تو یہی بتاتے ہیں کہ انہیں بچپن ہی سے جاسوس بننے کا شوق تھا اور وہ اپنا یہ شوق اس طرح پورا کرتے ہیں۔

یہ تقریباً ہر گھر میں ہوتا ہے۔ رشتے کے سلسلے میں لڑکے یا لڑکی کی چھان بین کی جاتی ہے۔ اگر آپ کے یہاں بھی کوئی ایسا مسئلہ ہے تو مجھ سے رابطہ کریں۔ میں آپ کو شگن بھائی کا فون نمبر دے سکتا ہوں اور وہ یہ کام خوشی خوشی رضاکارانہ طور پر انجام دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

▲▲▲

نابلد

تمکین رضا

تعلیمی قابلیت اس کے لب و لہجے اور گفتگو کے قرینے سے ظاہر ہو جاتی ہے... ملے جلے شہروں سے تعلق رکھنے والے کرداروں کی شناسائی اور یکجائی سے حل ہونے والے کیس کی دلچسپ کتھا... زبان و بیان کی روانی نے ان کی کشتی کو ڈبو دیا تھا۔

مغرب سے موصول شدہ سراغرسی کا مختصر شاہکار

انسپکٹر میلوری نے اپنی میز کے مقابل بیٹھے ہوئے سارجنٹ الفرڈ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''چیف سپرنٹنڈنٹ رچرڈ نے بینکرٹ کیس کا انچارج مجھے بنایا ہے۔ مجھے اس کیس کی مکمل تفصیلات سے آگاہ کرو۔''

''لائیڈ بینکرٹ ایک فلم پروڈیوسر تھا۔ وہ اپنے لیونگ روم میں مردہ پایا گیا ہے۔ اس کی موت کا سبب وہ کاری ضرب ہے جو پلاسٹر کے ایک مجسمے سے اس کے سر پر لگائی گئی تھی۔''

''کوئی مشتبہ ہے؟'' انسپکٹر میلوری نے پوچھا۔
''تین مشتبہ افراد ہیں۔ لائیڈ بینکرٹ جنگ عظیم دوم کی ایک فلم بنا رہا تھا جس میں ایک امریکن نرس ایک رائل ائرفورس کے پائلٹ اور اس کے مکینک کے عشق میں بیک وقت مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقی لو ٹرائی اینگل ہے۔''
''اور؟''
''اور تینوں لیڈنگ ایکٹر پروڈیوسر کی نگاہ میں قدرے مایوس کن کارکردگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔'' سارجنٹ الفرڈ نے بتایا۔
پھر اس نے ہتھیلی کے سائز کا ایک ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمیں لائیڈ بینکرٹ کی اسٹڈی سے ایک دراز میں رکھا ہوا ملا ہے۔'' ساتھ ہی اس نے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔
ٹیپ ریکارڈر سے لائیڈ بینکرٹ کی آواز اُبھر کر کمرے میں گونجنے لگی۔ ''کس نے اینا اولیور کو میری فلم میں نرس کے کردار کے لیے تجویز کیا تھا؟ بروک لین، نیویارک کا، اس کا لب و لہجہ خاصا درشت اور کرخت ہے۔ میں نے اسے لہجے کو نرم رکھنے کو بارہا کہا ہے لیکن اس میں اتنی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ اس بات کو سمجھے اور اس پر عمل کر سکے۔
''اور کولن ٹرنبل...... وہ بہت زیادہ ہینڈسم ہے۔ کوئی بھی کبھی یہ یقین نہیں کرے گا کہ نرس مکینک کی خاطر اسے رد کر دے گی اور اس پر مکینک کو فوقیت دے گی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی لائنیں ایک تھرڈ گریڈر کے مانند پڑھتا ہے۔
''اور جہاں تک لارنس گرے کا...... بہ طور مکینک تعلق ہے تو وہ جب اپنا اسکرپٹ پڑھ رہا ہوتا ہے تو وہ مکینکی اصطلاحات کا تلفظ تک درست ادا نہیں کر پاتا۔ بھلا وہ اس کردار کو صحیح طور پر کس طرح ادا کر سکے گا؟
''ان میں سے کم از کم کسی ایک کو تبدیل کرنا ہو گا۔ اپنے لیے ایک پیغام: کل صبح سب سے پہلے ان کو کال کرنا ہے۔''
سارجنٹ الفرڈ نے ٹیپ کا بٹن دوبارہ دبا دیا اور آواز بند ہو گئی۔
''لگتا ہے کہ سیٹ پر بدمزگی رہی ہو گی۔'' انسپکٹر میلوری نے کہا۔
سارجنٹ الفرڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''بظاہر اس فلم کے بارے میں یہی توقع کی جا رہی ہے کہ یہ ایک زبردست ہٹ فلم ثابت ہو گی۔ اس فلم سے وابستہ ہر فرد اپنے مستقبل کا انحصار اسی کی کامیابی پر کر رہا ہے۔''
''سو فلم سے اخراج کسی کے لیے بھی اس حد تک طیش میں آنے کا باعث ہو سکتا ہے کہ اس نے پلاسٹر کے مجسمے سے پروڈیوسر کے سر پر ضرب لگا دی ہو۔'' انسپکٹر میلوری نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔
''یہ ہمیں لائیڈ بینکرٹ کی دراز میں ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ رکھا ہوا ملا ہے۔'' سارجنٹ الفرڈ نے ایک کاغذ انسپکٹر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا جس پر کوئی پیغام چھپا ہوا تھا۔
انسپکٹر میلوری نے بلند آواز سے وہ تحریر پڑھنا شروع کی۔ ''مجھے وہ پیغام مل گیا ہے جو تم نے میرے سیل فون پر چھوڑا تھا۔ تمہارے اپارٹمنٹ پر میری آمد دوپہر کو ہو گی پھر ہم بات کریں گے۔''
''کورونر کے مطابق لائیڈ بینکرٹ کی موت دوپہر بارہ اور ایک بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی۔'' سارجنٹ الفرڈ نے بتایا۔ ''سو اگر ہمیں یہ پتا چل جاتا ہے کہ وہ پیغام کس نے تحریر کیا تھا تو سمجھیں ہمیں ہمارا قاتل مل جائے گا۔''
''کیا ہمیں یہ معلوم ہے کہ پروڈیوسر بینکرٹ تک یہ پیغام کس طرح پہنچا تھا؟'' انسپکٹر میلوری نے پوچھا۔
''اس کی سیکریٹری کو یہ پیغام ایک سادے لفافے میں جس پر لائیڈ بینکرٹ کا نام لکھا ہوا تھا، اپنی میز پر رکھا ہوا ملا تھا۔ جب اس صبح نو بجے بینکرٹ اپنے دفتر میں داخل ہوا تو سیکریٹری نے یہ لفافہ اسے تھما دیا تھا۔'' سارجنٹ الفرڈ نے کہا۔
''اس کا مطلب ہے کہ بینکرٹ نے اپنے اسٹارز میں سے کسی ایک کو فون کیا تھا۔'' انسپکٹر میلوری نے کہا۔ ''وہ تینوں اداکار دوپہر بارہ اور ایک بجے کے درمیان کہاں تھے؟''
''فلم کے سیٹ پر۔''
''سو ان تینوں کے پاس جائے واردات سے عدم موجودگی کا جواز موجود ہے۔''
''حقیقت میں نہیں۔'' سارجنٹ الفرڈ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فلم کے ڈائریکٹر نے معمول کے مطابق ساڑھے گیارہ بجے لنچ کے وقفے کا اعلان کر دیا تھا۔ ریہرسل دو بجے سے پہلے دوبارہ شروع نہیں ہوئی تھی۔ اداکاروں کا کہنا ہے کہ وہ اپنے اپنے ٹریلرز میں تنہا تھے اور اپنی اپنی لائنیں یاد کرنے کے ساتھ کھانا بھی کھا رہے تھے۔''
انسپکٹر میلوری نے ایک سرد آہ بھری۔ ''میرا خیال ہے مجھے ان مشتبہ افراد سے بات کرنے کے لیے فلم کے سیٹ

جنت کا راستہ

چرچ کے اسکول میں اتوار کی کلاسیں بچوں کے لیے ہوتی تھیں اور ان کو مذہب کے بارے میں بتایا جاتا تھا تاکہ بچے اس عمر میں مذہب سے واقف ہوں۔ ایک دن ان بچوں کی ٹیچر نے سوچا کہ کیوں نا بچوں سے پوچھوں کہ جنت میں جانے کے لیے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس نے اس سلسلے میں بچوں سے کہا۔ ”اگر میں اپنا گھر، گاڑی اور ساری گھر کی چیزیں بیچ کر سب رقم چرچ کو دے دوں تو میں جنت میں جاسکتی ہوں؟“

جونی نے کہا۔ ”نہیں۔“

اس پر ٹیچر نے پھر کہا۔ ”اگر میں روز چرچ آکر چرچ کی صفائی کروں اور ہر چیز قاعدے سے رکھوں تو کیا میں چرچ کے کام کرنے پر جنت میں جاسکتی ہوں؟“

جونی نے پھر چھوٹا سا جواب دیا۔ ”نہیں۔“

”اچھا تو میں اگر دوسرے اور بھی کام کروں مثلاً بچوں کو کینڈی (مٹھائی) دوں اور اپنے شوہر، بچوں اور ماں سے محبت کروں تو اس کام کرنے کے سلسلے میں، میں جنت میں جاسکتی ہوں؟“

جونی نے پھر کہا۔ ”نہیں۔“

زچ ہو کر ٹیچر نے کہا۔ ”تو پھر تم بتاؤ کہ مجھے جنت میں جانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟“

اس پر جونی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”آپ کو پہلے مرنا ہوگا پھر جنت میں جاسکتی ہیں۔“

امریکا سے مریم کاظمی کا تعاون

”لائیڈ ہینکرٹ نے ہمیں ملازمت دی تھی۔ ہم اسے بھلا کیوں مارنا چاہیں گے؟“

”اس لیے کہ بظاہر وہ تم میں سے کسی ایک کو برطرف کرنا چاہتا تھا اور اس فلم میں کردار کا ہاتھ سے نکل جانا تمہارے مستقبل کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔“

”ہمیں برطرف کرنا چاہتا تھا؟“ اینا اولیور نے حیرانی سے کہا۔ ”اگر وہ مجھے برطرف کرنا چاہتا تھا تو اس نے بذریعہ ہوائی جہاز مجھے نیویارک سے یہاں کیوں بلوایا تھا اور ہوٹل میں کیوں ٹھہرایا تھا؟“

”اس نے یہ سب کچھ تمہاری اداکاری دیکھنے سے پہلے کیا تھا۔“ انسپکٹر میلوری نے جواب دیا۔ ”اسے تمہارا مخصوص امریکی لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔“

”میرے اور کولن ٹرنبل کے بارے میں کیا کہنا ہے؟“ لارنس گرے نے پوچھا۔

”بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ تم دونوں کا بھی زیادہ دلدادہ نہیں تھا۔“ انسپکٹر میلوری نے کہا۔

پھر کچھ دیر غور کرنے کے بعد بے ساختہ بولا۔ ”میرا خیال ہے میں جانتا ہوں کہ تم میں سے کس نے مسٹر ہینکرٹ سے ملاقات کی تھی اور اس کے سر پر پلاسٹر کے مجسمے سے ضرب لگائی تھی۔“

یہ سن کر سب چونک پڑے۔

”سارجنٹ!“ اس نے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوکر کہا۔ ”اینا اولیور کو حراست میں لے لو۔“

سارجنٹ الفرڈ نے فوراً ہی اینا اولیور کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی اور ساتھ ہی استفہامیہ نگاہوں سے انسپکٹر کی طرف دیکھا۔

انسپکٹر میلوری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”جو تحریری پیغام پروڈیوسر ہینکرٹ کو موصول ہوا تھا پر جانا ہی پڑے گا۔“

☆☆☆

دو گھنٹے بعد وہ تینوں اداکار فلم کے سیٹ پر انسپکٹر میلوری کے روبرو پیش تھے۔

”تم سب کو معلوم ہوگا کہ میں یہاں کیوں موجود ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”تمہارے پروڈیوسر کو قتل کیا گیا ہے اور اس بات کا امکان ہے کہ تم میں سے کسی ایک نے اسے قتل کیا ہوگا۔“

”نان سینس۔“ کولن ٹرنبل نے تیکھے لہجے میں کہا۔

اس میں ’سیل فون‘ اور ’اپارٹمنٹ‘ کے الفاظ درج تھے۔ یہ امریکن اصطلاحات ہیں جو صرف امریکی استعمال کرتے ہیں۔ انگریز ’سیل فون‘ کی جگہ ’موبائل فون‘ اور ’اپارٹمنٹ‘ کی جگہ ’فلیٹ‘ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ باقی دونوں اداکار برطانوی اور انگریز تھے اس لیے وہ اپنے تحریری پیغام میں سیل فون اور اپارٹمنٹ کے الفاظ استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ لہٰذا یہ پیغام اینا اولیور ہی نے تحریر کیا تھا اور وہی ہینکرٹ کی قاتل ہے۔

ہمدردی کا صلہ

اسفندیار

نیکی اور بدی کے راستے مشکل ضرور ہیں... بس پہلا قدم اٹھانے کی دوری پر یہ راہیں منتظر ہوتی ہیں... ہر شخص اپنی فطرت اور ذوق طبع کا محتاج ہوتا ہے... دونوں راستوں کا انتخاب بیک وقت بگاڑ... سنوار دیتا ہے... ایک ہمدرد اور نیک پرور شخص کی دلچسپ روداد... اس کا دل دوسروں کی تکلیف اور دکھوں پر پل بھر میں تڑپ اٹھتا تھا... پھر ہمدردی اور مدد کا طوفانی ریلا اسے اپنے حصار میں لیتا کہ وہ اپنے پیاروں کی ضرورتوں کو بھی بھول جاتا...

ہمارے معاشرے میں پھیلے کرداروں کی ڈرامائی صورتِ حال ایک مزے دار کہانی کے پیچ و خم

اس روز کالج سے گھر واپس آئی تو خالہ زینب کو دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بے جوڑ رشتے کروانے کی ماہر تھیں۔ اسی لیے اب تک ان کا بتایا ہوا کوئی بھی رشتہ مجھے یا میرے گھر والوں کو پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے باوجود وہ مہینے دو مہینے بعد کوئی فضول سا رشتہ لے کر آجاتیں۔ امی اس کی آؤ بھگت کرنے پر اس لیے مجبور تھیں کہ انہیں میری شادی کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ میں اٹھائیس برس کی ہو چکی تھی اور ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک سرکاری

کالج میں لیکچرار کے طور پر ملازمت کر رہی تھی۔ ابو کا انتقال ہو چکا تھا اور دونوں بڑے بھائی بھی شادی کے بعد اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ اس لیے امی چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں ہی میرے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔

میں خالہ زینب کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ امی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی چائے اور سموسوں سے شغل فرما رہی تھیں اور مجھے اپنے کمرے میں جانے کے لیے وہیں سے گزرنا پڑتا۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے جی کڑا کیا اور انہیں سلام کر کے تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی گو کہ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی لیکن خالہ زینب کے جانے سے پہلے کمرے سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے میں نے فریش ہونے کے بعد لباس تبدیل کیا اور لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گئی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد امی کمرے میں داخل ہوئیں اور ناراض ہوتے ہوئے بولیں۔

''حد ہوتی ہے بداخلاقی کی بھی، وہ مسلسل تمہیں پوچھ رہی تھیں اور تم کمرا بند کیے بیٹھی رہیں۔''

''اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ کیوں پوچھ رہی تھیں۔ پھر لے آئی ہوں گی کوئی الٹا سیدھا رشتہ۔'' میں منہ بناتے ہوئے بولی۔

''تم خوامخواہ بدگمان ہو رہی ہو۔ وہ بے چاری تمہارے بھلے کے لیے ہی دوڑ دھوپ کر رہی ہیں۔ اب یہ بات دوسری ہے کہ اس کے لائے ہوئے رشتے ہم لوگوں کو پسند نہیں آتے لیکن اس بار معاملہ مختلف لگتا ہے، تم خود ہی دیکھ لو۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ایک تصویر میری طرف بڑھائی۔ میں امی کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ہاتھ بڑھا کر وہ تصویر ان سے لے لی۔ بظاہر اس میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو میں کوئی تنقید کرتی۔ مناسب شکل و صورت، چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ، بال سلیقے سے سنورے ہوئے، سوٹ میں ملبوس وہ ایک اسمارٹ شخص کی تصویر تھی۔ میں نے ایک نظر دیکھ کر امی کو واپس کر دی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا اور اس کے کوائف بتانے لگیں۔ ''لڑکا ایک غیر ملکی کمپنی میں اچھی پوسٹ پر ہے۔ ذاتی گھر اور اپنی گاڑی ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ بڑا بھائی امریکا میں اور دونوں بہنیں شادی شدہ ہیں۔ یہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ بیمار رہتی ہیں اس لیے ان کی خواہش ہے کہ اپنی زندگی میں ہی بیٹے کی شادی کر دیں۔ مجھے تو اس رشتے میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ آگے تمہاری مرضی۔''

میرے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس لیے صرف اتنا ہی کہہ سکی۔ ''خالہ زینب کو تو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت ہے۔ آپ ان کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے اپنے طور پر اطمینان کر لیں۔ البتہ میری ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' امی چونکتے ہوئے بولیں۔

''میں شادی کے بعد بھی ملازمت کرتی رہوں گی کیونکہ آج کے دور میں عورت کے لیے معاشی طور پر خود مختار ہونا بہت ضروری ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔'' امی مطمئن ہوتے ہوئے بولیں۔

اس کے بعد معاملات بہت تیزی سے آگے بڑھے۔ امی نے خالہ زینب سے کہہ کر ان لوگوں کو اگلے اتوار پر ہی بُلا لیا۔ صرف ماں بیٹا ہی آئے تھے۔ میں حسبِ روایت ان کے لیے چائے اور دیگر لوازمات لے کر گئی اور پہلی نظر میں ہی ان لوگوں کے بارے میں اچھی رائے قائم کر لی۔ وہ خاتون دیکھنے میں ہی بہت سلجھی ہوئی لگ رہی تھیں اور ان کی گفتگو میں ایک سلیقہ تھا۔ اسی طرح ان کے صاحب زادے ارشد بھی خاصے مہذب اور شریف نظر آئے۔ ان دونوں کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ میں انہیں پسند آگئی ہوں اور میرا اندازہ درست نکلا۔ خاتون نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بہن، مجھے آپ کی لڑکی بہت پسند آئی۔ لڑکا بھی آپ کے سامنے ہے۔ آپ اپنے اطمینان کے لیے اس سے براہِ راست گفتگو کر سکتی ہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اس لیے آج ہی آپ سے آپ کی بیٹی مانگ رہی ہوں۔''

امی نے روایتی انداز میں جواب دیا۔ ''اس عزت افزائی کا شکریہ لیکن ہمیں سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ میں اپنے بیٹوں اور بہوؤں سے بھی مشورہ کر لوں۔ البتہ آپ سے ایک گزارش ہے۔''

میرے بھائی اور بھابیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ امی کی بات سن کر وہ چونک پڑے۔ غالباً وہ چاہ رہے تھے کہ امی اسی وقت اس رشتے کے لیے ہاں کر دیں۔ تاہم خاتون نے تحمل سے کہا۔ ''جی فرمائیے۔''

''میری بیٹی کی خواہش ہے کہ وہ شادی کے بعد بھی اپنی ملازمت جاری رکھے۔''

اس بار ماں کے بجائے ارشد نے جواب دیا۔

”آنٹی! ویسے تو انہیں ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے میری تنخواہ اتنی ہے کہ ہمارا گزارہ بہ آسانی ہوسکتا ہے پھر بھی اگر یہ ملازمت جاری رکھنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”ٹھیک ہے بہن۔ آپ بھی اپنے طور پر تسلی کر لیں۔“ خاتون نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ آپ جواب دینے میں دیر نہیں لگائیں گی۔“

”آپ مطمئن رہیں۔ انشاء اللہ غیر ضروری تاخیر نہیں ہوگی۔“ امی نے جواب دیا۔

ان کے جانے کے بعد امی نے دونوں بھائیوں کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ارشد کے بارے میں اس کے دفتر اور محلے والوں سے معلومات حاصل کریں۔ انہوں نے جو رپورٹ دی۔ اس کے مطابق خالہ زینب اور ارشد کے گھر والوں نے جو کچھ بتایا وہ حرف بہ حرف درست نکلا۔ جب امی کو پوری طرح اطمینان ہوگیا تو انہوں نے ارشد کی والدہ کو فون کرکے اس رشتے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اس طرح میں دو مہینے بعد ہی ارشد کی دلہن بن کر ان کے گھر آگئی۔

شادی کے ابتدائی چند سال بہت اچھے گزرے۔ ارشد نے میرا ہر طرح سے خیال رکھا۔ ساس بھی بہت نیک اور محبت کرنے والی تھیں۔ انہوں نے کبھی ہمارے معاملات میں مداخلت نہیں کی۔ میں کیا کرتی ہوں، کہاں جارہی ہوں، کس سے ملتی ہوں، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ شادی کے بعد بھی انہوں نے گھرداری اپنے ہاتھ میں رکھی اور مجھ سے کبھی کسی کام کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی انہوں نے کبھی یہ پوچھا کہ میں کتنا کماتی اور کہاں خرچ کرتی ہوں۔ ارشد ہر مہینے گھر کے خرچ کے لیے ایک معقول رقم ان کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے۔ وہ مہینے میں ایک بار ارشد کے ساتھ سپر اسٹور جاتیں اور پورے مہینے کا سامان ایک ساتھ ہی لے آتی تھیں۔ کبھی میں بھی ان کے ساتھ چلی جاتی اور گھر کے لیے چادریں، تولیے یا اسی طرح کی کوئی اور چیز اپنے پاس سے خرید لیتی۔ میری ساری تنخواہ بینک میں جمع ہورہی تھی۔ گھر کے کام کاج کے لیے ماسی موجود تھی لیکن میں نے ایک کل وقتی ملازمہ رکھ لی جو کھانا پکانے کے علاوہ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کرتی تھی حالانکہ ساس نے اس کی مخالفت کی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس عمر میں گھر کا کام کریں۔

پانچ سال اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میرے یہاں دو بچے احمد اور سمیرا پیدا ہوئے۔ میں نے اسی ملازمہ کو آیا کی اضافی ذمے داری بھی سونپ دی۔ وہ میری غیر موجودگی میں بچوں کو بھی سنبھالتی تھی۔ اس طرح میں بے فکری سے اپنی ملازمت پر جاتی رہی۔ میری ترقی ہوگئی تھی اور مجھے گریڈ اٹھارہ مل گیا تھا۔ ارشد کے مشورے پر میں نے ایک چھوٹی گاڑی خرید لی۔ اس طرح مجھے کالج آنے جانے میں سہولت ہوگئی۔

اس دوران دو حادثات رونما ہوئے۔ پہلے میری امی داغِ مفارقت دے گئیں۔ اس کے کچھ عرصے بعد ساس نے بھی آنکھیں بند کرلیں۔ بھائیوں کو شاید امی کے مرنے کا ہی انتظار تھا۔ وہ امی کے انتقال کے چند ماہ بعد اپنے بیوی بچوں سمیت بیرونِ ملک منتقل ہوگئے۔ ایک کو امریکا پسند آیا تو دوسرے نے آسٹریلیا کی راہ لی۔ جانے سے پہلے انہوں نے مکان کی پاور آف اٹارنی مجھے دے دی جس کا مطلب تھا کہ اب ان کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس مکان کا کیا کروں۔ ارشد کا مشورہ تھا کہ اسے کرائے پر دے دیا جائے۔ اس کے لیے مکان خالی کرنا پڑتا لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ امی نے بڑے شوق سے جو چیزیں جمع کی تھیں، انہیں اونے پونے بیچ دیا جائے۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ فریج، ٹی وی، واشنگ مشین اور فرنیچر میں نے اپنے گھر منتقل کیا اور مکان اسی حالت میں کرائے پر دے دیا۔

ویسے تو ارشد میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن وہ ضرورت سے زیادہ ہمدرد، رحم دل اور خداترس واقع ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ سنی سنائی باتوں پر جلد یقین کرلیتے تھے بلکہ اس پر عمل بھی شروع کردیتے تھے۔ مثلاً دفتر میں کسی نے بتادیا کہ کلونجی میں ہر مرض کی شفا ہے سوائے موت کے تو وہ دوسرے دن ہی کلونجی کا تیل لے کر آگئے اور اس کے چند قطرے شہد اور پانی میں ڈال کر نہار منہ پینا شروع کردیا۔ اسی طرح کسی اخبار، رسالے یا نیٹ پر کوئی ٹوٹکا پڑھ لیتے تو فوراً ہی عمل شروع ہوجاتا۔ ایک دن جمعے کی نماز پڑھنے مسجد میں گئے تو خطبہ میں امام صاحب نے صدقہ خیرات کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کو اس کا کئی گنا اجر ملتا ہے۔ یہ سنتے ہی دریائے سخاوت جوش میں آگیا اور انہوں نے غریبوں کی مدد کرنے پر کمر باندھ لی۔ کچھ ہی دنوں میں یہ حالت ہوگئی کہ کوئی فقیر ہمارے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا حالانکہ ان میں اکثریت پیشہ ور گداگروں کی تھی جنہوں نے بھیک مانگنے کو کاروبار بنا

رکھا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو دینے کے سخت خلاف تھی۔ کبھی ان کے ساتھ شاپنگ پر جاتی تو مارکیٹ میں یا سگنل پر جو بھی فقیر ہاتھ پھیلاتا، وہ اسے کچھ نہ کچھ ضرور دیتے۔ حالانکہ وہ شکل سے ہی پروفیشنل لگ رہا ہوتا۔ میں منع کرتی تو کہتے 'میرے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں کہ اصلی اور جعلی کی پہچان کر سکوں، ضرورت مند ہوگا تبھی تو اس نے میرے آگے ہاتھ پھیلایا ہے۔'

ایک دن کہیں پڑھ لیا کہ ہر مہینے آمدنی کا پانچ فیصد خیرات کرنے سے رزق میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ انہوں نے پہلی تاریخ کو بینک سے پانچ ہزار روپے نکلوائے اور میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے۔ ''یہ ماسی کو دے دینا۔''

میں اتنے پیسے دیکھ کر حیران رہ گئی اور بولی۔ ''کیوں؟''

''ہمیں ہر مہینے اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ نکالنا چاہیے۔ اس سے رزق میں برکت ہوتی ہے۔''

''بہتر ہوگا کہ یہ پیسے آپ ایدھی کو دے دیں۔ یہ ماسی تو ایک نمبر کی حرام خور ہے۔ تین ہزار لیتی ہے اور کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرتی۔ اوپر سے چھٹیاں الگ۔''

''وہاں بھی دے دوں گا لیکن قریبی لوگوں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔''

آہستہ آہستہ ہمدردی کا جذبہ ٹھاٹھیں مارتا سمندر بن گیا اور نقد رقم کے علاوہ گھر کی چیزیں بھی مستحقین میں تقسیم ہونے لگیں۔ پہلے کپڑوں کی باری آئی۔ جتنے اچھے سوٹ تھے وہ سب لوگوں میں بانٹ دیے۔ ان میں سے بعض جوڑے تو شاید ایک دو دفعہ ہی پہنے ہوں گے۔ میں نے اعتراض کیا تو بولے۔ 'پرانا جائے گا تو نیا آئے گا۔' ایک دن میری الماری کھولی جو کپڑوں سے بھری ہوئی تھی۔ انہیں غصہ آگیا اور تیز لہجے میں بولے۔ ''جو کپڑے تمہارے استعمال میں نہیں ہیں، وہ کیوں لٹکا رکھے ہیں۔ انہیں کسی غریب کو دے دو۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ انہوں نے میرے کسی معاملے میں مداخلت کی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مصلحتاً خاموش رہی پھر یہ ہونے لگا کہ جو چیز پرانی ہوتی۔ وہ بیچنے کے بجائے کسی غریب کو دے دی جاتی۔ چھت کا پنکھا بدلا گیا تو پرانا، الیکٹریشن کو دے دیا حالانکہ اس نے پنکھا بدلنے کی مزدوری الگ سے لی تھی۔ کباڑیا آتا تو اسے پرانے اخبار مفت میں دے دیے جاتے۔ نئی واشنگ مشین آئی تو پرانی ماسی کو دے دی حالانکہ دکان دار اس کے دو ہزار روپے دینے پر تیار تھا۔ اس پر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے کہا۔ ''پاکستان کی آبادی اٹھارہ کروڑ سے زیادہ ہے جس میں سے پچاس فیصد غربت کی لکیر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ کس کس کی مدد کریں گے؟''

''اپنی بساط کے مطابق جو کر سکتا ہوں، وہ کر رہا ہوں۔ یہی اللہ کا حکم ہے۔''

ان کے رویے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ ایک دن وہ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دیں گے۔ لوگوں کو بھی ان کی اس کمزوری کا علم ہو گیا تھا اور وہ کسی نہ کسی بہانے مانگنے آجاتے۔ ان میں دوست، رشتے دار، محلے والے اور پھیری لگا کر سامان بیچنے والے بھی شامل تھے۔ کسی کی بیوی بیمار ہے۔ کسی کو بچے کی فیس جمع کروانی ہے۔ کسی کی بیٹی کی شادی ہے۔ غرض مانگنے کے سو بہانے اور وہ بڑی فراخ دلی سے سب کی مدد کیا کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے وہ اپنی تنخواہ سے اچھی خاصی بچت کر لیا کرتے تھے لیکن اب مہینا بھی مشکل سے پورا ہوتا تھا۔ اگر میری تنخواہ اور مکان کا کرایہ نہ ہوتا تو انہیں دن میں تارے نظر آجاتے۔

ایک دن دفتر سے آئے تو کچھ پریشان لگ رہے تھے۔ میں گھبرا گئی کیونکہ اس سے پہلے انہیں کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے۔ ''میرے دفتر میں جو چپراسی ہے۔ اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ بے چارہ غریب آدمی ہے۔ شادی کے اخراجات کیسے پورے کرے گا۔ دفتر کے سب لوگ کچھ نہ کچھ دے رہے ہیں۔ میرے اکاؤنٹ میں بیس ہزار تھے وہی دے دیے۔ اگر تم کچھ کر سکو تو......''

لڑکی کی شادی کا سن کر میرا دل پسیج گیا اور میں نے دس ہزار کا چیک کاٹ کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا پھر بولی۔ ''مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ آپ کے اکاؤنٹ میں، صرف بیس ہزار روپے تھے جبکہ آپ کی تنخواہ ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ کچن، بلز، بچوں کی فیس اور گاڑی کا پیٹرول ملا کر بھی یہ رقم پچاس ہزار سے زیادہ نہیں بنتی۔ باقی پچاس ہزار کہاں جا رہے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی انویسٹمنٹ کر رکھی ہے جس کا مجھے علم نہیں؟''

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولے۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل کسی نہ کسی کو پیسوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور میں حتی المقدور ان کی مدد کرتا ہوں۔ بس اسی میں ساری تنخواہ ختم ہو جاتی ہے۔''

''میں یہ نہیں کہتی کہ لوگوں کی مدد نہ کریں لیکن آپ کو مستقبل کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے۔ کل کو بچے بڑے ہوں گے۔ ان کی تعلیم اور شادی کے اخراجات کے لیے ہمیں اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہوگی پھر آپ کیا کریں گے؟''

''تم جانتی ہو کہ ہمارے مذہب میں مال جمع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔''

''مال جمع کرنے اور اپنی ضرورتوں کے لیے کچھ پس انداز کرنے میں فرق ہے۔ آپ بے شک لوگوں کی مدد کریں لیکن کچھ دینے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیا کریں کہ وہ واقعی مستحق ہے یا آپ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''اب میں محتاط رہوں گا اور میری کوشش ہوگی کہ ہر مہینے کچھ بچت کرلیا کروں۔''

اس کے بعد واقعی ان کے رویے میں تبدیلی آگئی گوکہ ہمدردی کا دریا اب بھی بہہ رہا تھا لیکن اس میں پہلے جیسی طغیانی نہیں تھی۔ وہ اب بھی حقیقی ضرورت مندوں کی مدد کررہے تھے لیکن جعلی مستحقین کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ میں مطمئن تھی کہ انہیں عقل آگئی ہے لیکن یہ اطمینان زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ دریائے ہمدردی میں ایک ایسا زبردست طوفان آنے والا ہے جس کے تھپیڑوں کی زد میں خود میں بھی آجاؤں گی۔

ہوا یوں کہ انہی دنوں ہمارے گھر سے دو مکان چھوڑ کر نئے کرائے دار آئے۔ کل تین افراد تھے۔ ایک جوان عورت، اس کا دس سالہ بیٹا اور ماں۔ مرد کوئی نہیں تھا جس پر مجھے کچھ تعجب ہوا کیونکہ جس مکان میں وہ لوگ آکر آباد ہوئے تھے، اس کا اچھا خاصا کرایہ تھا۔ وہ عورت یا اس کی ماں کوئی کام بھی نہیں کرتی تھی اور یہی بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ مکان کا کرایہ، یوٹیلٹی بلز اور گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوتے ہوں گے۔ میں نے یہی بات ارشد سے کہی تو وہ ناراض ہوتے ہوئے بولے۔ ''تمہیں کیا فکر ہے۔ یہ ان کا مسئلہ ہے کہ کس طرح وہ اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی جمع پونجی کہیں انویسٹ کر رکھی ہو اور اس کی آمدنی سے گزارہ ہورہا ہو۔''

ارشد کی بات میرے حلق سے نہیں اتری اور میں شروع دن سے ہی ان لوگوں کے بارے میں شک میں مبتلا ہوگئی۔ دوسرے دن ہی وہ عورت ہمارے گھر آگئی۔ شام کا وقت تھا اور ارشد بھی گھر میں ہی تھے۔ میں نے اخلاقاً اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کی خاطر تواضع میں لگ گئی۔

اس نے اپنا نام فرزانہ بتایا۔ شوہر نے اسے چھوڑ دیا تھا اور بیٹے کی کسٹڈی کے مسئلے پر دونوں میں تنازع چل رہا تھا۔ شوہر نے دھمکی دی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو عدالت کے ذریعے حاصل کرلے گا۔ اسی لیے وہ اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آگئی تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ شوہر سے چھپتی پھر رہی تھی۔ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اس کا گزارہ کیسے ہوتا ہے لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے خود ہی بتا دیا کہ اس کے مالی حالات اچھے نہیں ہیں۔ اس کے پاس تھوڑا سا زیور تھا۔ وہ اس نے بیچ دیا۔ وہ رقم اور مہر کے پیسے اس نے بینک میں رکھوا دیے۔ اس کا تھوڑا بہت منافع آجاتا ہے۔ ایک بھائی ہے جو اپنی بیوی سے چھپ کر کبھی کبھار کچھ مدد کردیتا ہے لیکن عموماً ہاتھ تنگ ہی رہتا ہے اور بعض اوقات تو فاقوں کی نوبت آجاتی ہے۔

وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے اس پر یقین کرنا بہت مشکل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ گورا رنگ، گہری سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، یاقوتی ہونٹ اور گالوں میں پڑنے والے ڈمپلز نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ دیکھنے میں وہ کوئی فلم ایکٹریس لگ رہی تھی۔ اس نے کھلے گلے کی شرٹ پہن رکھی تھی اور دوپٹا بے پروائی سے گلے میں پڑا ہوا تھا۔ اس کا لباس، ہیئر اسٹائل، پیروں میں پڑے ہوئے چپل، سب کچھ اس کے بیان کردہ حالات سے بہت مختلف تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی غریب عورت ہے اور اس کے گھر میں فاقے ہوتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ وہ چائے پینے کے بعد چلی جائے گی لیکن وہ بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور بولی۔ ''کیا بھائی صاحب گھر پر نہیں ہیں؟''

جی میں آیا کہہ دوں کہ نہیں، لیکن مجھے جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے کہا۔ ''وہ لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔''

''چلیں، میں ان سے وہیں مل لیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتی، وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر لاؤنج میں آگئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ ارشد ہاتھ میں ریموٹ پکڑے ٹی وی ... دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ بے دھڑک ان کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ''السلام علیکم بھائی صاحب۔''

ارشد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بے تکلفی

سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کی نئی پڑوسن ہوں، فرزانہ۔ ہم لوگ کل ہی یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ آج سیٹنگ وغیرہ سے فارغ ہوئی تو سوچا کہ آپ لوگوں کو سلام کر آؤں۔''

''اچھا، اچھا۔'' ارشد سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''کیسی ہیں آپ؟''

''جی اللہ کا بڑا کرم ہے۔'' وہ تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے بولی۔ اس کا دوپٹا شانوں سے ڈھلک کر گھٹنوں پر آن گرا تھا۔ ارشد اس نظارے کی تاب نہ لا سکے اور انہوں نے جھینپتے ہوئے اپنی نگاہیں ٹی وی پر جما دیں۔ اسے بھی کچھ خیال آ گیا تھا۔ وہ دوپٹا شانوں پر پھیلاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے اپنے بارے میں باجی کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ بہت بُرے حالات سے گزر رہی ہوں لیکن کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی گو کہ پہلی ملاقات میں یہ کہتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے لیکن میرے پاس بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ اس لیے جلد از جلد کوئی کام شروع کرنا چاہتی ہوں۔ اگر کسی ملازمت کا بندوبست ہو جائے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ میں گریجویٹ ہوں۔ تھوڑی بہت کمپیوٹر سے بھی واقفیت ہے۔''

ارشد کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ شاید انہیں بھی توقع نہیں تھی کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنا مدعا بیان کر دے گی۔ وہ یہ بات مجھ سے بھی کہہ سکتی تھی۔ یقیناً اس نے آنے سے پہلے ہمارے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لی ہوں گی اور وہ جان گئی ہوگی کہ میں بھی ایک سرکاری کالج میں گریڈ اٹھارہ کی لیکچرار ہوں لیکن اس نے نہ جانے کیوں ارشد کو ترجیح دی۔

ارشد نے رسماً پوچھ لیا۔ ''آپ نے پہلے کبھی ملازمت کی ہے؟''

''جی نہیں۔'' وہ بولی۔ ''تعلیم ختم ہوتے ہی شادی ہو گئی تھی پھر گھرداری کے جھمیلوں میں پھنس کر ملازمت کا خیال ہی نہیں آیا اور نہ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ اب حالات سے مجبور ہو کر اس بارے میں سوچنا پڑ رہا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ یوں لگا جیسے وہ فوراً رو پڑے گی۔ ارشد بھی گھبرا گئے، جلدی سے بولے۔

''آپ پریشان مت ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے لیے جلد از جلد کسی ملازمت کا بندوبست ہو جائے اور ویسے بھی آپ کو جس چیز کی ضرورت ہے۔ بلا تکلف کہہ سکتی ہیں۔ پڑوسیوں کا حق سب سے زیادہ ہوتا ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' وہ ایک ادا سے اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ''کس زبان سے شکر ادا کروں۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنا اچھا پڑوس ملے گا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' ارشد نے خوش دلی سے کہا۔ ''انسان ہی انسانوں کے کام آتے ہیں۔ آپ مجھے ایک درخواست دے دیں، میں کسی سے بات کرتا ہوں۔''

''میں کل ہی آپ کو درخواست پہنچا دیتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھی اور لہراتی بل کھاتی چلی گئی۔ اس کی چال ایسی تھی جیسے کوئی ماڈل ریمپ پر واک کر رہی ہو۔

اس کے جانے کے بعد ارشد نے ٹی وی بند کیا اور بولے۔ ''بے چاری بہت دکھی معلوم ہوتی ہے۔''

''ہاں، اس نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس سے تو یہی لگتا ہے لیکن وہ دکھی نظر نہیں آتی۔''

''کیا مطلب؟''

''آپ نے اس کا انداز نہیں دیکھا۔ دکھی عورتیں اس طرح بن سنور کر کہیں نہیں جاتیں۔ مجھے تو وہ کوئی فلم ایکٹریس معلوم ہو رہی تھی۔ دیکھا نہیں، کس بے حیائی سے اس نے اپنا دوپٹا نیچے گرا دیا تھا۔''

''اوہو، اتفاقاً ایسا ہو گیا ہوگا اور جہاں تک بننے سنورنے کا تعلق ہے تو وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی۔ اگر اس نے ڈھنگ کے کپڑے پہن لیے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔''

''آپ کیوں اس کی وکالت کر رہے ہیں؟'' میں نے بگڑ کر کہا۔

''میں کیوں کسی کی وکالت کرنے لگا۔'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بولے۔ ''بس یونہی ایک بات کہہ دی تھی۔''

''میں جانتی ہوں کہ آپ کے دل میں ہمدردی کا چشمہ ابل پڑا ہے لیکن ابھی اسے کچھ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلے میں اپنا اطمینان کر لوں کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس میں کتنی سچائی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ویسے میں چاہتا ہوں کہ اس کی ملازمت ہو جائے تو اچھا ہے تاکہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنے۔ تم بھی کوشش کرنا۔''

''دیکھوں گی۔ ویسے سرکاری ملازمت ملنا بہت مشکل ہے۔ اس کے لیے کوئی تگڑی سفارش یا بڑی رشوت چاہیے اور ظاہر ہے کہ اس کے پاس یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔''

دوسرے دن وہ درخواست لے کر آ گئی۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ بہت ہی خراب تھی اور بہت سے الفاظ پڑھنے میں

نہیں آ رہے تھے۔ شاید پانچویں جماعت کے بچے کی لکھائی بھی اس سے اچھی ہوگی۔ ارشد نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا کہ وہ اسے کمپیوٹر پر ٹائپ کروالیں گے۔ وہ کسی وقت آ کر اس پر دستخط کر دے۔ اس روز بھی وہ کافی دیر تک بیٹھی اپنا دکھڑا روتی رہی۔ وہ بار بار ایک ہی بات کہہ رہی تھی کہ اسے اپنے سابق شوہر سے خطرہ ہے کہ کہیں وہ اس کے بچے کو اغوا نہ کرا لے۔ مجھے اس کی جہالت پر ہنسی آ گئی اور میں نے کہا۔ ''دیکھو بی بی، یہ تمہارا وہم ہے۔ اسے اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ عدالت کے ذریعے بھی بچہ اپنی تحویل میں لے سکتا ہے لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ بچے کی ذمے داری نہیں سنبھالنا چاہتا ورنہ اب تک ایسا کر چکا ہوتا۔ شاید اس نے تمہیں ڈرانے کے لیے یہ دھمکی دی ہوگی۔''

''آپ نہیں جانتیں وہ کتنا کینہ پرور اور ظالم شخص ہے۔ اگر اسے میرے ٹھکانے کا پتا چل گیا تو وہ ضرور کوئی کارروائی کرے گا۔''

''یہ تمہارا دوسرا وہم ہے۔ اتنے بڑے شہر میں وہ تمہیں کیسے ڈھونڈ سکتا ہے پھر بھی اگر تمہیں ڈر ہے تو گھر سے باہر نکلتے وقت چہرے پر نقاب ڈال لیا کرو۔''

''تو یہ کریں جی، مجھے تو وحشت ہوتی ہے۔ نقاب کا نام سن کر ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔ میں نے تو تمہارے بھلے کے لیے ہی کہا تھا۔''

تیسرے دن وہ ٹائپ شدہ درخواست پر دستخط کرنے کے بہانے پھر آ گئی لیکن اس روز کافی بجھی بجھی اور پریشان لگ رہی تھی۔ چہرہ اترا ہوا اور لباس بھی ملگجا سا لگ رہا تھا۔ اس نے بننے سنورنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ گزشتہ دو روز کے مقابلے میں اس کا روپ یکسر مختلف تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے سر اور سینے کو دوپٹے سے ڈھانپ رکھا تھا اور نظریں جھکا کر باتیں کر رہی تھی۔ اس نے خاموشی سے درخواست پر دستخط کیے اور واپس جانے لگی لیکن میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟''

اس نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''پریشانیاں تو میرا مقدر بن گئی ہیں۔ کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں۔''

''پھر بھی کچھ پتا تو چلے کہ بات کیا ہے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔ میرے پاس جو پیسے تھے وہ مکان کا ایڈوانس اور کرایہ دینے میں ختم ہو گئے اور ابھی آدھا مہینا باقی ہے۔ بینک سے تو پہلی تاریخ کو ہی منافع ملے گا۔ آج صبح سے ہمارے گھر فاقہ ہے۔ ہم ماں بیٹی تو بھوک برداشت کر لیں لیکن گڈو کی حالت نہیں دیکھی جاتی۔''

یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا اور مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی۔ مجھے اپنی بے خبری پر افسوس ہونے لگا۔ ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ میرے پڑوس میں بھوک کا راج ہے اور ہم تر نوالے حلق میں انڈیل رہے تھے۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ''تم نے غیریت برتی اور ہمیں بھی گنہگار کیا۔ اگر صبح ہی بتا دیتیں تو کچھ نہ کچھ انتظام ہو جاتا اور یہ نوبت نہ آتی۔''

''میں نے بھائی کو فون کیا تھا۔ اس نے آنے کا وعدہ تو کیا تھا لیکن......''

میں نے اسے تسلی دی اور کچن میں جا کر ملازمہ سے کہا کہ وہ فوری طور پر تین آدمیوں کے لیے کھانا بنائے۔ وہ گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی لیکن میرے کہنے پر رک گئی پھر میں نے ارشد کو اشارے سے بلایا۔ وہ بھی اس کے حالات سن کر خاصے افسردہ نظر آ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ بازار جا کر صبح کے لیے ناشتے کا سامان اور چائے کی پتی، دودھ اور چینی وغیرہ لے آئیں تاکہ یہ لوگ صبح سکون سے ناشتا کر سکیں۔

''میرا خیال ہے کہ اسے کچھ پیسے بھی دینے چاہئیں۔ تم روز روز تو کھانا بنا کر نہیں دے سکتیں۔''

''وہ بھی دے دوں گی۔ پہلے آپ یہ سامان تو لے کر آئیں۔''

ارشد چلے گئے تو میں فرزانہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کا دل بہلانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ میں نے اسے مشورہ دیا کہ جب تک ملازمت نہیں ملتی وہ گھر پر ہی کوئی کام شروع کر دے تاکہ چار پیسے ہاتھ آئیں اور اسے کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

''باجی، میں کیا کام کر سکتی ہوں۔ میرے ہاتھ میں تو کوئی ہنر بھی نہیں ہے۔ شوہر کے گھر میں راج کرتی تھی اس لیے کوئی کام سیکھنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔''

''اب سیکھ لو۔ اس کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ شہر میں ایسے بے شمار ادارے ہیں جہاں عورتوں کو مختلف اقسام کے ہنر سکھائے جاتے ہیں۔ تم اپنے رجحان کے مطابق ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتی ہو۔ مثلاً سلائی کڑھائی، کمپیوٹر وغیرہ۔ آج کل کمپیوٹر پر کام کرنے والوں کی بہت مانگ ہے اور کچھ نہیں تو محلے کے بچوں کو گھر پر ٹیوشن ہی

پڑھانا شروع کردو۔''

''باجی، مجھے اس محلے میں آئے ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے ہیں۔ میں کسی کو نہیں جانتی اور نہ ہی کوئی مجھے جانتا ہے ایسے میں کون اپنے بچے میرے پاس بھیجے گا اور نہ ہی مجھے پڑھانے کا کوئی تجربہ ہے۔''

جی میں آیا کہہ دوں کہ تمہیں تو ملازمت کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہے، پھر اس کے لیے اتنی بے چین کیوں ہو رہی ہو لیکن موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے خاموش رہی البتہ یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ اس عورت کو مانگ کر کھانے کی عادت ہے۔ تھوڑی دیر میں ارشد سامان لے کر آ گئے۔ ملازمہ نے بھی کھانا تیار کر لیا تھا۔ میں نے وہ سب چیزیں اس کے حوالے کیں اور پانچ ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔

''فی الحال ان سے کام چلاؤ اور اگر مزید پیسوں کی ضرورت ہو تو بلاتکلف کہہ دینا۔ میں یہ گناہ اپنے سر نہیں لے سکتی کہ میرے پڑوس میں کوئی بھوکا سوئے اور ہاں میرے مشوروں پر ضرور غور کرنا۔''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ دوپٹے کے پلو سے انہیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ بس آپ مجھے کوئی کام دلوا دیں۔ ساری عمر آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

''میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں جلد از جلد کوئی جاب مل جائے۔'' ارشد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد فرزانہ نے میرے گھر کا راستہ دیکھ لیا اور موقع بے موقع آنے لگی۔ چند ہی دنوں میں اس کی بہت سی خوبیاں مجھ پر آشکار ہو گئیں اور میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ جیسا اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ویسی نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ دو نمبر عورت ہے اور اپنے مظلوم و غریب ہونے کا تاثر دے کر لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹتی ہے۔ اسے غالباً ارشد کے جذبۂ ہمدردی کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ ان کے سامنے اپنے آپ کو حد درجہ مظلوم ظاہر کرتی۔ ارشد تو پہلے دن سے ہی اس کے جھانسے میں آ چکے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنی پوری تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیں لیکن پے در پے کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ میری نظر میں وہ مشکوک ہو گئی۔

ایک دن میں کالج سے واپس آئی تو گھر کے سامنے سے سبزی والا گزر رہا تھا۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور اپنے گیٹ کے سامنے گاڑی کھڑی کر کے اس سے آلو پیاز خریدنے لگی۔ میں نے دیکھا فرزانہ اپنے دروازے پر کھڑی کسی مرد سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ میں کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر وہ شخص گھر کے اندر چلا گیا۔ مجھے کیونکہ کریدنے کی عادت نہیں ہے۔ اس لیے یہی سمجھی کہ وہ کوئی اس کا عزیز رشتے دار ہو گا۔ شام کو فرزانہ آئی تو وہ پہلے کے مقابلے میں کافی ہشاش بشاش لگ رہی تھی۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا اور کھلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے سرسری انداز میں دو چار باتیں کیں پھر ارشد کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ اپنی ملازمت کے بارے میں معلوم کرنے آئی ہے لیکن انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ارشد کو رجھانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ مال بٹور سکے اور وہ اس میں کامیاب ہو گئی۔

اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب پہلی تاریخ کو ارشد نے گھر کے خرچ کے علاوہ کچھ پیسے میرے ہاتھ پر رکھے اور بولے۔

''ہم جو تنخواہ کا پانچ فیصد مستحقین کو دیا کرتے ہیں۔ اب وہ فرزانہ کو دے دیا کرنا۔ اس کا حق سب سے زیادہ ہے۔ ایک تو وہ ہمارے پڑوس میں رہتی ہے۔ دوسرے اس کا کوئی مستقل ذریعۂ آمدنی نہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ اسے ہر مہینے بینک سے منافع ملتا ہے پھر اس کا بھائی بھی مدد کرتا رہتا ہے۔ ہمیں دوسرے لوگوں کا حق مار کر سارے پیسے اسے نہیں دینے چاہئیں۔''

''بینک کا منافع برائے نام ہے اور بھائی بھی باقاعدگی سے اسے نہیں دیتا۔ اس لیے میری نظر میں تو وہی سب سے زیادہ مستحق ہے۔''

اس فضول عورت کے لیے میں اپنے شوہر سے بحث نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے خاموش ہو گئی اور وہ سارے پیسے فرزانہ کو دے دیے۔ اس کے باوجود اس نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اب وہ بہانے بہانے سے ارشد کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلی جاتی اور اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ صبح ہی صبح آ گئی۔ ارشد دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ فرزانہ ہمیشہ کی طرح بن سنور کر آئی تھی جیسے کہیں باہر جانے کا ارادہ ہو۔ ارشد کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''اچھا ہوا میں وقت پر آ گئی۔ ورنہ ڈر رہی تھی کہ آپ نکل نہ گئے ہوں۔''

ارشد نے چونک کر دیکھا اور بولے۔ ''کہیں جانا ہے کیا؟''

"ہاں۔" وہ اپنا دایاں ہاتھ گال پر رکھتے ہوئے بولی۔ "رات سے ڈاڑھ میں شدید درد ہو رہا ہے۔ اسی لیے ٹھیک سے سو بھی نہ سکی۔ آپ مجھے جناح اسپتال چھوڑ دیں۔ میں وہیں دکھادوں گی۔ آپ کے تو راستے میں پڑے گا۔"

"وہاں چھوڑنا تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن سرکاری اسپتالوں میں تو بہت رش ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کو دکھا دیں۔"

"پہلی بات یہ کہ پرائیویٹ ڈاکٹر زیادہ تر شام میں بیٹھتے ہیں۔ اس وقت تک میں یہ تکلیف برداشت نہیں کر سکتی اور دوسرے یہ کہ میں پرائیویٹ ڈاکٹر کی فیس افورڈ نہیں کر سکتی۔ بس آپ مجھے اسپتال تک چھوڑ دیں۔ میں کسی نہ کسی طرح خود ہی واپس آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔"

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ اسے ہر تیسرے چوتھے روز کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا اور وہ ارشد کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلی جاتی۔ کبھی گڈو کے اسکول جانا ہے۔ کبھی بینک تو کبھی کسی سرکاری دفتر میں کوئی کام نکل آتا۔ میں اس کی حرکتوں سے عاجز آچکی تھی۔ کئی بار سوچا کہ اس سے پوچھوں، بی بی، اس محلے میں آنے سے پہلے تمہارے کام کون کرتا تھا اور تم کس کے ساتھ گاڑی میں گھومتی پھرتی تھیں لیکن میں بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی اور ارشد سے کچھ کہنا ہی بیکار تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ اپنے جذبۂ ہمدردی سے مجبور ہیں۔ فرزانہ کے علاوہ کوئی اور ہوتا تب بھی وہ ایسا ہی کرتے۔ البتہ مجھے اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ فرزانہ پرلے درجے کی مکار اور عیار عورت ہے اور اس کا کام ہی مردوں کو بے وقوف بنا کر ان سے پیسے بٹورنا تھا۔ اس نے محلے کے دو چار مردوں کو اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی لیکن اس کا مقصد پورا نہیں ہوا۔ ان کی مالی حیثیت ایسی نہ تھی کہ وہ فرزانہ پر بے تحاشا لٹاتے بلکہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو معمولی تحفے تحائف دے کر اس کے حسن سے سیراب ہونا چاہ رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ارشد کی طرح صاحبِ حیثیت، فراخ دل اور ہمدرد نہیں تھا۔ چنانچہ فرزانہ نے ان لوگوں کو ٹھینگا دکھایا اور پوری توجہ ارشد پر مرکوز کر دی۔

اس عورت نے میرا ذہنی سکون برباد کر دیا تھا۔ مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ وہ بڑی تیزی سے ارشد کے گرد گھیرا تنگ کر رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ کسی کمزور لمحے کی گرفت میں آکر بہک جاتے اور وہ انہیں جذباتی طور پر بلیک میل کرتی یا معاملہ اس حد تک آگے بڑھ جاتا کہ ارشد اس سے شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ مجھے لگا کہ ایک طوفان میری جانب بڑھ رہا ہے جو میرا سب کچھ بہا کر لے جائے گا۔ اب مجھے فوری طور پر اس کے آگے بند باندھنا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے اور میرے پاس پچھتاوؤں کے سوا کچھ نہ رہے۔

میں فرزانہ سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ وہ ایک جونک کی طرح ارشد سے چمٹ گئی تھی اور جونک اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتی۔ کئی دن اسی سوچ بچار میں گزر گئے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا پھر میں نے اپنی ایک سینئر کولیگ کو ساری بات بتائی اور ان سے مشورہ مانگا۔ انہوں نے بڑے غور سے میری بات سنی اور کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ "تم نے اس عورت کو سمجھنے میں بہت دیر لگا دی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے، تمہیں فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا۔"

"اسی لیے تو آپ سے مشورہ مانگا ہے۔"

"اب تمہارے پاس ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ اس عورت کے لیے رکاوٹیں کھڑی کر دو تاکہ وہ تمہارے میاں تک نہ پہنچنے پائے۔"

"شام میں تو ارشد کے ساتھ سائے کی طرح چمٹی رہتی ہوں۔ میری موجودگی میں اس کی ہمت نہیں کہ وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر سکے لیکن صبح کا کیا کروں۔ وہ ہر دوسرے چوتھے روز کسی نہ کسی بہانے ارشد کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔"

"اس کا بھی ایک حل ہے۔ تم کچھ دنوں کے لیے کسی بہانے سے اپنی گاڑی کھڑی کر دو۔ کوئی بھی بہانہ بنا سکتی ہو۔ مثلاً یہ کہ بہت زیادہ ٹریفک میں تم سے ڈرائیونگ نہیں ہوتی یا گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہے اور صبح کے وقت ارشد کے ساتھ کالج آجایا کرو۔ واپسی میں تمہیں کوئی بندوبست کرنا ہو گا۔ اس طرح وہ عورت خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔"

"ترکیب تو ٹھیک ہے لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے اور وہ یہ کہ ارشد کا دفتر نو بجے شروع ہوتا ہے جبکہ میں پہلے پیریڈ کی وجہ سے آٹھ بجے پہنچ جاتی ہوں۔"

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ تم پرنسپل سے کہہ کر اپنا پیریڈ آگے بڑھوا سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے، یہی کر کے دیکھتی ہوں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اس روز شام کو میں نے ارشد سے کہہ دیا کہ ان کے ساتھ صبح کو کالج جایا کروں گی کیونکہ ٹریفک بہت زیادہ ہوتا

ہے اور مجھ سے اتنے رش میں ڈرائیونگ نہیں ہوتی۔ آج بھی ایک موٹر سائیکل سوار اچانک ہی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ وہ تو میں نے فوراً ہی بریک لگا دیے ورنہ مصیبت گلے پڑ جاتی۔"

"واپسی میں کیا ہوگا؟" ارشد نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ کرلوں گی۔ ابھی تو میں نے ایک کولیگ سے بات کی ہے۔ وہ مجھے ڈراپ کر دیا کریں گی۔"

اس طرح میں صبح ارشد کے ساتھ کالج جانے لگی۔ دو تین دن بعد وہ پھر آ گئی۔ اسے شناختی کارڈ کے دفتر جانا تھا۔ ہمیشہ کی طرح خوب بنی سنوری اور ٹائٹ ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا کندھے پر جھول رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ڈیٹ پر جارہی ہے۔ اس سے پہلے کہ ارشد کچھ کہتے، میں بول پڑی۔ "فرزانہ! آج تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ مجھے کالج پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔ تم ٹیکسی سے چلی جاؤ۔"

یہ کہہ کر میں نے پرس کھولا اور اس میں سے پانچ سو کا نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"آپ اپنی گاڑی سے نہیں جارہیں؟"

"نہیں۔" میں نے بے رخی سے کہا۔ "صبح کے وقت ٹریفک بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مجھ سے ڈرائیونگ نہیں ہوتی۔ اب میں ارشد کے ساتھ ہی جایا کروں گی۔"

"اچھا" وہ مایوس ہوتے ہوئے بولی۔ "میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی اور اس نے پھر ارشد کے ساتھ جانے کے لیے نہیں کہا لیکن اس کی آمد میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ موقع بے موقع شام میں اس وقت آتی جب ارشد گھر پر موجود ہوتے۔ وہ گھنٹا دو گھنٹا بیٹھتی۔ بعض اوقات کھانے میں بھی شریک ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی ضرورت بیان کرتی اور پیسے اینٹھ کر لے جاتی۔ اسے اپنے حسن پر بہت ناز تھا۔ وہ بجلیاں گراتی آتی اور ارشد نے اپنے گرد جو حصار باندھ رکھا تھا، اس میں شگاف ڈالنے کی کوشش کرتی لیکن میری موجودگی میں اس کا کوئی داؤ کارگر نہیں ہو رہا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی ارشد کے پاس سے نہیں ہٹتی تھی اور میری کوشش یہی ہوتی کہ وہ ارشد سے زیادہ باتیں نہ کر سکے پھر میں نے ارشد کو بہانے بہانے باہر لے جانا شروع کر دیا۔ کبھی شاپنگ کبھی ڈنر تو کبھی کسی رشتے دار سے ملنے کے لیے ارشد اور بچوں کو لے کر چلی جاتی لیکن وہ بھی بہت ڈھیٹ تھی۔ اس نے اپنی آمد و رفت جاری رکھی حالانکہ اسے ارشد کے پاس بیٹھنے کا بہت کم موقع مل رہا تھا۔

میں اپنی جگہ مطمئن تھی لیکن اس نے ایک ایسا داؤ کھیلا جس سے میں تقریباً چاروں شانے چت ہو گئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن ارشد معمول کے مطابق دفتر سے واپس آنے کے بعد ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ ان کے موبائل پر فرزانہ کی کال آئی۔ ارشد نے فون سنا اور ٹی وی بند کرتے ہوئے بولے۔

"فرزانہ گر پڑی ہے اور اس کی کمر میں چوٹ آئی ہے۔ آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کافی تکلیف میں ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

مجھے بچوں کو ہوم ورک کروانا تھا۔ اس لیے میں نے کہہ دیا۔ "مجھے بچوں کو تیاری کروانی ہے آپ چلے جائیں۔"

ارشد کو شاید میری بات پسند نہیں آئی لیکن وہ کچھ نہیں بولے اور کپڑے بدل کر چلے گئے۔ ان کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا۔ "گھر کے دروازے پر کیلے کا چھلکا پڑا ہوا تھا۔ اس پر پاؤں پڑا اور وہ زمین پر گر گئی۔ کمر میں چوٹ آئی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہڈی بچ گئی۔ ڈاکٹر نے دوائیاں دی ہیں اور ایک ماہ تک فزیو تھراپی کے لیے کہا ہے۔"

"اوہو، یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے دکھاوے کے لیے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اسے کچھ پیسے دے دیں، وہ بیٹے کے ساتھ فزیو تھراپی کروانے چلی جایا کرے گی۔"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ بیٹے کو اس نے بھائی کے پاس بھیج دیا ہے کیونکہ اس حالت میں وہ اس کی حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ ماں اتنی ضعیف بھی نہیں کہ بیٹی کے ساتھ نہ جا سکے۔"

"شروع شروع میں تو ہم دونوں میں سے کسی ایک کو جانا ہوگا۔ بعد میں اس کی حالت بہتر ہوئی تو وہ خود ہی چلی جایا کرے گی۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھیں۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس وقت ہے اور نہ شام کے وقت ڈرائیونگ کر سکتی ہوں۔"

"پھر مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔" وہ آہستہ سے بولے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ جانتی تھی کہ اس وقت ہمدردی کے دریا میں طغیانی آئی ہوئی ہے اس لیے میرا کچھ کہنا بیکار ہوگا۔

اگلے روز سے ارشد نے اسے فزیو تھراپی کے لیے

لے جانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی میں بھی ساتھ چلی جاتی۔ وہ بھی اس لیے کہ محلے والے ارشد کی آمدورفت کو شک کی نگاہ سے نہ دیکھیں لیکن میرے لیے روز جانا ممکن نہ تھا کیونکہ اس میں کم از کم دو سے تین گھنٹے لگتے تھے۔ ارشد کا خیال تھا کہ وہ ہفتہ دس دن میں اس قابل ہو جائے گی کہ خود ہی اسپتال جا سکے لیکن ایسا نہیں ہوا اور پورا مہینا ارشد اس کے ساتھ جاتے رہے۔ اکثر دیر ہو جاتی تو وہ یہی کہتے کہ دیر سے نمبر آیا تھا۔

فرزانہ نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ارشد کو اپنے حسن کے جال میں جکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ فزیوتھراپی ختم ہو چکی تھی لیکن اس کے بعد بھی وہ ارشد کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلی جاتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ محلے میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ میری ملازمہ نے بھی بتایا کہ لوگ فرزانہ بی بی اور صاحب کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس کی بات کا کبھی یقین نہ کرتی اگر سب کچھ اپنے کانوں سے نہ سن لیا ہوتا۔

اس روز مجھے کسی کام سے باہر جانا تھا۔ ارشد کافی تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی قریبی سپر اسٹور تک چلی گئی۔ مجھے کچھ گروسری خریدنا تھی۔ اس میں بھی دو گھنٹے لگ گئے۔ واپس آئی تو لاؤنج سے فرزانہ کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ میرے بارے میں ہی کوئی بات کر رہی تھی۔ میں الٹے پاؤں پلٹ گئی۔ کچن کا ایک دروازہ سائڈ کی گیلری میں بھی کھلتا تھا۔ میں اس دروازے سے کچن میں داخل ہوئی۔ سامان کاؤنٹر پر رکھا اور لاؤنج میں کھلنے والے دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر ارشد اور فرزانہ کی باتیں سننے لگی۔

''میرا خیال ہے کہ تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔'' ارشد کی آواز آئی۔ ''اس معاشرے میں مرد کے بغیر عورت کے لیے زندگی گزارنا مشکل ہے۔ اسے قدم قدم پر مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں بیماری کے دوران ہو گیا ہوگا۔''

''مجھ سے کون شادی کرے گا؟'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

''کیوں؟ تمہارے اندر کیا کمی ہے؟ جوان ہو، خوب صورت ہو۔ تم سے شادی کرنے کے لیے بہت سے مرد تیار ہو جائیں گے۔''

''ہاتھ پکڑنے والے تو بہت ہیں لیکن ذمے داری لینے کے لیے کوئی تیار نہیں۔''

''کیسی ذمے داری؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''میرا ایک بیٹا بھی ہے ارشد صاحب۔ بہت سے لوگ مجھ سے شادی کرنے کی خواہش کر چکے ہیں لیکن جب انہیں گڈو کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور میں بھی نہیں چاہتی کہ میرے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ پڑے۔ خدا جانے دوسرا شوہر اس کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔''

''سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تم اس بارے میں ضرور سوچو۔''

''اگر آپ جیسا کوئی مل جائے تو میں شادی کرنے کے لیے تیار ہوں بلکہ آپ......'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی پھر شوخ لہجے میں بولی۔ ''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ گڈو کو باپ کا پیار اور شفقت دے سکتے ہیں۔''

''میں...... میں۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولے۔ ''یہ کیسے ممکن ہے۔ میں تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے۔ آپ ہی مجھے سہارا دے سکتے ہیں۔ آپ کے علاوہ میں کسی دوسرے مرد کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔''

''نہیں، تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت ہے۔''

''دوسری شادی کرنا کوئی جرم نہیں۔ بہت سے لوگ کرتے ہیں اور اسلام میں تو چار کی گنجائش ہے۔''

''تم جانتی ہو کہ دوسری شادی کرنے کے لیے مجھے سیما سے اجازت لینا ہوگی اور وہ تو کیا کوئی بھی عورت خوشی سے یہ اجازت نہیں دے سکتی۔''

''سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو ٹیڑھی انگلی استعمال کرنا پڑتی ہے۔ آپ مرد ہیں۔ تھوڑی سی ہمت کریں، وہ مان جائیں تو ٹھیک ورنہ تین لفظ ادا کرنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اس کے بعد تو کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی ناں۔''

اُف میرے خدا۔ کتنی خطرناک عورت تھی وہ اور کس بے دردی سے میرا گھر برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ جی میں آیا کہ سبزی کاٹنے والی چھری اس کے پیٹ میں گھونپ دوں لیکن میں اس کے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ رنگنا اور جیل جانا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی یہ وقت جوش کے بجائے ہوش سے کام لینے کا تھا۔ میں دروازے سے کان لگائے ارشد کے جواب کی منتظر تھی لیکن وہ گم صم بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے چہرے سے بیزاری عیاں تھی، پھر میری آنکھوں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور

ارشد کی گود میں جا کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنی بانہیں ان کی گردن میں ڈال دیں اور مخمور لہجے میں بولی۔

''میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ نے مجھے سہارا نہ دیا تو اپنی جان دے دوں گی اور میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔''

ارشد اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''ارے، ارے، یہ کیا کر رہی ہو، کوئی دیکھ لے گا۔''

''دیکھ لے، میں کسی سے نہیں ڈرتی۔'' وہ ان سے لپٹتے ہوئے بولی۔ ''پہلے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کریں۔''

ارشد نے بمشکل تمام اسے اپنے سے علیحدہ کیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔ ''اس وقت تم جاؤ، فی الحال میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''سوچ لیں۔ اگر آپ نے ایک ہفتے میں فیصلہ نہیں کیا تو نتائج کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔''

وہ لہراتی اور کولھے مٹکاتی ہوئی چلی گئی اور ارشد اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ شاید انہیں فرزانہ سے اس بے حیائی اور بے باکی کی توقع نہیں تھی۔ اس وقت مجھے ان پر بے تحاشا پیار آیا۔ وہ واقعی مضبوط کیریکٹر کے تھے۔ ان کی جگہ کوئی دوسرا مرد ہوتا تو فرزانہ کے تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے ہتھیار ڈال دیتا لیکن انہوں نے آخری وقت تک مزاحمت جاری رکھی اور اس کمزور لمحے میں بھی ثابت قدم رہے جب فرزانہ کے گداز جسم کی گرمی ان کے وجود کو پگھلا رہی تھی۔ مجھے وقتی طور پر اطمینان ہو گیا جو عارضی بھی ہو سکتا تھا۔ وہ ایک ایسی ناگن تھی جس کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگ سکتا تھا۔ اس کا دوسرا حملہ زیادہ خطرناک اور جان لیوا ہو سکتا تھا اور اب مجھے اسی کا توڑ تلاش کرنا تھا۔

میں نے کچن کاؤنٹر سے سامان اٹھایا اور عقبی دروازے سے باہر آ گئی۔ پھر گھوم کر دوبارہ فرنٹ ڈور پر آئی، لاؤنج میں داخل ہو کر سامان ڈائننگ ٹیبل پر رکھا اور ارشد والے صوفے پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلا دیں اور یوں ظاہر کیا جیسے بہت تھک گئی ہوں۔ ارشد نے مجھے گھور کر دیکھا اور ذرا تیز لہجے میں بولے۔ ''کہاں رہ گئی تھیں۔ دو گھنٹے سے بیٹھا سوکھ رہا ہوں۔''

''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ شام کے وقت بازاروں میں کتنا رش ہوتا ہے۔ پھر رکشا ملنے میں بھی دیر لگی۔''

''تمہاری منطق بھی عجیب ہے۔ ذاتی گاڑی ہونے کے باوجود رکشے ٹیکسی میں دھکے کھاتی پھرتی ہو۔''

''واقعی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اب آپ کے ساتھ ہی جایا کروں گی۔''

دوسرے روز میں نے مسز یزدانی کو ارشد اور فرزانہ کے درمیان ہونے والی گفتگو من و عن سنا دی۔ پوری کہانی سننے کے بعد وہ چند لمحے خاموش رہیں پھر بولیں۔ ''دیکھو سیما! حالتِ جنگ میں سب سے پہلے اپنے ہتھیاروں کو چیک کیا جاتا ہے۔ تمہارے اسلحہ خانے میں وہ کون سا مؤثر ترین ہتھیار ہے جس سے تم اپنا دفاع کر سکتی ہو۔''

''سارے ہتھیار بیکار ہو جائیں گے اگر ارشد نے اس عورت سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''تم نے جو کچھ بتایا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورت ابھی تک ارشد کو ورغلانے میں ناکام رہی ہے۔ وہ اس سے ہمدردی تو کر سکتے ہیں لیکن شادی کبھی نہیں کریں گے۔ دونوں کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہاری جیسی قابل اور ذہین بیوی کے ہوتے ہوئے وہ معمولی عورت کا ساتھ قبول نہیں کریں گے۔''

''بعض اوقات مرد کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ وہ آسانی سے ہار ماننے والی نہیں۔ کوئی ایسا جال بچھائے گی کہ ارشد اس سے شادی پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''موجودہ عائلی قوانین کے تحت مرد کے لیے دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینا ضروری ہے۔ تم صاف انکار کر دینا۔''

''ایسی صورت میں وہ مجھے طلاق دے سکتے ہیں۔''

''یہ تمہارا وہم ہے۔ وہ ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ میں نے اسی لیے پوچھا تھا کہ تمہارے اسلحہ خانے میں ایسا کوئی مؤثر ہتھیار ہے کہ تم اپنا دفاع کر سکو۔''

میں نے انہیں تفصیل نہیں بتائی لیکن اپنے طور پر مطمئن تھی کہ وقت آنے پر بھرپور جنگ لڑ سکتی ہوں۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی قیمت پر بھی ارشد کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دوں گی۔ چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ کبھی بھی طلاق نہیں دے سکتے کیونکہ ایسی صورت میں وہ بالکل کنگال ہو جاتے۔ جس مکان میں ہم رہ رہے تھے، وہ انہوں نے میرے نام کر دیا تھا۔ اگر وہ طلاق دیتے تو انہیں اس گھر سے بے دخل ہونا پڑتا۔ اس کے علاوہ بھائیوں نے نکاح نامے میں یہ شرط لکھوائی تھی کہ اگر انہوں نے کبھی مجھے طلاق دی تو انہیں اپنے اثاثوں کا نصف مجھے

دینا ہوگا اور بچوں کے سِن بلوغت کو پہنچنے تک وہ ان کی تعلیم اور پرورش کے اخراجات دیتے رہیں گے۔ یہ ایسی کڑی شرط تھی جسے پورا کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

آئندہ چند روز تک وہ کافی خاموش اور گم صم رہے۔ فرزانہ بھی نہیں آئی۔ لگتا تھا کہ بالا ہی بالا کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ شاید فرزانہ کی طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا اور وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہے تھے کہ مجھ سے اس موضوع پر بات کرسکیں۔ ان کے اندر ہونے والی کشمکش چہرے سے عیاں تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو بالکل نارمل رکھا اور بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس کشمکش سے واقف ہوں۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میرے اندیشے ہمیشہ کے لیے دور کردیے اور ارشد کا جذبۂ ہمدردی بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ فرزانہ کو گئے ہوئے چھٹا یا ساتواں روز تھا کہ ارشد کو دفتر میں موبائل پر اس کا ایک پیغام موصول ہوا۔ اس وقت وہ کسی میٹنگ میں تھے اور یہ ان کا طریقہ تھا کہ اس دوران وہ اپنا فون سائلنٹ پر رکھتے تاکہ کوئی انہیں ڈسٹرب نہ کرسکے۔ وہ پیغام پڑھ کر ارشد پریشان ہوگئے۔ جیسے ہی میٹنگ ختم ہوئی، انہوں نے باس سے دو گھنٹے کی چھٹی لی اور فرزانہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ وہاں ایک کہرام برپا تھا۔ فرزانہ اور اس کی ماں گلے لگ کر بین کررہی تھیں اور ان کے رونے کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ ارشد نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کروایا اور رونے کی وجہ معلوم کی۔ تو فرزانہ نے سسکیاں لیتے ہوئے بتایا کہ گڈو کو کسی نے اغوا کرلیا ہے اور اس کی رہائی کے لیے پچاس لاکھ کا مطالبہ کیا ہے ورنہ وہ اسے جان سے ماردیں گے۔

یہ سن کر ارشد بھی پریشان ہوگئے اور انہوں نے فرزانہ کو مشورہ دیا کہ فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرائی جائے تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ وہ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی کیونکہ اغوا کرنے والے نے دھمکی دی ہے کہ اگر پولیس کو اطلاع دی گئی تو گڈو کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔''

''اس کی زندگی تو ویسے بھی خطرے میں ہے۔'' ارشد نے کہا۔ ''اگر پچاس لاکھ کا بندوبست نہ ہوسکا تو......''

''خدا کے واسطے ایسی باتیں منہ سے مت نکالیں۔'' فرزانہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کو مجھ سے ذرا سی بھی ہمدردی ہے تو کسی بھی طرح پچاس لاکھ کا بندوبست کردیں۔ اس نے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی ہے جس میں سے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔''

بھولنے کی بیماری

سائیکا ٹرسٹ اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ اچانک ایک مریض بغیر اجازت کے اس کے کمرے میں داخل ہوا اور آرام دہ صوفے پر لیٹ گیا جہاں ڈاکٹر اپنے مریضوں سے سوال جواب کرتا تھا۔

''ڈاکٹر آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔ میں بڑی مشکلوں میں پھنس گیا ہوں۔ میں بہت اچھا کاروبار کرتا تھا۔ خوب صورت بیوی بچے بڑا مکان اور دوسری فیلی کے لوگ تھے۔ میں اپنے حلقے احباب میں اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ ساری چیزیں ختم ہوگئیں۔ اس کی وجہ میری میموری حافظہ کا ختم ہونا ہے۔ میں کاروبار Lose کرچکا ہوں کیونکہ میں اپنے کلائنٹ کے نام اور پتا بھول جاتا ہوں ساتھ ہی ساتھ میری بیوی اور بچے بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے اور اس میں ان کی کوئی غلطی میں محسوس نہیں کرتا۔ اکثر راتوں کو میں گھر نہیں جاتا مجھے اپنے گھر کا پتا بھی یاد نہیں رہتا اور میں صبح تک ادھر سے اُدھر گھومتا رہتا ہوں۔ مجھے یاد ہی نہیں رہتا کہ کہاں رہتا ہوں میری حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ برائے مہربانی میری مدد کریں۔''

اس پر ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''یہ عام سی بات ہے بھولنے کی۔ اکثر لوگ (بھولنے کی بیماری) میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اب آپ مجھے بتائیں کہ اس مرض یعنی بھولنے کی عادت آپ نے کب سے محسوس کرنا شروع کی؟''

مریض اچانک صوفے سے اٹھا اور بولا۔ ''کون سی حالت کیسی عادت کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔'' اور یہ کہہ کر مریض کمرے سے نکل گیا۔

امریکا سے جاوید کاظمی کا تجزیہ

''یہ بہت بڑی رقم ہے۔ اتنے کم وقت میں اس کا بندوبست نہیں ہو سکتا۔ میرے اکاؤنٹ میں زیادہ سے زیادہ ڈھائی تین لاکھ ہوں گے اگر گاڑی بیچ دوں تو بھی آٹھ نو لاکھ سے زیادہ نہیں ہوں گے اور اتنی جلدی گاڑی بھی نہیں بک سکتی۔''

ارشد بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ انہیں دو گھنٹے کے اندر دفتر پہنچنا تھا۔ ان کی ذمے داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ وہ زیادہ دیر دفتر سے باہر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے فرزانہ سے کہا۔ ''اب اگر اس کا فون آئے تو تاوان کی رقم کم کروانے کی کوشش کرنا۔ میں زیادہ سے زیادہ دس لاکھ کا بندوبست کر سکتا ہوں۔''

''امید تو نہیں کہ وہ مان جائے۔ میں کوشش کرتی ہوں۔''

ارشد اسے تسلی دے کر دفتر چلے گئے۔ شام چار بجے فرزانہ نے انہیں فون کر کے بتایا کہ وہ پچیس لاکھ پر راضی ہو گیا ہے۔ اب وہ دو گھنٹے بعد فون کرے گا۔ ارشد نے کہا۔ ''اس سے صاف صاف کہہ دو کہ ہم دس لاکھ سے زیادہ نہیں دے سکتے۔ مجھے امید ہے کہ وہ مان جائے گا کیونکہ گڈو کو جان سے مارنے کی دھمکی اس نے صرف تمہیں ڈرانے کے لیے دی ہے۔ اس سے اسے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ ان دس لاکھ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

شام کو ارشد گھر آئے تو انہوں نے سارا ماجرا مجھے سنایا۔ میں بھی پریشان ہو گئی۔ میری رائے بھی یہی تھی کہ پولیس کو اطلاع کر دینی چاہیے۔ کیونکہ پچیس لاکھ کا بندوبست کرنا بھی مشکل تھا۔ ارشد نے میرے کہنے پر ایک بار پھر فرزانہ کو فون کر کے یہی مشورہ دیا لیکن وہ نہیں مانی اور کہا کہ وہ اغوا کنندہ کے فون کا انتظار کر رہی ہے۔ اس سے ایک بار پھر پیسے کم کروانے کی کوشش کرے گی۔ رات دس بجے اس کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ وہ کسی طرح بیس لاکھ سے کم پر راضی نہیں ہو رہا تھا لیکن جب اس نے کہا کہ وہ بمشکل تمام دس لاکھ کا انتظام کر سکی ہے اور اس سے زیادہ نہیں دے سکتی، اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ یہ پیشکش قبول کرتا ہے یا نہیں ورنہ میں اپنے بیٹے پر صبر کر لوں گی۔ اس پر وہ مان گیا۔ اس نے کل بارہ بجے تک کا وقت دیا ہے پھر وہ بتائے گا کہ رقم کہاں پہنچانی ہے اور گڈو کی واپسی کس طرح ہوگی۔''

میں نے ارشد سے پوچھا کہ ان کے اکاؤنٹ میں کتنے پیسے ہیں اور کیا وہ دس لاکھ کا انتظام کر سکیں گے۔ اس پر انہوں نے کہا۔ ''میں نے بینک فون کر کے معلوم کیا تھا۔ میرے اکاؤنٹ میں دو لاکھ چالیس ہزار روپے ہیں۔ کار ڈیلر سے بات کی ہے۔ وہ چھ لاکھ دینے پر تیار ہے باقی رقم تم پوری کر دو۔ میں جلد ہی لوٹا دوں گا۔''

''میں تو پیسے دے دوں گی لیکن آپ گاڑی کیوں بیچ رہے ہیں۔ آنے جانے کا مسئلہ ہو جائے گا۔''

''اس وقت میرے نزدیک گڈو کی واپسی زیادہ اہم ہے۔ گاڑی تو بعد میں بھی آ جائے گی۔ اس وقت تک تمہاری کار استعمال کروں گا۔''

میں خاموش ہو گئی۔ جانتی تھی کہ اس وقت ان پر ہمدردی کا بخار چڑھا ہوا ہے اور میری کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ دوسرے دن میں نے انہیں دو لاکھ کا چیک دیا۔ وہ بینک گئے۔ چیک کیش کروایا۔ اپنے اکاؤنٹ سے بھی پیسے نکالے پھر گاڑی ڈیلر کے حوالے کر کے ٹیکسی میں فرزانہ کے گھر پہنچے اور دس لاکھ روپے اس کے حوالے کر دیے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

''آپ نے مجھ دکھیا پہ اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ میں ساری عمر بھی آپ کی جوتیاں سیدھی کرتی رہوں تو بھی کم ہے۔ آپ نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خرید لیا ہے۔''

''انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ مجھ سے جو ہو سکتا تھا وہ میں نے کیا۔'' پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میں یہاں رک کر گڈو کی واپسی کا انتظار کرتا لیکن مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ تم مجھے فون کر کے اس کی واپسی کے بارے میں بتا دینا۔''

یہ کہہ کر وہ دفتر کے لیے روانہ ہوئے۔ جاتے جاتے انہوں نے فرزانہ کو ایک بار پھر تاکید کی کہ وہ فون کرنا نہ بھولے۔ فرزانہ نے انہیں یقین دلایا کہ گڈو جیسے ہی گھر آیا، وہ انہیں فون کر دے گی۔ وہ اپنے کاموں میں ایسا مصروف ہوئے کہ انہیں کسی اور بات کا خیال ہی نہ رہا لیکن جب چار بج گئے تو وہ بے چین ہو گئے کہ فرزانہ نے اب تک فون کیوں نہیں کیا۔ تھوڑی سی فرصت ہوئی تو انہوں نے خود ہی فرزانہ کا نمبر ڈائل کیا لیکن دوسری جانب سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد انہوں نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن فرزانہ سے رابطہ نہ ہو سکا۔ چھٹی ہوتے ہی انہوں نے فرزانہ کے گھر کی طرف دوڑ لگائی۔ اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ارشد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ فرزانہ کے بارے میں کس سے معلوم کریں۔ وہ وہاں کھڑے یہی سوچ رہے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھے کہ مالک مکان کسی آدمی کو لے کر آیا۔ اس نے ارشد کو وہاں دیکھا تو پوچھا۔ ”خیریت تو ہے۔ آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں؟“

”میں معلوم کرنے آیا تھا کہ فرزانہ کا بیٹا واپس آیا کہ نہیں۔“

”اس کا تو کوئی بیٹا نہیں اور وہ آج دوپہر مکان خالی کر کے چلی گئی۔ میں نئے کرائے دار کو مکان دکھانے لایا ہوں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کا ایک دس سال کا بیٹا گڈو ہے جو......“ ارشد کہتے کہتے رک گئے۔ شاید وہ حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے تھے۔

”میں نے تو صرف ان دو ماں بیٹی کو ہی دیکھا ہے، اگر کوئی بیٹا ہوتا تو مجھے بھی نظر آتا۔ میں اوپر کی منزل پر ہی رہتا ہوں۔“

ارشد نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھر چلے آئے۔ جب انہوں نے مجھے پورا واقعہ سنایا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ مجھے تو شروع دن سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کوئی دو نمبر عورت تھی لیکن اس نے ارشد کو کچھ اس طرح سے شیشے میں اتارا کہ میں کوشش کے باوجود انہیں اس کی مدد کرنے سے باز نہ رکھ سکی۔

ارشد اسی وقت مجھے لے کر پولیس اسٹیشن گئے اور ایس ایچ او کو پوری بات بتائی تو اس نے الٹا ارشد کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا اور بولا۔ ”اگر وہ اپنے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ درج نہیں کروانا چاہ رہی تھی تو ایک پڑھے لکھے معزز شہری ہونے کی حیثیت سے آپ کا فرض بنتا تھا کہ آپ ہمیں اس معاملے پر اعتماد میں لیتے۔ اغوا کرنے والے تو ہمیشہ یہی دھمکی دیتے ہیں کہ پولیس کو نہ بتایا جائے تاکہ وہ بہ آسانی مغوی کے گھر والوں سے تاوان کی رقم اینٹھ لیں۔ پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ آپ نے کبھی اس کے لڑکے کو دیکھا؟“

”نہیں، میں نے جب بھی پوچھا تو اس نے یہی کہا کہ وہ ماموں کے یہاں گیا ہوا ہے۔“

”ارشد صاحب، اب میں سمجھ گیا۔ اس لڑکے کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس نے آپ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ایک فرضی کردار تخلیق کیا تھا اور پھر اس کے اغوا کا ڈراما رچا کر آپ سے دس لاکھ کی رقم اینٹھ لی۔ اگر آپ مجھے بتا دیتے تو ہم اس عورت کا پیچھا کر کے یہ رقم برآمد کر سکتے تھے۔“

میں اور ارشد ہونقوں کی طرح ایس ایچ او کا منہ دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ عورت نوسربازوں کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی جو مختلف طریقوں سے لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ میں ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے رپورٹ درج کر لیتا ہوں لیکن مجھے شبہ ہے کہ فرزانہ اس کا اصلی نام نہیں ہے۔ وہ ہر شہر میں ایک نئے نام کے ساتھ کارروائی کرتی ہوگی۔ مجھے مالک مکان کا بیان بھی لینا ہوگا۔ کرایہ نامہ دیکھ کر ہی اس کے اصل نام اور شناختی کارڈ نمبر کا پتا چل سکتا ہے۔ اب تک وہ عورت ہماری دسترس سے بہت دور جا چکی ہوگی لیکن ہم اسے پکڑنے کی کوشش ضرور کریں گے۔“

مالک مکان نے اپنے بیان میں کہا کہ اس نے اپنا نام فرزانہ ہی بتایا تھا۔ وہ صرف تین مہینے کے لیے آئی تھی۔ اس لیے اس نے کرایہ نامہ بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس عورت کا کہنا تھا کہ اسے وقتی طور پر سر چھپانے کے لیے جگہ چاہیے، جب اس کے بھائی کو بڑا مکان مل جائے گا تو وہ وہاں شفٹ ہو جائے گی۔ مالک مکان نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ گھر میں وہ صرف دو ماں بیٹی ہی رہا کرتی تھیں اور اس نے ڈیڑھ ماہ کے دوران کسی لڑکے کو وہاں نہیں دیکھا۔ اس عورت کا چال چلن اچھا نہیں تھا اور محلے والے اس کی شکایتیں کرنے لگے تھے۔ وہ ان لوگوں کو نوٹس دینے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خود ہی وقت سے پہلے گھر چھوڑ کر چلی گئی۔“

”اس لیے کہ اس کا مشن پورا ہو گیا تھا۔“ ایس ایچ او نے برجستہ کہا تھا۔ اس نے غریب اور مظلوم ہونے کا ڈھونگ رچا کر ارشد صاحب اور ان کی بیگم کی ہمدردیاں سمیٹیں اور ایک لمبی رقم لے کر فرار ہو گئی۔ کاش ارشد صاحب مجھے بتا دیتے تو اتنے بڑے نقصان سے بچ سکتے تھے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ آئندہ کے لیے میرا مشورہ ہے کہ کسی سے ہمدردی کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیا کریں کہ وہ اس کا مستحق بھی ہے یا نہیں۔“

دس لاکھ تو گئے لیکن ایک فائدہ یہ ہوا کہ ارشد کے دل میں ہمدردی کا جذبہ ماند پڑ گیا ہے۔ اب انہوں نے یہ شعبہ میرے حوالے کر دیا ہے اور میں کسی کو کچھ دینے سے پہلے اچھی طرح پرکھ لیتی ہوں کہ میرے سامنے کوئی فرزانہ تو ہاتھ پھیلائے نہیں کھڑی ہے۔ آپ بھی صرف ان لوگوں کی مدد کریں جنہیں پہلے سے جانتے ہوں۔

دائرہ

محمد فاروق انجم

چھوٹی چھوٹی باتیں... کچی عمر کی عادتیں... لمبے لمبے قصوں میں بدل جاتی ہیں... بعض اوقات یاد آنے پر آنکھوں میں دکھوں کا غبار بن جاتی ہیں... ان لمحوں کا ایک ایک نقش یادوں میں رچ بس جاتا ہے... ایسے ہی ایک لمحے سے شروع ہونے والی سنسنی خیز... پُرتجسس کہانی... وہ لمحۂ گرفت تھا... جو دائرہ در دائرہ پھیلتا چلا گیا... اس نادیدہ دائرے سے نکلنے کی ہر سعی ناکام ہورہی تھی... وہ تھا اور اس کی بے بسی کا لامتناہی سلسلہ...

اس چھوٹی سی شوخی کا احوال جو زندگی کا وبال بن گئی...... سرورق کی انوکھی کہانی......

سب کے چہروں کے رنگ اُڑے ہوئے تھے۔

نوٹس بورڈ کے سامنے رش تھا اور دھکم پیل بھی ہورہی تھی۔ ان سب کی نگاہیں حتمی لسٹ پر مرکوز تھیں۔ کسی کو لسٹ دکھائی دے رہی تھی اور کوئی محض ایڑیاں... اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ سب کو بے چینی تھی کہ پہلے وہ لسٹ دیکھ لے۔

وہ شہر کی ایک بڑی بزنس کمپنی کی راہداری تھی۔ مین دروازے سے کچھ آگے دیوار پر نوٹس بورڈ آویزاں تھا اور

اس بورڈ پر ابھی کچھ دیر قبل ان ملازمین کے ناموں کی لسٹ چپکائی گئی تھی جن کو کمپنی نوکری سے فارغ کر رہی تھی۔

دو ماہ قبل کمپنی نے اعلان کیا تھا کہ جدید مشینوں کے نصب ہو جانے پر اب ان کو بہت سے مزدور نوکری سے فارغ کرنے ہوں گے۔ کون کون نوکری سے فارغ ہوں گے اس کا فیصلہ کمپنی کے مالکان کریں گے۔

یہ خبر کمپنی میں کام کرنے والے ہر ملازم پر پہاڑ بن کر گری تھی۔ کون رہتا ہے اور کون جاتا ہے، ہر ایک کی آنکھوں میں سوالیہ نشان تھا۔ اس کے بعد نئی خبر آئی کہ کمپنی کا مزدور ہی نہیں بلکہ آفس اور مارکیٹ میں کام کرنے والے ملازمین بھی چھانٹی ہوں گے۔ اس خبر نے پریشانی کا روپ دھار کر تنویر علی کو بھی گھیر لیا تھا۔

تنویر علی شعبۂ مارکیٹنگ میں سیلز آفیسر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ باپ اسکول ماسٹر اور دو بڑے بھائی سرکاری ملازم تھے۔ جبکہ ماں مکمل گھریلو عورت تھی۔

تنویر نکلتے قد کا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور مسکراہٹ میں شرارت پوشیدہ رہتی تھی۔ ہنسنا کھیلنا اور شوخی اس کی سرشت میں شامل تھی۔ اپنی باتوں اور چٹکلوں سے وہ کسی بھی محفل میں قہقہے بکھیر دیتا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود وہ بہت محنتی تھا۔ اسے یہ نوکری بڑی مشکل سے اپنے خالو کی سفارش پر ملی تھی۔ اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دن رات نوکری کی سعی میں سارے شہر کی سڑکیں ناپ لی تھیں۔ تنویر کے خالو بھی ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھے۔ ان کا ایک دوست اس کمپنی میں تھا۔ اسی کے کہنے پر تنویر کو نوکری مل گئی تھی اور تنویر نے ٹھان لی تھی کہ وہ خوب محنت کرے گا اور کمپنی میں ایسی جگہ بنائے گا کہ وہ کمپنی کی مجبوری بن جائے۔ چند ہفتے قبل تنویر کو سال کا بہترین سیلز آفیسر کا ایوارڈ بھی ملا تھا۔

اس کے باوجود جب یہ اعلان ہوا کہ کمپنی کی فیلڈ فورس میں بھی چھانٹی ہوگی تو تنویر پریشان ہو گیا تھا۔ تنویر کا باس عنایت احمد تھا۔ جس کی توند نکلی ہوئی تھی اور اس کا چشمہ ہر وقت ناک کی نوک پر جما رہتا تھا، کسی سے بات کرتے ہوئے وہ چشمے کے اوپر سے دیکھتا ہوا بات کرتا تھا۔ وہ تنویر کو پسند کرتا تھا اور اپنی ٹیم کا اہم رکن سمجھتا تھا۔

تنویر کو جب اس بات کا پتا چلا تو وہ سیدھا عنایت احمد کے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت عنایت احمد اپنی کرسی پر براجمان ایک فائل کھولے اس پر جھکا ہوا تھا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں سر؟''

''ہاں...... آجاؤ۔'' عنایت احمد نے اپنی ناک پر جمی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے اجازت دی۔

تنویر سامنے کھڑا ہو کر بولا۔ ''سر میں کیا سن رہا ہوں۔''

''تم کیا سن رہے ہو؟'' عنایت احمد کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''فیکٹری میں کام کرنے والے مزدور ہی نہیں بلکہ ہم لوگوں میں سے بھی کام کرنے والے نوکری سے فارغ ہو جائیں گے۔'' تنویر نے کہا۔

''ہاں یہ فیصلہ تو ہوا ہے۔'' عنایت احمد بولا۔

''سر...... کون کون نوکری سے جائے گا؟'' تنویر نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

''یہ تو مالکان ہی جانتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔'' عنایت احمد نے کندھے اچکائے۔

''آپ مالکان کے بہت قریب ہیں سر۔ آپ کو کچھ تو پتا ہوگا۔'' تنویر اپنے باس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اب میں اتنا بھی قریب نہیں ہوں کہ وہ مجھ سے ہر بات شیئر کریں۔ لیکن میں ایک بات کہہ سکتا ہوں۔'' عنایت احمد نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور تنویر کی طرف دیکھنے لگا۔

''وہ کیا بات ہے سر؟'' تنویر نے فوراً پوچھا۔

''وہ بات یہ ہے کہ کم از کم تم نہیں جاؤ گے۔'' عنایت احمد مسکرایا۔

''واقعی سر؟'' تنویر کو کچھ حوصلہ ہوا۔

''بھئی تم بہت محنتی ہو، تم نے سیلز میں سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ ابھی تمہیں ایوارڈ بھی ملا ہے۔ مالکان تمہارے کام سے خوش ہیں اور پھر میں خود اپنے سب سے زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کے کام سے مطمئن اور خوش ہوں۔ اس لیے تم نہیں جاؤ گے۔'' وہ ایک بار پھر کہہ کر مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے عنایت احمد کے پھولے ہوئے گال اور بھی پھول جاتے تھے۔

''سر یہ سچ ہے۔'' تنویر خوش تو ہو گیا لیکن پھر بھی وہ مکمل یقین کر لینا چاہتا تھا۔

''مجھے پورا یقین ہے۔'' عنایت احمد بولا۔

''تو سر پھر میں ایزی ہو جاؤں؟''

''تو کیا تم ایزی نہیں ہو؟''

''سر پریشانی تو ہو ہی جاتی ہے۔''

''تم پریشان ہونا چھوڑ دو اور بے فکر رہو۔ جب تک

میں تمہارا باس ہوں تب تک تم اس کمپنی میں کام کرتے رہو گے۔ اب تم جاؤ اور مجھے کام کرنے دو۔ تم بھی کام کرو۔"

عنایت احمد نے کہہ کر اپنا سر پھر فائل پر جھکا لیا اور تنویر کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے بعد سب سے پہلے فیکٹری کے مزدوروں کی چھانٹی ہوئی اور پھر کمپنی کے آفس اور فیلڈ فورس میں سے ملازمین کو نوکری سے برخاست کرنے کی لسٹ نوٹس بورڈ پر آویزاں کردی گئی اور سب اپنے چہرے کے اُڑے ہوئے رنگ کے ساتھ لسٹ میں اپنا اپنا نام دیکھ رہے تھے، جس کا نام لسٹ میں تھا وہ مایوس ہوکر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔ تنویر نے بھی احتیاط کے طور پر لسٹ دیکھی اور اپنا نام نہ پا کر وہ مسکراتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

تنویر نے اس خوشی میں اپنے باس عنایت احمد کو دوپہر کا کھانا اپنی طرف سے کھلانے کی دعوت دی تو اس کے باس نے بخوشی دعوت قبول کرلی۔ تنویر نے بہترین ریسٹورنٹ میں باس کو پُرتکلف کھانا کھلایا، خوب گپ شپ ہوئی اور بل دینے سے پہلے تنویر نے شرارت سے کیچپ ٹشو پیپر کے ڈبے میں اس طرح سے انڈیل دی کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ اندر کیچپ ڈالی ہوئی ہے۔ اب جو ٹشو پیپر نکالے گا اس کے ہاتھ تو کیا صاف ہوں گے اُلٹا وہ نئی مصیبت میں پھنس جائے گا۔ کیونکہ بے خیالی میں نکالا ہوا ٹشو پیپر کیچپ سے بھرا ہوگا اور اس کے قطرے نکالنے والے کے کپڑے خراب کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائیں گے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" عنایت احمد نے متحیّر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہلکی پھلکی مستی کی ہے سر۔" وہ بے پروائی سے مسکرایا۔

"جانتے ہو جیسے ہی کوئی بے خیالی میں ٹشو باہر نکالے گا کیچپ سے اس کے کپڑے خراب ہوجائیں گے۔"

"سر زندگی میں مستی بھی ساتھ ساتھ ہی چلنی چاہیے۔" تنویر شرارت سے مسکرایا۔

عنایت احمد نے دائیں بائیں دیکھا اور نمک دانی کا ڈھکن کھول کر اچار کی پلیٹ میں ڈال کر اپنے پھولے ہوئے گالوں سے ہنسا اور بولا۔ "اب نکلو یہاں سے۔ تم مجھے بھی پھنساؤ گے۔ تم نے تو مجھے بھی بچہ بنا دیا ہے۔"

تنویر نے بل ادا کیا اور دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔ اس کھانے نے کمال یہ کیا کہ تنویر اور بھی عنایت کے قریب ہوگیا۔ اب تنویر کو اپنے کام اور نوکری کی فکر نہیں رہتی تھی۔

تنویر کو اب ایک ہی فکر تھی کہ اس کی منگیتر اور خالہ زاد عروسہ کی سالگرہ آرہی ہے اور اس کو عروسہ کے ساتھ سالگرہ کیسے منانی ہے۔

عروسہ اور تنویر شروع سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ دونوں میں اچھی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ جب دونوں کی محبت سر اُٹھانے لگی تو عروسہ کی ماں نے فوراً اس کے باپ سے بات کی اور دونوں کے رشتے کی بات تنویر کے ماں باپ تک پہنچ گئی۔ باہمی رضامندی اور خوشی سے دونوں کی منگنی ہوگئی۔

منگنی کے بعد خاندان میں ہونے والی تقریبات میں دونوں ایک دوسرے سے ملتے تھے، باتیں کرتے تھے اور گھنٹوں فون پر بھی اپنے اپنے دل کا حال بیان کرتے رہتے تھے۔

تنویر چاہتا تھا کہ وہ اس بار عروسہ کی سالگرہ باہر کہیں کھانا کھا کر اور گھوم پھر کر منائے، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ عروسہ کے والدین اس کے ساتھ جانے سے انکار کرسکتے تھے۔ تنویر سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیسے ان کو رضامند کرے۔ دوسری طرف عروسہ بھی چاہتی تھی کہ دونوں ایک ساتھ باہر وقت گزاریں، وہ بھی کوئی راستہ تلاش کررہی تھی۔

عروسہ کی سالگرہ کا دن آگیا تو تنویر نے ہمت کرکے پہلے اپنی ماں کو منایا اور اس کے بعد اپنی خالہ جو عروسہ کی ماں بھی اس سے بات کی، بات چلتے چلتے عروسہ کے باپ تک پہنچی اور اس نے بغیر کسی حیل وحجت کے ان کو اجازت دے دی لیکن صرف دو گھنٹوں کے لیے۔

دونوں کے لیے دو گھنٹے بہت تھے۔ سردیوں کا موسم الوداع کہہ رہا تھا۔ دن بھر دھوپ کی وجہ سے گرمی رہتی تھی اور شام ہوتے ہی موسم خوشگوار ہوجاتا تھا۔ شام ہوتے ہی تنویر اپنی موٹر سائیکل پر عروسہ کو بٹھا کر ایک اچھے ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ دونوں نے وہاں کیک کاٹا، تنویر نے عروسہ کو سالگرہ کا تحفہ دیا، کھانا کھایا، تصویریں بنائیں اور اس کے بعد دونوں ریسٹورنٹ سے باہر آگئے۔

"کہاں چلیں؟" باہر نکلتے ہی تنویر نے پوچھا۔

"اب واپس گھر چلتے ہیں۔" عروسہ نے کہا۔

"ابھی دو گھنٹے نہیں ہوئے۔" تنویر بولا۔ "ابھی ہم نے صرف کھانا کھایا ہے، کہیں گھومنے تو گئے ہی نہیں ہیں۔"

''پھر کہاں جانا ہے؟'' عروسہ نے اپنی دلکش مسکراہٹ عیاں کی۔

تنویر سوچ کر بولا۔ ''جانتی ہو شہر سے ذرا ہٹ کر ایک نئی کالونی بن رہی ہے۔ اس کالونی کا تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ سنا ہے وہ بہت ہی خوبصورت کالونی ہے اور لوگ وہاں شام کو ٹہلتے ٹہلتے چلے جاتے ہیں وہاں چلتے ہیں۔ ذرا لانگ ڈرائیو بھی ہو جائے گی اور جاتے اور آتے ہوئے بہت سی باتوں کا بھی موقع مل جائے گا۔''

''وہ دور ہے۔'' عروسہ نے کہا۔

''اتنی بھی دور نہیں ہے۔ باتوں میں پتا بھی نہیں چلے گا۔'' تنویر نے بے پروائی سے کہہ کر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔

''وہاں کا راستہ ویران ہے، کہیں اور چلتے ہیں۔'' عروسہ اس طرف جانے کو تیار نہیں تھی۔

''بہترین ڈبل سڑک بن چکی ہے۔ سڑک کے دائیں بائیں اسٹریٹ لائٹس روشن ہوتی ہیں کہ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا ہے۔ اور وہاں راستے میں ایک ریسٹورنٹ اور شاپنگ مال بھی زیرِ تعمیر ہے۔ گھبراؤ نہیں بیٹھو چلتے ہیں۔'' تنویر نے کہا۔

عروسہ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ تنویر نے موٹر سائیکل کا رخ اس کالونی کی طرف کر لیا۔ تنویر نے موٹر سائیکل کی رفتار مناسب رکھی تھی اور دونوں خوشگوار باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ شہر سے نکل کر نئی تعمیر ہونے والی سڑک کے شروع ہوتے ہی کچھ آگے ایک پیٹرول پمپ تھا۔ اس سڑک پر ان کی موٹر سائیکل دوڑنے لگی تھی۔ سڑک کے دائیں بائیں اسٹریٹ لائٹس تھیں اور دور تک روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں سڑک سے ہٹ کر آبادی دکھائی دے رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اور آدھا چاند چمک رہا تھا۔

کالونی شروع ہونے سے پہلے ایک زیرِ تعمیر ریسٹورنٹ آ گیا۔ اسے کچھ فاصلے پر شاپنگ پلازا کی عمارت دکھائی دینے لگی وہ بھی زیرِ تعمیر تھی۔ اس عمارت کے باہر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ ایک چمچماتی نئے ماڈل کی کار کھڑی تھی۔ کار کے ساتھ ایک کار اور بھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس زیرِ تعمیر شاپنگ سینٹر کے اندر کچھ لوگ تھے لیکن وہ زیرِ تعمیر شاپنگ سینٹر مکمل اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

تنویر کی نگاہیں کار پر تھیں۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور معدوم ہو گئی۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ نئی کالونی تھی جس کا رقبہ وسیع و عریض تھا۔ دور تک باؤنڈری وال تھی، ایک بڑا آہنی گیٹ تھا اور گیٹ پر روشنی کا ایسا انتظام تھا کہ سڑک پر پڑا کاغذ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس وقت اس کالونی کے اندر لوگ موجود تھے۔ کئی کاریں کھڑی تھیں۔ اس کالونی کی اپنی ہی کشش تھی، خریدار کے علاوہ تنویر جیسے لوگ بھی شام کو اس طرف نکل آتے تھے۔

تنویر نے موٹر سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی۔ دونوں نے دور تک نظر دوڑائی۔ پوری کالونی میں سڑکوں اور روشنیوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ تین بڑے پارک تھے اور ان میں ہریالی تھی۔ وہ کالونی ایک بہت بڑا گروپ بنا رہا تھا اور اس نے اس کالونی میں رہائش اختیار کرنے والوں کی ہر آسائش کا خیال رکھا تھا۔ دونوں تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ لوگ ایسے ہی اس کالونی کی تعریف نہیں کرتے۔

''کمال ہے۔'' تنویر بے اختیار بولا۔

''کاش ہمارے پاس پیسے ہوتے تو ہم بھی یہاں پلاٹ خرید لیتے۔'' عروسہ حسرت سے بولی۔

''یقین کرو میرا دل چاہتا ہے کہ ابھی زمین کھلے اور پیسوں کی بوریاں باہر نکل آئیں اور میں یہاں تمہارے لیے تاج محل کھڑا کر دوں۔'' تنویر نے دور تک دیکھتے ہوئے کہا۔

تنویر کی بات سن کر عروسہ نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہنس دی۔ ''چلو چلیں۔ اس سے پہلے کہ ہمارے خواب ہمیں یہیں دفن کر دیں۔''

''میں تو دفن ہو چکا ہوں۔ پیسے والے کتنے خوش نصیب ہیں۔ وہ کچھ بھی خرید سکتے ہیں اور ہم جیسے محض حسرت سے دیکھ کر چپ ہو جاتے ہیں۔'' تنویر اداس سا ہو گیا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو واقعی پیسہ بہت بڑی طاقت ہے۔ پیسہ ہو تو کوئی حسرت دل میں نہیں رہتی.....'' عروسہ نے بھی حسرت بھری نگاہوں سے دائیں دیکھا۔

''یہاں ایک پلاٹ کا جتنا ریٹ ہے اسے سن کر ہم صبر کے گھونٹ ہی پی سکتے ہیں۔'' تنویر بولا۔

''اب بس کرو اور چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔'' عروسہ کو گھر جانے کی جلدی تھی۔

''ایک تو تمہیں گھر جانے کی بہت جلدی ہے۔'' تنویر بولا۔

''ابو امی انتظار کر رہے ہوں گے اور پھر دیکھو کیا وقت ہو گیا۔'' عروسہ نے کہا۔

تنویر اور عروسہ اس جگہ میں کھو گئے تھے۔ عروسہ کو اگر گھر جانے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ شاید اس جگہ گھنٹوں بیٹھی رہتی۔

''ابھی ہمیں یہاں آئے آدھا گھنٹا بھی نہیں ہوا ہے۔'' تنویر نے کہا۔

''آنے اور جانے میں جو وقت لگ گیا ہے۔'' عروسہ کہہ کر موٹر سائیکل کی طرف بڑھی۔ تنویر کو بھی اپنی موٹر سائیکل کی طرف جانا پڑا۔

تنویر نے بجھے دل کے ساتھ موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور دونوں واپسی کے لیے کالونی سے نکل گئے۔

تنویر کو فاصلے سے ہی وہ زیرِ تعمیر شاپنگ سینٹر دکھائی دیا تو وہ کاریں اسی طرح کھڑی تھیں۔ ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ تنویر نے موٹر سائیکل کی رفتار دھیمی کر لی۔ وہ دائیں بائیں متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''کیا ہوا تم نے موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ کر دی ہے؟'' عروسہ نے پوچھا۔

''وہ کار دیکھ رہی ہو۔ وہ چمچماتی کار۔ بہت قیمتی ہے۔'' دور سے ہی تنویر نے اس کار کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں ہے، اب کیا کریں۔ اس کار کے پاس بھی رک کر حسرت بھری آہیں بھریں۔'' عروسہ بولی۔

''ایک شرارت سوجھی ہے۔'' تنویر نے موٹر سائیکل اس زیرِ تعمیر شاپنگ سینٹر کی ایسی جگہ پر کھڑی کر دی جہاں اندھیرا تھا۔ موٹر سائیکل اس نے پہلے ہی بند کر دی تھی۔

''کیسی شرارت سوجھی ہے۔'' عروسہ کو حیرت ہو رہی تھی۔

''میں وہ کار کبھی نہیں خرید سکتا۔ لیکن اسے چھو تو سکتا ہوں ناں۔'' تنویر کے ہونٹوں پر شرارت تھی۔

''چلو یہاں سے چلیں۔ مجھے خوف آ رہا ہے۔ تمہیں کار چھو کر کیا انعام لینا ہے۔'' عروسہ نے دائیں بائیں دیکھا۔

''بس ایک منٹ میں اس کار کو چھو کر آیا۔'' تنویر نے موٹر سائیکل کی چابی ہاتھ میں پکڑی ایک بار پھر دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کی اور کار کی طرف بڑھنے لگا تو عروسہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''جانے دو، چلیں گھر۔''

”بس ایک منٹ...... ابھی چھو کر آیا۔ ویسے بھی جب مجھے شرارت سوجھتی ہے تو پھر تب تک میرے ہاتھ میں کھجلی ہوتی رہتی ہے جب تک وہ شرارت نہ کرلوں۔“

تنویر تیزی سے اس کار کی طرف بڑھا، اس نے کار کے پاس جا کر دائیں بائیں دیکھا۔ زیر تعمیر شاپنگ سینٹر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی آواز اور آہٹ نہیں تھی۔ تنویر نے اپنی موٹر سائیکل کی چابی سے کار کے دائیں جانب ایک لمبی لکیر کھینچی اور بھاگتا ہوا موٹر سائیکل کی طرف آگیا۔ وہ منہ دبائے ہنس رہا تھا۔ اس نے جلدی سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی، عروسہ کو بٹھایا اور موٹر سائیکل کو گیئر میں ڈال دیا۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“ عروسہ کو اچھا نہیں لگا۔

”بس ذرا سا چھوا ہے، معمولی سی چھیڑ چھاڑ اور شرارت کی ہے۔“ تنویر نے موٹر سائیکل کی رفتار تیز کردی اور زور سے ہنسا۔ اس خاموشی اور سکوت میں اس کا قہقہہ دور تک سنائی دیا۔ عروسہ کو اس کی یہ حرکت بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ سامنے طویل اور سیدھی سڑک تھی۔ کچھ دور تک تنویر نے اپنی موٹر سائیکل کی رفتار تیز رکھی اور پھر ایک نظر پیچھے دیکھ کر موٹر سائیکل کی رفتار آہستہ کردی۔ پیچھے کوئی نہیں آرہا تھا۔

”مزہ آگیا...... اب دل میں یہ حسرت نہیں رہے گی کہ میں نے زندگی میں کبھی کار کو نہیں چھوا......“ وہ کہہ کر پھر ہنسا۔

”تم نے اچھا نہیں کیا تنویر۔“

”بس انجوائے کرو۔ باقی سب بھول جاؤ۔“ تنویر کو کوئی فکر نہیں تھی۔ عروسہ چپ ہوگئی۔ ان کی موٹر سائیکل نے وہ پیٹرول پمپ عبور کیا اور وہ بارونق سڑک میں داخل ہوگئے۔ وہاں سے ہوتے ہوئے وہ عروسہ کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے عروسہ کو اس کے گھر اتارا تو عروسہ کے ابا نے دروازہ کھولا۔

”خالو جی صرف بیس منٹ لیٹ ہوا ہوں۔“

”اس کا جرمانہ کروں گا تجھے۔“ خالو نے مسکرا کر کہا اور تنویر ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ سیدھا اپنے گھر گیا اور موٹر سائیکل کھڑی کر کے اپنے کمرے میں جاتے ہی بستر پر گر گیا۔

☆☆☆

تنویر کو اندازہ نہیں تھا کہ آج اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وہ اپنے آفس گیا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ دوپہر تک اس کی مصروفیت آفس کے اندر رہی اور دوپہر کے بعد وہ مارکیٹ جانے کے لیے پارکنگ کی طرف گیا تاکہ اپنی موٹر سائیکل نکال سکے۔ لیکن وہاں جاتے ہی وہ مبہوت اس جگہ کی طرف دیکھتا رہ گیا جہاں اس نے موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ اس کی موٹر سائیکل اس جگہ موجود نہیں تھی۔ تنویر روزانہ تقریباً اسی جگہ اپنی موٹر سائیکل کھڑی کرتا تھا پھر بھی اس نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا کہ شاید صبح اس سے جگہ تبدیل ہوگئی ہو لیکن اس کی موٹر سائیکل پورے موٹر سائیکل اسٹینڈ پر موجود نہیں تھی۔ وہ پریشان ہوگیا۔ وہ بھاگتا ہوا چوکیدار کی طرف گیا۔

”وہاں میری موٹر سائیکل کھڑی تھی؟“

”معلوم نہیں صاحب......“ چوکیدار کی کیونکہ پارکنگ میں کھڑی کسی گاڑی اور موٹر سائیکل کی کوئی ذمے داری نہیں تھی اس لیے اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”میری موٹر سائیکل کہاں چلی گئی؟“ تنویر سوچتا ہوا ایک بار پھر اس جگہ چلا گیا جہاں اس نے موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔ ایک گھنٹے تک وہ ایک ایک موٹر سائیکل کو دیکھتا رہا اور پھر اسے یقین ہوگیا کہ اس کی موٹر سائیکل چوری ہوگئی ہے۔

وہ بھاگتا ہوا اوپر آفس میں گیا اور سیدھا عنایت احمد کے کمرے میں چلا گیا۔ ”تم اتنی جلدی مارکیٹ سے آگئے؟“ اسے دیکھتے ہی عنایت احمد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”سر میری موٹر سائیکل چوری ہوگئی ہے۔“ تنویر نے بغیر وقت ضائع کیے گھبرائی آواز میں بتایا۔

عنایت احمد نے اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ کیسے؟“

”پتا نہیں سر۔ جہاں میں نے موٹر سائیکل کھڑی کی تھی وہاں نہیں ہے۔“ تنویر بدستور گھبرایا ہوا تھا۔

”ایسا بھی ہوا تو نہیں...... تم نے اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے؟“ اس بات پر عنایت احمد کو بھی تشویش ہوئی۔

”سر میں نے اچھی طرح سے دیکھ لیا ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیں، ہم جلدی سے اس کی رپورٹ لکھوا دیں۔ شاید پولیس موٹر سائیکل چور کو پکڑ لے۔“ تنویر بولا۔

”میں تھانیدار کو فون کردیتا ہوں لیکن پولیس اگر اتنی جلدی چور پکڑ لے تو جرائم میں کمی نہ آجائے۔“ عنایت احمد نے کہہ کر فون اٹھایا اور متعلقہ تھانیدار کو فون کردیا۔

تنویر نے جاکر موٹر سائیکل کی رپورٹ درج کرادی

لیکن اب وہ پیدل ہوگیا تھا۔ فوری طور پر نئی موٹر سائیکل خریدنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ اس کے ذمے جو مارکیٹ کا کام تھا وہ بھی نہیں ہوا تھا۔ اور وہ گھر بھی دو بسیں بدل کر گیا تھا۔

اس کی موٹر سائیکل کی چوری کا جب گھر والوں کو پتا چلا تو وہ بھی پریشان ہوگئے۔

اب تنویر کے لیے دو مشکلیں کھڑی ہوگئی تھیں۔ ایک تو اسے آفس جانے اور آنے کے لیے بسوں میں دھکے کھانے پڑتے تھے اور جو مارکیٹنگ اس کے ذمے ہوتی تھی، وہ کام بھی رک گیا تھا۔

تین دن کے بعد عنایت احمد نے تنویر کو اپنے کمرے میں بلا کر کہا۔ ''جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ اب تم نئی موٹر سائیکل خرید لو۔ دیکھو تمہارا کام رکا ہوا ہے۔''

''سر! ہمیں اپنے گھر میں اوپر کمرے بنانے کی ضرورت تھی، ابھی ہم نے وہ کمرے تعمیر کرائے ہیں اور سرِدست ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں فوری موٹر سائیکل خرید لوں۔'' تنویر نے بتایا۔

''پھر کام کیسے چلے گا؟'' عنایت احمد نے پوچھا۔ ''موٹر سائیکل کے بغیر تو تمہارا کام رک جائے گا۔''

''سر میں کوشش کر رہا ہوں۔'' تنویر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ نئی موٹر سائیکل کیسے خریدے گا۔

''اگر یہ کوشش طویل ہوگئی تو پھر مشکل کھڑی ہوجائے گی۔'' عنایت احمد کے لہجے میں متانت تھی۔

''میں جلدی کچھ کرتا ہوں۔'' تنویر بولا اور کمرے سے چلا گیا۔

تنویر شام تک یہی سوچتا رہا کہ وہ نئی موٹر سائیکل کا انتظام کہاں سے کرے۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا تھا کہ اسے عنایت احمد نے اپنے کمرے میں بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ایک فائل اس کی طرف بڑھا دی اور اسے پڑھنے کے لیے کہا۔ اس فائل کے اندر ایک کاغذ تھا۔ اس پر جو تحریر لکھی تھی، اسے پڑھ کر تنویر کے پیروں تلے سے زمین سے نکل گئی۔ اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''یہ کیا سر...... مجھے نوکری سے فارغ کر دیا...... سر کیوں؟''

''اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہارے پاس موٹر سائیکل نہیں رہی بلکہ یہ مالکان کا فیصلہ ہے اور انہوں نے نوکری سے فارغ کرنے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔'' عنایت احمد نے متانت سے کہا۔

''سر...... کوئی نوٹس نہیں اور اچانک مجھے نوکری سے فارغ کر دیا۔ یہ قانون کے خلاف ہے......'' تنویر نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

''یہاں روز قانون کے خلاف بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوگیا۔'' عنایت احمد نے کہا۔

''سر یہ میرے ساتھ زیادتی ہے۔ میں اس کمپنی کا اچھا ورکر ہوں۔ میرا کام سب سے اچھا ہے۔'' تنویر بولا۔

''یہ مالکان کا فیصلہ ہے۔ میں بے بس ہوں۔ کاش میں تمہارے لیے کچھ کرسکتا۔'' عنایت احمد کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''سر میں احتجاج کروں گا۔''

''تو کیا ہوگا؟ کچھ نہیں ہوگا۔ اس احتجاج میں جو واجبات ابھی تمہیں مل جائیں گے، وہ رک جائیں گے۔ تمہارے لیے لڑنا مشکل ہوگا۔ بہتر ہے کہ تم مالکان کے فیصلے کو مان لو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے لیے کہیں اور نوکری تلاش کروں۔'' عنایت احمد نے سمجھایا اور تنویر خون کے آنسو پی کر رہ گیا۔

اسی وقت اس کے واجبات کا چیک تیار کردیا گیا اور تنویر اس چیک کو اپنی جیب میں ڈال کر غصے میں سوچتا ہوا آفس سے باہر نکل کر بوجھل قدموں کے ساتھ بس اسٹاپ کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

تنویر گھر پہنچا تو وہ بہت اداس اور مرجھایا ہوا تھا۔ باپ نے وجہ پوچھی تو تنویر نے بتایا کہ اسے نوکری سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر گھر والوں کے لیے بھی پریشانی کا باعث بن گئی تھی۔ وہ سب نوکری کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی تنخواہ کی اینٹیں جوڑ کر وہ گھر کی گاڑی کھینچ رہے تھے۔ اب ایک اینٹ کھسکی تو پریشانی تو لازمی امر تھا۔

تنویر اپنے کمرے میں گیا تو اسے عروسہ کے فون کی بیل نے چونکا دیا۔ اس کا دل اس قدر اداس تھا کہ اس وقت اس کا عروسہ کے ساتھ بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، پھر بھی اس نے فون کان سے لگالیا۔

''تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تمہاری موٹر سائیکل چوری ہوگئی ہے؟'' دوسری طرف سے عروسہ نے فوراً شکوہ کیا۔

''ہاں وہ پریشانی ہی اتنی تھی۔ بس بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔'' تنویر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

''میں نے آج ہی خالہ کو فون کیا تو مجھے پتا چلا۔

بہر حال مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس دکھ میں تو مجھے خوشخبری سناتے ہوئے بھی بڑا عجیب لگ رہا ہے۔'' دوسری طرف سے عروسہ بولی۔

''کیسی خوشخبری......؟ مجھے بتاؤ۔'' تنویر نے کہا۔

''چند دن پہلے ابو کو رئیس گروپ نے نوکری کی پیشکش کی تھی۔ ابو نے وہ پیشکش قبول کرلی ہے۔ ابو اب پہلے سے بھی کہیں اچھی نوکری پر فائز ہوگئے ہیں اور کمپنی والے کہہ رہے تھے کہ وہ ان کو کار بھی دیں گے۔'' عروسہ کا لہجہ کھل گیا۔ ''ہم سب گھر والے بہت خوش ہیں۔''

''اچھا یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ رئیس گروپ بہت بڑا گروپ ہے۔ ملک بھر میں ان کے کئی یونٹ ہیں۔'' تنویر نے کہا۔

''ہاں...... ہم سب بہت خوش ہیں۔ ہمارے پاس بھی گاڑی آجائے گی۔'' عروسہ چہکی۔ ''ابو کی خوشی تو ناقابلِ بیان ہے۔''

''میری طرف سے سب کو مبارک دینا۔ عروسہ......'' تنویر کہتے کہتے رک گیا۔

''ہاں کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عروسہ نے جاننا چاہا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' تنویر نے ارادہ بدل لیا۔

''کہو نا کیا کہنا چاہتے ہو؟'' عروسہ نے استفسار کیا۔

تنویر نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر بولا۔ ''عروسہ مجھے اچانک نوکری سے فارغ کردیا ہے۔''

''کیا......؟ اچانک......؟'' عروسہ چونکی۔

''ہاں اچانک...... بغیر کسی وجہ کے۔ مالکان نے فیصلہ کیا اور میرے تمام واجبات مجھے دے کر فارغ کردیا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ پہلے ہی یہ نوکری خالو کی سفارش سے ملی تھی۔'' تنویر کا لہجہ مدھم اور غمزدہ تھا۔

''یہ تو تم نے دوسری دکھ بھری بات سنادی ہے۔ اب کیا کرو گے؟'' عروسہ نے کہا۔

''عروسہ...... اب خالو ایک بہت بڑے گروپ میں چلے گئے ہیں۔ تم اُن سے میرے بارے میں بات کرنا۔ شاید اس گروپ میں میری جگہ بھی بن جائے۔'' تنویر نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''میں بات کروں گی۔ تم فکر نہیں کرو لیکن تم نوکری کی تلاش جاری رکھنا۔ شاید تمہیں اچھی نوکری مل جائے۔'' عروسہ نے ساتھ تسلی بھی دی۔

''وہ تو میں جاری رکھوں گا ہی لیکن تم میری بات ضرور کرنا۔'' تنویر نے کہا اور کچھ باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔

تنویر اس رات بالکل بھی نہیں سو سکا تھا۔ پہلے موٹر سائیکل چوری ہوگئی، پھر نوکری سے فارغ کردیا...... دونوں صدمے اس کے لیے سوہانِ روح بن گئے تھے۔

صبح ناشتے کے بعد اس نے اپنا سی وی لیا اور نوکری کی تلاش میں چلا گیا۔ پہلے تو وہ عنایت احمد سے ملنے ان کے پاس گیا۔ تنویر کو گیٹ پر ہی روک لیا اور اسے عنایت احمد سے ملنے کی اجازت ہی نہیں مل سکی۔ اس نے عنایت احمد کو فون کیا تو مسلسل بیل ہونے کے باوجود عنایت احمد نے فون سننا گوارا نہیں کیا۔ تنویر مایوس ہوکر وہاں سے چلا گیا۔

دوپہر تک وہ اپنے تئیں مختلف کمپنیوں کے آفس کے چکر کاٹتا رہا لیکن کہیں بھی اسے کامیابی نہیں ملی۔ البتہ، دو، تین کمپنیوں نے اس سے سی وی لے کر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ شام کے سائے پھیلنے لگے اور وہ کئی دفاتر کے چکر کاٹ کر واپس گھر جانے کے لیے سوچنے لگا۔

وہ مریل سے انداز میں بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگا۔ بس اسٹاپ پر کچھ رش تھا۔ وہ بھی ان میں کھڑا ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بس آئی اور سواریاں اس میں سوار ہونے لگیں۔ دھکم پیل سی بھی شروع ہوگئی تھی۔ تنویر کوشش ہی کرتا رہ گیا اور بس چل پڑی۔ بس ویسے ہی بھری ہوئی تھی اس لیے جو مسافر بس میں سوار نہیں ہوسکے تھے، وہ پیچھے ہٹ گئے لیکن تنویر بس پر چڑھنے کے لیے بھاگا۔ بس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ تنویر کو یقین تھا کہ وہ بھاگ کر بس میں سوار ہوجائے گا۔ وہ بھاگتا رہا اور بس کی رفتار کچھ بڑھ گئی۔ اچانک بس کے اندر سے ایک ہاتھ باہر نکلا۔ بھاگتے ہوئے تنویر نے اپنا ہاتھ اس ہاتھ میں دے دیا اور اپنا ایک پیر بس کے اندر رکھ دیا۔ بس کی رفتار کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اب تنویر بس کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا لیکن وہ ہاتھ اس طرح سے سیدھا تھا کہ جیسے اس نے صرف تنویر کا ہاتھ پکڑا تھا لیکن وہ چاہتا نہیں تھا کہ تنویر بس کے اندر سوار ہو۔ تنویر نے اندر جانے کے لیے زور لگایا لیکن اس ہاتھ میں کوئی لچک نہیں تھی۔ تنویر حیران تھا کہ یہ کون ہے جس نے پہلے بس میں سوار کرانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اب وہ اسے بس میں سوار ہونے نہیں دے رہا ہے۔ اچانک اس ہاتھ نے تنویر کو باہر کی طرف دھکیل دیا اور ساتھ ہی تنویر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

تنویر کے لیے کوئی سہارا نہیں تھا اور وہ پیچھے سڑک پر گرتے ہی اس نے کئی قلابازیاں کھائیں اور اگر ایک کار

عین وقت پر بریک نہ لگالیتی تو تنویر اس کار کے نیچے آ کر کچلا جاتا۔

تنویر کے جسم پر کافی خراشیں آئی تھیں جن سے خون رسنے لگا تھا اور اس کے کپڑے خون آلود ہو گئے تھے۔ سڑک پر قلابازیاں کھانے سے اس کے کپڑے بھی پھٹ گئے تھے۔

وہی کار جو اس کے عین پاس آ کر رکی تھی، اس کے اندر سے ایک آدمی باہر نکلا اور اس نے زخمی تنویر کو اُٹھا کر اپنی کار میں ڈالا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

☆☆☆

مرہم پٹی کے بعد تنویر گھر آ گیا تھا۔ سب گھر والے اس کے اردگرد جمع تھے۔ اپنے گرنے کی داستان وہ سنا چکا تھا۔ سب گھر والوں کے ساتھ ساتھ وہ بھی پریشان تھا کہ وہ کون تھا جس نے اس کے ساتھ ایسا کیا تھا۔

تنویر کے باپ نے پوچھا۔ ''بیٹا تمہاری آفس میں کسی کے ساتھ کوئی لڑائی وغیرہ تو نہیں ہوئی تھی؟''

''نہیں کسی کے ساتھ بھی میرا ابھی آفس میں جھگڑا نہیں ہوا تھا۔'' تنویر نے جواب دیا۔

''پھر وہ کون تھا جس نے پہلے تو تمہیں سوار کرانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر تمہیں دھکا دے دیا؟'' تنویر کے باپ کو تشویش تھی۔

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ میرا تو کوئی دشمن بھی نہیں ہے۔ پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟'' تنویر کو خود حیرت تھی۔

''آج کے لڑکے بہت تیز ہیں۔ کسی نے شرارت کر دی ہوگی۔'' تنویر کی ماں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔'' تنویر کے باپ نے اس خیال سے اس کی ماں کی بات کی تائید کر دی کہ تنویر ان سوچوں سے باہر نکل آئے۔

تنویر سوچ میں پڑ گیا۔ اسی اثنا میں عروسہ اپنے والدین کے ساتھ آ گئی۔ انہیں تنویر کی ماں نے خبر کی تھی۔ عروسہ زخمی تنویر کو دیکھے جا رہی تھی۔ تنویر کو کوئی گہری چوٹ نہیں آئی تھی لیکن جسم پر آنے والی خراشیں بھی بہت تکلیف دہ تھیں۔ اس کے لیے کروٹ لینا اور چلنا محال تھا۔

''عروسہ بتا رہی تھی کہ تم کو نوکری سے بھی فارغ کر دیا ہے؟'' حال چال پوچھنے کے بعد عروسہ کے باپ نے موضوع بدلا۔

''جی ہاں۔'' تنویر نے آہستہ سے جواب دیا۔

''عروسہ نے مجھ سے بات کی تھی۔ مجھے نئی کمپنی میں گئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے اس لیے میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ تمہارے لیے کوئی جگہ بنا سکوں۔ پھر بھی تم مجھے اپنا سی وی دے دو۔ جیسے ہی مجھے موقع ملتا ہے میں ضرور کوشش کروں گا۔'' عروسہ کے ابو نے کہا۔

''جی شکریہ۔'' تنویر ہولے سے مسکرایا اور اس نے عروسہ کی طرف دیکھا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا شکریہ ادا کر رہا ہو۔

''مجھے بہت اچھی کمپنی مل گئی ہے۔ انہوں نے کار بھی دے دی ہے اور ہم اسی کار میں یہاں آئے ہیں۔'' عروسہ کا باپ خوش ہو کر بتانے لگا۔ ''اب وہ کہہ رہے تھے کہ مجھے بڑا گھر دیں گے۔ میں تو بہت خوش ہوں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے دن اس طرح تبدیل ہو جائیں گے۔''

''بہت بہت مبارک ہو۔'' تنویر کے باپ نے فوراً مبارک دی۔

''ہماری تو زندگی ہی بدل گئی ہے۔ بڑے لوگوں سے ملنا، ان کی پارٹیز میں جانا۔ بہت زبردست ہو گیا ہے۔'' عروسہ کا باپ زیرِلب مسکرا بھی رہا تھا۔

''کیسی عجیب بات ہے۔ ہمارے دن بہتری کی طرف بدل رہے ہیں اور تنویر بے چارہ مسائل میں گھرتا جا رہا ہے۔'' عروسہ کی ماں نے تاسف کیا۔

''تنویر کے اچھے دن پھر لوٹ آئیں گے۔'' تنویر کے باپ نے تنویر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' عروسہ کا باپ کھڑا ہو گیا۔ عروسہ کچھ دیر رکنا چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے تنویر کے ساتھ الگ بات کرنے کا موقع مل جائے لیکن اس کا باپ زیادہ دیر رکا نہیں اور وہ اجازت لے کر چلے گئے۔ تنویر نے یہ بات محسوس کی تھی کہ عروسہ کے باپ کے لہجے میں تغیر آ گیا تھا۔

☆☆☆

چند دن تک تنویر گھر میں ہی رہا۔ جب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو اس نے ایک بار پھر نوکری کی تلاش کے لیے باہر جانے کا سوچا۔

تنویر ابھی تیار ہو ہی رہا تھا کہ عروسہ کا فون آ گیا۔ پہلے اس نے تنویر کا حال چال پوچھا اور پھر خوش ہو کر بتایا۔

''ابو کو کمپنی نے نیا گھر دے دیا ہے۔ ہم کل تک اس بڑے گھر میں منتقل ہو جائیں گے۔ ہم رات ہی وہ گھر دیکھ

کرآئے ہیں۔ وہ شہر کی بڑی کالونی میں ہے... پورے ایک کنال کا گھر ہے۔ اس گھر کے اندر ایک لان بھی ہے اور اس کا بڑا سا گیراج ہے۔ بڑے بڑے کمرے ہیں۔ تنویر میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ گھر میرے خوابوں جیسا ہے۔'' عروسہ کی خوشی آسمان کو چھو رہی تھی۔

''بہت مبارک ہو عروسہ۔'' تنویر نے کہا۔

''خیر مبارک...... جب ہم گھر شفٹ ہو جائیں گے تو میں تمہیں بتاؤں گی تم ضرور آنا۔'' عروسہ نے کہا۔

''ہاں میں ضرور آؤں گا۔ عروسہ، خالو نے میری نوکری کی بات کی......؟'' تنویر نے پوچھا۔

''میں آج پوچھوں گی۔'' عروسہ بولی۔

''مجھے پوچھ کر بتانا۔'' تنویر نے کہہ کر خود ہی فون بند کر دیا۔ پتا نہیں کیوں اسے غصہ سا آ گیا تھا۔ ایک دم سے اسے احساسِ کمتری نے گھیر لیا تھا۔ اس کے خالو کا گھرانا ان کے برابر ہی تھا اب یکدم سے ان کے حالات بدل گئے تھے۔ وہ روز بروز ترقی کرنے لگے تھے۔

کچھ دیر نڈھال سا بیٹھنے کے بعد تنویر جانے کے لیے اٹھا تو اس کا فون پھر بج اٹھا۔ کوئی غیر مانوس نمبر تھا۔ اس نے بے دلی سے فون اٹھایا، دوسری طرف سے ایک مہذب آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''السلام علیکم...... کیا آپ تنویر عباس بول رہے ہیں؟''

''جی میں بول رہا ہوں۔'' تنویر نے بھی فوراً اچھے لہجے میں جواب دیا۔

''آپ ہمیں جاب کے لیے اپنا سی وی دے کر گئے تھے۔ ہمیں کچھ نئے لوگوں کی ضرورت ہے۔ آج دن پانچ بجے ہم انٹرویو کر رہے ہیں پلیز آپ ایڈریس نوٹ کر لیں اور انٹرویو کے لیے ٹھیک پانچ بجے اس جگہ پہنچ جائیں۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

تنویر تین، چار جگہ اپنا سی وی دے کر آیا تھا۔ اس لیے اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان میں سے کس کمپنی نے اسے کال کی ہے۔ وہ تو انٹرویو دینے کا سن کر ہی خوش ہو گیا تھا۔ اس کے مریل جسم میں توانائی آ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے کاغذ پنسل پکڑ کر وہ پتا لکھا جو دوسری طرف سے لکھوایا گیا تھا اور فون بند ہو گیا۔

تنویر پُرجوش انداز میں لکھا پتا پڑھنے لگا۔ وہ اس کے گھر سے تقریباً پندرہ، سولہ کلو میٹر پوش علاقے کے ایک شاپنگ سینٹر کی تیسری منزل پر واقع آفس کا پتا تھا۔

تنویر نے اپنا سی وی فائل میں رکھا اور نئے سرے سے کپڑے استری کرنے لگا۔ اس نے جوتے بھی چمکائے اور بار بار گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔ ابھی پانچ بجنے میں بہت وقت باقی تھا۔

☆☆☆

تنویر جب چار بجے گھر سے باہر نکلا تو آسمان پر بادلوں نے ڈیرے جمانا شروع کر دیے تھے۔ وہ بس میں جانے کے بجائے ٹیکسی کی طرف چلا گیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔

ٹیکسی نے اسے پون گھنٹے میں وہاں پہنچا دیا۔ وہ شاپنگ سینٹر سامنے تھا۔ اس شاپنگ سینٹر کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں جبکہ پہلی اور دوسری منزل پر کمپنیز کے دفاتر کے بورڈ دکھائی دے رہے تھے۔ تنویر کو تیسری منزل پر جانا تھا۔

بادلوں نے آسمان کو پوری طرح سے گھیر لیا تھا۔ ہوا میں بھی کچھ تیزی آ گئی تھی اور بارش کی آمد آمد تھی۔

تنویر لفٹ کے ذریعے سے تیسری منزل پر پہنچا تو سامنے طویل راہداری تھی۔ اس کے دائیں بائیں مختلف کمروں کے بند دروازے تھے۔ کمرا نمبر چوبیس کے سامنے کھڑا ہو کر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ تھوڑی دیر کے بعد محافظ کے یونیفارم میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والے ایک آدمی نے دروازہ کھول کر تنویر کی طرف دیکھا۔

''میں انٹرویو کے لیے آیا ہوں۔''

''آ جائیے۔'' اس نے دروازہ چھوڑ دیا۔

تنویر اندر گیا تو وہ ایک چھوٹا کمرا تھا۔ ایک طرف استقبالیہ کی میز لگی ہوئی تھی، لیکن وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ صوفہ تھا۔

''اندر ضروری میٹنگ ہو رہی ہے آپ تشریف رکھیں۔'' چوکیدار نے کہا اور تنویر یہ سوچتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا کہ اسے اکیلے کو ہی انٹرویو کے لیے بلایا ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہو سکتا ہے کہ پھر اسے نوکری مل جائے۔

تنویر آدھا گھنٹے تک بیٹھا رہا۔ اس کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھلی تھی اور باہر سے ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ بادل بھی گرج رہے تھے۔ تنویر نے دیکھا کہ باہر موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی اچانک چوکیدار اندر آیا اور اس نے کھڑکی بند کر دی اور پھر باہر چلا گیا۔

بیس منٹ کے بعد ایک لڑکی کمرے سے باہر نکلی اور اپنی میز پر جا کر اس نے رجسٹر کی طرف دیکھا اور تنویر سے

مخاطب ہوئی۔
''آپ تنویر عباس ہیں؟''
''جی۔''تنویر فوراً متوجہ ہوا۔
''آپ اندر چلے جائیں۔'' اس لڑکی نے دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ تنویر دھڑکتے دل کے ساتھ اُٹھا اور اس کمرے کی طرف بڑھا۔
تنویر دروازہ کھول کر کمرے میں گیا تو سامنے میز کے پیچھے کوئی کرسی گھما کر دوسری طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔
تنویر میز کے پاس کھڑا ہوگیا اور اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے اس نے اپنا گلا صاف کیا لیکن اس کرسی کا رخ اسی طرف رہا۔ تنویر نے کچھ توقف کے بعد پھر گلا صاف کیا۔ اس بار بھی وہ کرسی نہیں گھومی۔
''سر آئی ایم تنویر عباس......'' تنویر بولا۔ کرسی کا رخ دوسری طرف ہی رہا۔ تنویر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ وہ تذبذب کے عالم میں دائیں بائیں دیکھنے لگا اور پھر ہولے سے بولا۔
''سر......''
کرسی پر براجمان دوسری طرف منہ کیے شخص کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ تنویر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ اچانک کرسی پر براجمان شخص کا ہاتھ نیچے لڑھک گیا۔ تنویر نے فوراً اس جانب دیکھا تو اسے کرسی کے پاس فرش پر سرخ خون دکھائی دیا۔ تنویر کی آنکھوں میں خوف دوڑنے لگا۔ وہ باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا پھر یکدم رکا اور کرسی پر بیٹھے شخص کی طرف چلا گیا۔ اس نے دوسری طرف دیکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کرسی پر براجمان شخص کے سینے میں دستے تک خنجر پیوست تھا اور خون اس کے کپڑوں پر پھیلا ہوا تھا۔
تنویر تیزی سے باہر نکلا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ تنویر باہر بھاگنے کے لیے اس دروازے کی طرف دوڑا جس سے وہ اندر آیا تھا۔ جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا سامنے چوکیدار کھڑا تھا۔
''اندر......خون......'' تنویر نے گھبرائی ہوئی آواز میں بمشکل کہا۔
''کیا......؟'' چوکیدار نے حیرت زدہ منہ بنایا۔
اچانک پیچھے سے اسی لڑکی کی آواز آئی جو استقبالیہ کی میز پر بیٹھی تھی، اس نے چلا کر چوکیدار کو حکم دیا۔
''اسے پکڑو، یہ باس کا خون کر کے بھاگ رہا ہے۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' تنویر خوف سے چلاّیا۔
چوکیدار نے اسے اپنے دونوں بازوؤں میں بھر لیا۔
تنویر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ چوکیدار کی گرفت مضبوط تھی۔ اس کے باوجود تنویر مزاحمت کرتے ہوئے اپنے جسم کو جھٹکے دے رہا تھا اور اس کوشش میں وہ اس سے اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا اور سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ تنویر نے کیونکہ ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چوکیدار سے چھڑایا تھا اس لیے چوکیدار ایک طرف گر گیا تھا اور وہ فوری اس کے پیچھے نہیں بھاگ سکا تھا۔

تنویر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ وہ سرعت سے نیچے پہنچا اور گراؤنڈ فلور پر جاتے ہی اس نے بھاگنے کے بجائے تیز تیز قدم اُٹھانے شروع کر دیے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے بھاگتا ہوا دیکھے۔

وہ باہر نکلا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس نے بارش کی پروا نہیں کی اور ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف دوڑا۔ تیز بارش میں وہ پانی میں شرابور ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل بھی بھیگ گئی تھی۔ اس نے اپنا سی وی باہر نکالا اور اسے پھاڑ کر نالی کی طرف بہتے پانی میں پھینک دیا۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کی طرف بھاگا۔ وہ پیچھے بھی دیکھ رہا تھا اچانک اس نے دیکھا کہ وہی چوکیدار اس کے پیچھے بھاگا آ رہا ہے۔

تنویر نے اچانک ٹیکسی کی طرف جانے کے بجائے اپنا رخ تبدیل کیا اور دوسری طرف بھاگ نکلا۔ تیز بارش اور سڑک پر بہتے پانی میں تنویر پوری قوت سے بھاگ رہا تھا۔ سڑک پر جا بجا پانی کھڑا تھا اور جب بھاگتے ہوئے تنویر کا پیر پانی پر پڑتا تھا تو پانی اچھل کر اوپر تک آ جاتا تھا۔ وہ بار بار پیچھے بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ چوکیدار کہیں غائب ہو گیا ہے۔ لیکن اچانک ایک موٹر سائیکل دائیں طرف سے نکلی۔ موٹر سائیکل سوار نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ موٹر سائیکل اس کے پیچھے تھی۔

تنویر سمجھ گیا کہ یہ بھی ان کا ہی آدمی ہے۔ وہ اور تیز بھاگنے لگا۔ اچانک ایک کار اس کے سامنے آ کے تھوڑی سی ترچھی ہو کر رک گئی۔ شیشہ نیچے ہوا اور اندر سے ایک نوجوان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''یہ خطرناک لوگ ہیں۔ کار میں بیٹھ جاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے۔''

تنویر کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ موٹر سائیکل سوار ان کے قریب آ رہا تھا، اسے اپنی جان بچانے کی فکر تھی، سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے کار کا دروازہ کھولا اور وہ اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نوجوان کار بجلی کی سی تیزی سے وہاں سے لے گیا۔

☆☆☆

موسلا دھار بارش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ برستے پانی میں وہ کار تیزی سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ تنویر بار بار گردن گھما کر عقب میں دیکھ رہا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔ دل کی دھڑکنیں منتشر تھیں۔ اس کے کپڑوں سے پانی کے قطرے نیچے بہہ رہے تھے اور اس کے پیروں کے پاس جگہ گیلی ہو رہی تھی۔

تنویر کو بس یہ فکر تھی کہ وہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جائے۔ اس پر ڈر اور خوف ایسا چھایا ہوا تھا کہ اس نے ایک بار بھی اس نوجوان کی طرف نہیں دیکھا جو اس کے برابر میں بیٹھا کار چلا رہا تھا۔ کار کس جانب جا رہی تھی، اس کا بھی اسے اندازہ نہیں تھا۔

اچانک تنویر اس وقت چونکا جب اس نے دیکھا کہ ان کی کار شہر سے باہر تنہا کھڑے مکان کے گیٹ کے سامنے رک گئی تھی۔ نوجوان نے کار کا ہارن دیا تو گیٹ کھلا اور نوجوان کار کو اندر لے جانے لگا تو تنویر نے سوالیہ نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا کہ یہ کونسی جگہ ہے۔ وہ کوئی ویران جگہ تھی۔ اور اس مکان کے آس پاس کوئی اور مکان دکھائی نہیں دے رہا تھا البتہ اس مکان کے اردگرد بہت سے درخت اسے گھیرے ہوئے تھے۔

کار اندر چلی گئی اور گیٹ بند ہو گیا۔ وہ نوجوان کار سے باہر نکلنے سے قبل تنویر سے بولا۔

''تم ملازم کے ساتھ اندر چلو میں آتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کار سے باہر نکل کر ایک طرف چلا گیا اور تنویر مبہوت بیٹھا دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ نوجوان کون ہے اور کہیں وہ ایک مصیبت سے نکل کر دوسری آفت میں تو نہیں پھنس گیا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ یہ انہی کا آدمی ہو؟

تنویر سہمے ہوئے انداز میں کار سے باہر نکلا تو وہ ملازم جس نے گیٹ کھولا تھا، وہ کھڑا تھا۔ وہ تنویر کو لے کر مین دروازے کی طرف چلا گیا۔ اندر ایک مختصر سی راہداری تھی۔ اسے عبور کر کے وہ لاؤنج میں پہنچے اور پھر وہ اسے سامنے کمرے میں لے گیا۔

وہ کمرا کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ کمرے میں ایک بڑا بیڈ اور دوسری طرف دو کرسیاں، چھوٹی میز کے ساتھ

رکھی تھیں۔ تنویر کمرے کا جائزہ لے رہا تھا کہ ملازم نے سامنے الماری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''صاحب کہہ رہے تھے کہ اس الماری سے کپڑے نکال کر بدل لیں۔'' ملازم چلا گیا۔

تنویر کو پھر وہ منظر یاد آگیا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس شخص کی لاش آگئی جو کرسی پر پڑی تھی اور خنجر دستے تک اس کے سینے میں پیوست تھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا اور ایک بار پھر وہ خوف میں مبتلا ہو گیا۔ کچھ دیر اسی حالت میں رہنے کے بعد اس نے الماری کا پٹ کھولا تو سامنے بہت سے کپڑے لٹک رہے تھے۔ تنویر نے ایک پینٹ اور شرٹ لی اور اپنے کپڑے بدلنے لگا۔

ابھی وہ کپڑے بدل کر فارغ ہوا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا، اس نے چونک کر اس جانب دیکھا وہاں وہی نوجوان کھڑا تھا جو اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں تک لایا تھا۔ تنویر نے پہلی بار اس کو غور سے دیکھا۔

اس کے پیروں میں لیدر کے جوتے تھے۔ اس نے نیلے رنگ کی جینز زیب تن کی تھی، جس کا رنگ اُڑ چکا تھا، اوپر سرخ رنگ کی شرٹ تھی۔ گریبان کے اوپر والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور نیچے سے پہنی ہوئی سفید بنیان دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی بائیں کلائی پر بڑے ڈائل والی گھڑی تھی اور دائیں کلائی پر اس نے رنگ برنگے دھاگے باندھے ہوئے تھے۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور سر کے بال لمبے تھے جن پر پیچھے کی طرف کنگھی کی تھی۔ نوجوان کے دائیں کان کی لو میں چھوٹی سی بالی چمک رہی تھی۔ اس نوجوان کا یہی انداز تھا۔ وہ ایسا ہی رہنا پسند کرتا تھا۔

''بے فکر ہو جاؤ اب تم محفوظ ہو۔'' نوجوان نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''شکر کرو کہ میں وہاں موجود تھا ورنہ تمہارا حشر بہت برا ہوتا۔''

''تم کون ہو؟'' تنویر نے پوچھا۔

اس نے تنویر کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اس وقت تو تم مجھے اپنا محسن کہہ سکتے ہو کیونکہ اگر میں بروقت وہاں نہ ہوتا تو تم اس وقت پولیس کی حراست میں ہوتے۔''

''تم کیسے جانتے ہو کہ...... میں پولیس کی حراست میں ہوتا۔؟ میں نے کیا کیا ہے؟'' تنویر نے کہا۔

جس وقت تم چوکیدار کو دھکا دے کر بھاگ رہے تھے تو میں اس وقت لفٹ میں سوار ہو رہا تھا۔ میں تم سے بھی پہلے نیچے آگیا تھا۔ جب میں اپنی گاڑی نکال کر سڑک پر آیا تو تم بھاگ رہے تھے اور تمہارا پیچھا ہو رہا تھا۔ میں نے فوراً تمہارے پاس اپنی کار روکی اور تمہیں اپنی کار میں بٹھا لیا اور اب تم یہاں ہو۔''

''لیکن میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا......'' تنویر نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں تر کیا۔

''میں جانتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ انہوں نے تمہیں انٹرویو کے لیے کال کی ہوگی۔ یہ بہت بڑا جرائم پیشہ گروپ ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ لوگ ایسا ہی ایک اور نوجوان کے ساتھ کر چکے ہیں۔ کیونکہ جب ان کو کسی کو مارنا ہوتا ہے تو پھر یہ ایسا ڈراما رچا کر اپنا کیا ہوا قتل اس کے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ لوگ ہر بار ایسے ڈرامے کے لیے مقام بدل لیتے ہیں۔ پولیس تک ان کے ہاتھ میں ہے۔ شکر کرو کہ میں وہاں موجود تھا اور تمہیں بچا لیا۔''

''تم وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ میں اپنا کام کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام جمی ہے۔ سب مجھے جمی کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے جمی کہہ سکتے ہو۔'' اس نے بتایا۔

''آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے ان لوگوں سے بچایا۔ اب میں گھر جانا چاہتا ہوں۔'' تنویر نے کہا۔

''تم کیا سمجھ رہے ہو کہ تم ان لوگوں سے بچ گئے ہو؟ یہ تمہارا خیال ہے۔ سی سی کیمروں سے تمہاری ویڈیو بن چکی ہے۔ تمہاری تصویریں بن چکی ہوں گی اور پولیس تک یہ خبر پہنچ چکی ہوگی کہ تم قتل کر کے فرار ہو گئے ہو۔ ایک من گھڑت کہانی کو بنیاد بنا کر تمہارے خلاف قتل کی ایف آئی آر درج ہو چکی ہوگی اور پولیس تمہیں تلاش کر رہی ہوگی۔'' جمی بولا۔

اس کی بات سن کر تنویر پریشان ہو گیا۔ ''اگر ویڈیو بنی ہوگی تو اس میں یہ بات واضح ہوگی کہ میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ وہ لاش پہلے سے وہاں موجود تھی۔''

''میرے بھولے دوست تمہاری سوچ سے بھی کہیں آگے وہ سوچتے ہیں۔ باہر نکلو گے تو پکڑے جاؤ گے اور تین سو دو کے جرم میں ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے انصاف تلاش کرتے رہ جاؤ گے۔ کبھی یہ ثابت نہیں کر سکو گے کہ تم بے قصور ہو۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا......''

''پھر ایسا کرو کہ میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں اور خود دیکھ لینا کہ تم نے کچھ نہیں کیا مگر پولیس تمہیں کھینچ

کر اپنی وین میں ڈال کر کیسے تھانے لے کر جاتی ہے۔ آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔'' جمی کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

تنویر سوچ میں پڑ گیا۔ شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جب سب کچھ ان کے ہاتھ میں ہے تو پھر وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

''پھر میں کیا کروں؟'' اس نے پوچھا۔

''اطمینان سے یہاں بیٹھے رہو۔'' جمی نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔

''میرے گھر والے پریشان ہوں گے؟''

''ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کی فکر کرو گے اور ان کے پاس جانا چاہو گے تو جیل تمہارا مقدر بن جائے گی۔'' جمی نے کہا اور تنویر پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی عقل سلب ہو گئی تھی۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

جمی گھوم کر اس کے عقب میں گیا اور بولا۔ ''تم بری طرح سے پھنس گئے ہو۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں تمہیں اس گرداب سے نکال سکتا ہوں۔ اس میں میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ بس تم سے ہمدردی ہے کیونکہ میں ان کے ہاتھوں اپنا دوست کھو چکا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ تمہاری مدد کر کے میں یہ سمجھوں گا کہ میں نے اپنے دوست کی مدد کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے جمی کچھ افسردہ سا ہو گیا اور تنویر نے اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیں۔

''کیا ایسا تمہارے دوست کے ساتھ بھی ہو چکا ہے؟''

''ہاں...... ایسا میرے دوست کے ساتھ بھی ہو چکا ہے اور میں ان کو انجام تک پہنچانے پر کام کر رہا ہوں۔ وہ بہت طاقتور ہیں اور میں اکیلا ہوں...... لیکن ہمت ہار کے نہیں بیٹھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ پیشہ ور لوگ ہیں۔'' تنویر بڑبڑایا اور اچانک وہ ڈر کر چونک گیا کیونکہ اس کا موبائل فون بجنے لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے اپنا موبائل فون جیب سے نکالا، اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ اس سے پہلے کہ تنویر موبائل فون کو کان سے لگاتا، جمی نے اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا اور بولا۔

''بہتر ہے کہ تم کسی سے رابطہ نہ کرو۔ میرا انتظار کرو میں آتا ہوں۔'' جمی کہہ کر اس کا موبائل فون پکڑے باہر چلا گیا۔

سوچ بچار کے بعد تنویر کو یہی مناسب لگا کہ وہ جمی پر اعتماد کرے ورنہ وہ ان لوگوں سے بچ نہیں سکے گا۔ اس پر چوری کا نہیں قتل کا الزام تھا۔

ایک گھنٹے تک تنویر کمرے میں اکیلا بیٹھا سوچتا رہا پھر جب جمی آیا تو اس نے بتایا۔ ''میں سب پتا کر آیا ہوں۔ تمہارے خلاف جھوٹی ایف آئی آر لکھی جا چکی ہے۔ پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔ جو انسپکٹر تمہیں تلاش کر رہا ہے وہ ان کا خاص آدمی ہے۔ اب تمہارا باہر نکلنا ممکن نہیں ہے اور تم اطمینان سے یہاں رہو۔ باہر کی خبر میں تم تک پہنچاتا رہوں گا اور مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

تنویر اس کی بات سن کر اور بھی پریشان ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی، وہ نڈھال سا ہو کر بیڈ پر ڈھے گیا۔

وہ رات تنویر کے لیے بہت بوجھل اور پریشان کن تھی۔ وہ کبھی بستر پر لیٹ جاتا اور کبھی اُٹھ کر بیٹھ جاتا اور کبھی کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ اسی بے چینی اور الجھن میں رات گزر گئی اور نئی صبح کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

عروسہ کی زندگی بدل گئی تھی۔ وہ چھوٹے سے محلے کی تنگ گلیوں سے نکل کر پوش علاقے کے بہترین مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہاں جاتے ہی ان کی سوچیں بھی خود بخود تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کے باپ کا لہجہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کی ماں کی سوچ میں بھی تغیر آ گیا تھا۔ اب وہ بڑے لوگوں کی طرح سوچنے لگے تھے۔ اس گھر کا جو کمرا عروسہ کو ملا تھا، وہ اتنا کشادہ تھا کہ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہ اتنے بڑے کمرے میں اکیلی رہتی ہے۔

عروسہ نے تنویر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کے پاس کال کرنے کا بیلنس نہیں ہے، تب اس نے اپنے ابو کا موبائل فون لیا جو انہیں کمپنی کی طرف سے ملا تھا۔ اس نمبر سے جب عروسہ نے تنویر کو کال کی تو مسلسل بیل ہونے پر بھی تنویر نے فون آن نہیں کیا۔ اس کے بعد اس کا فون بند ہو گیا۔

عروسہ بارش کا نظارہ کرنے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ دور تک بڑے بڑے عالیشان مکانات دکھائی دے رہے تھے۔ ان بڑے بڑے گھروں پر بارش برس رہی تھی اور عروسہ کے لیے وہ منظر بہت خوبصورت تھا۔ اچانک اس کی ماں نے آ کر بتایا۔

''عروسہ تیار ہو جاؤ، ہمیں ایک پارٹی میں جانا

ہے۔"

"پارٹی میں؟" عروسہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں بھئی ان کی کمپنی کے جی ایم کے گھر پارٹی ہے۔ انہوں نے ہم سب کو بلایا ہے۔"

"اس بارش میں ہم جائیں گے؟" عروسہ کے لیے یہ بات بڑی حیران کن تھی۔

"ہمارے پاس کار ہے۔ بارش ہو یا طوفان ہمیں کیا۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" اس کی ماں نے بے پروائی سے کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

عروسہ کو خوشگوار حیرت ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اس کا مطلب ہے کہ اب بڑے بڑے لوگوں کی پارٹیز میں بھی جانا ہوا کرے گا۔

بارش تھم گئی تھی۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ وہ سب پارٹی میں جانے کے لیے تیار تھے۔ پھر وہ کار میں بیٹھ کر شہر کے اس سے بھی خوبصورت علاقے کے وسیع و عریض بنگلے میں گئے جو کمپنی کے جی ایم کا تھا۔

عروسہ خیرہ کن نگاہوں سے بنگلے اور مہمانوں کو دیکھتی رہی۔ ہر لڑکی اور خاتون نے مہنگا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گئی ہو۔

جی ایم صاحب نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ تینوں مہمانوں کی طرف چلے آئے۔

کچھ دیر کے بعد عروسہ کے امی ابو اپنے ہم عمر لوگوں میں چلے گئے اور ان کی گپ شپ اور قہقہوں کا حصہ بن گئے۔ جبکہ عروسہ ایک طرف کھڑی سب کا جائزہ لیتی سوچ رہی تھی کہ وہ واقعی اس دنیا میں ہے؟

اچانک کسی نے اس کے قریب آ کر کھنکھارا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ عروسہ نے فوراً اس کی طرف دیکھا۔

اس کے قریب ایک وجیہہ نوجوان کھڑا تھا۔ وہ تویر کا ہم عمر تھا لیکن اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور خوش پوش تھا۔ اس کے چہرے پر دلکش مسکراہٹ تھی اور مسکراتے ہوئے اس کے دائیں گال پر ہلکا سا گڑھا پڑ رہا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ اکیلی کیوں کھڑی ہیں جبکہ سب مہمان ہنس رہے ہیں، باتیں کر رہے ہیں، کیا آپ بور ہو رہی ہیں۔" اس نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں میں بس ایسے ہی یہاں کھڑی تھی۔" عروسہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مجھے عامر ...... کہتے ہیں۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی میں ......" عروسہ نے اپنے بارے میں بتانا چاہا، اس نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔

"آپ عروسہ ہیں اور نذیر صاحب کی بیٹی ہیں۔"

"آپ میرے بارے میں کیسے جانتے ہیں؟"

"جس گھر میں آپ کھڑی ہیں، یہ گھر ہمارا ہے۔ یعنی میں جی ایم صاحب کا بیٹا ہوں۔ اور آج میری ہی سالگرہ ہے۔ میرے گھر میں آئے مہمانوں کے بارے میں اگر میں نہ جانوں تو پھر مجھ سے بڑھ کر بے خبر کون ہوگا۔" وہ کہہ کر پھر مسکرایا۔ اس کی نگاہیں عروسہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"آپ کو سالگرہ مبارک ہو۔"

"ابھی میں کیک کاٹنے لگا ہوں۔ آپ آئیں سب کے ساتھ مل کر گاتے ہوئے مجھے وش کریں۔ سب میرا انتظار کر رہے ہیں۔" عامر نے کہا اور اس جانب اشارہ کیا جہاں اس کی سالگرہ کا بڑا سا کیک تھا اور وہاں مہمان کھڑے تھے۔

عامر اس جانب چلا گیا اور عروسہ بھی چھوٹے قدم اُٹھاتی ان مہمانوں کے قریب آ گئی۔

عامر نے تالیوں کی گونج اور سالگرہ کے گیت میں کیک کاٹا۔ ایک شور برپا ہو گیا، ہر کوئی بڑھ چڑھ کر سالگرہ کا گیت گا رہا تھا۔ عامر نے کیک کاٹ کر اپنے والدین کو کھلایا اور پھر مہمان کھانے پینے میں مصروف ہو گئے۔

عروسہ ایک طرف کھڑے سب کو دیکھتی رہی۔ اس کے لیے بڑے لوگوں کے درمیان کھڑے ہو کر وہ سب دیکھنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ سبھی مہمان عامر کو اس کی سالگرہ کی مبارکباد دیتے رہے اور کھانے پینے میں مصروف رہے، اس کے بعد تیز میوزک بجنا شروع ہو گیا اور لڑکے لڑکیاں اور سب مہمان ناچنے لگے۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا۔

رات گئے سالگرہ کی تقریب اپنے اختتام کو پہنچی تو مہمان جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔ سب عامر کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔ عروسہ کو حیرت ہو رہی تھی کہ اب سب عامر کے اردگرد کیوں کھڑے ہو گئے ہیں۔ اب کیا ہونے والا ہے؟ عامر نے مسکراتے ہوئے سب کی طرف دیکھا اور پھر چمکدار کاغذ میں لپٹا ہوا ایک تحفہ اُٹھایا اور سب کی طرف دیکھتے ہوئے وہ اچانک عروسہ کی طرف بڑھا اور وہ تحفہ عروسہ کو پیش کر دیا۔ یکدم سب مہمانوں نے تالیاں بجانا شروع کر دیں اور عروسہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے متحیر

نگاہوں سے سب کی طرف نظر دوڑا کر عامر کی طرف دیکھنے لگی۔

''قبول کیجیے...... مجھے خوشی ہوگی۔''

عروسہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ تحفہ عامر کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک بار پھر تالیاں بجنے لگیں، اس کے بعد ایک ایک کر کے مہمان رخصت لینے لگے۔ عروسہ بھی وہ تحفہ ہاتھ میں پکڑے اپنے والدین کے ساتھ باہر آ گئی، وہ گاڑی میں بیٹھے اور ان کی گاڑی اپنے گھر کی طرف چل دی۔ عروسہ کے والدین بہت خوش تھے۔ عروسہ کی حیرت ابھی تک اپنی جگہ قائم تھی کہ عامر نے سب مہمانوں میں سے اسے ہی کیوں تحفہ دیا؟

عروسہ گھر پہنچی تو وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے اس تحفے کو دیکھا اور پھر اس کا چمک دار کاغذ پھاڑ دیا۔ اندر ایک ڈبا تھا اور ڈبے کے اندر ایک قیمتی موبائل فون تھا۔

عروسہ نے موبائل فون نکال کر اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اسے آن کر دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد موبائل فون آن ہو گیا۔ اس کے اندر سم موجود تھی۔ اچانک اس موبائل فون کی بیل بجنے لگی۔ عروسہ چونک گئی۔ اسکرین پر عامر کا نام آ رہا تھا۔

عروسہ نے فون کان سے لگایا تو عامر کی آواز آئی۔

''میں کب سے فون کر رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آپ نہ ڈبا کھولیں گی اور نہ موبائل فون آن کریں گی۔ لیکن شکر ہے کہ آپ نے موبائل فون آن کر ہی دیا۔''

''شکریہ...... آپ نے اتنا قیمتی موبائل فون کا تحفہ مجھے دیا۔'' عروسہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے موبائل فون دینے کا شکریہ ادا کر دیا۔

''قیمتی تو نہیں ہے، بس پچاسی ہزار روپے کا ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''بس آپ تحفہ قبول کر لیں۔''

''کیا ضرورت تھی مجھے یہ گفٹ دینے کی؟'' عروسہ سوچ رہی تھی کہ عامر نے کس بے پروائی سے کہا ہے کہ یہ موبائل فون محض پچاسی ہزار روپے کا ہے۔

''ضرورت تھی۔ کیونکہ میری امی نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اس سالگرہ کے موقع پر مجھے اپنا جیون ساتھی چننا ہے۔ سب مہمانوں کو پتا تھا کہ مجھے آج اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کرنا ہے۔ میرے خاندان کی ہر لڑکی خوب سج دھج کر آئی تھی لیکن میری نظر آپ پر پڑی تو مجھے اپنا فیصلہ کرنے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور میں نے سب کے سامنے آپ کو گفٹ دے کر اعلان کر دیا کہ میں نے اپنا جیون ساتھی عروسہ کو چن لیا ہے۔'' عامر نے وضاحت کی۔

''جی کیا...... یہ گفٹ اس لیے تھا......'' اس کی بات سن کر عروسہ حیرت سے چونکی۔

عامر کی آواز آئی۔ ''جی ہاں۔''

''لیکن میری تو منگنی ہو چکی ہے۔'' عروسہ نے بتایا۔

''منگنی توڑنے کے لیے کون سا کسی قانونی پیچیدگی سے گزرنا پڑتا ہے۔ انگلی سے رِنگ اتار کر واپس کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، پھینک دینے سے بھی منگنی ٹوٹ جاتی ہے۔''

''لیکن یہ کیسے ہوگا......؟''

''یہ ہو چکا ہے۔ جیسے ہی میں نے آپ کو گفٹ دیا، تالیاں بجیں اور میرے والدین نے آپ کے والدین سے فوراً بات کی اور انہوں نے فوراً اقرار کر لیا۔'' عامر نے یہ بتا کر اسے اور بھی حیران کر دیا۔

''وہ کیسے اقرار کر سکتے ہیں؟'' عروسہ کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''یہ سب ہو چکا ہے۔ ماضی کے اس بندھن کو فلیش میں بہا کر مستقبل کے حسین سپنے دیکھیں۔ شب بخیر۔'' عامر نے کہہ کر فون بند کر دیا اور عروسہ حیرت اور پریشانی سے ہاتھ میں موبائل فون لیے بیٹھی رہی۔

اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا ہو جائے گا۔ تنویر کے ساتھ اس کی منگنی ہو چکی تھی، وہ اسے پسند کرتی تھی، اب عامر نے کتنی آسانی سے کہہ دیا تھا کہ اس رشتے کو ختم کر دو۔

اسی اثنا میں اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور پھر اس کی ماں مسکراتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس نے عروسہ کے ہاتھ میں موبائل فون دیکھا تو اسے دیکھ کر بولی۔

''ارے واہ بہت قیمتی موبائل فون ہے۔ عامر نے یہ گفٹ دیا ہے؟''

''جی ہاں......'' عروسہ نے متانت سے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا۔

''تمہاری تو قسمت کھل گئی ہے۔ تم بہت خوش نصیب ہو۔ لیکن کیا بات ہے تم پریشان نظر آ رہی ہو۔'' اس کی ماں خوش تھی۔

''ابھی عامر کی کال آئی تھی۔ کیا آپ عامر کے ساتھ میرا رشتہ طے کر آئے ہیں؟'' عروسہ نے پوچھا۔

''تمہیں عامر نے بتایا ہے۔''

''ابھی بتایا ہے۔''

''اس نے ٹھیک بتایا ہے۔ تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہارا اتنے بڑے گھر میں رشتہ ہوگیا ہے۔ ہم بھی بہت خوش ہیں۔'' اس کی ماں کا چہرہ اور بھی خوشی سے دمک اُٹھا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میری منگنی تنویر سے ہو چکی ہے؟''

''تنویر کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ نوکری سے فارغ ہو چکا ہے۔ پہلے بھی اسے جو نوکری ملی تھی، وہ تمہارے ابو کی سفارش سے ملی تھی' اب بھی اس کی نظریں تمہارے باپ پر ہیں۔ ہم وہ رشتہ ختم کر چکے ہیں۔ تم بھی اس رشتے کو ختم کردو۔'' اس کی ماں نے دوٹوک کہا۔

''لیکن کیسے ختم کردوں؟''

''کیسے ختم کردوں کا کیا مطلب؟ کل تمہارے ابو آفس جاتے ہوئے ان کی پہنائی ہوئی انگوٹھی واپس کردیں گے۔ ذرا سوچو اس نے خاندان کی تمام لڑکیوں کو چھوڑ کر تمہیں پسند کیا ہے۔ تمہیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیے۔ یہ بھی دیکھو کہ ہمارے حالات کس تیزی سے بدل گئے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ تعلق ہے۔ بلکہ نہیں رشتے داری بھی قائم ہوگئی ہے۔ ایک چھوٹے سے گھر سے ہم اتنے بڑے گھر میں آگئے ہیں۔ ماضی بھول کر اب صرف مستقبل کی سوچو۔ یہ سوچو کہ تم اس بڑے گھر کی بہو بنو گی جہاں نوکروں کی فوج اور دولت کی ریل پیل ہے۔ ان کا گھر اس گھر سے بھی بڑا ہے۔ ساری زندگی عیش کرو گی۔'' اس کی ماں کہہ کر اُٹھی اور مسکرا کر چلی گئی۔

عروسہ بہت دیر تک سوچتی رہی۔ وہ مضطرب ہوگئی تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے عامر کا چہرہ آگیا، پھر اس کا بہت بڑا گھر، نوکر، گاڑیاں اور عیش و آرام گھوم گیا اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس آسائشوں میں تنویر کا چہرہ دھندلا ہوتا چلا گیا۔ اور اسے لگا کہ اس کی ماں ٹھیک کہہ رہی ہے۔

اچانک عروسہ کو موبائل فون کی بیل نے چونکا دیا۔ عامر کی کال تھی۔ اس بار ایک خفیف سی شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ عروسہ نے موبائل فون کان سے لگالیا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

''تو کیا سوچا آپ نے؟''

''کس بارے میں؟'' عروسہ نے پوچھا۔

''بھول گئیں آپ، ابھی میں نے کیا کہا تھا۔'' عامر نے کہا۔

''آپ نے تو بہت سی باتیں کی تھیں، آپ وضاحت کردیں تو میں سمجھ جاؤں گی۔'' عروسہ مسکرا رہی تھی۔

''شاید آپ پھر سننا چاہتی ہیں۔ میں پھر کہہ دیتا ہوں۔ آپ اپنے ماضی کو الوداع کہہ کر مستقبل کے حسین جھولے میں جھولنا چاہیں گی؟'' عامر نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے کہا۔

عروسہ مسکرائی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی بدل گئی ہے۔ ابو کی نئی نوکری، نئی کار، بڑا سا نیا گھر اور اب......''

''اور اب...... بولو بولو۔'' عامر نے اس کے چپ ہوتے ہی جلدی سے کہا۔

''اور اب مجھے بھی ماضی بھول کر آنے والے کل کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ شاید میں سوچ چکی ہوں، یا میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔'' عروسہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی اور دوسری طرف سے عامر نے خوشی سے کہا۔

''یہ ہوئی نا بات۔''

اس کے بعد وہ دونوں مستقبل کی حسین..... باتوں میں کھو گئے۔

☆☆☆

تنویر کی پریشانی روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ وہ اس گھر میں قید تھا۔ اس کا باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ جمی دن میں دو، تین بار چکر لگالیتا تھا اور باہر کے حالات سے آگاہ کردیتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس کے گھر گیا تھا اور اس کے والدین کو ایک جھوٹی کہانی سنا کر آگیا ہے کہ تنویر اس کی کمپنی میں ملازم ہوگیا ہے اور وہ ٹریننگ کے لیے کراچی چلا گیا ہے۔ اس سے اس کے گھر والے مطمئن ہوگئے تھے۔

جمی نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے گھر پر بھی پہرا دیا جارہا ہے۔ جب وہ اس کے گھر سے باہر نکلا تو اس کی کئی گھنٹے تک نگرانی ہوتی رہی تھی اور وہ تب اس طرف آیا تھا جب اسے تسلی ہوگئی تھی کہ اب اس کی نگرانی ختم ہوگئی ہے۔

شام سے پہلے جمی اپنے مخصوص حلیے میں آیا تو اسے دیکھتے ہی تنویر بولا۔ ''میں تھک گیا ہوں۔ میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے خود اندازہ نہیں ہے کہ میں اس گھر میں کب سے قید ہوں۔''

''اگر تم جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں بے وقوف ہوں کہ تمہارے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے تمہیں ان لوگوں سے بچا رہا ہوں۔

میرا اس میں کیا مطلب ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ جو ہو، ٹھیک ہے، تم چلے جاؤ۔'' جمی نے کہا۔

تنویر تذبذب سوچ میں پڑ گیا۔ بے چینی اس کے چہرے سے عیاں تھی اور جمی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

''میں کیا کروں، یہ کب تک چلتا رہے گا؟'' تنویر اکتا گیا تھا۔

''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے صرف تم سے ہمدردی ہے۔ میں اپنا دوست کھو چکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم پر آنچ نہ آئے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ تم کو کیسے بچایا جائے۔ اس چار دیواری میں رہ کر اگر تم بوریت کا شکار ہو تو تیار ہو جاؤ۔ میرے دوست کی منگنی ہے۔ ہم وہاں چلتے ہیں۔ تمہارا ذہن فریش ہو جائے گا۔ اور میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ تمہیں کسی طرح سے تمہارے گھر پہنچا دوں۔''

''کہاں جانا ہے؟'' تنویر نے پوچھا۔

''گھبراؤ نہیں۔ یہاں سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر فارم ہاوس ہے وہاں جانا ہے۔ وہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ چلنا چاہتے ہو تو تیار ہو جاؤ۔'' جمی نے کہا۔

تنویر سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ جب سے وہ اس مکان میں تھا وہ اذیت میں تھا۔ تنہائی اسے بار بار ڈس رہی تھی اور سوچیں چونٹیوں کی طرح اس کے دماغ میں ایک ہی دائرے میں رینگ رہی تھیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دماغ کو سکون دینے کے لیے اس کے ساتھ چلا جائے۔

جمی نے اس کے لیے اچھے لباس کا انتظام کیا تھا۔ وہ نہا دھو کر شیو کر کے تیار ہوا اور لباس زیب تن کر کے جمی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جمی اسی حلیے میں تھا۔

''آپ تیار نہیں ہوں گے؟'' تنویر نے پوچھا۔

''میرا یہی اسٹائل ہے۔'' جمی کہہ کر مسکرایا اور اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ دونوں کار میں بیٹھے اور اس نے کار اس مکان کی حدود سے باہر نکال دی۔

رات ہو چکی تھی۔ سڑک زیادہ بارونق نہیں تھی۔ تنویر پھر بھی ڈرا ہوا تھا۔ ان کی کار ایک بڑے فارم ہاوس کے گیٹ کے پاس رکی تو گیٹ کھلا ہوا تھا اور اندر کئی کاریں کھڑی تھیں۔ جمی اپنی کار اندر لے گیا۔

دونوں باہر نکلے تو جمی نے اس سے کہا۔ ''ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کرو۔ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔''

تنویر نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں ایک ہال میں چلے گئے۔ جمی نے اسے ایک طرف بٹھا دیا۔ تنویر ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ وہ سب کو دیکھ سکتا تھا لیکن اس پر کم ہی کسی کی نظر جا سکتی تھی۔

''میں یہیں تمہارے آس پاس ہوں۔'' جمی کہہ کر ایک طرف چلا گیا۔

تنویر آتے جاتے مہمانوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے دل و دماغ پر جو ایک جیسی سوچوں نے ہی قبضہ کیا ہوا تھا، وہ رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگی تھیں۔ اس کی توجہ ان سوچوں سے ہٹنے لگی تھی۔

سامنے اسٹیج پر جس لڑکے کی منگنی تھی، وہ خوبصورت لباس زیب تن کیے مسکراتا ہوا آیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کچھ خواتین اور لڑکیاں اس لڑکی کو لے آئیں جس کے ساتھ اس کی منگنی تھی۔ جیسے ہی وہ لڑکی اسٹیج پر بیٹھی اور اس کا گھونگھٹ اوپر ہوا تنویر چونک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں اس لڑکی پر مرکوز ہو گئی تھیں۔ کیونکہ وہ لڑکی عروسہ تھی۔ اس نے فوراً دائیں بائیں دیکھا کہ شاید اسے کچھ اور رشتے دار بھی دکھائی دیں لیکن عروسہ کے والدین کے سوا اسے کوئی نظر نہ آیا۔

تنویر دم بخود سوچ رہا تھا کہ یہ کیسے ہو گیا۔ عروسہ اس کی منگیتر ہے۔ کہیں اس کی نظروں کا تو دھوکا نہیں ہے۔ اپنی تسلی کے لیے وہ اسٹیج کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ درمیان میں تھا کہ اس نے واضح عروسہ کو دیکھ لیا اور اس پر حیرت کا پہاڑ گر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ آگے جانے کے لیے قدم اٹھاتا، جمی اس کے سامنے آ گیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' جمی نے پوچھا۔

''اسٹیج پر...... یہ تو عروسہ ہے۔'' تنویر نے کہا۔

''کون عروسہ؟'' جمی اس سے پوچھتا ہوا اسے زبردستی واپس اس کی کرسی کی طرف بھی لے جا رہا تھا۔

''میری خالہ زاد میری منگیتر عروسہ۔'' تنویر پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹا ہوا تھا اور اسے اس حقیقت کا یقین نہیں آ رہا تھا۔

''یہ تمہاری کزن ہے۔'' جمی اسے واپس اس کی کرسی تک لے گیا تھا۔

''کزن ہی نہیں یہ میری منگیتر ہے۔ لیکن اس کی منگنی اس کے ساتھ ہو رہی ہے۔ کیوں؟'' تنویر کے لہجے میں تڑپ تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جمی کو دھکا دے کر اسٹیج پر چلا جائے۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہاں تمہارے اور رشتے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماےراحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

دار بھی ہوں گے۔ یہاں سے چلتے ہیں۔'' جمی نے کہا۔

''میں عروسہ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' تنویر بلاتامل بولا۔

''پاگل مت بنو۔ جس سے اس کی منگنی ہو رہی ہے، وہ میرا دوست ہے۔ میں اس سے سب پوچھ لوں گا۔ تمہارے وہاں اسٹیج پر جانے اور بات کرنے سے ہنگامہ ہوجائے گا۔ تمہاری ہنگامہ آرائی سے ہو سکتا ہے، وہ لوگ پولیس بلالیں اور پھر کیا ہوگا...... جانتے ہو۔''

تنویر کو جمی زبردستی باہر لے آیا اور کار میں بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور تیزی سے کار وہاں سے نکال لی۔

تنویر کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ وہ تاسف اور غصے کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ کار سڑک پر دوڑ رہی تھی کہ تنویر چیخا۔

''تم مجھے وہاں سے کیوں لے کر آئے...... میں پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے منگنی کیوں کر رہی ہے۔''

''تم اس سے پوچھنا چاہتے ہو۔'' جمی نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں میں اس سے پوچھنا چاہتا ہوں۔'' تنویر غصے اور کرب میں مبتلا تھا۔

''ٹھیک ہے میں گاڑی روک دیتا ہوں۔ اور تم اس کے پاس چلے جاؤ اور جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو۔'' جمی نے غصے سے کہا اور گاڑی روک دی۔ جس جگہ جمی نے کار روکی تھی اس کے بائیں جانب پانچ فٹ دیوار بنی ہوئی تھی شاید کسی نے اپنی زمین کے اردگرد چاردیواری کھڑی کی تھی۔

''اترو اور اس کے پاس چلے جاؤ اور پولیس سے بچنے کے لیے جو کرنا ہے، وہ بھی تم خود ہی کرو گے۔'' جمی نے دوٹوک کہہ دیا۔

تنویر نے یکدم کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل کر اس طرف بڑھا جس طرف وہ فارم ہاؤس تھا۔ اچانک پیچھے سے جمی نے اسے آواز دی۔

''ایک منٹ رک جاؤ۔''

تنویر رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جمی کار سے باہر کھڑا تھا۔ وہ فوراً اس کی جانب بڑھا اور اس کا بازو پکڑ کر کھینچ کر جس جگہ کار کھڑی تھی اس کے قریب جو دیوار تھی وہاں لے گیا اور اس نے اس جانب اشارہ کیا جہاں دیوار پر ایک پھٹا ہوا اشتہار لگا تھا۔

''اسے پڑھو......'' جمی نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اشتہار پر تنویر کی تصویر تھی اور پولیس نے اس کی تلاش کا اشتہار لگایا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں اطلاع دینے والے کو پانچ لاکھ روپے کا انعام بھی مقرر کیا تھا کیونکہ تنویر ایک بڑے بزنس مین کو قتل کر کے فرار ہوا تھا۔

''یہ کیا......'' تنویر کے منہ سے حیرت زدہ آواز نکلی اور خوف اس کی رگوں میں سرایت کر گیا۔

تنویر پھٹی پھٹی نظروں سے اشتہار کی طرف دیکھنے لگا۔ جمی نے ہاتھ بڑھا کر وہ اشتہار دیوار سے اتارا اور اسے کار میں بٹھا کر اپنی کار کا رخ اپنے مکان کی طرف کر دیا۔

☆☆☆

تنویر کے چہرے پر خوف مترشح تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا بچنا اب محال ہے۔ وہ پولیس کی گرفت میں آجائے گا اور اس قتل کے الزام میں وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے گا۔ اس کا دل گھبرا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ بے چین تھا۔

اس کے سامنے جمی ٹہل رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''بھلائی کا زمانہ ہی نہیں ہے۔ میں تمہیں بچانا چاہتا ہوں اور تم مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' تنویر ندامت سے بولا۔

''ایسی ہی بات ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ان لوگوں کو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ تمہارا قبر تک پیچھا کریں گے۔'' جمی اس پر ناراض ہو رہا تھا۔

''میں جذباتی ہو گیا تھا۔''

''اب جان گئے ہو کہ باہر کتنے خطرناک حالات ہیں۔؟ اب تمہیں یقین آگیا ہے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہو۔''

''اب بتاؤ کیا کرنا ہے۔ جانا ہے تو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' جمی نے پیشکش کی۔

''مجھے اپنی جان بچانی ہے۔'' یکدم تنویر مایوس ہو گیا۔ ''لیکن اب میں جی کر کیا کروں گا۔ عروسہ کی منگنی اس سے ہو چکی ہے اور اس نے مجھے اتنی جلدی چھوڑ دیا ہے۔''

''اس دنیا میں جینے کے لیے صرف عروسہ ہی نہیں ہے۔ تمہارے گھر والے بھی ہیں۔'' گویا جمی نے اسے یاد دلایا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' تنویر نے اثبات میں گردن

ہلاتے ہوئے جمی کی طرف دیکھا۔

''اب تم کو ان لوگوں کے لیے جینا ہے۔ عروسہ کو بھول جاؤ۔'' جمی نے متانت سے کہا۔

''بس اب یہی امنگ رہ گئی ہے۔''

''میں تمہارے لیے یہ کرسکتا ہوں کہ تمہیں ملک سے باہر بھجوا دیتا ہوں۔'' جمی بولا۔

''ملک سے باہر......؟ کہاں؟'' تنویر نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں تمہیں دبئی بھجوا سکتا ہوں۔ تمہارا پاسپورٹ اور کاغذات بھی تیار کرادوں گا اور تم وہاں جا کر نوکری بھی کرنے لگو گے۔ وہاں جا کر تم اپنے گھر والوں سے رابطہ کرنا اور محفوظ زندگی گزارنا۔'' جمی کی اس بات نے تنویر کے مریل جسم میں جان بھر دی۔

''کیا ایسا ہو جائے گا جبکہ میرا تو پاسپورٹ بھی نہیں بنا۔''

''وہ سارے کام ہو جائیں گے۔ تمہارا پاسپورٹ بھی بن جائے گا اور تم اس ملک سے بھی چلے جاؤ گے۔ بس یہی ایک راستہ ہے کہ تم ان لوگوں سے بچ سکو۔'' جمی بولا۔

''اگر ایسا ہو جائے تو یہ اچھا ہے۔'' تنویر تیار ہو گیا۔

''اب تم آرام کرو میں بندوبست کرتا ہوں۔'' جمی کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔

تنویر اسی جگہ بیٹھا رہا اور اپنی زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کتنی جلدی اس کی زندگی میں تغیر آیا اور وہ بیٹھے بٹھائے ایک گرداب میں پھنس گیا۔

☆☆☆

رات کے ڈھائی بجے تھے۔

دور تک سکوت کا عالم تھا۔ آسمان صاف اور چاند اپنی روشنی بکھیر رہا تھا۔ تنویر اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔

اچانک اس کے کمرے کا دروازہ کھلا اور جمی تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے کمرا روشن کرنے کے بجائے جمی کے اوپر لی ہوئی چادر کھینچی اور اپنی آواز کو زیادہ بلند نہ کرتے ہوئے اسے پکارا۔

''تنویر...... تنویر اٹھو جلدی کرو۔''

تنویر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا......؟''

''جلدی اٹھو پولیس نے تمہارا سراغ لگا لیا ہے۔'' جمی نے کہتے ہوئے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ جبکہ یہ سنتے ہی تنویر اپنی جگہ سے ایسے اٹھا جیسے اس کے بستر میں کوئی خطرناک چیز گھس آئی ہو۔ اس نے بوٹ پہنے اور اڑے ہوئے رنگ کے ساتھ جمی کی طرف دیکھا۔

جمی کھڑکی سے ہٹ کر اس کی طرف بڑھا۔ ''اس طرف پولیس ہے، جلدی آجاؤ۔''

جمی کا رخ باہر کی طرف تھا اور تنویر اس کے عقب میں تھا۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا اور خوف اس کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔

جمی اسے پچھلے راستے کی طرف لے گیا۔ اس مکان کے عقب میں باؤنڈری وال تھی۔ جمی جست لگا کر دیوار کے اوپر چڑھا اور تنویر کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔

''جلدی کرو......''

تنویر نے بھی جست لگائی اور دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ دونوں ایک ساتھ دوسری طرف کود گئے۔ باہر اندھیرا تھا لیکن چاند کی روشنی رات کے اندھیرے کو معدوم کر رہی تھی۔

''تیز بھاگو......'' جمی بولا۔ دونوں سرپٹ بھاگنے لگے۔ اس طرف ویران جگہ تھی۔ جابجا درخت تھے۔ دونوں بھاگتے جا رہے تھے۔ اچانک پیچھے گاڑی کی تیز روشنی ان پر پڑی۔ اس کے عقب میں آنے والی گاڑی ان کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

''تیز بھاگو......'' جمی بولا۔ دونوں کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی تھی۔ پیچھے آنے والی گاڑی کی روشنی کا فاصلہ کم ہو رہا تھا۔

اچانک بھاگتے بھاگتے جمی گر گیا۔ تنویر بھاگتے بھاگتے رک گیا اور اسے اٹھانے کے لیے رکا، دور کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی آنے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پولیس کے ساتھ کتے بھی تھے۔

''میری فکر چھوڑو اور تم نکلو...... مجھے لگ رہا ہے ہمارے پیچھے کتے بھی ہیں۔'' جمی نے کہا۔

تنویر نے ایک لمحے کے لیے رک کر اپنے عقب میں دیکھا، اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا لیکن کتوں کے بھونکنے کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جمی نے مجبور کر دیا اور تنویر کو بھاگنا پڑا۔

تنویر بھاگتا جا رہا تھا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی۔ اس کے لیے مزید بھاگنا دوبھر ہو رہا تھا۔ لیکن اسے جان بچانے کے لیے بھاگنا تھا۔ اس نے اپنے تعاقب میں گاڑی کی روشنی کئی بار دیکھی تھی اور کتوں کے بھونکنے کی

آوازیں بھی مسلسل آرہی تھیں۔ بھاگتے بھاگتے تنویر بے حال ہوگیا تھا۔ اب بھاگتے ہوئے گاڑی کی روشنی دکھائی نہیں دی تھی، کتوں کی آوازیں بھی دور ہوتی جارہی تھیں۔ شاید ان کا رخ تبدیل ہوگیا تھا۔ اس کے باوجود وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے وہ جانے کس طرف نکل گیا تھا۔

اچانک اسے سامنے پٹری پر ٹرین دوڑتی دکھائی دی۔ اس کا مطلب تھا کہ سامنے ریلوے کی پٹری تھی۔ درخت بھی پیچھے رہ گئے تھے اب چاند کی روشنی میں اسے لمبی جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک وہ نڈھال ہوکر گر گیا۔ گرتے ہی وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بے حال تھا۔ پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اس کا پیٹ کسی مشین کی طرح اوپر نیچے ہورہا تھا۔ وہ اس سناٹے میں ٹرین کی آواز بہت دیر تک سنتا رہا اور پھر سے سناٹا چھا گیا۔ وہ بہت دیر تک زمین پر چت لیٹا رہا۔ پھر جب اس کی سانس بحال ہوئی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔ اس نے اپنا سر اُٹھا کر اپنے دائیں بائیں دور تک دیکھنے کی کوشش کی۔ دور تک ویرانی تھی اور سکوت تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور کھڑا ہوگیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

تنویر اسی جگہ کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ اچانک اسے دور ایک نقطہ دکھائی دیا۔ وہ نقطہ ٹرین کی پٹری کے ساتھ دوڑتا چلا آرہا تھا۔ تنویر کو لگا جیسے ٹرین آرہی ہے۔ وہ نقطہ بڑی تیزی سے واضح ہورہا تھا اور پھر اسے لگا کہ وہ ٹرین نہیں ہے بلکہ گاڑی ہے۔ وہ نقطہ گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔

تنویر سمجھا کہ وہ پولیس کی گاڑی ہے۔ وہ بھاگنے لگا۔ اب وہ پہلے سے بھی تیز بھاگنے کی کوشش کررہا تھا۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ وہ اب پھنس گیا ہے اور اب پولیس سے نکلنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس ویرانے میں وہ کتنا بھاگ لے گا۔ وہ بھاگتا بھاگتا گر جائے گا اور پولیس اسے دبوچ لے گی۔ اس وقت تنویر اپنے آپ کو بہت بے بس اور ناچار محسوس کررہا تھا۔

وہ کار تھی اور وہ تیزی سے تنویر کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ کار کے پیچھے دھول کا دھواں اُڑ رہا تھا۔ تنویر اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ کار کی رفتار اس کے بھاگنے سے زیادہ تیز تھی اس لیے کار نے بھاگتے ہوئے تنویر کو عبور کیا اور اس کے آگے جاکر ترچھی کھڑی ہوگئی۔ برق رفتاری سے بھاگتے ہوئے تنویر کے لیے ایک دم سے رکنا مشکل ہوا اور وہ رکتے رکتے بھی کار کے ساتھ ٹکرا گیا۔

یکدم کار کا دروازہ کھلا اور اندر سے جمی باہر نکلا۔ اس نے جلدی سے تنویر کو تھام لیا اور وہ نیچے گرنے سے بچ گیا۔

''گھبراؤ نہیں یہ میں ہوں۔ کار میں بیٹھ جاؤ۔''

جمی کی آواز نے تنویر کو حوصلہ دیا اور اس کا خوف کم ہوگیا۔ جمی نے اسے کار میں بٹھایا اور وہ خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔ کار نے ایک بار پھر رفتار پکڑی اور چمکتے چاند کے نیچے اس ویران اور کچی سڑک پر ان کی کار دوڑنے لگی۔ دھول اُڑنے لگی تھی اور تنویر نڈھال سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

☆☆☆

جمی اسے گنجان آباد علاقے کے ایک مکان میں لے آیا تھا۔ وہ مکان بھی بڑا اور کشادہ تھا۔ فرق یہ تھا کہ وہ مکان کسی ویرانے میں اکیلا نہیں کھڑا تھا۔ بھاگتے بھاگتے تنویر کے جسم میں درد ہونے لگا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا انگ انگ درد سے چور ہے۔ وہ بیڈ پر نیم دراز تھا۔ جبکہ جمی اس کے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ پولیس کو یہ اطلاع کس نے دی تھی کہ تم اس مکان میں ہو۔'' جمی بولا۔

''شاید تمہاری کوئی نگرانی کررہا ہو۔'' تنویر نے اپنا خیال پیش کیا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ میں اس مکان میں اتنا غافل ہوکر نہیں آتا تھا۔'' جمی نے اس کا خیال رد کردیا۔

''میرے دل میں اور بھی خوف بیٹھ گیا ہے۔'' تنویر پریشان ہوگیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ میں بالکل بھی محفوظ نہیں ہوں اور وہ مجھے تلاش کررہے ہیں۔''

''مجھے خود لگ رہا ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ تمہارے گرد گھیرا تنگ ہوتا جارہا ہے۔ وہ لوگ پوری طاقت سے تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش میں ہیں۔'' جمی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کو گرفتار کرنا ان کے لیے بہت اہم ہے۔''

''اس سے پہلے کہ وہ لوگ مجھ تک پہنچ جائیں آپ مجھے اس ملک سے نکال کر دبئی بھیج دیں۔'' تنویر ایک دم سے اُٹھ کر بولا۔

''اب یہی چارہ ہے۔'' جمی سوچتے ہوئے بولا۔

تنویر اپنی جگہ سے اُٹھ کر جمی کے پاس چلا گیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''آپ دل کے بہت اچھے ہو۔ واقعی آپ میرے لیے فرشتہ ہو۔ سچ ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں شاید اس وقت اپنے ناکردہ جرم کی سزا میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے انصاف کے سائے کو ترس رہا ہوتا۔''

''میں تمہاری نہیں اپنے اس دوست کی مدد کر رہا ہوں جس کو میں بچا نہیں سکا تھا۔'' وہ پھر اداس ہو گیا۔

''جمی بھائی آپ بھاگتے ہوئے گر گئے تھے پھر مجھے کیسے تلاش کیا؟'' تنویر نے پوچھا۔

''شکر ہے کہ وہ لوگ اور ان کے کُتے مجھ تک نہیں پہنچ سکے۔ دراصل انہوں نے کُتے آزاد نہیں چھوڑے ہوئے تھے۔ بہرحال جب وہ آگے نکل گئے تو میں نے اپنے دوست کو کال کی۔ وہ وقت پر گاڑی لے کر پہنچ گیا اور پھر ہم نے تم کو تلاش کر لیا۔''

''میری زندگی آپ کا قرض ہے۔'' اس نے ممنون نگاہوں سے جمی کی طرف دیکھا۔

''نہیں ایسا مت کہو۔ بس اب ایسا ہی کرنا جیسا میں کہوں گا۔ اب جب تک تمہیں میں دبئی نہ بھجوا دوں مجھے چین نہیں آئے گا۔'' جمی بولا۔

☆☆☆

دوسرے دن ناشتے کے بعد جمی نے بتایا کہ اس نے اپنے دوست کی مدد سے ایک ایسے شخص کو بلایا ہے جو لوگوں کو جعلی دستاویزات پر ملک سے باہر لے جاتا ہے۔ وہ یہ کام کئی سالوں سے اس کامیابی سے کر رہا ہے کہ کبھی پکڑا نہیں گیا۔ وہ جرم کی دنیا کا بادشاہ کہلاتا ہے لیکن کبھی کوئی ثبوت نہ چھوڑنے کی وجہ سے وہ ایک عام شہری سے بھی زیادہ آسان زندگی گزار رہا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد جمی جس شخص کو تنویر کے پاس لے کر آیا، اس کا نام نواز تھا اور وہ چوڑے اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی اور گھنی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں مختلف پتھروں سے جڑی چاندی کی انگوٹھیاں تھیں۔

''یہ تنویر ہے جس کے بارے میں بات کی تھی۔'' جمی نے تعارف کرایا۔

نواز نے ایک نظر تنویر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''اسے باہر بھیجنا ہے؟''

''ہاں۔'' جمی نے اثبات میں گردن ہلائی۔

نواز نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اشتہار نکالا اور اسے کھول کر ایک نظر دیکھ کر بولا۔ ''یہ تو مشہور بزنس مین کے قتل میں مطلوب ہے۔''

اس کی بات سن کر تنویر نے گھبرا کر جمی کی طرف دیکھا۔ جمی بولا۔ ''تم کو اپنے کام سے مطلب ہونا چاہیے، اس نے کیا کیا ہے کیا نہیں اس سے تمہیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''

''اس پر پانچ لاکھ روپے کا انعام ہے۔ میرے ساتھ ڈیل کر لو، تین لاکھ میرے اور دو لاکھ تمہارے۔'' نواز نے جمی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سفاک تھا۔

تنویر اس کی بات سن کر ایسے گھبرا گیا جیسے وہ ابھی نیچے گر جائے گا۔ جمی جلدی سے بولا۔ ''میں نے آپ کو اس لیے نہیں بلایا کہ آپ اس کے بارے میں میرے ساتھ سودے بازی کریں۔''

وہ ہنسا۔ ''ٹھیک ہے، میں نے تو ایک پیشکش کی تھی اگر نہیں منظور تو ہم اصل موضوع کی طرف آ جاتے ہیں۔ دراصل میرا یہی کام ہے۔ اس لیے سوچا کہ اگر آپ میرے ساتھ وہ ڈیل کر لیں تو آپ کا بھی فائدہ ہو سکتا تھا۔''

''اصل موضوع یہ ہے کہ اسے بحفاظت دبئی پہنچانا ہے۔'' جمی نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

''پہنچ جائے گا، یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

''تو پھر اپنا کام آج ہی شروع کر دو اور اسے اس ملک سے باہر لے جاؤ۔'' جمی بولا۔

''میں اپنا کام ابھی سے شروع کر دیتا ہوں۔ آٹھ لاکھ روپے لوں گا۔ وہ بھی اس لیے کہ تمہارا تعلق اس کے ساتھ ہے جو میرا ابھی دوست ہے۔'' اس نے کہا۔

''مجھے منظور ہیں۔ تم کام شروع کرو اور اسے باہر بھیج دو۔ میں آٹھ لاکھ روپے دینے کو تیار ہوں۔'' جمی مان گیا۔

''تو پھر دیر کس بات کی۔ مجھے پیسہ دو تا کہ میں کام شروع کروں۔'' نواز نے اس کی طرف دیکھا۔

''سارے پیسے ابھی لوگے۔''

''سارا پیسہ ایڈوانس لوں گا۔''

''کام کی کیا گارنٹی ہوگی۔''

''نواز دو نمبر کام ضرور کرتا ہے لیکن ایمانداری سے۔'' نواز کے لہجے میں اعتماد تھا۔

جمی بولا۔ ''میرے پاس چار لاکھ روپے ہیں۔''

''باقی کے چار لاکھ؟'' نواز کی سوالیہ نگاہیں اس کے

چہرے پر منجمد تھیں۔

''اس کا بھی انتظام کرتا ہوں۔ تم چار لاکھ روپے لو اور کام شروع کرو۔'' جمی نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم آٹھ لاکھ کا بندوبست کرلو۔ آٹھ لاکھ ایک ساتھ لوں گا پھر ہی کام شروع کروں گا۔'' نواز نے دوٹوک کہہ دیا۔

''تم بہت بے اعتبار ہو۔'' جمی کے لہجے میں کچھ تلخی سی آگئی۔

''بات بے اعتباری کی نہیں، اصول کی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ مجھے اس کام کے لیے کہاں کہاں اور کیسے پیسے تقسیم کرنے ہیں۔ میں پورے پیسے لیے بغیر کام نہیں کرتا۔''

''مجھے مزید چار لاکھ کا بندوبست کرنے میں کم از کم ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ تم چار لاکھ مجھ سے ایک گھنٹے کے اندر لے لو۔''

''میری طرف سے تم دو ہفتے لے لو۔ لیکن ایک بات کہوں گا۔ جب تک تم پیسے کا انتظام کرو گے شاید پولیس اسے پکڑ کرلے جائے۔ کیونکہ جس تیزی سے وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے یہ میں جانتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اس کی تلاش میں تھا۔ میں پیسے کے لیے کچھ بھی کرتا ہوں یہ تم جانتے ہو۔'' نواز کی للچائی نگاہیں تنویر پر گئیں تو وہ اور بھی ڈر گیا۔

جمی سوچنے لگا۔ اچانک نواز بولا۔ ''ایک تجویز دوں۔ فائدہ ہوجائے گا۔''

''کیا تجویز ہے؟'' جمی سوچ سے باہر نکلا۔

نواز نے ایک نظر تنویر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوجاتا ہوں۔ ہم نے ایک بزنس مین کو اغوا کیا ہے۔ تاوان کی رقم وصول کرنے کے لیے ہم کسی کو بھی پیسے دے کر وہ کام کرواتے ہیں، ہمارا کام یہ کردے تو میں سمجھ لوں گا کہ چار لاکھ مجھے مل گئے، اس طرح تمہارے آٹھ لاکھ میری طرف آجائیں گے۔''

تنویر نے اس کی بات سن کر متوحش نگاہوں سے نواز اور جمی کی طرف دیکھا۔ جمی نے پوچھا۔

''اس کام میں خطرہ کتنا ہے۔''

''خطرہ تو صاف ستھرے کاروبار میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ یہ کام کرلے گا۔ اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ کیونکہ پولیس کو بالکل اطلاع نہیں ہوئی ہے۔''

''تم اس کام کے لیے اتنے پیسے دے دیتے ہو؟'' جمی کو حیرت ہوئی۔

''موٹی اسامی ہے۔ موٹا تاوان ہے۔ چار لاکھ کیا چیز ہیں۔''

''تم اپنا آدمی بھیج کر کیوں نہیں پیسہ وصول لیتے۔ تمہارے چار لاکھ بھی بچ جائیں گے۔''

''ہر کام کا اپنا انداز اور طریقہ ہوتا ہے۔ تم بتاؤ میری پیشکش سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو، یا نہیں۔'' نواز نے کہا۔

جمی نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے...... تاوان کی رقم تنویر لینے جائے گا۔'' جمی نے کہا تو تنویر نے چونک کراس کی طرف دیکھا۔

''تو پھر بات پکی...... مجھے چار لاکھ روپے دو۔ میں آج ہی کام شروع کرتا ہوں اور کل جب یہ تاوان کی رقم وصول کرلے گا تو تمہارے آٹھ لاکھ پورے ہوجائیں گے۔''

''میں ایک گھنٹے کے اندر پیسہ لے کر آتا ہوں۔'' جمی نے کہا اور وہ اجازت لے کر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی تنویر نے کہا۔

''یہ کیا کیا تم نے؟''

''کیا کیا ہے میں نے؟'' جمی نے کہا۔

''میں تاوان کی رقم لینے جاؤں گا۔ جانتے ہو یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔'' تنویر کے لہجے میں خوف تھا اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''میں تمہارا ایسا میک اپ کروں گا کہ تم پہچانے نہیں جاؤ گے۔ اپنی جان بچانی ہے تو کچھ تو خطرہ لینا ہی ہے۔ ویسے بھی میں وہاں موجود ہوں گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو میرا وعدہ رہا کہ میں تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا۔'' تنویر نے انکار کردیا۔

''میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تم پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔ اب تم ریلیکس ہوجاؤ۔ اور تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ تمہاری تصویر جیب میں ڈالے پھر رہا ہے۔ ہمارا کام کرنے سے بھی پہلے اس نے یہ کہا کہ ہم تمہیں ان کے حوالے کرکے ان سے پانچ لاکھ روپے لے لیں۔ دو لاکھ مجھے دے رہا تھا وہ۔ لیکن میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہاری جان بچا کر رہوں گا۔ اپنی جیب سے تمہارے لیے چار لاکھ روپے خرچ کررہا ہوں اور تم اپنے لیے چار لاکھ کا

بندوبست نہیں کرسکتے۔'' جمی کے لہجے میں متانت تھی۔

تنویر چپ ہوکر سوچنے لگا۔ ویسے بھی اس وقت اسے اپنی حیثیت اس تنکے کے مانند محسوس ہورہی تھی... جو پانی کے تیز بہاؤ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ تنکا خود اپنے آپ کو بچانے کی طاقت نہیں رکھتا اسے تیز بہاؤ بچالے تو بچا لے۔

جمی چلا گیا۔ تنویر اس گھر میں اکیلا رہ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ پریشان ہوگیا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

☆☆☆

جمی جب واپس آیا تو اس نے بتایا کہ اس نے نواز کو چار لاکھ روپے ادا کردیے ہیں۔ تنویر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ جمی کتنا مخلص انسان ہے۔ وہ محض اسے بچانے کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کے ساتھ مالی طور پر بھی اس کی مدد کررہا ہے۔ اس نے بھی اس کام کے لیے رضامندی ظاہر کردی۔ جمی نے اسے حوصلہ دیا اور کسی کو فون کرنے لگا۔

آدھے گھنٹے کے بعد دو آدمی آگئے۔ ایک نے تنویر کو وگ اور ہلکی مونچھیں اور داڑھی لگا کر ایسا میک اپ کیا کہ تنویر نے جب اپنا جائزہ آئینے میں لیا تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچانا۔ تنویر کی آنکھوں میں لینز لگائے تھے اور اب اس کی آنکھیں نیلی ہوگئی تھیں۔

اس کے بعد اسی حلیے میں تنویر کی تصویر بنائی گئیں۔ کچھ کاغذات پر دستخط ہوئے اور وہ چلے گئے۔

جمی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا کیسا حلیہ بنایا ہے کہ تم خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان سکو گے۔''

''واقعی...... مجھے بھی نہیں لگ رہا ہے کہ یہ میں ہوں۔'' آئینے میں دیکھتے ہوئے تنویر کو خود یقین نہیں ہورہا تھا۔

''اب تم اسی حلیے میں رہو گے۔''

''کیا مطلب؟''

''میرا مطلب ہے کہ انہوں نے آج رات کو بزنس مین کی رہائی کے بدلے میں تاوان لینا ہے، اور تم اسی حلیے میں ان سے تاوان لینے جاؤ گے۔'' جمی نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

''لیکن وہ تو کل کا کہہ رہے تھے؟''

''یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اس بات کا مطلب کچھ اور ہی ہوتا ہے۔'' جمی نے کہا۔

''جمی بھائی مجھے ابھی سے خوف محسوس ہونے لگا

کس کام کے

ایک دفعہ ایک صاحب نے اپنے شرابی دوست سے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ہر ماہ سو روپے دیا کروں، مگر ایک شرط پر کہ تم شراب پینا چھوڑ دو گے۔'' شرابی دوست نے ہنس کر جواب دیا۔ ''تو پھر آپ کے یہ سو روپے ماہوار میرے کس کام آئیں گے؟''

تحفہ

ایک صاحب ملبوسات کی دکان میں داخل ہوئے اور سیلز مین سے زنانہ سوٹ دکھانے کے لیے کہا۔

سیلز مین نے ایک نظر ان کے سراپا پر ڈالی اور پوچھا۔ ''آپ کو اپنی بیگم کے لیے سوٹ لینا ہے یا کچھ عمدہ سے سوٹ دکھاؤں؟''

ارسال: عروج عارف، کراچی

ہے۔'' تنویر گھبرایا ہوا تھا۔

''ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ میں اسی جگہ دائیں بائیں ہوں گا۔ بس تم کام کرنا اور ہم نکل جائیں گے۔''

''سچ یہ ہے کہ آپ نے میرے لیے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ بس اس لیے ہمت پکڑ رہا ہوں۔ جب آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا ہے تو مجھے بھی اپنے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا اور دبئی جاکر پیسہ کماؤں گا اور آپ کا پیسہ آپ کو واپس کروں گا۔'' تنویر نے کہا۔

''مجھے اپنے پیسے واپس نہیں لینے۔ بس تم خیریت سے دبئی چلے جاؤ اور پھر اپنے گھر والوں سے رابطہ کرکے ان کو بتانا کہ تم دبئی میں ہو اور پیسہ کما کر ان کو بھیجنا بس میرے لیے یہی کافی ہے۔'' جمی نے کہا۔

''ویسے میں کب تک دبئی چلا جاؤں گا۔''

''زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ......''

''ابھی ایک ہفتہ اور مجھے کانٹوں پر چلنا ہوگا۔''

''فکر نہیں کرو سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' جمی نے اسے تسلی دی۔ ''ابھی کچھ دیر میں نواز آنے ہی والا ہوگا۔ وہ تمہیں سارا منصوبہ سمجھائے گا کہ کیسے پیسے لینے ہیں۔ تم وہ سب غور سے سمجھ لینا اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے تیار کرلینا۔ پھر تم وہ کام آسانی سے کرلو گے۔''

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L - 5 / 79 ڈاکخانہ L.5 / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

''اگر وہاں پولیس آ گئی تو؟'' تنویر نے اپنا اندیشہ بیان کیا۔

''بے فکر رہو۔ میں سائے کی طرح تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' جمی نے اسے یقین دلایا۔

''مجھے تم پر بھروسا ہے۔''

''اگر بھروسا ہے تو بے فکر ہو کر کام کرو۔'' جمی نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور تنویر ہولے سے مسکرا دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد نواز آ گیا۔ اس نے بغیر وقت ضائع کیے ایک چھوٹا سا نقشہ میز پر پھیلا دیا۔ نواز کے ہاتھ میں پنسل تھی اور وہ نقشے پر پنسل رکھتے ہوئے سمجھانے لگا۔ جمی اور تنویر بغور نقشے کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ شہر کا مشہور پرائیویٹ عدیل اسپتال ہے۔ اس اسپتال سے دو سو گز کے فاصلے پر یہ بس اسٹاپ ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی سڑک کی اس جانب سے دوسری جانب جانے کے لیے پل بنا ہوا ہے۔ تمہارے پاس ایک موبائل فون ہوگا۔ موبائل فون تمہاری جیب میں ہوگا اور اس کا ہینڈ فری تمہارے کان میں ہوگا۔ میں تمہیں ہدایت جاری کر رہا ہوں گا کہ تم کو کیا کرنا ہے۔ تم بس اسٹاپ کی طرف سے پل پر چڑھنے والی سیڑھیوں سے اوپر جاؤ گے۔ دوسری طرف کی سیڑھیوں سے وہ آدمی چڑھے گا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر بیگ ہوگا۔ اس نے کالا کوٹ پہنا ہوگا اور کوٹ کے کالر پر سرخ گلاب کا پھول ہوگا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر بیگ کے اندر ہماری مانگی ہوئی رقم ہوگی۔ تم دونوں جیسے ہی اوپر جاؤ گے تم اسے سامنے سے آتا ہوا دیکھ لو گے یہ وہی ہے۔ کیونکہ اس کی نشانیاں میں نے تمہیں بتا دی ہیں۔ جیسے ہی وہ تمہارے برابر سے گزرے گا۔ تم آہستہ سے اسے کہو گے۔ گلاب کا پھول اچھا ہے۔ وہ اسی وقت... شاپنگ بیگ تمہاری طرف بڑھا دے گا اور تم وہ بیگ پکڑ کر دوسری طرف سے نیچے اترو گے اور سیدھے چلتے ہوئے اسپتال کے گیٹ کے سامنے پہنچ جاؤ گے۔ وہاں سیاہ رنگ کی کار کھڑی ہوگی۔ جس کا نمبر گیارہ ہوگا۔ تم اس کار میں بیٹھ جاؤ گے' وہ کار تمہیں اسی گھر میں چھوڑ دے گی جبکہ شاپر بیگ ہم کار میں سے ہی تم سے لے لیں گے۔''

''اس کار میں کون ہوگا؟'' جمی نے پوچھا۔

''اس کار میں میرا ڈرائیور اور میں ہوں گا۔'' نواز نے بتایا۔

''تم کو یقین ہے کہ انہوں نے پولیس کو اطلاع نہیں کی ہوگی۔'' جمی نے اپنی تسلی چاہی۔

''دو سو فیصد یقین ہے۔ کیونکہ وہ دو نمبر کاروبار کرتے ہیں۔ ان کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ پولیس کو اس معاملے میں کسی قیمت پر بھی ملوث نہیں کریں گے۔ وہ رہائی کے لیے ہماری مطلوبہ رقم دینے کو تیار ہیں۔'' نواز نے بتایا۔

جمی نے اپنا چہرہ تنویر کی طرف کیا۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ کوئی مشکل ہوگی۔ میں بھی اس جگہ موجود ہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ کام آسانی سے کر لو گے۔''

''میں کوشش کروں گا۔'' تنویر کے دل میں خوف تھا۔

''ہمارے کام میں کوشش نہیں ہوتی، کام ہوتا ہے اور وہ بھی پوری طاقت اور ہمت سے۔ لہٰذا تم یہ کام کرو گے۔ بالکل نہیں ڈرو گے، کچھ نہیں ہوگا۔'' نواز نے جلدی سے کہا۔

''جی......'' تنویر نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے بعد نواز نے اور بھی ہدایات دیں اور چلا گیا۔

☆☆☆

تنویر کے لیے ایسا کام کرنا سوہانِ روح تھا لیکن وہ اس کام کو کرنے کے لیے ذہنی طور پر مکمل تیار تھا۔ اس نے بہت حد تک اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا اور اپنے دماغ میں یہ بات بٹھالی تھی کہ اسے یہ کام کرنا ہے۔

جیسے جیسے اندھیرا چھا رہا تھا، خوف رینگتا ہوا اس کے قریب آ رہا تھا، وہ اپنا سر جھٹک کر خوف کو دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں جمی آ گیا اور بولا۔

''چلو نکلیں۔''

تنویر کا دل زور سے دھڑکا اور وہ اس کے ساتھ کار میں بیٹھ کر عدیل اسپتال کے پاس پہنچ گیا۔ جیسے ہی کار گیٹ سے کچھ فاصلے پر رکی، کار کا دروازہ کھلا اور نواز اندر بیٹھ گیا۔ اس نے موبائل فون اور ہینڈ فری تنویر کی طرف بڑھا دیا۔

''اسے کان سے لگا لو اور موبائل فون جیب میں ڈال لو۔ میرا تم سے مستقل رابطہ رہے گا۔ فون مسلسل آن رہے گا اور جو میں کہتا رہوں تم کرتے رہنا۔'' نواز بولا۔

تنویر نے فون جیب میں ڈال لیا اور ہینڈ فری کان سے لگا لیے۔ فون آن تھا۔ نواز نے کہا۔

''کار سے باہر جاؤ اور بس اسٹاپ کی طرف چلے

جاؤ۔"

تنویر کار سے باہر نکل کر بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگا۔ اسے مناسب رفتار سے آگے جانے کی ہدایت تھی۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھا اور سڑک کے دائیں بائیں فٹ پاتھ پر لوگ آ جا رہے تھے۔ وہ چلتا ہوا بس اسٹاپ کے پاس پہنچا تو وہاں چند سواریاں کھڑی تھیں۔

"ان لوگوں میں رک جاؤ۔" نواز کی ہدایت آئی۔

تنویر وہاں پر موجود چند لوگوں کے درمیان رک گیا۔

تنویر تقریباً پانچ منٹ تک وہاں کھڑا رہا۔ میک اپ کے باوجود اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی پہچان نہ لے۔ پھر نواز کی آواز اس کے کان میں پڑی۔ "پل کی طرف چلو۔ رفتار ویسی رکھنا۔"

تنویر پل کی طرف چلنے لگا۔ جیسے ہی وہ سیڑھیوں کے پاس ... پہنچا، نواز نے اگلی ہدایت دی۔ "کچھ دیر کے لیے رکو اور اپنا جوتا ایسے چیک کرو جیسے جوتے کا کیل تنگ کر رہا ہو۔"

تنویر رک گیا۔ اس نے بایاں پیر اُٹھا کر جوتے کو ایسے دیکھنا شروع کیا جیسے وہ کچھ تلاش کر رہا ہو۔ اس کے ساتھ وہ اپنے ہاتھ سے جوتے کو چھو بھی رہا تھا۔ ایک منٹ کے بعد نواز کی پھر آواز آئی۔

"اب دھیرے دھیرے اوپر چڑھو......"

تنویر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے اوپر جا رہا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور خوف نے یکدم سے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ نواز کی آواز آئی۔

"وہ بھی سیڑھیاں چڑھ رہا ہے۔ وہ اوپر پہنچ چکا ہے تم بھی ذرا جلدی کرلو اور سامنے دیکھنا۔ اس نے ہاتھ میں سفید پھولا ہوا شاپر پکڑا ہوا ہے، سیاہ کوٹ ہے اور کوٹ پر سرخ گلاب کا پھول لگا ہے۔"

ہدایت سنتے ہی تنویر جلدی سے اوپر گیا تو سامنے ایک نوجوان اسی کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید پھولا ہوا شاپر تھا۔ پل پر اور بھی لوگ آ جا رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے، تنویر کا خوف بھی دو چند ہوتا جا رہا تھا اور اسے لگ رہا تھا جیسے وہ یہ کام نہیں کر سکے گا۔ گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے اس کی آواز نہیں نکلے گی۔

وہ نوجوان اور بھی پاس آ گیا۔ جونہی دونوں برابر سے گزرنے لگے، تنویر نے ہمت کی اور آہستہ سے بولا۔

"گلاب کا پھول اچھا ہے۔"

یہ سنتے ہی اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا شاپر اس کی طرف ایسے بڑھایا کہ کسی کو محسوس بھی نہیں ہوا اور تنویر نے اس کے ہاتھ سے شاپر بیگ لے لیا۔ دونوں اپنی اپنی جانب چلے گئے۔

"شاپر لے لیا۔" نواز کی آواز آئی۔

"جی لے لیا ہے۔" تنویر نے جواب دیا۔

"اب جلدی سے نیچے اترو اور اس کار کی طرف بڑھتے چلے جاؤ۔" تنویر نے رفتار بڑھا دی اور دوسری طرف سے سیڑھیاں اتر کر سڑک کی دوسری جانب چلا گیا۔ اب اس کا رخ اسپتال کے گیٹ کی طرف تھا جہاں وہ کار کھڑی تھی جس میں اسے بیٹھنا تھا۔

تنویر کا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی وہ سینے کا پنجرہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس کے لیے قدم اُٹھانا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ کچھ دور اسے گیارہ نمبر کی کار کھڑی دکھائی دی۔ اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کرلی۔

جونہی وہ کار کے پاس پہنچا، اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کے برابر نواز بیٹھا تھا۔

"بہت خوب...... تم نے ٹھیک کام کیا ہے۔" نواز خوش ہو کر بولا۔

تنویر نے کانپتے ہاتھوں سے شاپر نواز کی طرف بڑھا دیا، ٹھیک اس وقت تنویر کی دوسری طرف والا دروازہ کھلا اور ایک صحت مند شخص کار کے اندر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ نواز کے پیچھے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا پستول نواز کی پسلی کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"گیم از اوور۔"

"تم......؟" نواز نے اس کی طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ جبکہ تنویر کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھا تھا اسی جگہ ساکت ہو گیا۔

"کار چلاؤ۔" اس شخص نے حکم دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے آدمی نے کار آگے بڑھا دی۔

وہ شخص بولا۔ "یہ بات ذہن میں رکھنا کہ پیچھے جو کار آ رہی ہے، اس میں میرے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ذرا گڑبڑ ہوئی تو ہماری طرف سے بہت بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" نواز نے بارعب آواز میں پوچھا۔

''تم ہماری مسلسل نگرانی میں تھے۔ اس لیے حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم یہاں کیا کر رہے تھے۔'' پھر اچانک اس نے تنویر کی طرف دیکھا۔ ''یہ کون ہے؟''

''تم سے مطلب؟'' نواز غصے سے بولا۔

''یہ بات یاد رکھو کہ میرے پستول کے دانتوں میں جو گولیاں ہیں، وہ تمہارے جسم میں منتقل ہو جائیں گی اگر تم نے اپنا لہجہ ایسا ہی رکھا۔'' اس بار اس شخص نے اپنا لہجہ درشت کیا تو نواز بھی ڈھیلا ہو گیا جبکہ تنویر اور بھی زیادہ خوفزدہ ہو گیا۔

''بتاؤ یہ کون ہے؟'' اس بار بھی اس شخص کا لہجہ درشت تھا۔

''یہ کرائے کا ٹٹو ہے۔'' اس بار نواز کو نرمی سے بولنا پڑا۔

''اپنے کام کے لیے کرائے کے ٹٹو بھی لینے لگے ہو۔'' اس شخص نے گہری نظروں سے تنویر کا جائزہ لیا۔ تنویر سہم گیا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا اور اس کی ٹارچ روشن کرنے کے بعد تنویر کے چہرے پر ڈالی اور پھر بولا۔ ''اس کی مونچھ داڑھی جعلی ہے۔''

تنویر اور بھی خوفزدہ ہو کر نظریں چرانے لگا۔ نواز بولا۔ ''اس کی مونچھ داڑھی جعلی ہے یا اصل...... تم کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''ہاں مجھے تو تم سے مطلب ہے۔'' اس نے موبائل کی ٹارچ بند کر کے موبائل فون جیب میں ڈالا اور نواز کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تاوان کی کتنی رقم لی ہے تم نے۔''

''کہیں بیٹھ کر بات کریں۔'' نواز نے جواب دینے کے بجائے اسے پیشکش کی۔

اس آدمی نے سوچا اور پھر ڈرائیور کو تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''کار ٹاور کی طرف لے جاؤ...... تجھے پتا ہے ناں کہ میں ٹاور کسے کہتا ہوں۔ نواز اگر بیٹھ کر بات کرنا چاہتا ہے تو میں بیٹھنے کو تیار ہوں۔''

ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کار کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ کار سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی اور کار کے اندر مکمل خاموشی تھی۔ تنویر کا ڈر اور خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اچانک اس شخص نے تیز لہجے میں کہا۔ ''کار روکو......''

ڈرائیور نے یکدم کار روک دی۔ کار کے ٹائر چیخے اور اس شخص نے تنویر کو حکم دیا۔ ''تم نیچے اترو...... اور بھاگو یہاں سے، تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس شخص نے تنویر کے پاس پڑا وہ شاپر بیگ بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔

تنویر نے اسی وقت کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ کار کا دروازہ بند ہوتے ہی کار پھر آگے بڑھ گئی۔ اس کے پیچھے وہ کار بھی تھی جس کے بارے میں اس شخص نے کہا تھا کہ پیچھے آنے والی کار میں اس کے آدمی بیٹھے ہیں۔ وہ کار تنویر کے سامنے سے گولی کی طرح گزر گئی۔

تنویر اس جگہ اکیلا ہی کھڑا تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ اس وقت کباڑ مارکیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ شہر کی بہت بڑی کباڑ مارکیٹ تھی۔ اس مارکیٹ کے اندر بڑے بڑے گودام تھے۔ وہ جگہ تنویر کے گھر سے... کم از کم پچیس کلومیٹر دور تھی۔

تنویر سوچنے لگا کہ جمی نے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ سائے کی طرح ہوگا۔ اس لیے اسے اُمید تھی کہ جمی ابھی وہاں پہنچ جائے گا۔

بیس منٹ گزر گئے لیکن جمی نہیں آیا۔ وہ ٹہلتے ہوئے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس جگہ کچھ اندھیرا تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں وہ موبائل فون بھی ہے جو اسے نواز نے تاوان کی رقم لینے سے قبل دیا تھا۔

تنویر نے اپنی جیب سے موبائل فون نکالا اور سوچنے لگا کہ وہ کسے فون کرے۔ پہلا خیال یہی آیا کہ وہ اپنے گھر فون کر کے انہیں ساری حقیقت سے آگاہ کر دے۔ چنانچہ اس نے اپنے ابا کے موبائل فون کا نمبر ملایا اور جیسے ہی اسے کان سے لگایا اس کا چہرہ لٹک گیا کیوں کہ سم کارڈ میں بیلنس نہیں تھا۔ اچانک دو موٹر سائیکل سوار وہاں سے گزرے اور کچھ آگے جا کر پھر واپس تنویر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ تنویر نے دونوں کی طرف دیکھا اور ڈر کر دو قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اچانک ایک نے پستول نکالا اور اس کا رخ تنویر کی طرف کر دیا۔ تنویر ڈر گیا۔ جبکہ دوسرا نوجوان موٹر سائیکل سے نیچے اترا اور وہ تیزی سے تنویر کے پاس گیا اور بولا۔

''جو کچھ ہے جلدی نکال۔''

''میرے پاس کچھ نہیں ہے۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' اس نے درشت انداز میں کہا اور خود اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیب میں سوائے موبائل فون کے اور کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے موبائل فون لیا اور موٹر سائیکل پر سوار ہوتے ہی اس جگہ سے چلے گئے۔ تنویر اُڑے ہوئے رنگ کے ساتھ ان کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کے پاس موبائل فون آیا تو وہ بھی ڈاکو چھین

کر لے گئے۔

تنویر نے دائیں بائیں دیکھا، وہ جگہ بالکل سنسان تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کباڑ مارکیٹ کا عقبی حصہ تھا۔ جبکہ مارکیٹ اندر تھی اور بارونق سڑک دوسری جانب تھی اسی طرف سے لوگ کباڑ مارکیٹ میں آتے اور جاتے تھے۔ مارکیٹ کا یہ حصہ دن کو بھی تقریباً ویران رہتا تھا۔

جمی بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں دور تک اندھیرے میں اسے دیکھ کر واپس آجاتی تھیں۔ تنویر سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اپنے گھر چلا جائے؟ لیکن گھر جانا تو بہت خطرناک ہے۔ جمی بتا رہا تھا کہ اس کے گھر کے باہر بھی پہرا تھا۔ رات کو جگہ جگہ ناکے بھی لگ جاتے ہیں، اس میں بھی خطرہ تھا۔ اگر اس کی بات اس کے ابا سے ہو جاتی تو پھر شاید گھر جانے کی کوئی صورت نکل آتی۔

جب تنویر کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ کباڑ مارکیٹ کے اس چھوٹے گیٹ کی طرف چل پڑا جو اس جانب سے مارکیٹ کے اندر جانے کا راستہ تھا۔ ابھی وہ گیٹ کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اس کے عقب سے کسی نے زور سے آواز دی۔

''ابے رک......''

تنویر نے فوراً گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔ اس سے کچھ دور ہاتھ میں ٹارچ لیے کوئی کھڑا تھا۔ ٹارچ روشن تھی اور اس کی روشنی کی وجہ سے یہ دیکھنا مشکل تھا کہ وہاں کون کھڑا ہے۔

وہ پھر بارعب آواز میں بولا۔ ''یہیں رک جا......''

یہ کہتے ہی وہ اس کی طرف بڑھا۔ تنویر خوفزدہ ہو گیا اور اس نے اس جگہ رکنا مناسب نہیں سمجھا اور وہ گیٹ کی طرف بھاگا۔

وہ پھر چلّایا۔ ''کہاں بھاگ رہے ہو...... یہیں رکو......''

تنویر نے اپنی بھاگنے کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ وہ بھاگتا ہوا اس چھوٹے گیٹ سے کباڑ مارکیٹ کے اندر چلا گیا۔ اس گلی میں سارے شٹر بند تھے، تنویر نے بھاگتے ہوئے وہ گلی عبور کی اور دوسری گلی میں چلا گیا۔ وہاں بڑے بڑے گودام ابھی کھلے تھے اور روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ خالی پلاسٹک کی بوتلوں اور نہ جانے کس کس چیز کے وہاں انبار لگے ہوئے تھے۔ وہاں عجیب سی بُو کا بھی احساس تھا۔ تنویر وہاں سے بھاگتا ہوا ایک دوسری گلی میں چلا گیا۔ وہاں کئی گودام کھلے اور بند تھے۔ لوگوں کی چہل پہل بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتے ہوئے وہ ایک طرف سے نکلتے ہوئے نوجوان سے ٹکرا گیا۔ دونوں ایک طرف خالی پلاسٹک کی بوتلوں کے انبار پر گرے اور تنویر نے فوراً اُٹھنے کی کوشش کی۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید وہ جس سے ٹکرایا ہے، وہی ہے جس نے اسے رکنے کو کہا تھا۔

''دکھائی نہیں دیتا...... اندھے ہو؟'' وہ نوجوان چلّایا۔

تنویر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اُٹھ کر بھاگا۔ پیچھے سے وہ آدمی بھی بھاگتا ہوا اس طرف آ گیا تھا۔ وہ زور سے چلّایا۔

''کہاں تک بھاگو گے......''

تنویر وہ آواز سن کر اور بھی تیز بھاگنے لگا۔ وہ اندھا دھند بھاگتا رہا اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں داخل ہوتا رہا۔ اس کی سانس پھول چکی تھی اور اس سے مزید بھاگنا مشکل ہو رہا تھا۔ اچانک ایک طرف سے جمی نکلا اور تنویر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

تنویر نے بھاگتے ہوئے اپنے سامنے جمی کو دیکھا تو جیسے اس کے جسم میں جان آ گئی ہو۔ وہ بھاگتا ہوا اس کے سامنے رک کر ہانپنے لگا۔

''میرے ساتھ آجاؤ۔'' جمی کہہ کر اس کے آگے تیز تیز چلنے لگا۔ وہ چلتے رہے اور پھر جمی ایک گودام کے اندر چلا گیا۔ تنویر بھی اس کے پیچھے تھا۔

وہ وسیع گودام تھا۔ اس کے اندر جگہ جگہ کچھ فاصلے پر مختلف کباڑ کی چیزوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ گودام کے اندر ٹیوب لائٹس روشن تھیں اور دن کا سماں دکھائی دے رہا تھا۔

جمی نے ایک جگہ رک کر تنویر کی طرف گھوم کر دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کے پاس ہی ایک کرسی پڑی تھی۔ جمی اس پر بیٹھ گیا۔ تنویر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور اپنی سانس درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فی الحال اس سے بولنا دوبھر تھا۔ اچانک اس کی نگاہ جمی کے عین عقب میں پڑی تو اس کی خیرہ نگاہیں پھیل گئیں۔

جمی کے عقب میں اس کی وہ موٹر سائیکل کھڑی تھی جو چوری ہو گئی تھی۔ تنویر نے اپنی موٹر سائیکل کو پہچاننے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی۔

''یہ تو میری موٹر سائیکل ہے۔'' وہ حیرت زدہ بولا۔

جمی نے بھی اس نظر موٹر سائیکل کی طرف دیکھا اور

بولا۔ ''یہ کباڑ مارکیٹ ہے، یہاں کچھ بھی بک سکتا ہے اور خریدا جا سکتا ہے۔''

''یہ گودام تمہارا ہے؟''

''نہیں میرے دوست کا ہے۔''

''اپنے دوست سے پوچھو کہ میری موٹر سائیکل یہاں کیسے آئی؟'' اس نے کہا۔

جمی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''صرف یہ جاننا چاہتے ہو کہ یہ موٹر سائیکل کیسے آئی...... یہ نہیں جاننا چاہو گے کہ تم اس حال کو کیسے پہنچے......؟''

جمی کی بات نے تنویر کو دم بخود سا کر دیا۔ جمی اپنی جگہ سے اُٹھا اور سامنے کی طرف چل دیا۔ وہاں ایک بڑا کیبن بنا تھا جس کی دیواریں شیشے کی تھیں۔ آر پار کچھ بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ جمی اندر چلا گیا۔ اس کیبن میں ایک بڑی میز اور گھومنے والی کرسی بچی تھی جبکہ اس میز کے سامنے دائیں اور بائیں کرسیوں کی چھوٹی قطاریں تھیں۔

تنویر بھی اس کے پیچھے ہی اس کیبن میں آ گیا تھا۔ جمی کرسی پر بیٹھ کر دھیرے دھیرے دائیں بائیں جھوم رہا تھا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟'' تنویر متحیر اس کی...... طرف دیکھ رہا تھا۔

جمی اطمینان سے بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

تنویر اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں جمی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور جمی آہستہ آہستہ مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔

''کیسی مزے کی زندگی تھی تمہاری...... اپنی جاب پر جاتے تھے۔ اپنی منگیتر کے ساتھ گھومتے تھے۔ اور جو من میں شرارت آتی تھی، وہ کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ بہت خوبصورت شب و روز تھے۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟'' تنویر کی حیرت دو چند ہو گئی۔

''پھر اچانک تمہاری موٹر سائیکل چوری ہو گئی اور تم بس میں آنے جانے لگے۔ اور پھر ایک اور دھما کا ہوا کہ تم نوکری سے بھی فارغ ہو گئے اور ایک دن کسی ظالم نے تمہیں بس میں سوار کرانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر چھوڑ دیا، تم زخمی ہو گئے۔''

''یہ سب باتیں میں نے تمہیں نہیں بتائیں تم کیسے جانتے ہو۔'' تنویر کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے

عورت

ایک ہاتھ میں لپ اسٹک، دوسرے میں موبائل، ایک کان کوکر کی سیٹی پر، دوسرا واٹس ایپ کی نوٹیفکیشن پر، ایک آنکھ ٹی وی پر، دوسری شوہر کی حرکتوں پر...... کون کہتا ہے عورت کی زندگی ''آسان'' ہے۔

ہوا کا رخ

ایک لڑکی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ گھوم رہی تھی کہ اچانک اس کا شوہر آ گیا اور بوائے فرینڈ کو مارنے لگا۔ لڑکی نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''مارو کمینے کو دوسروں کی بیوی کو گھمانے لے آتا ہے۔''

اتنے میں بوائے فرینڈ کو ہوش آ گیا اور وہ شوہر کو مارنے لگا۔ لڑکی پھر بولی۔

''مار کم بخت کو، نہ خود گھمانے لے جاتا ہے اور نہ کسی کو گھمانے دیتا ہے۔''

چڑیل

بیوی شوہر سے۔ ''جب تم بھنگ پی کر آتے ہو تو مجھے بیلی کہتے ہو اور چرس پی کر آتے ہو تو مجھے مُنّی کہتے ہو، اور شراب پی کر آتے ہو تو شیلا کہتے ہو۔ آج چپ کیوں ہو؟ ڈارلنگ......''

شوہر۔ ''آج میں ہوش میں ہوں چڑیل......''

مرحا گل، دراہن

چہرے پر متانت تھی۔

''آگے سنو۔'' جمی اطمینان سے بولا۔ ''ادھر تم نوکری سے فارغ ہوئے اور ادھر تمہارے ہونے والے سسر جو رشتے میں تمہارے خالو بھی تھے، ان کی زندگی میں اچانک تبدیلی آئی اور انہیں ایک بڑے گروپ نے اپنی کمپنی میں نوکری دینے کی پیشکش کر دی۔ بڑا گروپ اور پہلے سے کہیں زیادہ تنخواہ...... بھلا کون اس نوکری کو قبول نہ کرتا۔ تمہارے خالو نے بھی وہ نوکری قبول کر لی اور پھر کمپنی نے انہیں کار اور گھر بھی دے دیا۔ اس سے ان کی زندگی ہی تبدیل ہو گئی۔ انہیں اپنا ماضی کتاب کا وہ صفحہ دکھائی دینے لگا جسے وہ پھاڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے کیونکہ تمہاری منگیتر عروسہ کا باپ بڑے لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا تھا۔''

جمی نے اس کی طرف دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر

مسکراہٹ عیاں کی اور دم بخود تنویر کے ساکت چہرے پر اپنی نظریں جما کر بولا۔

''کمپنی کے جی ایم کے گھر اس کے بیٹے کی سالگرہ تھی۔ اس سالگرہ میں خصوصی طور پر عروسہ کی فیملی کو مدعو کیا گیا۔ جی ایم صاحب اور ان کی بیگم چاہتی تھیں کہ اب ان کا بیٹا شادی کر لے۔ وہ سالگرہ کی اس تقریب میں جس لڑکی پر بھی ہاتھ رکھے گا وہ اس سے شادی کرنے میں روکاٹ نہیں بنیں گے۔ عروسہ کی خوبصورتی سب سے بڑھ کر تھی اور جی ایم کے بیٹے کو عروسہ پسند آگئی اور یوں ان کی منگنی کی بات آگے بڑھی۔ عروسہ کے ماں باپ کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ تو پہلے ہی اپنے ماضی سے بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے تم سے منگنی توڑنے اور اس سے رشتہ جوڑنے میں دیر نہیں کی۔ جی ایم کا بیٹا عامر میرا دوست ہے۔''

ایک لمحے کے لیے جمی چپ ہوا اور پھر بولا۔

''تم خود اس تقریب میں گئے اور عروسہ کی منگنی دیکھی اور تڑپ اُٹھے۔ اس وقت تمہارے چہرے پر کرب کے جو تاثرات تھے وہ ناقابلِ فراموش تھے۔''

''تم ہو کون؟'' تنویر نے اس کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت تنویر کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

''ابھی آگے تو سنو'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''تمہیں انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور وہاں تم پر قتل کا الزام لگ گیا۔ اس کے بعد اب تک تم بھاگ رہے ہو۔ تمہارے اردگرد خوف اور ڈر کا دائرہ ہے۔ تم اس دائرے کے حصار میں کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر بھاگ رہے ہو۔ اپنی جان بچانے کے لیے تم وہی کر رہے ہو جو میں چاہ رہا ہوں۔ اس کے لیے خواہ تمہیں پولیس سے بچ کر بھاگنا پڑ رہا ہو، یا پھر ملک چھوڑنے کے لیے پیسے کا انتظام کرنے کے لیے تاوان کی رقم لینے جانا ہو، اب بھی تم ایک آواز پر بھاگ کھڑے ہوئے اور بھاگتے بھاگتے خوف اور ڈر کے دائرے میں بند یہاں تک پہنچ گئے ہو۔''

''کیا یہ سب تمہارا کیا ہوا ہے؟ اس سارے کھیل کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے؟'' تنویر نے پوچھا۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

''ہاں...... اس سارے کھیل کے پیچھے میرا ہاتھ ہے۔ میرے کہنے پر تمہاری موٹر سائیکل چوری ہوئی اور تم بسوں میں آنے جانے پر مجبور ہوگئے۔ میرے حکم پر تمہیں بس سے گرایا گیا، میرے کہنے پر تمہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ میرے کہنے پر عروسہ کے باپ کو اچھی نوکری ملی، عروسہ کی منگنی میرے دوست کے ساتھ ہوئی اور میرے کہنے پر اس فلیٹ میں انٹرویو کے لیے بلایا گیا، وہاں قتل کا ڈراما رچایا گیا۔ چوکیدار نے تمہیں پکڑا لیکن بھاگنے کا موقع دیا اور میں اچانک تمہارے سامنے آگیا۔ اس کے بعد میں تمہیں ڈراتا رہا، بھگاتا رہا، کبھی رات ڈھائی بجے جگا کر بھگایا، کبھی میرا ہی آدمی نواز تمہارے پاس آکر باہر لے جانے کا بندوبست کرنے آیا، میرے ہی کہنے پر تمہارا پولیس کی جانب سے جعلی اشتہار بنایا گیا اور جب تم تاوان کی رقم لے کر گاڑی میں بیٹھے تو وہ بھی ڈراما تھا۔ تاوان کی رقم لانا بھی ایک ڈراما تھا۔ سب ڈراما تھا اور اس ڈرامے میں ایک خوفزدہ، سہما ہوا، اور ڈر کا مارا ہوا نوجوان کٹ پتلی بنا ہمیں لطف اندوز کر رہا تھا۔'' جمی نے تیز لہجے میں کہا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ طاری ہوگئی تھی۔ اپنے سامنے بے بس اور ناچار تنویر کی صورت دیکھتے ہوئے بھی وہ لطف اندوز ہو رہا تھا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا......؟ میں نے کیا بُرا کیا تھا تمہارا کہ تم نے مجھے مسلسل اذیت، خوف اور ڈر میں مبتلا رکھا۔ میں ایک رات بھی ٹھیک سے سو نہیں سکا، میں پوری زندگی اتنا نہیں بھاگا جتنا تم نے مجھے بھاگنے پر مجبور کر دیا، تمہاری وجہ سے میری عروسہ مجھ سے دور ہوگئی۔ میری زندگی سے چلی گئی اور میرے والدین کا جانے کیا حال ہوگا۔'' تنویر چیختے ہوئے کہا۔

''اس کے تم خود ذمے دار ہو۔'' جمی نے ایک ایک لفظ رک رک کر ادا کیا۔ ''کوئی اور نہیں صرف تم ذمے دار ہو اپنی اس بربادی کے۔''

''میں ذمے دار ہوں؟ میں کیسے ذمے دار ہوں۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟'' تنویر کو سن کر حیرت ہوئی۔

''کیونکہ شرارت کرنا تمہیں اچھا لگتا ہے۔ تم نے ہی کہا تھا ناں کہ جب مجھے شرارت سوجھتی ہے تو پھر تب تک میرے ہاتھ میں کھجلی ہوتی رہتی ہے جب تک میں وہ شرارت کر نہ لوں۔''

تنویر اس کی بات سن کر سوچنے لگا کہ اس نے یہ بات کب کہی تھی۔ جمی کے منہ سے وہ الفاظ سن کر اسے دھچکا سا لگا جب کچھ خاموشی بڑھی تو جمی نے پوچھا۔

''کچھ یاد آیا؟''

''تم نے میری یہ بات کہاں سنی تھی؟'' تنویر نے حیرت کے غلاف سے جھانک کر پوچھا۔

''شکر ہے تمہیں یہ تو یاد ہے کہ تم نے یہ بات کہی تھی۔ میں تمہیں یاد دلاتا ہوں۔ دراصل وہ زیرِ تعمیر شاپنگ پلازا میرا ہی ہے۔ ہم اس دن وہ پلازا دیکھنے گئے تو ٹارچ بھول گئے۔ میں وہاں اپنے ایک دوست کے ساتھ رک گیا جب کہ میرا ملازم ٹارچ لینے چلا گیا۔ میری نئی ایک ہفتہ پہلے خریدی کار کھڑی تھی۔ میں کار سے کچھ فاصلے پر اپنے زیرِ تعمیر شاپنگ سینٹر کے اندر دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ تم عروسہ کے ساتھ تھے۔ تم میری نئی کار کو چھونا چاہتے تھے۔ عروسہ نے منع بھی کیا تھا۔ لیکن تم نے میری نئی چمچماتی کار پر لکیر کھینچ دی اور خوب خوش ہوئے۔ اس سڑک پر آگے ایک پیٹرول پمپ ہے۔ وہ میرے دوست کا ہے۔ میں نے فوراً فون کیا اور تمہاری موٹر سائیکل کا نمبر اور تم دونوں کے بارے میں بتایا۔ وہاں سے اس کا آدمی تمہارے تعاقب میں چلا اور تم دونوں کے گھر دیکھ کر مجھے بتا دیا۔ اس کے بعد میں نے تم سے شرارت کی، تم نے میری کار پر لکیر کھینچی اور میں نے تمہاری زندگی کے اردگرد خوف اور ڈر کا دائرہ کھینچ کر تم سے بہت کچھ چھین لیا۔ تمہارا سکون اور وہ سب کچھ جو تمہاری دسترس میں تھا۔''

جمی کا لہجہ کچھ درشت ہو گیا تھا۔ اپنی کار کے خراب کرنے پر اسے ایک بار پھر غصہ آ گیا تھا۔

تنویر کو سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ وہ ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا۔ پچھتاوا اُس کے چہرے سے عیاں ہونے لگا تھا۔ اس کی شرارت کا جمی نے ایسا بھیانک انتقام لیا تھا کہ وہ تہی دست ہو گیا تھا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ جمی اور اس کے آدمی اسے کس طرح سے اپنے انتقام کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ جمی کس ہوشیاری سے اس کا ہر پل چین اور سکون چھین رہا تھا۔

جمی بولا۔ ''تم نے میری نئی کار کو چھوا اور میں نے تمہاری زندگی چھو کر برباد کر دی۔ جاؤ اب چلے جاؤ۔ آج سے میرا ڈراما ختم...... میرا انتقام مکمل ہوا...... کل عروسہ کی میرے دوست کے ساتھ شادی ہے۔ عروسہ بھی بہت خوش ہے اور اس نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ شاید تمہارے خالو نے تمہارے گھر والوں کو بلایا ہو۔ تم بھی جانا اور اپنی آنکھوں سے اپنی بربادی کے مناظر دیکھنا اور پھر اس کی یاد میں رونا......'' وہ کہہ کر ہنسا۔

تنویر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اس وقت جمی کا ہنسنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ وہ بولا۔ ''تم نے میرے ساتھ بہت بُرا کیا ہے۔ میری ایک شرارت کا اتنا بڑا انتقام کہ تم نے میری زندگی برباد کر دی...... مجھ سے سب کچھ چھین لیا......''

جمی بے پروائی سے ہنسا۔ ''شکر کرو میں نے تمہاری جان بخش دی ہے ورنہ اپنی قیمتی چیز کی بربادی پر میں کسی کو صرف اتنی سزا نہیں دیتا جتنی تمہیں دی ہے۔''

''یہ سزا کم دی ہے تم نے...... مجھے برباد کر کے کہتے ہو کہ میری جان بخش دی ہے۔'' تنویر یکدم سے اُٹھا اور چیخا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔

''میرے حساب سے یہ کم ہی ہے۔ میں ابھی تمہیں اور بھگاتا اور تڑپانا چاہتا تھا لیکن میرے دوستوں کو تم پر ترس آ گیا اور ہم نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔'' جمی نے کہا۔

''لیکن جو تم نے میرے ساتھ کیا، اس کی سزا تجھے میں ضرور دوں گا۔'' تنویر سرعت سے اس کی طرف بڑھا اور اس کے گلے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ دونوں میں مزاحمت ہونے لگی۔ جمی اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنے لگا جبکہ تنویر کے سر پر خون سوار ہو چکا تھا، اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی بربادی کی راکھ سے اُٹھنے والے دھوئیں نے اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں۔ اس کی گرفت بڑھتی جا رہی تھی، اس مزاحمت میں میز پر پڑا سامان فرش پر گر کر بکھرنے لگا۔ جمی کا جسم بے جان ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی مزاحمت میں وہ جان نہیں رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اُبل کر باہر آ گئی تھیں اور چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

اس دوران اچانک باہر سے کوئی بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے ایک طرف سے لوہے کا مضبوط ٹکڑا اُٹھا لیا تھا۔ اس نے کیبن کے اندر آتے ہی تنویر کے سر پر وہ لوہے کا ٹکڑا مارا اور تنویر کے سر سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ تنویر نے اس کا گلا چھوڑ دیا اور اپنا سر تھام کر پیچھے ہٹ گیا۔

آنے والا نوجوان جلدی سے جمی کی طرف بڑھا۔ جمی مر چکا تھا۔ اس نے غصے سے تنویر کی طرف دیکھا۔ تنویر بھی فرش پر گر چکا تھا۔ خون اس کے سر سے جاری تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر تھا جب وہ عروسہ کے ساتھ کار پر لکیر کھینچ کر ہنستا ہوا موٹر سائیکل پر سوار جا رہا تھا...... اپنی اس شرارت سے وہ بہت خوش تھا اور عروسہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اسی منظر کو دیکھتے ہوئے اس کی آخری سانسیں ٹوٹنے لگیں اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

خونی رات

کبیر عباسی

گردش حالات کب... کیسے اور کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے... عقل حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔ حالات کی ستم ظریفی... مجرمانہ و سفاکانہ ذہنیت رکھنے والے شکاریوں کی خمار پسندی... وہ حریص طبع شکاری جال لیے پھر پھڑاتے پرندوں کی بو سونگھتے پھرتے تھے... ایسی ہی انہونی رات کی کہانی... جو ایک مظلوم... نہتے... لاچار اور معصوم کی زندگی کو تاریکیاں دے گئیں... جو گرفت میں آئے تو پھر سنبھلنے... نکلنے اور فرار کے تمام راستے مسدود ہوتے چلے گئے... انسانی بے بسی اور مجبوریوں کی دل گداز داستان... معاشرے میں رہتے بستے لوگوں کی زخم زخم کہانی...

ترمیم نقاب چھپے گھناؤنے چہروں کی کج ادائیاں... سرورق کی تیکھی کتھا

وہ دونوں سیڑھیوں سے نیچے اترے تو بہت سی نظروں نے اُن کا استقبال کیا۔ کچھ نظریں تو پل بھر میں ہی پلٹ گئیں مگر بہت سی نظریں اس پر جیسے ٹھہر کر رہ گئیں۔ اس نے ان نگاہوں سے الجھن محسوس کی۔ مگر اگلے ہی پل عامر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے کھینچا۔ اس کا نرم گداز ہاتھ پسینے سے تر تھا۔ عامر اسے کھینچتا ہوا نیچے لے گیا۔ نیچے پہنچنے تک کچھ مزید نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس نے اپنا ہاتھ نرمی سے عامر کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

ہال کا ماحول اس کے لیے مکمل اجنبی تھا۔ چاروں طرف سگریٹ کا دھواں اور پسینے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا جی متلانے لگا۔ عامر کچھ لڑکوں سے مل رہا تھا۔ ہال گو کے سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھا مگر رش کی وجہ سے اسے گھٹن ہونے لگی۔ وسیع و عریض ہال میں چار اسنوکر ٹیبل اور دو بلیئرڈ ٹیبل لگے تھے جن پر مختلف لوگ کھیل رہے تھے۔ اکثریت نوجوانوں کی تھی۔ کچھ لڑکے سائڈ پر لگی بینچ پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لڑکوں کی نظریں ہال میں نصب ایک بڑی سی ایل ای ڈی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جس پر بے ہودہ سا گانا چل رہا تھا۔ اس کی آواز بھی خاصی بلند تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے کان کے پردے پھٹنے لگے ہوں۔ مگر ہال میں بیٹھے لڑکوں کو جیسے اس کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ ان میں سے اکثر لڑکے اونچی آوازوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ بہت سے لڑکے اس کی طرح اسکول یا کالج یونیفارم میں تھے۔

عامر سے مل کے کچھ لڑکوں نے اس کی طرف بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عامر نے اُن سے اس کا تعارف کرایا۔

”یہ میرا دوست ہے صائم...... میرے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔“

”واہ یار، تمہارا دوست تو بڑا خوبصورت ہے۔“ ایک

لڑکے نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے لوفرانہ انداز میں کہا۔

یہ کمنٹ سن کے اس کے گال سرخ ہو گئے۔

''ہاں یار بالکل ''بچیوں'' کی طرح...... ایک اور لڑکے نے جملہ کسا۔ باقی لڑکے بھی ہنسنے لگے۔ ''بچیوں'' سے اس کی مراد لڑکیاں ہی تھیں۔

صائم کو اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بے چارگی سے عامر کی طرف دیکھنے لگا۔

''کوئی بھی اس کے متعلق ایسے بات نہیں کرے گا۔ یہ بالکل ممی ڈیڈی لڑکا ہے۔ مائنڈ کر جاتا ہے ایسی باتیں۔'' عامر نے مصنوعی رعب سے کہا۔ باقی لڑکے پھر ہنسنے لگے۔

وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا مگر اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر اسے ایسا لگا جیسے اس کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی ہو۔ اس کا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے منہ سے ایک لفظ ادا ہوا۔

''پانی......''

میوزک کی بلند آواز میں اس کی آواز تو کسی نے نہیں سنی مگر عامر نے اس کے ہلتے ہونٹ دیکھ لیے۔

''پانی پینا ہے....؟'' اس نے سوال کیا۔

اس کا سر اثبات میں ہل گیا۔

عامر کولر کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ لڑکے اس کے گرد آ کر کھڑے ہو گئے۔

ٹی وی پر گانا چل رہا تھا۔

''اللہ بچائے میری جان کہ رضیہ غنڈوں میں پھنس گئی۔''

ایک لڑکا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تھرکنے لگا۔ باقی لڑکے ہنسنے لگے۔

صائم نے ناگواری سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے جھٹکا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

''اوئے ہوئے، صائمہ کا غصہ تو دیکھو؟''

جس لڑکے کا اس نے ہاتھ جھٹکا تھا، وہ اس کا نام بگاڑتے ہوئے دوسرے لڑکوں سے بولا۔ اس کا انداز استہزائیہ تھا۔

اتنے میں عامر کولر سے اس کے لیے پانی لے آیا تھا۔ صائم نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لیا اور غٹاغٹ پی گیا۔ پانی پی کے اس کے حواس بحال ہوئے۔ اب وہ خود کو کافی پُراعتماد محسوس کررہا تھا۔

''عامر میں جارہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلتے ہو تو ٹھیک ہے ورنہ......''

اتنا کہہ کے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ منتظر نگاہوں سے عامر کو دیکھ رہا تھا۔

''صبر یار۔ ایک آدھ گیم تو کھیلنے دو۔ ان میں سے اب کوئی تمہیں تنگ نہیں کرے گا، میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں۔'' عامر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

صائم کی قوتِ ارادی بہت کمزور تھی۔ اس کی آنکھوں میں کشمکش کے تاثرات جھلکے۔ عامر اس کی کمزور قوتِ ارادی سے واقف تھا۔ اس کی آنکھوں میں جھلکتے تاثرات دیکھتے ہی وہ اسے ہلکا سا دھکا دے کے بینچ پہ بٹھاتے ہوئے بولا۔

''بس آدھے گھنٹے کی بات ہے یار تم بیٹھ کے گیم دیکھو پھر چلتے ہیں ہم۔''

''اوکے یار۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

اسے رضامند دیکھ کے اس کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات آگئے۔ وہ بڑی مشکل سے اسے یہاں لایا تھا اور اپنا مقصد پورا ہوئے بغیر اسے کیسے جانے دے سکتا تھا۔

''آؤ یار، کون کون کھیل رہا ہے؟'' صائم کی طرف سے بے فکر ہو کے اس نے اسٹک پکڑلی۔

ایک لڑکا اس کے پاس ہی بیٹھ گیا جبکہ باقی لڑکوں نے اسٹکس اٹھالیں۔

وہ دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ پہلی بار اسنوکر کلب میں آیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اسنوکر کا صرف نام ہی سنا تھا۔ دوسرے لڑکوں کی باتیں سن سن کے اسے بھی یہ کھیل کھیلنے کا اشتیاق تھا مگر اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ کسی اسنوکر کلب میں جاسکتا۔

صائم اور عامر دونوں فرسٹ ایئر کے اسٹوڈنٹس تھے اور ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ صائم سترہ سال کا ہوچکا تھا مگر اس کی ابھی مسیں تک نہیں بھیگی تھیں۔ وہ دبلے پتلے جسم کے ساتھ نازک سے نقوش کا مالک تھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھا مگر اس کی خوبصورتی میں ہلکی سی نسوانیت کی جھلک تھی۔

اس نے قدرے لمبے بال رکھ چھوڑے تھے جن کے باعث وہ پہلی نظر میں تو لڑکی ہی لگتا۔ مزاجاً بھی کافی شرمیلا واقع ہوا تھا۔ اس کے برعکس عامر کافی تیز طرار قسم کا لڑکا تھا۔

آج کالج میں ایک فری پریڈ کے دوران میں وہ کالج کے کیفے ٹیریا میں آبیٹھے تھے۔ ٹی وی پر اسنوکر کا میچ دکھایا جارہا تھا۔ وہ عامر سے اسنوکر کے متعلق پوچھنے لگا۔

اسنوکر میں اس کی دلچسپی دیکھ کے عامر کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ وہ اسے جوش و خروش سے اسنوکر کے متعلق بتانے لگا۔ صائم اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا مگر اسے کچھ خاص سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ عامر اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے بولا۔

''یار کیوں نا آج اسنوکر کلب چلیں، وہاں دیکھ کے تمہیں سب سمجھ آجائے گا۔''

''نہیں یار تمہیں تو پتا ہے امی میرے بارے میں کتنی فکرمند رہتی ہیں۔ چھٹی کے بعد میں مقررہ وقت پر گھر نہ پہنچوں تو وہ پریشان ہوجاتی ہیں۔''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ مقررہ وقت پر تم گھر پہنچ جاؤ گے۔'' عامر جوش سے بولا۔

''وہ کیسے؟'' صائم کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

''ہم ابھی کلب جاتے ہیں۔ چھٹی کے وقت سے پہلے اُدھر سے نکل جائیں گے۔ تم اپنے گھر چلے جانا۔'' اس نے فوراً حل نکالا۔

''تمہارا مطلب ہے کلاس بنک کرکے؟'' اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''ہاں یار ویسے بھی اب تو انگلش اور اسلامیات کا پیریڈ ہی تو رہتا ہے۔ وہ چھوڑ بھی دیے تو کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ بے فکری سے بولا۔

''نہیں یار......'' اس نے انکار کردیا تھا مگر اس کے انداز میں نیم رضامندی کی جھلک عامر نے محسوس کرلی تھی۔

اس نے کچھ اور زور دے کے آخرکار اسے کلب جانے پر تیار کر ہی لیا۔ اب وہ گیم کھیل رہا تھا اور ساتھ ساتھ صائم کو سمجھا بھی رہا تھا۔

صائم دلچسپی سے انہیں کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسے کافی حد تک گیم کی سمجھ آچکی تھی۔ ابتدائی گھبراہٹ پر وہ قابو پاچکا تھا۔ عامر کے منع کرنے کے بعد کسی لڑکے نے بھی اس کے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سو اب وہ کافی حد تک پُرسکون تھا مگر وہ ان دو آنکھوں سے بے خبر تھا جو کلب کے ایک طرف بنے کیبن کے شیشوں کے پیچھے کافی

دیر سے اس پر مرکوز تھیں۔

☆☆☆

وحید احمد کی آنکھیں کافی دیر سے اس پر جمی ہوئی تھیں مگر وہ اس کی طرف سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کی ساری توجہ کھیل کی جانب تھی۔

''یہ یہاں کیسے آگیا؟ اسے تو کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ یہ جگہ ہرگز اس کے قابل نہیں۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے تاسف سے سوچ رہا تھا۔

اچانک اس کے سامنے بیٹھے ذیشان علی نے اپنی نظریں کتاب پر سے ہٹائیں اور اسے دیکھا۔ اس کی پُرسوچ نگاہوں کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

''کیا سوچ رہے ہو ڈیئر؟'' اس کے چہرے پر نرم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''کچھ خاص نہیں ذیشان بھائی۔ بس قدرت کے کھیل دیکھ رہا تھا۔'' اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

ذیشان کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔ اس نے سراوپر کر کے درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔ تیز ہوا اس کے بالوں کو بکھیر رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک بند کتاب رکھی تھی جس کے درمیان اس نے اس جگہ ہاتھ رکھا ہوا تھا جہاں سے ابھی اس نے پڑھنا چھوڑا تھا۔ اس نے سفید رنگ کا کاٹن کا شلوار قمیص زیب تن کیا ہوا تھا۔ جو اس کی گوری رنگت پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔ لمبی داڑھی اور بالوں کے ساتھ وہ کافی وجیہہ لگ رہا تھا۔ اس کی عمر صرف بائیس سال تھی۔

وحید اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے چہرے پر جمی بچوں جیسی معصومیت دیکھ کے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک ڈاکو ہے۔

وحید بھی اس کا ہم عمر تھا۔ اسے اس ڈیرے پر آئے چند دن ہی ہوئے تھے۔ وہ ادھر خانساماں کے طور پر آیا تھا، مگر چند دنوں میں ہی ان میں گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ اکثر و بیشتر شام کے وقت جنگل کے اس الگ تھلگ گوشے میں آ کے بیٹھ جاتے تھے۔ وہ یا تو باتیں کرتے رہتے یا ذیشان کوئی کتاب پڑھتا رہتا اور وحید خاموشی سے اس کے ساتھ بیٹھ کے اسے دیکھتا رہتا۔

''ذیشان بھائی آپ سے ایک سوال پوچھوں...... آپ برا تو نہیں مانو گے؟'' وحید ڈرتے ڈرتے گویا ہوا۔

''واہ یار، اب تم مجھ سے بھی ڈرنے لگے ہو۔'' ذیشان نے آنکھیں کھول کے بغور اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

''میں بس آپ کے برا ماننے سے ڈرتا ہوں۔'' وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

''خیر پوچھو، تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟'' وہ پھر سے آنکھیں موند کے کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

''ذیشان بھائی، آپ...... آپ ڈاکو کیسے بنے؟'' وہ رک رک کے بولا۔

''اپنی ایک اچھی عادت کی وجہ سے۔'' اس نے اسی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے چند لمحوں کے توقف کے بعد جواب دیا۔

''اچھی عادت کی وجہ سے؟'' اس کی آنکھوں میں الجھن نمودار ہوئی۔ ''ایسی کون سی اچھی عادت ہے جس کی وجہ سے آپ ڈاکو بن گئے؟''

''ایک تھی ایسی عادت جس کی وجہ سے گاؤں کا ہر شخص میری عزت کرتا تھا۔ گاؤں کیا میں جہاں بھی جاتا لوگوں کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش ہوتی تھی۔ حالانکہ میں کوئی چوہدری یا وڈیرا نہیں تھا۔ ایک غریب آدمی تھا، بالکل تمہاری طرح۔'' وہ آنکھیں موندے کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر اس نے آنکھیں کھول کے وحید کو دیکھا۔

وہ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کے حیرت سے بولا۔ ''ایسی...... ایسی کون سی عادت تھی؟''

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مختصراً بولا۔ ''میری خوش لباسی۔''

اس کا جواب سن کے وحید کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہوگئیں۔ ''آپ خوش لباسی کی وجہ سے ڈاکو بن گئے؟''

''ہاں جی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اس بار اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''ذیشان بھائی پہیلیاں نہ بجھوائیں، مجھے صاف صاف بتائیں کہ آپ ڈاکو کیسے بنے؟'' وہ قدرے ناراضی سے بولا۔

''چلو یار آج تمہیں سب بتا ہی دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔

''میں گاؤں کے عام بچوں سے کافی مختلف تھا۔ اور اس کی وجہ میری ماں تھی۔ وہ شہر میں پلی بڑھی تھی۔ وہ میرے باپ کی پھوپی زاد بہن تھی۔ اس کی ماں یعنی میری نانی کی شادی شہر میں ہوئی تھی۔ ان کی ایک بیٹی تھی۔ وہ کالج میں پڑھ رہی تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اس کی

ماں اسے لے کے گاؤں آ گئی۔ وہاں اس کی شادی میرے باپ سے ہو گئی۔ وہ پڑھی لکھی تھی، اسے گاؤں کے ماحول میں خود کو ڈھالنے میں کچھ مشکل تو پیش آئی مگر آخر کار اس نے خود کو اس ماحول میں ڈھال لیا۔ میرے باپ کا گاؤں میں ہی جنرل سٹور تھا، ہمارا گزارا اچھا ہو رہا تھا۔ میری ایک بہن بھی ہے۔ زرتاج نام ہے اس کا۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹی ہے۔ میں اگر دنیا میں سب سے زیادہ کسی سے پیار کرتا ہوں تو وہ اپنی بہن سے ہی کرتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں بے پناہ پیار امڈ آیا تھا۔ وحید کو اس کی آنکھوں میں نمی بھی دکھائی دی۔

''ہماری ماں نے ہم دونوں بہن بھائیوں کی تربیت بہت اچھی طرح کی۔ گاؤں میں ایک ہی سرکاری اسکول تھا اور وہ بھی مڈل تک۔ وہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہاں پڑھائی تو گزارے لائق ہی تھی مگر ہماری ماں ہمیں گھر میں خود پڑھاتی تھی جس کی وجہ سے ہم دونوں پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ جب بھی ہمارا باپ شہر جاتا، وہ اسے کتابوں کی ایک لسٹ بھی پکڑا دیتی، ہمارے لیے بھی وہ بچوں کے رسائل منگوا لیتی تھی۔ مطالعے کی عادت مجھے انہی سے لگی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے گود میں رکھی کتاب کو دیکھا۔''

وحید اس کی کہانی کو پورے انہماک سے سن رہا تھا۔

''مڈل کے بعد میں دوسرے گاؤں میں ایک ہائی اسکول میں داخل ہو گیا، اس وقت زرتاج تیسری کلاس میں تھی۔ میں گاؤں کا پہلا بچہ تھا جس نے ہائی اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ ورنہ عام طور پر بچے پرائمری یا زیادہ سے زیادہ مڈل کے بعد تعلیم کو خیرآباد کہہ کہ اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بٹانے لگتے تھے۔ میری ماں کا ارادہ تھا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلائے گی، اس نے یہ خواب میری بھی آنکھوں میں بھر دیا تھا مگر ہمارے خوابوں کو کسی کی نظر لگ گئی۔ میں میٹرک کے پیپر زدے کے اپنے باپ کے ساتھ دکان پہ بیٹھنے لگا۔ میرا ارادہ رزلٹ کے بعد شہر کے کالج میں داخلہ لینے کا تھا۔ جس دن میرا رزلٹ آیا، اس دن میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ میں بہت اچھے نمبروں کے ساتھ پاس ہو گیا تھا۔ میرے باپ نے اس خوشی میں پورے گاؤں میں مٹھائی بانٹی تھی۔ اس رات میرے ماں باپ میرے مستقبل کے منصوبے بناتے رہے تھے، اگلے دن ہمیں شہر جا کے کسی کالج میں داخلے کی کوشش کرنی تھی۔ شہر جانے کی خوشی کے باعث میں پوری رات سو نہیں سکا تھا۔ مگر میں نہیں جانتا تھا کہ یہ خوشی میرے نصیب میں نہیں۔ اس صبح میرا باپ رفع حاجت کے لیے کھیتوں کی طرف گیا تو اس کی لاش ہی واپس آئی۔ اسے ایک انتہائی زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔''

اتنا کہہ کے اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ وحید کو اس کی آنکھوں میں گہری اداسی نظر آئی۔ وہ تھوڑے سے توقف کے بعد پھر گویا ہوا۔

''میرے خوابوں کا محل مسمار ہو گیا۔ گھر کی گاڑی کو دھکیلنے کے لیے مجھے اپنے باپ کی دکان سنبھالنی پڑ گئی۔ اب میرا ارادہ پرائیویٹ تعلیم جاری رکھنے کا تھا۔ دکان کا سامان لینے کے لیے مجھے اکثر و بیشتر شہر جانا پڑتا تھا۔ میں ایف اے کی کتابیں بھی لے آیا اور ان کی تیاری کرنے لگا۔'' اتنا بتا کے اس نے گہرا سانس لیا۔

''اس دن میرا ایف اے کا پہلا پیپر تھا، میں نک سک سے تیار ہو کے پیپر دینے نکل پڑا۔ گاؤں سے صبح صبح ایک بس شہر کو جاتی تھی میں اسی میں سوار تھا۔ میں ہمیشہ اپنے لباس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ یہ عادت مجھے میری ماں نے بچپن میں ڈالی تھی۔ وہ ہم دونوں بہن بھائیوں کو ہمیشہ کافی قیمتی لباس لے کے دیتی تھی۔ لباس کی وجہ سے ہم گاؤں کے دیگر بچوں سے بہت منفرد لگتے۔ دکان سنبھالنے کے بعد بھی میں ہمیشہ اپنے لباس کا خاص خیال رکھتا تھا۔ اپنی خوش لباسی کے باعث میں دیکھنے میں کافی دولت مند گھرانے کا فرد لگتا تھا اس وجہ سے ہر جگہ لوگ میری کافی عزت کرتے تھے مگر اس دن یہ خوش لباسی کی عادت ہی مجھے لے ڈوبی اور آج میں تمہارے سامنے ہوں۔'' یہاں تک پہنچ کے وہ رکا اور وحید کو دیکھنے لگا۔

وحید اسے رکتے دیکھ کے کسمسایا۔ ''وہ کیسے؟''

وہ اس کے ڈاکو بننے کے متعلق جلد از جلد جاننا چاہتا تھا اس لیے اس کے رکتے ہی بولا۔

''بس کو راستے میں ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ میرے حلیے کے باعث وہ مجھے کسی امیر گھرانے کا فرد سمجھے اس لیے مجھے ساتھ ہی لے آئے۔ ان کا خیال تھا کہ میرے گھر والے انہیں میرے بدلے اچھا خاصا تاوان دے دیں گے۔ مگر جب میرے بارے میں انہیں تفصیل پتا چلی تو وہ مایوس ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ مجھے چھوڑ دیں گے مگر یہ میری خام خیالی تھی۔ وہ مجھ سے کام لینے لگے۔ میں دیکھنے میں کافی شریف لگتا ہوں اس لیے عام طور پر جب یہ ڈاکا ڈالنے جاتے ہیں تو مجھے ساتھ لے جاتے ہیں، مجھے دیکھ کے عام طور پر کوئی بھی گاڑی والا ہو گاڑی روک لیتا ہے اور یہ اس

گاڑی کو لوٹ لیتے ہیں۔ بعض اوقات یہ مجھے کسی گھر میں داخل ہونے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں اور جب انہیں کسی خاص جگہ کے متعلق معلومات درکار ہوں تو تب بھی میں ہی ان کے کام آتا ہوں۔ شروع میں انہوں نے مجھے مکمل ڈاکو بنانے کی کوشش بھی کی۔ اس مقصد کے لیے وہ مجھے اسلحے کا استعمال سکھا رہے تھے مگر اپنی عدم دلچسپی کے باعث میں کچھ خاص سیکھ نہیں پایا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ اب تو لگتا ہے میرا مرنا بھی انہیں لوگوں کے ساتھ لکھا ہے۔'' اس نے چہرہ دوسری طرف کر کے اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کی۔

''اوہ، تو یہ ہے آپ کی کہانی۔'' وحید تاسف سے بولا۔ ''آپ کو اپنی ماں اور بہن کی کوئی خیر خبر ہے؟''

''پتا نہیں ان کے بقول تو ان میں سے ایک بندہ ان کو ہر ماہ رقم دینے جاتا ہے اور میرا حال احوال بھی انہیں بتا دیتا ہے، مگر پتا نہیں یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں یا نہیں؟'' وہ افسردگی سے بولا

''آپ نے کبھی بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟'' وحید نے اگلا سوال کیا۔

ذیشان اس کے سوال کا جواب دینے والا تھا کہ اچانک درخت کی اوٹ سے ایک شخص نکلا۔ وہ ڈاکو ہی تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ وہ انہیں معاندانہ نظروں سے گھور رہا تھا۔ وحید اسے دیکھتے ہی خوف سے اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ہراس تھا۔

☆☆☆

پہلا گیم کھیلنے کے بعد عامر، صائم سے بولا۔ ''کھیلو گے تم؟''

''مجھے کھیلنا نہیں آتا۔'' وہ شرماتے ہوئے بولا۔

''او میرے بھولے بادشاہ کھیلو گے تو کھیلنا آئے گا ناں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ ''چل پہلے تجھے بلیئرڈ کھلاتے ہیں۔ وہ چھوٹا سا ٹیبل ہے جلدی سیکھ جاؤ گے۔'' وہ اسے لے کے بلیئرڈ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی کوشش سے وہ شاٹ مارنا سیکھ گیا۔ عامر اسے ساتھ ساتھ بلیئرڈ کے اصول بتا رہا تھا اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کر رہا تھا۔

کیبن میں موجود شخص کی توجہ اتنی دیر سے صرف صائم پر ہی مرکوز تھی۔ اسے کھیلتا ہوا دیکھ کے اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

''اس بار عامر نے واقعی ہی کمال کر دیا ہے۔ کیا شاہکار ''پیس'' ڈھونڈ کے لایا ہے۔''

بار بار اس کے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا۔ ''اسے جا کے قریب سے دیکھتا ہوں۔'' یہ خیال آتے ہی اس نے کیبن کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

صائم نے ایک قدرے مشکل بال ''پاٹ'' کر کے داد طلب نظروں سے عامر کو دیکھا۔ عامر کی آنکھوں میں اس کے لیے ستائش ابھری۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چونک گیا۔ ایک شخص پاس کھڑا تالیاں بجا رہا تھا۔ وہ مناسب قد والا ایک شخص تھا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شلوار قمیص میں بھی اس کی توند کافی نمایاں نظر آ رہی تھی۔

''واہ، واہ بہت ہی زبردست شاٹ۔'' اس شخص نے کھل کے صائم کے شاٹ کی تعریف کی تو وہ شرما گیا۔

عامر نے اس شخص سے ہاتھ ملایا۔

''کمال بھائی، یہ میرا دوست صائم ہے۔'' اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے حال احوال دریافت کرنے کے بجائے صائم کا تعارف کرایا۔

کمال نے عامر کا ہاتھ چھوڑ کے صائم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''آپ کو پہلی بار ادھر دیکھ رہا ہوں؟'' اس کا ہاتھ تھام کے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مہذب انداز میں بولا۔

کمال کو اپنی طرف دیکھتا پا کے وہ شرما گیا۔ اس نے اپنی نظریں جھکالیں۔ وہ کچھ بولنا چاہ رہا تھا مگر اس کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

کمال دلچسپی سے اس کے چہرے پر بکھرتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی لڑکے کے چہرے کو شرم سے گلنار ہوتے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

''یہ آج پہلی بار اِدھر آیا ہے۔'' عامر نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے جواب دیا۔

''صائم یہ کمال بھائی ہیں اس کلب کے اونر۔ ویسے تو انہوں نے ایک منیجر بھی رکھا ہوا ہے مگر اکثر یہ خود بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔'' اس نے صائم سے کمال کا تعارف کرایا۔

صائم کا گریز دیکھ کے کمال نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اسے ڈر تھا کہ پنچھی جال میں پھنسنے سے پہلے ہی بدک نہ جائے۔

"تم عامر کے ساتھ ہی پڑھتے ہونا؟" اس نے صائم کو بلوانے کے لیے ایک سادہ سا سوال کیا۔

"جی۔" صائم نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"تم نے اسے بتایا ہے کہ نئے کھیلنے والوں کے لیے ایک ہفتہ ٹیبل فری ہے۔ ایک ہفتے تک ان سے کوئی پیسے وصول نہیں کیے جاتے؟" اس نے آنکھ میچتے ہوئے عامر سے سوال کیا۔

عامر اس کا اشارہ سمجھ گیا اور بولا۔ "اسلم بھائی نے تو یہ اصول ختم کر دیا تھا۔" اس نے کلب منیجر کا نام لیا۔

"اس نے ختم کر دیا ہوگا، میں نے تو ختم نہیں کیا۔ آپ ایک ہفتے تک فری کھیل سکتے ہو۔" اس نے صائم کی طرف دیکھ کے کہا۔

صائم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "شکریہ سر۔" وہ شرماتے ہوئے اتنا ہی کہہ سکا۔

"او کے گائز، تم لوگ انجوائے کرو میں چلتا ہوں۔" کمال نے صائم کا بازو تھپکا اور کیبن کی طرف چل دیا۔

صائم اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ ایک ہفتہ فری اسنوکر کھیلنے کی آفر سن کے وہ بہت خوش ہوا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ "فری آفر" اسے مہنگی پڑنے والی ہے۔

☆☆☆

ذیشان نے خوفزدہ انداز میں وحید کو اٹھتے دیکھا تو چونک گیا۔ اس نے وحید کی نظروں کے تعاقب میں نگاہ گھمائی تو اسے دوسری جانب ایک رائفل بدست ڈاکو نظر آیا۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

"تم لوگ اِدھر کیا کر رہے ہو؟" ڈاکو تحکمانہ انداز میں بولا۔

"کچھ خاص نہیں، اندر گرمی تھی تو اِدھر آ کے بیٹھ گئے۔" ذیشان نے نظریں جھکا کے دھیمے سے انداز میں جواب دیا۔

"تم اپنی ڈیوٹی بھول گئے ہو؟ اس وقت تم نے سب کو چائے پلانا ہوتی ہے۔" وہ وحید کی طرف مڑتے ہوئے غصیلے انداز میں بولا۔

وحید کی تو جیسے جسم سے جان نکال دی ہو۔ وہ بمشکل بولا۔ "میں...... میں ابھی جا کے بناتا ہوں۔"

اس نے اتنا کہتے ہی دوڑ لگا دی۔ ذیشان اسے بھاگتے دیکھ کے سوچ رہا تھا۔ "پتا نہیں یہ معصوم نوجوان کیسے اِن ظالموں کے ہتھے چڑھا؟"

ڈاکو نے رائفل سے اسے ٹہوکا دیا۔ "چل بے تو بھی اب اندر چل، نکل گئی ہوگی تیری گرمی اب۔" وہ کھردرے انداز میں بولا۔

ذیشان کو اس کا لہجہ ناگوار تو گزرا مگر وہ بے بس تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈیرے کی طرف چل دیا۔

ڈاکوؤں کا یہ ڈیرا ایک گھنے جنگل میں واقع تھا۔ ادھر کم و بیش دو درجن کے قریب ڈاکو رہتے تھے۔ جنگل کے ایک طرف سے ایک راستہ شہر کو جاتا تھا اس پر چند ڈاکو مستقل نگرانی کا کام سرانجام دیتے تھے۔ باقی اطراف سے جنگل لامتناہی علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار ڈاکوؤں کا کوئی ایک گروہ شہر کی طرف واردات کرنے جاتا تھا۔ بعض اوقات ذیشان کو بھی وہ ساتھ لے جاتے تھے۔ ان ڈاکوؤں کو کسی بااثر شخصیت کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ وہ انہیں اپنے مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتا تھا۔ اس شخصیت کا نام سردار کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کچھ اپنے مشاہدے اور کچھ دوسرے ڈاکوؤں کی بات چیت سے وہ چار سال میں ان کے بارے میں صرف اتنا ہی جان سکا تھا۔ وہ فطرتاً کافی کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والا نوجوان تھا۔ اس لیے اس نے کبھی کسی سے کوئی خاص بات چیت کی کوشش نہیں کی تھی۔ ڈاکو بھی کام کے علاوہ شاذونادر ہی اس سے کوئی بات کرتے تھے۔ جس طرح وہ اس کے لیے ناپسندیدہ تھے اسی طرح ذیشان کو بھی ان کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی کی جھلک واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔

ڈاکوؤں کا سردار ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی داڑھی اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ ذیشان کو بہت ڈراؤنا لگتا تھا۔ وہ بھی واردات پر نہیں جاتا تھا۔ بس اکیلا ہی ایک کمرے میں پڑا اینڈتا رہتا۔ بعض اوقات ڈاکو کسی واردات کے دوران کسی لڑکی کو بھی اغوا کر لیتے۔ ان دنوں تو سردار اس جھونپڑی نما کمرے سے بالکل باہر نہیں نکلتا تھا۔ جھونپڑی سے آتی دلدوز چیخیں ذیشان کو دہلائے رکھتیں۔ پتا نہیں اندر وہ ان لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا تھا کہ جب تک کوئی لڑکی جھونپڑی میں رہتی وقفے وقفے سے اس کی چیخیں بلند ہوتی رہتیں۔ چھ سات دن کے بعد اس لڑکی کو وہاں سے لے جایا جاتا۔ خدا جانے وہ لوگ اس کے بعد ان لڑکیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے تھے۔ ذیشان نے کبھی اس بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا۔

وہ چار سال سے ادھر تھا، شروع کے دنوں میں وہ

بہت بے چین رہتا تھا۔ اسے اپنی ماں اور بہن کی یاد بے طرح ستاتی۔ وہ ادھر سے بھاگنے کے منصوبے بناتا رہتا مگر وہ اپنے اندر کبھی اتنی ہمت ہی مجتمع نہیں کر سکا۔

وہ ایک ماہ تک تو ادھر بے کار ہی پڑا رہا۔ ڈاکوؤں نے اس کے گھر والوں کے بارے میں پہلے دن ہی اس سے پوچھا تھا۔ اس نے سب سچ سچ بتا دیا۔ وہ یہ جان چکا تھا کہ اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے اس لیے اس نے سب سچ سچ بتا دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ جب ڈاکو یہ جان جائیں گے کہ اس کا تعلق ایک غریب خاندان سے ہے تو وہ اسے چھوڑ دیں گے مگر یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ انہوں نے اس سے کام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک ماہ بعد وہ پہلی بار ان کے ساتھ ایک واردات میں شریک ہوا تھا۔ اسے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے ان کے کہے پر من وعن عمل نہیں کیا تو اس کی ماں اور بہن کی جان اور عزت خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ وہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے گئے تھے۔ کافی راستہ پیدل چلنے کے بعد وہ ایک گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اس کی آنکھ سے پٹی اتاری گئی تو کافی دیر تک اسے کچھ نظر ہی نہیں آیا۔ یہ ایک قدرے ویران روڈ تھا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ چھ ڈاکو تھے۔

اسے روڈ کے کنارے کھڑا کر دیا گیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ کچھ ہی دیر میں اِدھر سے ایک بس گزرنے والی ہے، اسے بس کو ہاتھ دے کے روکنا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک موٹر سائیکل بھی کھڑا کر دیا گیا تھا۔ موٹر سائیکل دیکھ کے بس والا یہی سمجھتا کہ اس کا موٹر سائیکل خراب ہو گیا ہے۔ سو وہ ویران علاقے میں بھی بس روک لیتا۔ باقی ڈاکو نقاب پہن کے پاس ہی چھپ گئے تھے۔

اسے وہاں رکے پندرہ بیس منٹ ہو گئے تھے، اندھیرا کافی حد تک گہرا ہو چکا تھا جب اس نے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنیوں سے سڑک کو منور ہوتے دیکھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آواز سے یہ کوئی بڑی گاڑی ہی لگ رہی تھی۔ تاہم ہیڈ لائٹس کی روشنیوں کی وجہ سے وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بس ہی ہے۔ وہ سڑک کے درمیان آ گیا۔ اس نے گاڑی کو روکنے کا اشارہ کیا تو وہ رک گئی۔ یہ ان کی مطلوبہ بس ہی تھی۔ اچانک اِدھر اُدھر سے ڈاکو برآمد ہوئے اور ایک دم سے بس پر چڑھ گئے۔ ذیشان خاموشی سے پاس کھڑے ہو کے تماشا دیکھنے لگا۔ بس میں سے لوگوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ساتھ ہی ڈاکو بھی دہاڑ رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد وہ بس سے اترے اور ایک طرف کو چل دیے۔ ذیشان بھی ان کے ساتھ تھا۔ ایک ڈاکو نے روڈ کے کنارے کھڑا موٹر سائیکل اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔ کچھ دور اُن کی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ ایک کھلی جیپ تھی۔ وہ اس پر سوار ہو گئے۔ ڈاکوؤں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنے چہروں سے نقاب ہٹا دیے۔ اس کی آنکھوں پر ایک بار پھر پٹی باندھ دی گئی۔

واپسی کے سفر میں اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا تو وہ چونک گیا۔ وہ حیران تھا کہ اتنے سامنے کی چیز پہلے اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔

☆☆☆

اسنوکر کلب صرف ایک کلب نہیں تھا۔ در پردہ اس کے اندر بہت سے غیر قانونی کام ہوتے تھے۔ کلب شہر کے ایک پوش علاقے میں واقع تھا۔ کافی امیر لڑکے وہاں کھیلنے آتے تھے۔ کھیلنے والوں میں اکثریت اسکول کالج کے طلبا کی تھی۔ وہ اسکول یا کالج ٹائم میں یونیفارم میں ہی ادھر کھیلنے آ جاتے تھے۔ شہر کی انتظامیہ اسنوکر کلب کی در پردہ سرگرمیوں سے بھی آگاہ تھی مگر انہیں ان کا حصہ پہنچ جاتا تھا اس لیے انہوں نے خاموشی سادھ رکھی تھی۔

اسنوکر کلب میں آ کے مستقل کھیلنے والے لڑکوں کے بارے میں وہ معلومات حاصل کر کے ان میں سے اپنے ٹارگٹس چن لیتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے کچھ لڑکوں کو ہائر کر رکھا تھا۔ وہ لڑکے نہ صرف ان لڑکوں سے معلومات اکٹھی کر کے دیتے تھے بلکہ ان کے مطلوبہ لڑکوں کو کلب میں آ کے کھیلنے کے لیے راغب بھی کرتے تھے۔ عامر بھی انہی لڑکوں میں سے ایک تھا۔

وہ جن لڑکوں کو کلب میں کھیلنے کے لیے راغب کر کے لاتا تھا ان میں دو میں سے کم سے کم ایک خصوصیت کا ہونا ضروری تھا۔ یا تو وہ دولت مند ہوتے تھے یا انتہائی خوبصورت۔ دولت مند لڑکوں کے متعلق اسے یہ چھان بین بھی کرنا پڑتی تھی کہ وہ کسی اثر رسوخ رکھنے والی فیملی سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ یہ چیز بعد میں ان کے لیے مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ صائم کا تعلق تو ایک غریب گھرانے سے تھا مگر وہ انتہائی خوبصورت تھا۔ اسی وجہ سے اس نے اس کے ساتھ دوستی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ابھی ان کی دوستی اس اسٹیج پر نہیں پہنچی تھی کہ وہ اس کے کہنے پر اس کے ساتھ کلب چلا جاتا، وہ بھی کالج ٹائمنگ میں مگر اس دن اچانک ہی صائم

نے اس کے سامنے اسنوکر میں اپنی دلچسپی ظاہر کر کے اس کی راہ ہموار کر دی تھی۔ اسے تیار کرنے کے لیے اسے زیادہ زور نہیں لگانا پڑا تھا۔ اب اسے کلب جاتے مسلسل تیسرا دن تھا۔ وہ کلاس بنک کر کے جا رہے تھے۔

صائم اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے ابو کچھ ماہ پہلے ہی ایک ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ شوہر کی وفات کے بعد انہوں نے اپنے گھر کا کچھ حصہ کرائے پر دے دیا اور خود ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچنگ کرنے لگی تھیں۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے اس کے والدین نے اس کا حد سے زیادہ خیال رکھا تھا۔ وہ اسے شروع سے ہی کہیں اکیلے جانے نہیں دیتے تھے، ان کی مرضی ہوتی تھی کہ وہ ہر وقت ان کے سامنے رہے۔ اس وجہ سے اس کی شخصیت میں وہ اعتماد پیدا نہیں ہو سکا تھا جو نوجوان لڑکوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ وہ فرسٹ ائیر میں تھا مگر کافی شرمیلا تھا۔ اس کی خوبصورتی میں بھی ایک طرح کی نزاکت اور نسوانیت پائی جاتی تھی۔ اس کی کلاس کے اکثر لڑکے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے مگر وہ سوائے شرمانے یا پیچ و تاب کھانے کے کچھ نہیں کر پاتا تھا۔

کلب میں اس دن کے بعد لڑکوں نے اسے تنگ نہیں کیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان میں اچانک یہ تبدیلی کیسے آئی تھی۔ اس نے اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اتنے مہنگے کلب میں وہ فری کھیل رہا ہے۔ اسے اچھا خاصا گیم آ گیا تھا مگر ابھی تک وہ بلیئرڈ ہی کھیل رہا تھا۔

''کل تمہیں اسنوکر کھلانا ہے۔'' کلب سے باہر نکلتے ہوئے عامر اس سے بولا۔

''کل؟'' اس کے چہرے پر مایوسی کے سے تاثرات ابھرے۔ ''کل تو اتوار ہے۔''

''تو کیا ہوا۔ کل تو کالج سے بھی چھٹی ہے۔ ہمیں کلاس بھی بنک نہیں کرنا پڑے گی۔'' عامر حیرانی سے بولا۔

''یار تم میری ماما کو نہیں جانتے۔ وہ تو مجھے ایک منٹ کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتیں۔'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''یار، کر لینا کوئی بہانہ تم کوئی ننھے بچے تو ہو نہیں، نہ کوئی لڑکی ہو کہ تمہاری ماما تم پہ اتنی پابندیاں لگا رہی ہیں۔'' عامر جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ اگلے دن کا تو اسے حکم ملا تھا کہ صائم کو لازمی لانا ہے اور اب وہ انکار کر رہا تھا۔

''میں کوشش کروں گا مگر وعدہ نہیں کرتا۔'' صائم بے بسی سے بولا۔

''کوشش نہیں، کل میں دس بجے تمہارے گھر آؤں گا۔ آنٹی نہ مانیں تو میں خود ان سے بات کر لوں گا۔'' وہ اٹل لہجے میں بولا۔

اگلے دن وہ واقعی دس بجے اس کے گیٹ پر موجود تھا۔ وہ بائیک پر آیا تھا۔ صائم نے اپنی ماں سے بہانہ بنایا تھا کہ اس کے دوست کے ایک بھائی کی شادی دوسرے شہر میں ہے وہ ادھر جا رہا ہے۔ اس کی ماں پہلے تو نہ مانی مگر کافی ضد کے بعد آخر کار وہ تیار ہو گئی تھی۔ اب وہ ڈھیر ساری فکر چہرے پر سجائے اسے الوداع کہہ رہی تھی۔

انہیں فکر مند دیکھ کے عامر بولا۔ ''آنٹی، آپ فکر نہ کریں، ہم لوگ چار بجے تک واپس پہنچ چکے ہوں گے۔ میں خود اسے گیٹ پر اتار کے جاؤں گا۔''

اس کی ماں نے جواب میں انہیں ڈھیر ساری دعائیں دی تھیں۔ ان کی دعائیں سن کے عامر کو لگا کہ وہ اسے شادی پر نہیں بلکہ کسی محاذ پر بھیج رہی ہوں۔ وہ دل ہی دل میں ان کے انداز پر ہنسا مگر زبان سے مطمئن کرنے والے جملے ادا کرتا رہا۔

صائم بائیک پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا تو عامر نے بائیک آگے بڑھا دی۔

صائم بہت خوش تھا کہ وہ اپنی ماں کو بیوقوف بنا کے اجازت لینے میں کامیاب ہو گیا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا یہ جھوٹ اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دے گا۔

☆☆☆

ذیشان کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے چنگل میں بری طرح پھنس چکا ہے۔ اس واردات میں سب ڈاکوؤں نے نقاب پہنا ہوا تھا۔ صرف وہی تھا جس کا چہرہ سب لوگوں نے دیکھا تھا۔ شاید اسی لیے ڈاکوؤں نے اسے اس مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اب اگر وہ کسی طرح یہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو وہ پکڑا جا سکتا تھا۔ گویا آزاد اور کسی خوف کے بغیر زندگی گزارنے کی اس کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔

اگلے دن ایک ڈاکو، ڈاکے میں سے اس کا حصہ لے کے اس کے پاس آیا۔ یہ پانچ ہزار روپے تھے۔ ڈاکوؤں نے نقدی کے علاوہ موبائل، زیورات گھڑیاں اور دوسری چیزیں بھی لوٹی تھیں مگر اس کا حصہ صرف نقدی میں سے ہی نکالا تھا۔ یہ سب اسے اس ڈاکو نے ہی جانے کیوں بتایا۔

''مجھے ان کا کیا کرنا ہے؟'' اس نے پیسوں کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر سوال کیا۔ وہ اپنے خیالات کی وجہ سے

اس وقت کچھ زیادہ ہی قنوطی ہو رہا تھا۔

''تم خود نہیں رکھنا چاہتے تو گھر بجھوا دو۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

اس کا جملہ سن کے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میں گھر والوں سے مل سکتا ہوں؟'' اس کی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ امید کا دِیا بھی جل اٹھا تھا۔

''خود تو نہیں جا سکتے مگر ہم میں سے کوئی یہ رقم لے کے تمہارے گھر پہنچا سکتا ہے بلکہ تم گھر والوں کو کوئی پیغام دینا چاہو تو وہ بھی پہنچایا جا سکتا ہے۔''

اس کا جواب سن کر اسے مایوسی ہوئی مگر فی الحال یہ بھی غنیمت تھا۔ اس نے اپنی ماں اور بہن کے لیے ایک خط لکھا۔ جس میں اس نے انہیں اپنی خیریت سے آگاہ کیا اور بتایا کہ جلد ہی وہ ان سے ملنے آئے گا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اسے شہر میں اچانک ایک بہت اچھی نوکری مل گئی ہے اور ابھی اسے چھٹی نہیں مل سکتی، اس نے اپنی ماں سے معذرت بھی کی تھی کہ اس نے بغیر بتائے شہر میں نوکری کر لی تھی۔ ڈاکو نے وہ خط خود بھی پڑھا تھا۔ خط پڑھ کے اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔

''تم تو کافی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔'' وہ بولا۔

ذیشان کچھ نہیں بولا۔ وہ بس اسے افسردگی سے دیکھتا رہ گیا۔

ایک ہفتے کے بعد اسی ڈاکو نے اس کی ماں کا خط لا کے دیا تھا۔ اس کے بقول اس کی ماں اور بہن خیریت سے تھیں اور رقم اور اس کی خیریت کا سن کے بہت خوش ہوئی تھیں۔

اس نے بے چینی سے خط کھولا۔ ہینڈ رائٹنگ سے وہ اسے ماں کے ہاتھ سے لکھا ہوا خط ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی توقع کے مطابق خط میں گلے شکوے تھے، اندیشے تھے، آنسو تھے اور ناراضی کا اظہار تھا۔ وہ سب پڑھتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کے روئے مگر اسے اپنی مردانگی کا بھرم قائم رکھنا تھا سو وہ سارے آنسو اس کے اندر ہی اندر گر گئے۔ ان آنسوؤں نے ایک دن لاوا بن کے پھٹنا تھا۔

☆☆☆

کلب میں صائم کی توقع کے خلاف زیادہ رش نہیں تھا۔ صرف چند لوگ کھیل رہے تھے۔ دو ٹیبل تو بالکل خالی تھیں، گویا انہیں باری کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ وہ یہ دیکھ کے بہت خوش ہوا۔ اس نے جاتے ہی اسٹک اٹھالی مگر عامر اس سے بولا۔ ''ٹھہرو پہلے کمال بھائی سے مل لیتے ہیں۔''

وہ طوعاً و کرہاً اس کے پیچھے چل پڑا۔ عامر کلب کے ایک طرف بنے ایک کیبن میں داخل ہو گیا۔ صائم اس کے پیچھے تھا، وہ پہلی بار اس کیبن میں داخل ہوا تھا۔

کیبن کافی بڑا تھا۔ کیبن کیا، وہ ایک مکمل آفس تھا۔ اس میں دو تھری سیٹرز صوفے رکھے تھے۔ ایک طرف ایک بھاری ٹیبل تھی جس کے عقب میں ایک ریوالونگ چیئر تھی۔ کمال اس کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے ہی خوش خلقی سے مسکرایا۔

اس سے مصافحے کے بعد وہ بیٹھ گئے۔

صائم بیٹھ کے آفس کا جائزہ لینے لگا۔ آفس کے دو اطراف دیواریں تھیں۔ جبکہ باقی دو طرف مکمل شیشے سے بنی تھیں۔ یہ ٹنٹڈ گلاس تھا جس سے کلب کا مکمل جائزہ لیا جا سکتا تھا مگر کلب میں سے آفس میں دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا تو کبھی اس آفس کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ وہ یہ سارا سیٹ اَپ دیکھ کے کافی مرعوب ہوا۔

کمال، عامر سے باتیں کرتے ہوئے اس کا بھی بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی مرعوبیت اس نے دیکھ لی تھی۔

اس نے ایک بوتل سے گلاسوں میں کولڈ ڈرنکس انڈیل کے گلاس ٹیبل پر رکھ دیے۔ عامر اپنی نشست سے اٹھا اور ایک گلاس صائم کو پیش کیا۔ صائم نے شکریے کے ساتھ گلاس قبول کر لیا۔ وہ عامر اور کمال کی آنکھوں میں معنی خیز قسم کا ہونے والا تبادلہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

وہ گھونٹ گھونٹ کولڈ ڈرنک پینے لگا۔ اس نے آدھا گلاس پیا تھا کہ اسے اپنے دماغ میں سنسناہٹ سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔ کمال اور عامر اسے گھورے جا رہے تھے۔ اسے ان کی نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہی گھونٹ میں باقی ماندہ کولڈ ڈرنک اپنے اندر انڈیل لی۔ گلاس ٹیبل پر رکھنے کے لیے وہ اپنی نشست سے اٹھا ہی تھا کہ اسے زور کا چکر آیا، وہ اپنی نشست پر ہی گر گیا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کارپٹ پہ گرا۔ وہ اس کی آواز سننے سے پہلے ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو اسی نشست پر بیٹھے ہوئے پایا۔ کافی دیر تک تو وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا۔ آہستہ آہستہ اسے سب یاد آنے لگا۔ وہ کولڈ ڈرنک پی رہا تھا اور...... اس کے بعد اس کے ذہن کی سلیٹ

بالکل خالی تھی۔ عامر اور کمال اسی طرح بیٹھے آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ اسے آنکھیں کھولتا ہوا دیکھ کے عامر اس سے بولا۔
"تم رات کو سوئے نہیں تھے جو یوں بیٹھے بیٹھے سو گئے؟"
وہ اس کا سوال سن کے حیران ہوا۔
"میں...... میں سو گیا تھا؟" اس کی آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔
"ہاں یار، کولڈ ڈرنک پینے کے بعد تم اچانک ہی سو گئے، میں حیران تو ہوا مگر میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ تم پورے چار گھنٹے سوئے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ اسے کافی عجیب لگی۔
"میں چار گھنٹے تک سوتا رہا؟" وہ پھر الجھن بھرے انداز میں بولا۔ اچانک اس کی نظر ایک دیوار گیر گھڑی پر پڑی جو دو بج کر پچیس منٹ بجا رہی تھی۔ وہ ایک دم سے اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ اٹھتے ہی اسے زور کا چکر آیا۔ وہ پھر اپنی نشست پر گیا۔ اسے لگا کہ ایسا ہی لمحہ پہلے بھی اس کے ساتھ بیت چکا ہے۔
اس کی حالت تھوڑی سنبھلی تو اس نے عامر کو اپنے نزدیک پایا۔ وہ اس کے منہ کے ساتھ گلاس لگا کے اسے کچھ پلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کوئی مشروب تھا۔ وہ پی کے اس کی حالت کافی حد تک سنبھل گئی۔ مگر اس کی الجھن ابھی تک دور نہیں ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کی ذہنی حالت کے ساتھ ساتھ اس کی جسمانی حالت میں بھی کوئی تغیر رونما ہو چکا ہے۔ مگر وہ تغیر کس قسم کا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔
اسی دوران ایک پیزا بوائے اندر داخل ہوا۔ اس نے تین "پیزا پیک" اور کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل ٹیبل پر رکھی اور اپنی پیمنٹ لے کے روانہ ہو گیا۔ عامر نے ایک پیزا اور کولڈ ڈرنک اس کی طرف بڑھائی۔ وہ خاموشی سے پیزا کھانے لگ گیا۔
عامر اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس کی توجہ بھی کچھ دیر کے لیے بٹ گئی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد عامر نے کمال سے اجازت طلب کی اور وہ دونوں اس کے آفس سے نکل آئے۔
چلتے ہوئے بھی صائم کو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ گھر پہنچتے ہی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی ماں اس کے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ اس سے سفر اور شادی کے متعلق استفسار کرنے لگی مگر صائم بس ہوں ہاں ہی کرتا رہا۔ آخر وہ تنگ آ کے بولا۔
"ماما! میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔ پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔" اس نے یہ کہتے ہی اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔
"میں گولی لا دوں؟" اس کی ماں فکرمندی سے بولی۔
"نہیں۔ میں گولی لے چکا ہوں۔ آپ پلیز، یہاں سے چلی جائیں۔ مجھے کچھ دیر آرام کرنے دیں۔" وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔
وہ اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ کے رہ گئی۔ آج پہلی بار صائم نے اس انداز میں ان سے بات کی تھی۔

☆☆☆

ذیشان روز بروز ایک گہری دلدل میں دھنستا جا رہا تھا مگر اسے اس دلدل سے نکلنے کا کوئی چارہ کار نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ چار سالوں میں بے شمار وارداتوں میں شریک ہو چکا تھا۔ جب وہ کسی واردات پر ہوتا تو ڈاکو اس پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ چند بار واردات سے پہلے شہر میں کسی بک شاپ سے کتابیں خریدنے کے لیے گیا تو ایک ڈاکو وہاں بھی اس کے ساتھ گیا۔
اس کی ماں ہر خط میں اس سے واپسی کا تقاضا کرتی تھی۔ مجبوراً اس نے ایک خط میں ماں کو لکھ دیا کہ اس کی کمپنی اسے بیرونِ ملک بھیج رہی ہے۔ اسے اچانک جانا پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے وہ ان سے ملنے نہیں آ سکتا۔ وہ نہیں جانتا کہ اس کی واپسی کب ہوگی تاہم وہ ایسا بندوبست کر کے جا رہا ہے کہ انہیں ہر ماہ کچھ رقم ملتی رہے۔ اس کے بعد نہ اس نے ماں کو کوئی خط لکھا تھا نہ اسے کوئی جواب ملا تھا۔ ماں سے اس کے رابطے کا واحد سہارا بھی چھن گیا تھا مگر وہ بے بس تھا آخر کب تک وہ انہیں ٹال سکتا تھا۔ اب جب بھی وہ بہت افسردہ ہوتا تو ماں کے پرانے خط نکال کے وہی پڑھنے لگ جاتا۔ اس کے آنسو اندر ہی اندر گرتے رہتے۔
آج پھر وہ اور وحید جنگل کے تنہا گوشے میں بیٹھے تھے۔ وحید کی کہانی بھی اسے پتا چل چکی تھی۔
اس کا تعلق بھی ایک گاؤں سے ہی تھا۔ اس کے بقول وہ گاؤں میں شادیوں اور دیگر فنکشنز میں دیگیں پکاتے تھے اور کمہار کہلاتے تھے۔ وہ مڈل کے بعد ہی اپنے باپ کے ساتھ کام میں ہاتھ بٹانے لگ گیا تھا۔ اب تو وہ اپنے کام میں ماہر ہو چکا تھا۔ اس کا باپ چھوٹے موٹے فنکشنز میں

اسے اکیلے ہی بھیج دیا کرتا تھا۔

اس کی شادی کے دن مقرر تھے کہ گاؤں کے چوہدری نے انہیں اپنے گھر بلوایا۔ اس کے گھر ایک چھوٹی سی تقریب تھی جس میں انہوں نے چاولوں اور سالن کی ایک دیگ تیار کرنا تھی۔ یہ آرڈر تھا تو چھوٹا سا مگر چونکہ چوہدری کا تھا اس لیے اس کی تکمیل اس کے باپ کو ہی کرنا تھی۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ مین فنکشن والے دن اس کے باپ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس نے باپ کو آرام کا مشورہ دیا اور خود کھانا پکانے چل پڑا۔ اس کے ساتھ دو مددگار لڑکے بھی تھے۔ اس نے پوری ذمے داری سے کھانا بنایا مگر سالن میں نمک تھوڑا سا زیادہ پڑ گیا۔ چوہدری تو آپے سے باہر ہوگیا۔ اس نے اسے اپنے کارندوں سے خوب پٹوایا اور اسے اپنے گھر میں بند کر دیا۔ وہ زخم زخم جسم کے ساتھ پوری رات بھوکا پیاسا کمرے کے فرش پر پڑا رہا۔ اگلے دن کچھ لوگ اسے لینے کے لیے آئے۔ وہ جیپ میں لے کے اسے روانہ ہوئے۔ گاؤں سے باہر نکلتے ہی انہوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ ڈیرے پر پہنچ کے اسے پتا چلا کہ وہ ڈاکوؤں کا ڈیرا تھا۔ ڈاکوؤں سے اسے معلوم ہوا کہ وہ سزا کے طور پر سال بھر ادھر قید رہے گا۔

''تمہیں تو پھر بھی امید ہے کہ ایک سال بعد تمہیں ان کے چنگل سے رہائی مل جائے گی، میں تو زندگی بھر کے لیے ان سے چھٹکارا حاصل نہیں کرسکتا۔'' اس کی کہانی سن کے وہ افسردگی سے بولا۔

''یہ ڈاکو ہیں، ان کے وعدے کا کیا اعتبار۔'' وہ بولا۔ ''ادھر میرے ماں باپ پر، میری منگیتر پر نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ پتا نہیں انہیں علم بھی ہوگا کہ نہیں میں کہاں ہوں؟ میں ایک سال کا انتظار ہرگز نہیں کرسکتا۔ بس مناسب موقع دیکھ کے میں یہاں سے ہر صورت بھاگ جاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان پر ہی کیوں نا کھیلنا پڑے۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ ذیشان کو لگا کہ وقت آنے پر وہ ایسا کر بھی گزرے گا۔

''تم اتنی کڑی نگرانی میں یہاں سے کیسے فرار ہو گے؟'' اس نے شکی انداز میں سوال کیا۔

''بس ہے ایک طریقہ...... وقت آنے پر آپ کو بھی بتادوں گا۔'' وہ پُراسرار انداز میں بولا۔ ذیشان اسے حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ اسے جہاں اس کی ہمت پر رشک آرہا تھا وہاں اپنی کم ہمتی پر غصہ بھی۔

☆☆☆

اپنی ماں کے جانے کے بعد صائم نے اپنی آنکھوں سے بازو ہٹالیا۔ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ کا پتا دے رہی تھیں۔ اس کے احساسات بالکل منجمد ہو چکے تھے۔ وہ کافی دیر تک سوچتا رہا۔ آخرکار وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اسے جلد ہی نیند آگئی۔ صبح وہ اٹھا تو ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔

''ماما! جلدی سے ناشتا دیں، بہت سخت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ واش روم سے غسل کر کے نکلا تھا اور اب تولیے سے اپنے بال خشک کر رہا تھا۔

اس کی ماں اس کا انداز دیکھ کے چونکی۔ اس نے آج تک کبھی اس انداز میں ناشتا نہیں مانگا تھا۔ تاہم انہوں نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

''بھوک تو لگنی ہی تھی تم کل چار بجے سوئے تھے اور اب اٹھے ہو۔ میں تمہیں رات کو کھانے کے لیے جگانے بھی گئی تھی مگر تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔'' وہ پیار بھرے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولیں۔

''اوہ، کل بہت لمبا سفر کیا ہے میں نے... بہت تھکن ہو رہی تھی۔'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

''خیر چھوڑیں اسے، رات گئی بات گئی۔ آپ جلدی سے ناشتا لائیں۔'' وہ لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولا۔

اس کی ماں نے ناشتے کی ٹیبل پر ایک فرائی انڈا اور پراٹھا لا کے رکھا۔ وہ ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ آج اس کا ہر انداز ہی بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ تو گھر میں بھی قدرے شرمایا شرمایا سا رہتا تھا۔ کھانا بھی ایسے کھاتا تھا جیسے کسی کے گھر مہمان ہو۔

''چائے...'' ناشتے کے درمیان توقف کر کے وہ مختصراً بولا۔

وہ اس کے لیے چائے لے آئیں۔ وہ چائے پیتے ہی بیگ لے کے کالج کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ''اوکے مام، اللہ حافظ، اپنا خیال رکھیے گا۔'' ان کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ان کے گلے میں بازو ڈال کے کہا۔

آج پہلی بار اس نے ایسا کیا تھا۔ ''ایک ہی دن میں اتنا بدلاؤ؟'' وہ حیرانی سے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئیں۔

کالج میں عامر اس کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ مگر وہ بھی اس کا انداز دیکھ کے حیران رہ گیا۔ وہ آج کافی بے تکلفی سے سب سے بات چیت کر رہا تھا۔ تین پیریڈز

کے بعد وہ اس سے خود بولا۔

''کل تو تم نے مجھے اسنوکر نہیں کھلایا۔ مگر آج میں ضرور کھیلوں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ عامر کو اس کی مسکراہٹ بہت عجیب سی لگی۔ عجیب اور پُراسرار! اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ محسوس ہونے لگی۔

''آج چھوڑو یار کل چلیں گے۔'' اس کا عجیب سا انداز دیکھ کے اسے خوف آرہا تھا سو اس نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''آج تو لازمی جانا ہے۔'' وہ اسی پُراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''مجھے آج ایک ضروری کام ہے تم اکیلے چلے جاؤ۔'' عامر نے اسے بضد دیکھا تو اس نے درمیانی راہ نکالی۔

خلافِ توقع وہ فوراً اکیلے جانے کو تیار ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد عامر نے کمال کا نمبر ملایا۔ چند گھنٹیوں کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ اب وہ اسے صائم کے عجیب و غریب سے انداز کے بارے میں بتا رہا تھا۔

''آنے دو اُسے۔ یہ کوئی پہلا کیس تو نہیں ہے جو تم اتنا گھبرا رہے ہو۔'' کمال بےفکری سے بولا۔

عامر کو الفاظ نہیں مل رہے تھے جس سے وہ اسے اپنی کیفیت سے آگاہ کر سکتا۔ اس نے بےبسی سے کال کاٹ دی۔ اب وہ کمال کی خیریت کی دعا ہی کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اس نے فون بند کیا تو اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار نمایاں تھے۔ فون پر تو وہ بےفکری کا اظہار کر رہا تھا مگر درحقیقت وہ کافی پریشان ہوگیا تھا۔ کل کا انہوں نے ایک اور پروگرام بنا رکھا تھا۔ اس کی ساری تیاری مکمل کر لی گئی تھی، مگر اب اچانک اس فون کال نے اس کے منصوبے میں خلل ڈال دیا تھا۔

''شکورے۔'' وہ اچانک بلند آواز میں دہاڑا۔

شکورا دوڑتا ہوا آیا۔ ''جی سردار......'' وہ دھیمے سے انداز میں سر جھکا کے بولا۔

سارے ڈاکو اپنے سردار سلطان شاہ سے بہت ڈرتے تھے۔ اس وقت تو وہ ویسے بھی کافی غصے میں لگ رہا تھا۔

''اوپر سے ایک فون آیا ہے۔ کل ہی ایک کام کرنا ہے۔ تم باقی لوگوں کو جمع کرو۔'' وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

''جو حکم سردار۔'' وہ عاجزی سے کہتے ہوئے پلٹا۔

تھوڑی دیر میں پوری بیٹھک لگ چکی تھی۔ یہ درجن کے قریب ڈاکو تھے۔ وہ نیچے بچھی چٹائی پر دائرے میں بیٹھے تھے۔ سلطان شاہ ایک کونے میں موجود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''کل کے لیے ایک اور کام آگیا ہے، اور یہ کل ہی کرنا انتہائی ضروری ہے۔'' وہ گمبھیر آواز میں بولا۔

''مگر کل تو......'' رفیق جسے سردار کا نائب ہونے کی حیثیت حاصل تھی، نے اسے کل کے پروگرام کے متعلق آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

سلطان نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں جانتا ہوں کل کے پروگرام کے بارے میں، مگر لگتا ہے تم نے میری بات توجہ سے نہیں سنی۔'' وہ اسے دیکھتے ہوا سرد لہجے میں بولا۔

''معافی چاہتا ہوں سردار۔ آپ اپنی بات جاری رکھیں۔'' رفیق نے نظریں جھکا کے کہا۔ اس کے سرد لہجے نے ہی اسے لرزا دیا تھا۔ سلطان شاہ غصے میں اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بخشتا تھا۔ وہ معمولی غلطیوں پر ان کی کھال اُدھیڑ دیتا۔ ایک چابک ہر وقت اس کے سرہانے رکھا رہتا تھا۔

وہ انہیں اپنے کل کے نئے پروگرام کے بارے میں بتانے لگا۔ سب توجہ سے اس کی بات سن رہے تھے۔

اس کی بات کے اختتام پر سب نے باری باری اپنی رائے دی۔ زیادہ تر لوگ چاہتے تھے کہ کل دونوں منصوبوں پر عمل کیا جائے۔ انہوں نے اُدھر بیٹھے بیٹھے ہی اپنے پہلے منصوبے میں تھوڑا بہت ردو بدل کیا۔ اور ساتھ ہی دوسرے منصوبے کی جزئیات طے کیں۔

وہ ہر کام پوری پلاننگ سے کرنے کے عادی تھے اور یہ چیز انہوں نے سلطان شاہ سے سیکھی تھی۔

سلطان شاہ نے آخر میں انہیں پھر وارن کیا۔ اس منصوبے میں معمولی سی غلطی کی سزا بھی موت ہے۔ اس کے سرد لہجے میں دیے گئے مفہوم کو سب اچھی طرح سمجھتے تھے۔

☆☆☆

کلب میں صائم کے جاننے والے لڑکے بھی اس کا انداز دیکھ کے کافی حیران ہوئے تھے۔ آج وہ بےتکلفی سے سب سے گپ شپ کر رہا تھا۔ اور تو اور وہ ان کی طرح بات بات پہ گندی گندی گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ آج اسنوکر کھیل رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ بلیئرڈ ہی کھیلتا رہا تھا۔ آج پہلی بار وہ اسنوکر کھیل رہا تھا۔ اس نے چار گیمز کھیلیں اور چاروں ہار گیا۔

چار گیمز کے بعد دوسرے لڑکے اس سے باری مانگنے

لگے۔ اس نے ایک لڑکے کو لسٹک تھمائی اور بیگ لے کے باہر کی طرف جانے لگا۔ وہ کاؤنٹر کے قریب سے گزرنے لگا تو کلب کا منیجر اس سے بولا۔ ”آپ چار گیمز ہارے ہیں۔ چار سو روپے دے دیں۔“

”کون سے چار سو روپے، مجھے کمال بھائی نے فری کھیلنے کی اجازت دے رکھی ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔

”وہ رعایت ختم سمجھیں۔ مجھے انہوں نے آپ کے بارے میں خاص تاکید کی تھی کہ آپ سے پیسے لوں۔“ وہ سپاٹ انداز میں بولا۔

صائم کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا۔ وہ کمال کے آفس کی طرف بڑھا۔

منیجر نے کندھے اچکائے۔ کمال نے اسے تھوڑی دیر پہلے آفس میں بلا کے۔۔۔ چند ہدایات جاری کی تھیں۔ وہ ان ہدایات پر ہی عمل کر رہا تھا۔ اس نے اسے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ صائم پیسوں کی بات سن کر اس کے آفس کی طرف آئے گا۔ اسے روکا نہ جائے۔

آفس کی طرف بڑھتے ہوئے صائم نے اپنے آپ کو ہدایت دی۔ ”کول صائم کول...... غصہ نہیں...... عقل کا دامن تھامے رکھو۔“

آفس کا دروازہ کھول کے جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کے چہرے پر غصے کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

کمال بھی اسے دیکھ کے مسکرایا۔ ”آؤ بھئی، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”آپ کو انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ بلوا لیتے میں آجاتا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”عامر ایسے ہی ڈر رہا تھا۔ یہ تو لگتا ہے خود ہی لائن پر آگیا ہے۔“ اس کا جملہ سن کے کمال نے سوچا۔

”جو مزہ کسی کے خود آنے میں ہے وہ بلوانے میں کہاں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے انداز میں ایک عجیب طرح کی سرشاری تھی۔ صائم اس کی وجہ سمجھ چکا تھا۔ ایک رات میں ہی وہ اتنا سمجھ دار ہو چکا تھا کہ لفظوں میں چھپے ہوئے مفہوم اور لہجوں کے پیچ وخم کو بھی جاننے لگا تھا۔

”وہ، آپ کا منیجر مجھ سے پیسے مانگ رہا ہے۔“ اس نے اندر آنے کا مدعا پیش کیا۔

”تو دے دو اُسے پیسے۔“ وہ سکون سے بولا۔

”ابھی تو آپ نے مجھے ایک ہفتہ فری کھیلنے کی جو مہلت دی تھی وہ بھی ختم نہیں ہوئی۔“ وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”بھئی، ہماری مرضی جب چاہیں مہلت دیں جب چاہیں لے لیں۔“ اس کا انداز لطف لینے والا تھا۔

”آپ نے مجھے جو مہلت دی تھی، اس سے کئی گنا قیمت بھی تو وصول کرلی ہے۔“ صائم سرد انداز میں بولا۔

”ابھی کہاں ڈیئر، ابھی تو قیمت وصول کرنا شروع کرنی ہے۔“ وہ پُراسرار سے انداز میں بولا۔

”آپ نے میرے ساتھ جو کیا، وہ میں سب جانتا ہوں، اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اِدھر لڑکے جوا کھیلتے ہیں۔ میں اگر پولیس کو یہ سب بتا دوں تو آپ کا کلب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔“

اس نے اپنی دانست میں ترپ کا پتا پھینکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کمال اس کی دھمکی سن کے ڈر جائے گا مگر اس کا ردعمل دیکھ کے وہ ششدر رہ گیا۔

اس نے ایک بلند و بانگ قہقہہ لگایا۔ وہ کافی دیر تک ہنستا ہی رہا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولا۔ ”تم پولیس کے پاس جانا چاہتے ہو تو شوق سے جاؤ، مگر پہلے اِدھر آؤ میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔“

صائم آنکھوں میں الجھن لیے اس کی طرف بڑھا۔ وہ ٹیبل کے پاس پہنچا تو کمال نے اپنے پاس رکھی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”اِدھر آکے بیٹھو۔“ صائم بیٹھ گیا۔

کمال کے سامنے ایک لیپ ٹاپ رکھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اس نے ایک ویڈیو چلائی۔ صائم اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ پہلا ہی سین دیکھ کے وہ اچھل کے کھڑا ہو گیا۔ خون اس کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ٹیبل پر رکھے ایک پیپر نائف پر پڑی اور اُدھر ہی جم کے رہ گئی۔

☆☆☆

ذیشان ڈاکوؤں کو تیار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ وہ کسی واردات پر جا رہے ہیں، اور وہ بھی کسی خاص واردات پر۔ کیونکہ معمول کے برعکس اس دفعہ درجن سے زائد ڈاکو جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ پیچھے ڈیرے پر تین چار ڈاکو ہی بچتے۔ چند ڈاکو جنگل کے مختلف حصوں کی نگرانی پر مامور تھے۔

کل وحید سے بات کر کے اس نے اپنی کم ہمتی کو جی بھر کے کوسا تھا۔

”کیا میں ساری زندگی اِن ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر رہ سکتا ہوں؟“ ذہن میں در آنے والے اس سوال کا جواب

اسے نفی میں ہی ملا تھا۔

''لیکن میں یہاں سے بھاگوں کیسے؟ اور اگر کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہو بھی گیا تو جاؤں گا کہاں، میں گھر گیا تو میرے ساتھ ساتھ میری ماں اور بہن کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔'' یہ خیال آتے ہی اس کے اندر تک مایوسی کی لہر پھیل گئی۔

''چل بیٹا! تو پھر انتظار کر، اس وقت کا جب کسی دن کوئی اندھی گولی تیری جان لے کے ان ڈاکوؤں کی چنگل سے رہائی دلا دے، اور ساتھ ہی زندگی کی قید سے بھی۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔

''میں اگر کسی واردات کے دوران میں گرفتار ہو جاؤں یا مارا جاؤں تو بھی تو میری ماں اور بہن کی عزت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ان ڈاکوؤں کا کیا اعتبار میرے بعد وہ میری بہن کو ہی اغوا کرلیں اور......'' یہ خیال ہی اس کے لیے روح فرسا تھا۔

''مجھے یہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگنا ہی ہوگا۔ آگے اللہ مالک ہے۔'' آخرکار وہ ایک نتیجے پر پہنچ ہی گیا۔ اب وہ یہاں سے بھاگنے کا منصوبہ تیار کررہا تھا۔

''وحید نے یہاں سے فرار کا جو منصوبہ سوچ رکھا ہے، اگر وہ پتا چل جائے تو شاید بھاگنے کی راہ نکل ہی آئے۔'' یکایک ہی اس کے دل میں خیال آیا تو اس کی آنکھوں میں امید کے دیے ٹمٹمانے لگے۔

اس نے سوچا تھا کہ اب جب بھی اسے وحید سے بات کرنے کا موقع ملا، وہ اس حوالے سے اسے کریدنے کی کوشش کرے گا۔ آج ڈاکوؤں کی تیاری دیکھ کے اسے لگ رہا تھا کہ وہ موقع اسے جلد ہی ملنے والا ہے۔ باقی ڈاکوؤں کے جانے سے خطرے کی شرح قدرے کم ہوگئی تھی۔ وہ چانس لے سکتا تھا۔ لگ رہا تھا کہ ڈاکوؤں کا اس بار اسے لے جانے کا کوئی پروگرام نہیں۔ وہ ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

صائم کی نظریں پیپر نائف پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ کمال اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں کو ایک ہی جگہ مرتکز دیکھ کے اس نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ چاقو پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے چاقو لے لیا۔ ''پیارے بچے، اتنے خطرناک ہتھیاروں کی طرف نہیں دیکھتے۔'' وہ اسے پچکارتے ہوئے بولا۔

صائم بے بسی کے عالم میں بیٹھ گیا۔ اس کی نظر پھر سے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر پڑی۔ وہ اپنے آپ کو ایک بیڈ پر پڑا دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں پھر سے جھک گئیں۔ وہ بالکل برہنہ تھا۔

اسے نظریں جھکائے دیکھ کے کمال نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔ ''سامنے دیکھو نا، کتنا پیارا منظر ہے۔''

اس نے مجبوراً پھر سے نظر اٹھائی۔ منظر میں ایک اور آدمی کی انٹری ہوگئی تھی، وہ بھی اس کی طرح فطری لباس تھا مگر اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی جسامت دیکھ کے اس نے اندازہ لگایا کہ یہ شخص کمال ہی ہوگا۔

''یہ تم ہی ہونا؟'' اس نے سپاٹ انداز میں پوچھا۔

''تم نہیں آپ۔'' وہ قدرے ناگواری سے بولا۔

اگلے ہی لمحے وہ اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے پھر بولا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، میں تمہیں حاصل کرنے کا پہلا موقع کسی اور کو دے سکتا تھا۔'' وہ لطف لینے والے انداز میں بولا۔

صائم کچھ نہیں بولا۔ وہ خاموشی سے اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کسی نے موبائل کے کیمرے سے ویڈیو بنائی ہے۔ اسکرین کے مناظر نے اس کے خون کی روانی بڑھا دی تھی۔ کمال اس کے سرخ ہوتے چہرے کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''دیکھ لو میں نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ سب بہت پیار سے کیا ہے۔''

صائم نے اسکرین سے نظریں ہٹا کے کمال کو دیکھا۔ کمال کی آنکھوں میں خمار تھا۔

''آپ نے یہ ویڈیو کیوں بنائی؟'' اس کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

''مجھے اس کی ضرورت تھی اس لیے بنائی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیسی ضرورت؟'' وہ اچنبھے سے بولا۔

''بھئی، یہ بہت اہم ویڈیو ہے۔ کیا تمہیں اس کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی؟'' اس نے مسکراتے ہوئے شریر سے انداز میں سوال کیا۔

صائم کے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ ''گویا آپ مجھے اس ویڈیو کے سہارے بلیک میل کریں گے؟'' وہ بالکل ٹھیک نتیجے پر پہنچا تھا۔

''ارے نہیں۔ یہ بلیک میل لفظ مجھے بالکل پسند نہیں۔

اس سے تو بڑا منفی سا تاثر پیدا ہوتا ہے۔" وہ منہ بنا کے بولا۔

"تو پھر؟" صائم اسے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

"تو پھر یہ کہ جس طرح کچھ تمہاری ضروریات ہیں اسی طرح ہر شخص کی کچھ ضروریات ہیں، ہم تمہاری ضروریات پوری کریں گے تم ہماری ضروریات پوری کرنا۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ ایک شیطانی مسکراہٹ......

"مثلاً؟" وہ مختصراً بولا۔

"مثلاً یہ کہ پیسے کی ضرورت تو ہر انسان کو ہے، یہ ویڈیو کسی ویب سائٹ پر کم سے کم پچاس ہزار ڈالرز میں بہ آسانی بیچی جاسکتی ہے۔ پچاس ہزار ڈالر کا مطلب سمجھتے ہو نا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

صائم کو اس کی مسکراہٹ سے گھن آرہی تھی۔ مگر وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ وہ دبے دبے غصے سے بولا۔ "مجھے نہیں چاہئیں پچاس ہزار ڈالر۔"

"ارے ارے...... تمہیں پچاس ہزار ڈالر کون دے رہا ہے۔ تمہیں تو صرف دس ہزار ڈالر مل سکتے ہیں وہ بھی زیادہ سے زیادہ۔" وہ شریر انداز میں بولا۔

"مجھے اس ویڈیو کے بدلے ایک پیسا بھی نہیں چاہیے۔" اس کا انداز اٹل تھا۔

"اوہ...." اس نے ہونٹ سکیڑے۔ "ٹھیک ہے مگر تمہیں یہ ویڈیو مفت تو نہیں مل سکتی، آخر کافی خرچہ ہوا ہے اس پر ہمارا۔" وہ چہرے پر مصنوعی پریشانی کے تاثرات لا کے بولا۔

"چلو میں تمہارے سامنے دوسرا آپشن رکھتا ہوں۔ مگر یہ آخری آپشن ہے۔ اس پر عمل کرنے کے سوا تمہارے پاس کوئی چارہ نہیں۔" اس بار اس کے لہجے میں واضح دھمکی چھپی تھی۔

صائم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اس شہر میں بہت سے لوگوں کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔ تم بس ان کی ضرورت پوری کرنا۔ یہ ویڈیو بھی ہمارے پاس محفوظ رہے گی اور ہم تمہاری کچھ ضروریات بھی پوری کرتے رہیں گے۔" وہ اس کی آنکھوں کی گہرائی ناپتے ہوئے بولا۔ اس بار اس کا انداز بالکل سپاٹ تھا۔

"مجھے کتنا عرصہ تم لوگوں کی یہ ضرورت پوری کرنا ہو گی؟" صائم اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

اسکرین پر ابھی بھی ویڈیو چل رہی تھی۔ وہ اس کی بات میں چھپا مفہوم سمجھ گیا تھا۔

"یہ ضرورت تو تم چند سال ہی پوری کرسکو گے۔ ہماری کچھ خواتین کلائنٹس بھی ہیں۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے انہیں تمہاری ضرورت پڑ جائے۔" اس بار وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

صائم اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ بہت بری طرح سے ان کے جال میں پھنس چکا ہے۔ اس کے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ویسے بھی اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس کے ساتھ تو جو ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بیتنے والے واقعے اور کلب میں جوئے کی بنیاد پر انہیں بلیک میل کرنے کے نتیجے میں کچھ فوائد حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ کتنے بڑے فنکار ہیں۔

کچھ لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا۔ "میں اگر تم لوگوں کی بات مان لوں تو مجھے کیا ملے گا؟"

کمال کے چہرے پر فاتحانہ تاثرات ابھرے۔ "تم ہمارے ففٹی پرسنٹ کے پارٹنر بن جاؤ گے اور وہ ففٹی پرسنٹ بھی کم سے کم دو ہزار پر "ٹرپ" ہوگا، اس کے علاوہ اس کلب میں تم جتنا چاہو کھیلو، تم سے ایک پیسا بھی طلب نہیں کیا جائے گا۔" وہ اتنے سکون سے بول رہا تھا جیسے وہ کسی بزنس ڈیل کو فائنل کررہا ہو۔

صائم کی نظریں اندھیری اسکرین پر جمی تھیں جہاں ویڈیو ختم ہو چکی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے ویڈیو ڈیلیٹ کر دی۔

کمال اسے ویڈیو ڈیلیٹ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ صائم نے جب دیکھا کہ اس نے اس کے ویڈیو ڈیلیٹ کرنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تو اس نے "ری سائیکل بن" کو بھی خالی کردیا۔ کمال اب بھی خاموش تھا۔

صائم نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے پاس ویڈیو کی مزید کاپیز بھی محفوظ تھیں۔ صائم سوچ میں پڑ گیا۔

"مجھے منظور ہے۔" وہ کچھ دیر کے بعد بولا تو اس کے لہجے میں گہری تھکن تھی۔

کمال کو اس کے لہجے کی کیا پروا تھی۔ اس نے مسرت بھری آواز نکالی اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

☆☆☆

ڈاکو سرشام ہی روانہ ہو گئے۔ ذیشان ایک جھونپڑی

میں چٹائی پر لیٹا تھا۔ وہ اپنے فرار کے فیصلے پر پھر سے غور و خوض میں مشغول تھا کہ باقی رہ جانے والے ڈاکو بھی ادھر ہی آگئے۔ ایک ڈاکو اس کے پاس آیا۔

''اوئے! تو زنانیوں کی طرح ادھر کیوں پڑا ہے جا کوئی کام کر جا کے۔'' وہ اسے دیکھتے ہی درشت انداز میں بولا۔

ذیشان اٹھ کے بیٹھ گیا۔ ''کیا کام کروں جی؟'' وہ عاجزی سے بولا۔

''جا، جا کے وحید کی کھانا بنانے میں مدد کر۔'' وہ اسی انداز میں بولا۔

ویسے تو عام طور پر کوئی ڈاکو ہی کھانا بنانے میں وحید کی مدد کیا کرتا تھا مگر اس وقت شاید ڈاکوؤں کی نفری کم ہونے کی وجہ سے اس کی ڈیوٹی لگائی جا رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے باہر کی طرف چل پڑا۔ وحید اسے کچن نما کمرے میں مل گیا۔ وہ بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ ایک لالٹین کی روشنی میں پیاز کاٹ رہا تھا۔

ذیشان کو دیکھ کے وہ چونکا۔ ''ذیشان بھائی، آپ اِدھر کیسے؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''ایک ڈاکو نے کہا ہے کہ تمہاری کھانا بنانے میں مدد کروں۔'' وہ سپاٹ انداز میں بولتے ہوئے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''چلیں یہ تو اچھا ہو گیا اسی بہانے آپ کے ساتھ گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ یہ ڈاکو تو مجھے اچھوت سمجھتے ہیں۔ مجال ہے کہ اچھے انداز میں کوئی دو لفظ بھی بول دے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

ذیشان اس کے شکوے کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کوئی کام بتاؤ۔''

وحید نے مٹر کا تھیلا اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''لو جی، آپ یہ چھیلیں۔'' اس نے ایک پرات بھی لا کے اس کے پاس رکھ دی۔

ذیشان خاموشی سے مٹر چھیلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وحید سے اس کے فرار کے منصوبے کے بارے میں کیسے بات کرے۔

کچھ دیر کے بعد وحید خود بولا۔ ''کیا بات ہے ذیشان بھائی آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

''یار، تم اس دن کہہ رہے تھے کہ تمہارے ذہن میں یہاں سے بھاگنے کا کوئی منصوبہ ہے؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کا لہجہ بالکل نارمل رہے۔

وحید کے چلتے ہاتھ رک گئے۔ ''کیوں، آپ کو بھی میرے ساتھ بھاگنا ہے کیا؟'' وہ قدرے طنزیہ سے انداز میں بولا۔

''کچھ تو کرنا پڑے گا۔ آخر میں کب تک اِن ڈاکوؤں کے اشاروں پر ناچتا رہوں گا۔'' اس کا طنزیہ انداز اسے ناگوار گزرا تھا۔ اسے لگا کہ وحید اس کی بزدلی کی وجہ سے اس پر طنز کر رہا ہے۔ اس لیے اس نے کھل کے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''واہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے، شکر ہے آپ میں بھی اتنی ہمت آئی۔'' وہ خوش ہو کے بولا۔

''طنز کر رہے ہو؟'' اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

''نہیں ذیشان بھائی۔ بس آپ کو یہاں دیکھ کے میرا دل بڑا کڑھتا ہے۔ مگر لگتا ہے حالات سے آپ نے سمجھوتا کر لیا ہے۔''

''سمجھوتا تو کر لیا تھا، مگر اب میں یہاں پڑے پڑے بیزار ہو چکا ہوں۔ پوری زندگی ایسے گزارنے سے بہتر ہے کہ آر یا پار کر لیا جائے۔'' وہ اٹل انداز میں بولا۔

''یہ ہوئی ناں بات۔ تو پھر کب بھاگیں اِدھر سے؟'' وحید نے اتنے آرام سے پوچھا گویا یہاں سے بھاگنا اس کے لیے بچوں کا کھیل ہو۔

''میں تو چاہتا ہوں۔ آج اور ابھی یہاں سے بھاگ چلیں۔ ویسے بھی آج ڈاکو کم ہیں سو خطرہ بھی کم ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر باقی ڈاکو ہمارا جینا حرام کر دیں گے۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''وہ تو جب بھی بھاگے، یہ ہمارا جینا تو حرام کریں گے۔''

''میں انہیں اس قابل چھوڑوں گا تو حرام کریں گے نا۔'' وحید عجیب سے انداز میں بولا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا، تم ان دو درجن ڈاکوؤں کو اکیلے مار لو گے؟'' ذیشان پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولا۔

''ہاں۔'' وہ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں مسکراتا وحید اسے بہت پُراسرار لگا۔

''وہ کیسے؟'' اس نے پھر حیرانی سے سوال کیا۔

''میں نے جنگل سے ایک زہریلی بوٹی کافی مقدار میں اکٹھی کر کے خشک کر لی ہے۔ وہ مجھے کھانے میں ڈالنی ہے۔ جو وہ کھانا کھائے گا، چند نوالوں کے بعد ہی موت کے

گھاٹ اتر چکا ہوگا۔" وہ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔
ذیشان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"انہیں پتا نہیں چلے گا کہ کھانے میں کچھ ملا ہے؟" وہ بے یقینی سے بولا۔
"نہیں پتا چلے گا۔" وہ اعتماد سے بولا۔
"یہ تقریباً بے ذائقہ ہے.... اور کھانے میں دیکھ کے ایسا ہی لگے گا جیسے میتھی پڑی ہوئی ہے۔ اس لیے سب سکون سے کھالیں گے۔"
"تمہیں اس بوٹی کے بارے میں کیسے پتا چلا؟" ذیشان نے مشکوک انداز میں دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔
"ہمارے گاؤں کے پاس بھی ایک جنگل ہے، اُدھر یہ بوٹی بکثرت پائی جاتی ہے۔ میرے ایک چچا جڑی بوٹیوں کے ماہر ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔ آپ اس کی فکر چھوڑیں۔ میں اس کے استعمال اور اثرات سے اچھی طرح واقف ہوں۔" اس نے ذیشان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔
ذیشان کو حیرت تو ہوئی مگر اسے زیادہ بال کی کھال اتارنے کی عادت نہیں تھی اس لیے اس نے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں پوچھی۔
"پہرے داروں کا کیا ہوگا؟" اس نے اگلا سوال اٹھایا۔
"پہلے ایک بندہ ان کے لیے ہی کھانا لے کے جاتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ہی کھانا کھاتا ہے۔ آپ اس کی فکر چھوڑیں۔ میں نے تمام مسائل کا حل سوچ رکھا ہے۔ بس مناسب وقت کا انتظار ہے۔" وہ اطمینان بھرے انداز میں بولا۔
اس نے تو سب طے کر رکھا تھا، ذیشان کو کافی حیرانی ہوئی۔
"مناسب وقت تو میرے خیال میں آج ہی ہے۔" ذیشان پُرسوچ لہجے میں بولا۔
"میرے خیال میں مناسب وقت وہ ہوگا جب سب لوگ اِدھر موجود ہوں گے۔ زیادہ تر لوگ کھانا کھانے سے ہی مر جائیں گے۔ جو بچ جائیں گے انہیں میں گولیوں سے بھون دوں گا۔" وحید کے لہجے میں شعلوں کی سی لپک تھی۔
ذیشان کو اس پر رشک محسوس ہوا۔ آج وہ وحید کا ایک نیا روپ دیکھ رہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ اسے اپنی طرح ایک معصوم سا نوجوان ہی سمجھتا تھا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے مگر اس میں خطرہ زیادہ ہے۔ اگر آج ہم فرار کی کوشش کرتے ہیں تو اتنا خطرہ نہیں۔" ذیشان نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔
"جو لوگ بچ جائیں گے، آپ نے اُن کے بارے میں نہیں سوچا اس لیے آپ ایسا کہہ رہے ہیں۔"
"یہ اتنے ہی لوگ نہیں جو یہاں نظر آتے ہیں۔ انہیں پولیس کی آشیرباد بھی حاصل ہے اور کوئی اہم سیاسی شخصیت بھی ان کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ ہم سب ڈاکوؤں کو بھی مار دیں تو میرا نہیں خیال کہ خطرہ ٹل جائے گا۔"
"اچھا جی!" اس کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔
کچھ دیر سوچ میں گم رہنے کے بعد وہ پھر بولا "اگر ایسا ہے پھر بھی ہمارے بارے میں ان میں سے تو کوئی اتنا نہیں جانتا۔"
"یہ تمہاری بھول ہے۔ میرے بارے میں تو کم سے کم سب جانتے ہوں گے، اور تمہارے بارے میں بھی چوہدری تو جانتا ہی ہے۔" ذیشان نے اسے قائل کرنے کے لیے ایک اور دلیل دی۔
"ہم...... یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ چلیں پھر ڈن ہو گیا آج ہی ہم کو یہاں سے بھاگنا ہے۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ اسی لمحے انہیں باہر ایک آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں چونک گئے۔ اچانک اس کمرے کا ٹین کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا۔ وہ اپنی جگہ پر اچھل کے رہ گئے۔ اندر آنے والا ایک ڈاکو تھا۔ اس نے ہاتھ میں رائفل پکڑ رکھی تھی، اس کی سرخ انگارا آنکھیں وحید پر جمی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

صائم جانتا تھا کہ وہ ایک گہری دلدل میں پھنس چکا ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے خود کو حالات کے دھارے پر بہنے کے لیے چھوڑ دیا۔ کمال نے اسے اگلی رات گیارہ بجے اپنے کلب میں ہی بلایا تھا۔ عامر اسے اپنی بائیک پر ساتھ لاتا۔
اس کی ماں دس بجے سو گئی تو اس نے عامر کو میسج کیا۔ کمال نے اسے ایک موبائل بھی دے دیا تھا۔ عامر نے آدھے گھنٹے میں پہنچنے کا وعدہ کرلیا۔ گیارہ بجنے میں کچھ دیر باقی تھی کہ وہ کمال کے پاس پہنچ گئے۔ وہ انہیں دیکھ کے خوش ہو گیا۔
کمال نے اپنے منیجر کو بلا کے بتایا کہ وہ جا رہا ہے۔ بارہ بجے وہ کلب بند کر دے۔ وہ چلا گیا تو صائم نے اس سے پوچھا۔ "ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"تم تو مجھ سے بھی زیادہ بیتاب لگ رہے ہو۔" کمال نے اسے چھیڑا۔

صائم نے اسے ناگواری سے دیکھا تاہم بولا کچھ نہیں۔

"میں جاؤں؟" عامر نے اس سے پوچھا تو کمال نے اسے اجازت دے دی۔

صائم اسے جاتے دیکھ کے پریشان ہو گیا۔ "یہ چلا جائے گا تو میں گھر کس کے ساتھ جاؤں گا۔" وہ فکرمندی سے بولا۔

"کیوں فکر کرتے ہو جانو... میں ہوں نا۔ خود تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔"

عامر دروازہ کھول کے باہر نکلا ہی تھا کلب میں شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔ عامر گھبرایا ہوا واپس اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"باہر ڈاکو ہیں۔" کمال نے یہ سنتے ہی اپنی ٹیبل کے ساتھ لگا ایک بٹن دبایا۔ اس کی عقبی دیوار میں ایک خلا نمودار ہوا۔ صائم اس خلا کو دیکھ کے چونک گیا۔ کمال نے صائم کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ اسی لمحے ان کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز سے کھلا۔

"رک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا۔" یہ آواز سنتے ہی کمال اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ صائم کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ دونوں نے بیک وقت پیچھے مڑ کے دیکھا۔ یہ دو افراد تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں سیاہ پسٹل نظر آ رہے تھے۔ ان کی سیاہ لمبی نالوں کا رخ انہی کی طرف تھا۔ دونوں افراد... سرتاپا سیاہ لباس میں تھے۔ دونوں کے چہروں پر بھی سیاہ نقاب تھے جن میں سے صرف ان کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ صائم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ چکا تھا۔ اس نے عامر کو دیکھا وہ بھی ایک صوفے پر گرا لرز رہا تھا۔

ان میں سے ایک شخص تیزی سے آگے آیا۔ قریب آ کے اس نے پستول کو نال سے پکڑ کے اچانک کمال کے سر پر ضرب لگائی۔ کمال اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے جھکائی دے کے خود کو بچایا۔ اگلے ہی لمحے وہ چھلانگ لگا کے اپنے عقب میں موجود خلا سے اندر جا چکا تھا۔ پستول والا شخص پہلے اپنے زور میں تھوڑا سا لڑکھڑایا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، دوسرے فرد نے دوڑ لگائی۔ اس نے جست لگائی۔ ایک ٹانگ ٹیبل پر رکھنے کے بعد دوسری جست میں وہ بھی خلا سے اندر پہنچ چکا تھا۔ صائم یہ سارا منظر دیکھ کے ششدر رہ گیا۔ ایسا تو اس نے فلموں میں ہی ہوتے دیکھا تھا۔ جست لگانے والے شخص کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ پل بھر میں ہی اس کی آنکھوں میں ہراس کی جگہ دلچسپی نے لے لی۔

کمال نے اندر چھلانگ لگانے کے بعد پھر سے حرکت کی۔ اس نے شاید تیزی سے وہ خلا بند کرنے کی کوشش کی تھی۔ پستول والے شخص کی پھرتی دیکھ کے وہ بھی حیران رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پل بھر کے لیے حیرت ابھری۔ یہی لمحہ اسے مہنگا پڑ گیا۔ پستول والے شخص نے اس بار انتہائی پھرتی سے اس کی کنپٹی پر وار کیا تھا۔ اس کمرے میں باہر سے کچھ روشنی اندر جا رہی تھی۔ صائم یہاں سے اندر کا سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ضرب لگتے ہی کمال پٹ سے گرا۔ اس کے عقب میں ایک بیڈ رکھا تھا۔ صائم کو یاد آ گیا وہ فلم جس کا وہ مرکزی کردار تھا اسی بیڈ پر فلمائی گئی تھی۔ گویا یہ ایک خفیہ کمرا تھا جسے کمال اپنے خاص مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔

کمال کے گرنے کے بعد اس شخص نے اسے کندھے پر اٹھا لیا۔ بھاری بھرکم کمال کو اس نے اتنی آسانی سے کندھے پر اٹھایا تھا گویا وہ دو من وزنی انسان کے بجائے بیس کلو کے آٹے کا تھیلا ہو۔

اس شخص نے باہر آ کے صائم کی طرف پستول سے اشارہ کیا۔ "چلو۔" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ صائم بنا چوں چراں کیے اس کے آگے چل پڑا۔ عامر بھی اس شخص کے اشارے پر اس کے عقب میں چل پڑا۔

وہ باہر نکلنے لگے تھے کہ ایک شخص اندر داخل ہوا۔

"تم نے ان کی تلاشی لی؟" اس نے سوال کیا۔

دوسرے شخص کا نفی میں جواب سن کر اس نے اسے شرربار نظروں سے گھورا۔

اس نے ان کے جسموں پر ہاتھ پھیر کے ان کے پرس اور موبائل ضبط کر لیے۔ وہ انہیں بے بسی سے دیکھ کے رہ گئے۔

تلاشی کے بعد وہ باہر نکلے۔ باہر کا منظر دیکھ کے صائم کا دل دہل گیا۔ چار ڈاکوؤں نے کلب میں موجود تمام افراد کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ صائم کو ایک شخص کی لاش بھی اُدھر نظر آئی۔ اس کی کھوپڑی پچکی ہوئی تھی۔ اس میں سے رسنے والا خون اس کے پاس ہی فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔ صائم کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ لاش دیکھ کے ٹھٹک کے رک گیا تھا۔

اس کے عقب میں آنے والے فرد نے گن اس کے

پہلو میں چبھوئی۔ ''چل بے......''

صائم فوراً چل پڑا۔ پستول کی سرد نال نے اس کے پورے وجود میں سنسنی پھیلا دی تھی۔

''چلو کام ختم کرو۔''

کمال کو اٹھائے شخص نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک فرد تیزی سی آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کین تھا۔ اس نے کمرے میں جاتے ہی اس کین میں سے پیٹرول چھڑکنا شروع کر دیا۔ صائم کی سونگھنے کی حس سے اسے پتا چل گیا کہ یہ لوگ یہاں پیٹرول چھڑک رہے ہیں۔ گویا ان کا ارادہ ہر چیز کو جلا دینے کا تھا۔ صائم کو سکون کا احساس ہوا۔ کیونکہ آگ لگنے سے اغلب امکان تھا کہ اس پر فلمائی جانے والی فلم بھی راکھ کا ڈھیر بن جائے گی۔ یہ ڈاکو تو اس کے لیے رحمت کے فرشتے بن کے آئے تھے، جنہوں نے اسے ایک گہری دلدل میں..... دھنسنے سے قبل ہی بروقت نکال لیا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک دلدل سے نکل کے دوسری دلدل میں پھنسنے جا رہا ہے۔

☆☆☆

''تم لوگ کھانا بنا رہے ہو یا گپ شپ کر رہے ہو؟'' اندر آنے والا شخص درشت لہجے میں بولا۔

ذیشان کو یکدم سکون کا احساس ہوا گویا اس شخص نے ان کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وحید عاجزی سے بولا۔ ''سبزی کاٹ رہے تھے جی، ابھی آدھے گھنٹے میں کھانا بن جائے گا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''ذیشان بھائی، میں باہر آگ جلا رہا ہوں۔ آپ یہ سب چیزیں باہر پہنچاتے جائیں۔'' وحید سبزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ وہ شخص انہیں گھورتا ہوا چلا گیا تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

انہوں نے کھانا باہر ہی بنایا تھا۔ وحید نے ساتھ ہی تنور پر روٹیاں بھی لگا لی تھیں۔ ذیشان سے وقت کٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ اس کے دل میں ہزار ہا اندیشے سر سرا رہے تھے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں امید کے دیے بھی روشن تھے۔ آخر فیصلہ کن لحہ پہنچ آیا۔

وحید نے زہریلی بوٹی پورے سالن میں انڈیل دی۔ اس کی خوشبو بھی میتھی سے ملتی جلتی تھی۔ ذیشان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے جا کے ڈاکوؤں کو کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ ایک ڈاکو نگرانی کرنے والوں کے لیے کھانا لے گیا۔ وحید اور ذیشان نے مل کے باقی ڈاکوؤں کے لیے کھانا لگایا۔ وحید سردار کو بھی کھانا دے آیا تھا۔

اب وہ دونوں کن انکھیوں سے ڈاکوؤں کو کھانا کھاتے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے فکری سے ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ لگاتے کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے ایک ڈاکو کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھے۔ اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ ''او یار...... میرے پیٹ میں تو آگ لگی ہوئی ہے۔'' وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اچانک اس نے زور کی قے کی۔ قے میں خون بھی شامل تھا۔ باقی ڈاکو بھی اتنی دیر میں پیٹ پکڑ کے دہرے ہو گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں ہی کمرا تینوں ڈاکوؤں کے الٹی کرنے کی آوازوں سے بھر گیا۔ ذیشان نے بھی متلی کی کیفیت محسوس کی۔ اسے چکر آنے لگے۔ اس نے وحید کو دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ نظر آ رہا تھا۔

ذیشان باہر آ گیا۔ باہر آ کے ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اس کی طبیعت کسی حد تک سنبھل گئی۔ اچانک اس کی نظر سردار کی کوٹھری پر پڑی۔ وہ دھڑکتے دل سے اس کی کیفیت دیکھنے اس کی کوٹھری کی طرف چل پڑا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ اندر داخل ہوتے ہی وہ یوں اچھلا جیسے اسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ سردار کا کھانا جوں کا توں رکھا تھا اور وہ کمرے سے غائب تھا۔

☆☆☆

صائم کا خیال تھا کہ ڈاکو باہر نکلتے ہی اسے چھوڑ دیں گے۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ وہ باہر نکلے تو اس نے ایک گاڑی کلب کے دروازے کے ساتھ ہی کھڑی دیکھی۔ یہ ایک پرانے ماڈل کی کرولا تھی۔ کمال کو اس گاڑی کی ڈکی میں ٹھونسا جا رہا تھا۔ دو ڈاکوؤں نے اسے اور عامر کو گلی کے کونے پر کھڑی ایک کھلی جیپ میں دھکیل دیا۔ وہ خود بھی ان کے پیچھے سوار ہو گئے۔ گلی اس وقت بالکل سنسان نظر آ رہی تھی۔

دونوں گاڑیاں بیک وقت چل پڑیں۔ صائم کی نظر اچانک کلب سے نکلتے شعلوں پر پڑی۔ اسے اندر رہ جانے والوں کا خیال آیا۔ شاید ان سب کی قسمت میں زندہ جلنا لکھا تھا۔

ان کے ساتھ بیٹھے دونوں افراد نے اپنے چہروں پر سے نقاب اور گاؤن نما سیاہ لبادے اتار لیے۔ گاڑی میں اندھیرا تھا۔ اس لیے وہ اب بھی ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد صائم نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

''آپ لوگ ہمیں کہاں لے کے جا رہے ہیں؟''
''تم لوگوں کو تمہارے کرتوتوں کی سزا دینے۔'' ایک شخص سکون سے بولا۔ اندھیرے میں اس کا ہیولا بہت پُراسرار لگ رہا تھا۔ صائم کو اس سے خوف محسوس ہوا۔
''دیکھیں جی ہم تو صرف کھیلنے آئے تھے۔ ہمارا اس شخص سے کوئی تعلق نہیں۔'' عامر بھی ہمت کر کے بولا۔
''ہمیں پتا ہے تم لوگ اِدھر کون سا کھیل کھیلتے ہو۔ اِدھر لڑکوں کی گندی ویڈیوز بنا کے انہیں بلیک میل کرتے ہو۔'' وہ شخص استہزائیہ انداز میں بولا۔
''آپ لوگوں نے وہ سب ویڈیوز جلانے کے لیے کلب میں آگ لگائی ہے نا؟'' صائم کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
''ہاں۔ اور تم لوگوں نے اگر وہ ویڈیوز کہیں اور بھی رکھی ہوئی ہیں۔ تو تمہیں ان کے بارے میں بھی بتانا ہوگا۔'' وہ زہر خند لہجے میں بولا۔
گاڑی اب مین روڈ پر پہنچ چکی تھی۔ مین روڈ پر اکا دکا گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ صائم نے ان کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دونوں افراد کو دیکھا۔ دونوں نے پینٹ شرٹس پہن رکھی تھیں۔ اور چہرے سے کافی مہذب لگ رہے تھے۔ دونوں کی عمریں چالیس کے لگ بھگ تھیں۔
اپنے لباس اور رائفلیں جانے کہاں انہوں نے چھپا دی تھیں۔ صائم کو وہ گاڑی میں کہیں نظر نہیں آئیں۔
ان کے مہذب چہرے دیکھ کے صائم نے ہمت کی اور بولا:''انکل، میں تو خود ان کے ظلم کا ستایا ہوا ہوں۔ مجھے بھی بے ہوش کر کے انہوں نے میری ویڈیو بنائی تھی۔ یہ بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔'' اس نے عامر کی طرف اشارہ کیا۔
عامر اسے غصے سے گھورنے لگا۔
وہ اس سے نظریں چرا کے بولا۔ ''پلیز انکل، مجھے چھوڑ دیں میری امی گھر میں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
اس کے ساتھ بیٹھے شخص نے اسے بغور دیکھا عقب سے آتی گاڑی میں اس کا چہرہ روشن نظر آ رہا تھا۔ صائم نے اس شخص کی آنکھوں میں یکا یک دلچسپی ابھرتی دیکھی۔
''اوئے، اِدھر دیکھ یہ ہم کیا پکڑ لائے ہیں۔'' اس شخص نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ وہ بھی اسے گھورنے لگا۔ وہ ان نظروں کا مفہوم بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس نے نظریں چرا لیں۔

''یہ تو لگتا ہے آسمان سے گر کے میں کھجور میں اٹک چکا ہوں۔'' اس نے مایوسی سے سوچا۔ اچانک جیپ کی رفتار آہستہ ہوگئی۔ وہ دونوں افراد چوکنے ہو کے بیٹھ گئے۔ صائم نے جیپ کے شیشے میں سے ڈرائیونگ کیبن میں جھانکا۔ اُدھر ڈرائیور کے ساتھ ایک اور فرد بھی بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نظر ونڈ اسکرین کے پار ایک منظر پر پڑی۔ وہ پولیس کا ناکا تھا۔ اس کا دل یکبارگی زور سے دھڑکنے لگا۔ پل بھر میں ہی اس کے دل میں چھایا مایوسی کا غبار چھٹ گیا۔ اب اس کی آنکھوں میں امید کی کرن جگمگا رہی تھی۔

☆☆☆

ذیشان الٹے قدموں واپس ہوا۔ وہ بھاگا ہوا وحید کے پاس پہنچا۔ وہ ایک رائفل کو الٹا پکڑے، ایک ڈاکو کے سر پر بجا رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی پچک چکی تھی۔ باقی دو ڈاکوؤں کے ساتھ وہ پہلے ہی یہی سلوک کر چکا تھا۔ وہ سب اپنے ہی خون اور الٹیوں میں لت پت پڑے تھے۔ ذیشان کو دیکھ کے اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتی دیکھ کے وہ بھی پریشان ہوگیا۔
''کیا ہوا ذیشان بھائی؟'' اس نے لرزتی آواز میں استفسار کیا۔
''وہ...... وہ سردار اپنی کوٹھری سے غائب ہے۔ اس کا کھانا بھی جوں کا توں رکھا ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔
وحید کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ سردار کا کمرا الگ تھلگ سا تھا۔ وہ باقی ڈیرے سے قدرے فاصلے پر تھا۔ دونوں اکٹھے سردار کے کمرے میں داخل ہوئے تو چونک گئے۔ سردار ایک چارپائی پر بیٹھا کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ اس نے نظر اٹھا کے انہیں دیکھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں درندے کی سی چمک بیدار ہوئی۔ اس نے وحید کے ہاتھ میں گن دیکھ لی تھی۔ وہ اپنی گن کی طرف لپکا جو کمرے میں دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ وحید نے فوراً اپنی گن کا رخ اس کی طرف موڑ کے ٹریگر دبا دیا۔ کمرا فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ گن برسٹ پر سیٹ تھی۔ سردار کی پشت میں لاتعداد سوراخ ہو چکے تھے۔ وہ تیورا کے نیچے گرا۔
وحید نے لپک کے دیوار کے ساتھ لٹکی گن اتار لی۔ اس کے چہرے پر جنگجوؤں والے تاثرات تھے۔ وہ گن اس نے ذیشان کی طرف بڑھا دی۔ ذیشان بھی گن کے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

استعمال سے واقف تھا۔ شروع شروع میں ڈاکوؤں نے اسے بھی نشانے بازی کی پریکٹس کرائی تھی۔ مگر اس کی عدم دلچسپی دیکھ کے انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

ذیشان نے گن تھام لی۔ وحید، سردار کی جیبیں ٹٹولنے لگ گیا۔ چند لمحوں بعد ہی وہ سیدھا ہوا۔

"چلیں۔" وہ ذیشان سے مخاطب ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چابی تھی۔

دونوں تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ چاند کی روشنی سے سارا علاقہ منور ہو چکا تھا۔ وحید اسی روشنی میں تیزی سے ایک طرف بھاگ رہا تھا۔ ذیشان اس کے پیچھے تھے۔ درختوں کی اوٹ میں کھڑی ایک جیپ کے پاس پہنچ کے وہ رک گئے۔ وحید نے فوراً دروازہ کھول کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے پسنجر سیٹ کا لاک کھولا۔ ذیشان بھی اچھل کے گاڑی میں سوار ہو گیا۔

وحید نے زن سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ذیشان اسے اتنی مہارت سے گاڑی چلاتے دیکھ کے حیران نظر آ رہا تھا مگر وہ بولا کچھ نہیں۔ آج وحید قدم قدم پر اسے حیران کر رہا تھا۔

کچھ دور پہنچ کے اس نے جیپ روکی۔ ذیشان اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"نگرانی کرنے والوں کی بھی کچھ خیر خبر لے لیتے ہیں ناں۔" وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ اسے گاڑی سے اترتا دیکھ کے ذیشان بھی گاڑی سے اتر آیا۔ کچھ دیر کے بعد ہی وہ اس جگہ موجود تھے جہاں نگرانی کرنے والے اکٹھے بیٹھ کے کھانا کھایا کرتے تھے۔

چار ڈاکو زمین پر لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ ذیشان نے انہیں دور سے ہی دیکھ لیا۔ ان کے قریب جانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ وحید رائفل تھامے ان کے پاس پہنچا۔ اس نے گن کا رخ ان کی طرف کیا ہی تھا کہ ایک گونجیلی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ "رک جاؤ۔"

وحید اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ اچانک ایک درخت کے عقب سے ایک شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کا رخ وحید کی طرف تھا۔

یہ ایک ڈاکو تھا جو جانے کیسے بچ گیا تھا۔ ذیشان کو لگا کہ وہ دلدل سے نکلتے نکلتے اچانک پھر سے اس میں دھنسنے لگے ہیں۔

☆☆☆

پولیس والوں نے ناکے پر گاڑی روکی ہی نہیں تھی۔ صائم کی آنکھوں میں امید کا جلتا چراغ پھر بجھ گیا۔ ان کے ساتھ بیٹھے دونوں افراد اب ریلیکس تھے۔ صائم کے ساتھ بیٹھے شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ کسمسایا۔

"میری جان تم ڈر رہے کیوں ہو؟ ہم تمہیں کھا تو نہیں جائیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"آپ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔" وہ روہانسا ہو گیا۔

"دیکھو بھئی، ہم حکم کے پابند ہیں۔ ہمارے سردار نے ہمیں حکم دیا تھا کہ کمال کے کلب میں آگ لگانے کے بعد اسے اور اس کے تمام ساتھیوں کو پکڑ لائیں۔" اس بار وہ نرمی سے بولا۔

"میں اس کا ساتھی نہیں ہوں۔" صائم نے احتجاج کیا۔

"تم اس کے ساتھی نہیں ہو، پر اس کے ساتھ تو تھے۔" وہ عیاری سے بولا۔

"میں تو مجبوری میں اس کے ساتھ تھا۔ آپ نے اس کے ساتھی کو ہی ساتھ لے کے جانا ہے تو اسے ساتھ لے جائیں۔ یہ اس کے سارے دھندوں میں اس کا شریکِ کار ہے۔" اس نے نفرت سے عامر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عامر اسے گھور کے رہ گیا۔

"اسے بھی ساتھ ہی لے کے جا رہے ہیں۔ مگر ایک کے ساتھ ایک فری مل رہا ہو، اور وہ بھی تم جیسا لڑکا تو کس کافر کا دل تمہیں چھوڑنے کو چاہے گا۔" وہ اس کی طرف لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر میٹھی سی مسکان تھی۔ چاند کی روشنی میں صائم کو یہ مسکراہٹ زہر سے بھی بری لگی۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

گاڑی نے مین روڈ چھوڑ دیا تھا اور اب ایک نیم پختہ سڑک پر رواں دواں تھی۔ کرولا ان سے آگے آگے چل رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں گاڑی ایک جنگل میں داخل ہو گئی۔ چاندنی رات میں ان کے ارد گرد ڈولتے درختوں کے ہیولے پُراسرار منظر پیش کر رہے تھے۔ صائم کا دل انجانے خدشوں سے لرز رہا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے عامر کی طرف دیکھا۔ اس کی حالت اس سے بھی بری لگ رہی تھی۔

صائم کے ساتھ بیٹھے شخص نے ہولے سے اس کا کندھا دبایا۔ اس کا انداز تسلی دینے والا تھا۔ مگر صائم کی فکرمندی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ "پتا نہیں یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں اور میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔" اس نے پریشانی سے سوچا۔

اب اسے ماں کی فکر مندی یاد آرہی تھی۔ ”وہ بلاوجہ تو مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھیں۔ کاش میں نے ان کی ہدایات پر عمل کیا ہوتا۔“ وہ اب پچھتا رہا تھا۔

کافی دیر کے سفر کے بعد ان کی گاڑی اچانک رک گئی۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے شخص نے کھڑے ہوکے جیپ کی چھت کے اوپر سے باہر جھانکا۔ اس کی نظر آگے کھڑی کرولا پر پڑی۔

”کیا ہوا؟“ دوسرے شخص نے استفسار کیا۔ اسی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ صائم کا دل اچھل کے حلق میں آگیا۔ ”پتا نہیں، آج کی رات مزید کیا کیا تماشے ہونے ہیں۔“ اس نے پریشانی سے سوچا۔

☆☆☆

ذیشان کو لگا کہ وہ شخص وحید پر فائر کرنے ہی والا ہے۔ وہ شاید ذیشان کی ادھر موجودگی سے بے خبر تھا۔ اس کی ساری توجہ وحید کی طرف تھی۔ وحید کی گن کا رخ زمین پر لوٹ پوٹ ہوتے ڈاکوؤں کی طرف تھا، وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا اس شخص کو گھور رہا تھا۔ ذیشان کے لیے یہ فیصلہ کن لمحات تھے، کوئی پل جاتا تھا کہ وہ شخص وحید کو گولیوں سے بھون دیتا۔ اس کے بعد اس کی باری بھی آسکتی تھی۔ اس نے ہمت کر کے گن کا رخ اس شخص کی طرف کیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا، اس کے علاوہ گن برسٹ پہ سیٹ تھی اس لیے ذیشان کو امید تھی کہ کوئی گولی تو اس شخص کو لگ ہی جائے گی۔

اس نے ٹریگر پر ہاتھ رکھ کے آہستہ آہستہ اس پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔ رائفل کا بٹ اس کے کندھے کے ساتھ جڑا تھا۔ وہ فائر کے بعد لگنے والا دھکا سہنے کے لیے تیار تھا۔ اچانک فضا فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ درختوں میں سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ پرندے اپنے نشیمن چھوڑ کے اڑ گئے تھے۔ ذیشان نے اس شخص کو ہوا میں اچھلتے دیکھا۔ اس کے جسم کا سامنے والا حصہ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ اسے بھی ہلکا سا دھکا لگا تھا مگر وہ اس کے لیے تیار تھا اس لیے اسے سنبھلنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس شخص کو گرتے دیکھ کے وحید اس کی طرف مڑا۔ اتنی دور سے بھی ذیشان کو اس کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات نظر آئے۔ اس نے انگوٹھا بلند کیا۔

ذیشان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا قتل تھا۔ وحید نے اپنی گن کا رخ زمین کی طرف کر کے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے۔ زمین پر پڑے ڈاکوؤں کی کھوپڑیوں میں سوراخ ہو چکے تھے۔

ان تینوں کو مارنے کے بعد وہ تیزی سے جیپ کی طرف بھاگا۔ ذیشان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے جیپ پر سوار ہوتے ہی وحید نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ”ایک کام تو ختم ہوا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اتنے لوگوں کے قتل کے بعد بھی وہ ریلیکس نظر آرہا تھا۔ ذیشان کو اس پر حیرت ہوئی۔ وہ تو ابھی تک لرز رہا تھا۔

”تم تو لگتا ہے ساری زندگی مار دھاڑ ہی کرتے رہے ہو؟“ ذیشان اس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔

وحید نے اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں اس بار وحشیانہ سے تاثرات تھے۔ ”میں نے زندگی میں پہلی بار کسی انسان پر گولی چلائی ہے، وہ بھی اس لیے کہ وہ اس کے حق دار تھے۔“ اس کے لہجے سے واضح طور پر ناگواری کا اظہار ہو رہا تھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ذیشان نے فوراً صفائی پیش کی۔ میرا مطلب تھا کہ تم بہت بہادر اور باہمت ہو۔ تمہیں دیکھ کے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم چیونٹی کو بھی مار سکتے ہو۔“

”وہ تو آپ کو دیکھ کے بھی نہیں لگتا۔“ وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ”لیکن ہم دونوں نے جو بھی کیا مجبوری میں کیا۔ بلی کا راستہ بھی بند کر دیا جائے تو وہ بھی انسان پر حملہ کر دیتی ہے۔ ہم تو پھر بھی انسان ہیں۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آخر ہم کب تک ان کی غلامی میں زندگی بسر کر سکتے تھے۔ آزادی کی کوشش تو ہمارا حق ہے۔“ اس نے وحید کی تائید کی۔

”ابھی تو ایک مرحلہ طے ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ راستے میں ہی ہمیں باقی ڈاکوؤں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔“ وحید نے اس کی توجہ پیش آمدہ مسئلے کی طرف دلائی۔

”اب کوئی مسئلہ نہیں جتنی آسانی سے پہلا مرحلہ سر ہوا ہے۔ اس سے لگتا ہے کہ قدرت ہمارے ساتھ ہے۔ ہم انشاءاللہ آج ضرور ان کے چنگل سے آزاد ہو جائیں گے۔“ اس کے لہجے میں عزم تھا۔

”یہ چیز......“ وحید کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”آپ ایسے ہی جذبے کا مظاہرہ کرتے رہیں تو ہم ضرور اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

اس نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ انہیں ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ وحید نے گاڑی فوراً روک دی۔ اپنی

گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس نے آف کر دی تھیں۔ ''لگتا ہے باقی ماندہ کمپنی سے مقابلے کا وقت آن پہنچا۔'' وہ سرسراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ذیشان کے ساتھ رکھی گن اس نے اٹھا لی تھی۔

''آپ تیار ہیں نا؟'' وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بالکل۔'' اس نے اپنی رائفل کی نال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ وحید اچھل کے گاڑی سے اتر گیا۔ ذیشان بھی اس کے پیچھے پیچھے گاڑی سے اترا۔ یہ روڈ کافی تنگ تھا۔ ان کی گاڑی اس انداز میں کھڑی تھی کہ اس کے قریب سے دوسری گاڑی کا گزرنا ممکن نہیں تھا۔

وحید ایک درخت کے عقب میں پہنچ کے رک گیا۔ تھوڑی دیر میں ہی انہوں نے دو گاڑیوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ کرولا ان کی گاڑی کے پاس آ کے رک گئی۔ اس کے عقب میں جیپ بھی رک گئی۔ کرولا کی پیٹرول کی ٹنکی سامنے نظر آ رہی تھی۔ وحید نے اس کی طرف گن کا رخ موڑ کے ایک برسٹ مارا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ ہی اس نے کرولا کو فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ پیٹرول کی ٹنکی دھماکے سے پھٹ گئی تھی۔ انہوں نے زمین کو لرزتا محسوس کیا۔

کچھ دیر کے لیے تو وہ دونوں بھی حواس باختہ ہو گئے۔ فضا میں بلند ہونے کے بعد شعلوں میں گھری کار درختوں سے جا ٹکرائی، جس سے جھاڑیاں دھڑا دھڑ جلنے لگیں۔ ان کے جلنے سے اردگرد کا منظر روشن ہو گیا تھا۔

وحید نے سنبھلنے کے بعد جیپ کی طرف گن کا رخ موڑا۔ ذیشان اس سے پہلے ہی جیپ پر ایک برسٹ فائر کر چکا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ جیپ کے سامنے والے دونوں ٹائر برسٹ ہو گئے۔ اچانک وحید کی نظر ڈرائیونگ کیبن سے باہر آتی گن کی نالی پر پڑی۔ اس کا رخ ذیشان کی طرف تھا۔

اس نے فوراً ونڈ اسکرین کی طرف گن موڑ کے ایک برسٹ فائر کر دیا۔ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ہی چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ڈرائیونگ کیبن میں بیٹھے دونوں افراد شاید گولیوں کا نشانہ بن گئے تھے۔ کچھ دیر رک کر انہوں نے انتظار کیا۔ جیپ کی طرف سے کسی قسم کی سرگرمی نظر نہیں آئی تو انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''شاید سارے دشمن نیست و نابود ہو چکے ہیں۔'' ذیشان نے سرگوشی کی۔

''ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی زندہ ہو۔ میں جیپ کی طرف جاتا ہوں۔ آپ مجھے کور کرنا۔'' وہ اتنا کہہ کے آہستہ آہستہ جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ جنگل میں اب مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اتنی فائرنگ کے بعد اسے یہ موت کا سناٹا محسوس ہوا۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا جیپ کے پاس پہنچا۔ ڈرائیونگ کیبن میں دو افراد اپنے ہی لہو میں رنگین پڑے تھے۔ چاند کی روشنی میں ان کی لاشیں عجیب ہی منظر پیش کر رہی تھیں۔ وہ کھسکتا ہوا پیچھے کی جانب آیا۔ پیچھے آتے ہی اس نے گن کا رخ یکدم اندر کی طرف موڑ دیا۔ ''ہینڈز اَپ......'' ساتھ ہی وہ بولا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ جواب میں اسے خوفزدہ سی آواز سنائی دی۔ وہ آواز کی سمت فائر کرنے ہی والا تھا کہ اس نے گاڑی کی سیٹ پر دو لڑکوں کو دیکھا۔ یہ لڑکے حلیے سے شہری لگ رہے تھے۔ لگتا تھا ڈاکو انہیں اغوا کر کے لائے تھے۔

یکایک اسے ایک خیال آیا۔ اگر ان دونوں کو اغوا کر کے لایا گیا تھا تو ان کی نگرانی کے لیے بھی کم سے کم ایک فرد کا عقبی حصے میں موجود ہونا ضروری تھا۔ وہ شاید جیپ سے فرار ہو چکا تھا۔ وحید کو خطرے کا احساس ہوا۔ وہ ایکدم سے چوکنا ہو گیا، مگر اس کا چوکنا ہونا اس کے کام نہ آ سکا۔ اچانک ہی اس نے اپنی گردن کے ساتھ لگی گن کی سرد نال محسوس کی۔

''گن چھوڑ دو۔'' اس کے کانوں نے سرسراتی ہوئی سرگوشی سنی۔ یہ آواز اتنی سرد تھی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ اس نے گن چھوڑ دی۔

☆☆☆

ذیشان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے وحید کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھاڑیوں کو لگی آگ تھوڑی دیر میں خود ہی بجھ گئی تھی اس کی وجہ سے اب اندھیرا کافی گہرا لگنے لگا تھا۔ درختوں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی سے ماحول کسی حد تک روشن لگ رہا تھا، مگر اس روشنی میں اسے وحید کا صرف ہیولا ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی کچھ دیر کے بعد جیپ کے عقب میں غائب ہو گیا۔

ذیشان درختوں میں چلتا ہوا اس سمت جانے لگا جدھر سے وہ جیپ کے عقب میں دیکھ سکتا تھا۔

اس نے ایک درخت کی اوٹ سے جیپ کے عقب میں جھانکا تو چونک گیا۔ ایک شخص نے وحید کو گن پوائنٹ پر لیا ہوا تھا۔ مگر وہ وحید کے اتنے قریب تھا کہ کچھ فاصلے سے ذیشان کے لیے اسے نشانہ بنانا ممکن نہیں تھا۔ گولی غلطی سے وحید کو بھی لگ سکتی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ آخر اس کے

ذہن میں ایک آئیڈیا آگیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کے اس شخص کے پاس پھینکا۔ وہ شخص بدک کے پیچھے ہٹا۔ وحید کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی اور جیپ کی اوٹ میں چھلانگ لگا دی۔ ذیشان نے اس شخص کو نشانہ بنایا مگر اس نے ابھی ٹریگر پوری طرح دبایا ہی نہیں تھا کہ ایک فائر ہوا۔ ذیشان چونک گیا۔ اتنی جلدی چھلانگ لگانے کے بعد وحید تو فائر نہیں کر سکتا تھا۔ تو کیا یہ فائر کسی اور شخص نے کیا تھا؟ یہ سوال ذیشان کے لیے پریشان کن تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔ اس نے ایک بار پھر اس شخص کو نشانہ بنا کے پورا برسٹ مارا۔ وہ ایک درخت کی اوٹ میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ برسٹ کا نتیجہ اس کی خواہش کے عین مطابق نکلا تھا۔ وہ شخص تیورا کے نیچے گرا۔ گن اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی۔

اسی لمحے ذیشان نے درختوں میں ایک ہیولا دیکھا۔ اس نے فوراً گن کا رخ موڑ کے ادھر فائر کیا۔ پتا نہیں اس کی فائرنگ سے خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا یا نہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے درختوں میں دیکھنے لگا مگر اب منظر ساکت تھا۔

''ذیشان بھائی کدھر ہیں آپ؟'' وحید کی آواز جیپ کی طرف سے آئی تھی۔ اس نے ادھر نگاہ کی تو وحید اسے جیپ کی اوٹ میں نظر آ گیا۔ اس نے مدھم آواز میں اپنی پوزیشن بتائی۔

''اب شاید ایک ہی دشمن بچا ہے۔ وہ درختوں کی اوٹ میں چھپا ہوا ہے۔'' وحید نے اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

ذیشان بھی چوکنا انداز میں چلتے ہوئے اس کے قریب آ گیا۔ ''میں نے درختوں میں غائب ہوتا ایک ہیولا دیکھا تھا اس پر میں نے فائر بھی کیا تھا۔ یا تو اسے گولی لگ گئی ہے یا وہ بھاگ گیا ہے۔''

''چلیں کچھ دیر انتظار کر لیتے ہیں۔ تم سامنے نظر رکھو' میں عقبی طرف سے ہوشیار رہتا ہوں۔'' وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ کافی دیر تک انتظار کرتے رہے مگر کسی قسم کی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی۔

''میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' آخر کار ذیشان بیزار ہو کے بولا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر پہلے یہ گاڑی سائڈ پر لگانا پڑے گی۔ تبھی ہماری گاڑی کے گزرنے کا راستہ بنے گا۔'' وحید کی بات سن کے ذیشان کے چہرے پر پریشانی نمودار ہو گئی۔ اس بارے میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''ہم دو افراد کے لیے تو یہ بہت مشکل ہوگا۔ اس کے تو سامنے والے دو ٹائر بھی بے کار ہو چکے ہیں۔'' وہ پریشانی سے بولا۔

''ہم دو افراد نہیں چار افراد ہیں۔'' وحید پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تو ذیشان چونک گیا۔

''چار افراد کون سے؟''

''دولڑکے جیپ میں بیٹھے ہیں۔ یہ شاید انہیں اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔'' وحید کی وضاحت پر اس نے اطمینان... کا سانس لیا۔

''آپ ادھر ہی ٹھہریں میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں۔'' وحید اتنا کہہ کے چوکنا انداز میں جیپ کے سامنے سے ہوتے پیچھے جانے لگا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کوئی بھی اندھی گولی اس کا کام تمام کر سکتی تھی۔ مگر خیریت گزری۔ وہ ڈاکو شاید فرار ہو چکا تھا۔ عقبی سمت میں آ کے اس نے جیپ میں جھانکا تو حیران رہ گیا۔ جیپ ان دونوں کے وجود سے خالی تھی۔

☆☆☆

فائرنگ کے بعد ہی صائم نے آسمان پر شعلے بلند ہوتے دیکھے تھے۔ یہ ایک کار تھی جو روڈ کے کنارے درختوں میں گر گئی تھی۔ اس میں آگ لگی تھی۔ اس کے چہرے پر سنسنی نمودار ہوئی۔ ایسا منظر تو اس نے فلموں میں ہی دیکھا تھا۔ اچانک اسے کمال کا خیال آیا تو اس کا دل سکون سے بھر گیا۔ کمال ڈکی میں بند تھا۔ اب وہ اپنے کرتوتوں سمیت نیست و نابود ہو چکا تھا۔

گاڑی کے تباہ ہوتے ہی اس نے دو افراد کو دیکھا۔ وہ اسلحہ بردار تھے۔

صائم اپنی سیٹ پر دبک کے بیٹھ گیا ادھر تو قتل و غارت شروع ہو چکی تھی۔

وہ خشک پتے کی طرح لرزنے لگا۔ دل ہی دل میں وہ ان تمام دعاؤں کا ورد کر رہا تھا جو بھی اس نے یاد کی تھیں۔

''ہینڈز اَپ۔'' یہ آواز سنتے ہی اچھلا۔ آواز اس کے قریب سے ہی آئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں اوپر کیں۔ ایک شخص ان پر رائفل تانے کھڑا تھا۔ اس کا فشارِ خون تیز ہو گیا۔ اپنے دل کی دھڑکن اسے اپنی کنپٹیوں میں سنائی دے رہی تھی۔ اچانک اس شخص کے پیچھے ایک اور شخص نمودار ہوا۔ وہ ان کے ساتھ جیپ میں سفر کر رہا تھا۔ صائم نے اسے پہچان لیا۔ اس نے ان پر رائفل تانے شخص سے رائفل چھڑوا دی۔ اسی لمحے ایک آہٹ کی آواز پر وہ بدکا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی ان پر گن تانے شخص نے اپنی گن

اٹھائی اور جیپ کے عقب میں غائب ہو گیا۔ فضا میں ایک بار پھر فائرنگ کی سمع خراش آواز بلند ہوئی۔ صائم نے بدک کے پیچھے ہٹنے والے شخص کو اچھل کے گرتے دیکھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" عامر کی خوفزدہ آواز پاس سے ہی ابھری۔

"جو بھی ہو رہا ہے تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔" وہ زہرخند لہجے میں بولا۔

"اچھا یہ شکوے بعد میں کر لینا۔ ابھی اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈو۔" وہ بیزار سے انداز میں بولا۔

"میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو خود تمہاری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسا ہوں، اب تم ہی بچنے کا کوئی راستہ نکالو۔" اس نے بال عامر کے کورٹ میں پھینک دی۔

کچھ دیر فائرنگ کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ دم سادھے ادھر ہی پڑے رہے۔ آخر کار عامر بولا۔ "میرا خیال ہے، ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" صائم نے پریشانی سے پوچھا۔

"پہلا ٹارگٹ تو ان ڈاکوؤں کے چنگل سے نکلنا ہے۔ اگر ان سے بچ جائیں تو کہیں نہ کہیں پہنچ ہی جائیں گے۔"

عامر کی بات کے جواب میں اس کی آنکھوں میں نیم رضامندی کی جھلک ابھری۔ عامر اس کا ہاتھ پکڑ کے گاڑی سے اتر آیا۔ وہ جھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے جنگل کی طرف بڑھنے لگے۔ صائم نے جینز کے ساتھ آدھی آستین والی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جھاڑیاں اس کے بازوؤں میں خراشیں ڈالتیں تو وہ سسکاری بھر کے رہ جاتا۔ عامر اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے کھینچتا جا رہا تھا۔ اسے جیسے جھاڑیوں اور کانٹوں کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ اچانک صائم کو اپنے پاس ہی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ رک گیا۔ عامر بھی رک کے غور سے آواز سننے لگا۔ جھاڑیوں کی سرسراہٹ سے لگ رہا تھا کہ ان کی طرح کوئی اور بھی جھاڑیوں میں چل رہا ہے۔

اچانک صائم کے منہ سے ایک خوفزدہ سی چیخ بلند ہوئی۔ جو سناٹے کی چادر چیرتی ہوئی دور تک پھیلتی چلی گئی۔

☆☆☆

وحید ان دونوں کے غائب ہونے سے پریشان ہو گیا تھا۔ اب گاڑی کو دھکا کون لگاتا؟ اچانک اس کی نظر جیپ کے فرش پر ایک کھلے ہوئے ڈھکن پر پڑی۔ اس نے جیپ میں سوار ہو کے اندر جھانکا۔ اس خانے میں سیاہ لبادے پڑے تھے۔ اس نے وہ نکالے تو اندر رائفلز کے اضافی میگزینز پر اس کی نظر پڑی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس کی گن میں اب گنی چنی گولیاں ہی رہ گئی تھیں۔ چونکہ ڈاکوؤں کی آخری پارٹی سے بھی ان کی مڈبھیڑ متوقع تھی۔ انہیں مزید گولیوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس نے وہ میگزینز نکال لیے۔

ذیشان کے پاس پہنچ کے اس نے دونوں لڑکوں کے غیاب کے بارے میں اسے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

وحید نے اپنی گن میں اضافی گولیاں ڈالیں اور پھر ذیشان سے اس کی گن لے کر اسے لوڈ کرنے لگا۔ سارے ڈاکو ایک ہی قسم کی گن استعمال کرتے تھے۔ ذیشان اسے یہ سب کرتے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ "تم نے یہ سب کیسے سیکھا؟" اس نے حیرانی کے عالم میں وحید سے استفسار کیا۔

"ہمارے گاؤں کے پاس ہی ایک جنگل ہے۔ گاؤں کے اکثر لوگ شکار کی غرض سے اُدھر جاتے رہتے ہیں اس لیے میں تو بچپن سے ہی اسلحے سے واقفیت رکھتا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

ذیشان جواب میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ان دونوں کو ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ آواز جنگل کی طرف سے آئی تھی۔ "یہ تو لگتا ہے ان دونوں لڑکوں میں سے کوئی چیخا ہے۔" وحید پُرسوچ انداز میں بولا۔

"ہو سکتا ہے مگر وہ چیخا کیوں؟" ذیشان کے لہجے میں اندیشے بول رہے تھے۔

"جس وجہ سے بھی چیخا ہماری بلا سے۔ وہ خود ہی یہاں سے بھاگ کے گئے ہیں اب بھگتیں۔" وحید اُن کے اچانک غیاب کی وجہ سے ابھی تک جھنجلایا ہوا تھا۔ ان کے بھاگ جانے کی وجہ سے وہ گاڑی کو اکیلے ہٹا نہیں سکتے تھے۔

"ڈاکوؤں کی ایک اور پارٹی بھی آج کسی مشن پر گئی تھی۔ میرا خیال ہے وہ واپس آنے ہی والے ہوں گے۔ ہمیں ان سے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچنی چاہیے۔" وحید نے اپنے مسائل سے اسے آگاہ کیا۔

"میرے خیال میں ہم اپنی جیپ کو کچھ پیچھے لے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک دم سے کسی کو نظر نہ آسکے۔ اس جیپ کو دیکھ کے وہ یہی سمجھیں گے کہ کسی وجہ سے اس کے ٹائرز

برسٹ ہو گئے ہیں۔ اور باقی ڈاکو دوسری گاڑی میں بیٹھ کے یا کسی اور ذریعے سے چلے گئے ہیں۔ وہ سب مل کے اسے دھکا لگا کے راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت ہمارے پاس ان سے نمٹنے کا اچھا موقع ہوگا۔ اگر ہم انہیں مارنے میں کامیاب ہو گئے تو ان کی گاڑی میں ہم فرار بھی ہو سکیں گے، اور کسی کا پیچھا کرنے کا چانس بھی نہیں رہے گا۔'' ذیشان نے پل بھر میں ہی سارا منصوبہ بنا لیا تھا۔

وحید اسے تعریفی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ''واہ ذیشان بھائی! آپ تو جینیئس ہیں۔'' وحید نے کھل کے اس کی تعریف کی تو اس کے چہرے پر شرمیلی سی مسکان ابھر گئی۔

وحید سامنے کا جائزہ لینے کے لیے جیپ کے عقب میں گیا۔ ذیشان اس کے ساتھ تھا۔ وہاں اسے ایک ڈاکو کی لاش پڑی نظر آئی۔ ان دونوں نے مل کے اسے جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا دیا۔ جلی ہوئی کار کا ڈھانچا روڈ سے کافی ہٹ کے پڑا تھا۔ ڈاکوؤں کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی سامنے ہی پڑ رہی ہوتی۔ سائڈ کا منظر مزید اندھیرے میں اوجھل ہو جاتا۔ اس لیے اس پر ڈاکوؤں کی نظر پڑنے امکانات کم ہی تھے۔ اس کے بعد دونوں نے ڈرائیونگ کیبن میں سے دونوں لاشوں کو نکال کے جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپا دیا۔ پوری طرح سے مطمئن ہو کے وحید اپنی جیپ میں سوار ہو گیا۔ وہ جیپ کو ریورس کر کے پیچھے لے جانے لگا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس نے آن نہیں کی تھیں۔

ذیشان ادھر ہی رک گیا تھا۔ اچانک ہی اس نے ایک روشنی نمودار ہو کے غائب ہوتے دیکھی۔ یہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس لگ رہی تھیں۔ موڑ کاٹنے کی وجہ سے شاید لائٹ پھر سے اوجھل ہو گئی تھی۔ ذیشان نے مزید ایکشن کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ اسے خود اپنی کیفیت پر حیرانی ہوئی۔ اس بار اسے خوف کے بجائے سنسنی محسوس ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی اسے روشنی پھر سے نظر آنے لگی۔ اب وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ان کی طرف کوئی گاڑی آ رہی ہے۔ وحید بھی واپس آ گیا تھا، دونوں نے پوزیشنز سنبھال لیں اور بے چینی سے گاڑی کے قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ اس خونی رات میں ابھی مزید خون بہنے والا تھا۔

☆☆☆

صائم کی نظر جھاڑیوں میں سے جھانکتے ایک انسانی سر پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کے بے ساختہ ہی اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ عامر نے بھڑک کے اسے دیکھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں کسی چیز پر مرکوز تھیں۔ اس نے اسی نگاہوں کا

تعاقب کیا تو اس کی نظر بھی اس وجود پر پڑ گئی۔ وہ جھاڑیوں میں اوندھا پڑا تھا۔ اس کا بالائی دھڑ ہی نظر آرہا تھا۔ اس کے کندھے میں شاید گولی لگی تھی جس سے رسنے والے خون کے باعث اس کی ساری قمیص رنگین ہو چکی تھی۔ وہ گھسٹ گھسٹ کے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ شاید وہی ڈاکو ہے جو ہمارے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ یہ جنگل کی طرف بھاگا تھا تو اس پر فائرنگ ہوئی تھی۔ شاید اسی فائرنگ سے یہ زخمی ہوا ہے۔'' عامر نے اندازہ لگایا۔

ان کی آواز سن کے ڈاکو کراہا۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش بھی کی تھی مگر انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

صائم ابھی تک خوفزدہ تھا۔ عامر اس کا ہاتھ پکڑ کے پھر سے آگے بڑھنے لگا۔

کافی دیر چلنے کے بعد وہ کافی دور نکل آئے۔ جنگل کافی گھنا تھا، مگر اب جھاڑیوں سے زیادہ درختوں کی بہتات تھی۔ ان کی شاخوں سے چھنتی چاندنی میں انہیں کسی حد تک راستہ نظر آرہا تھا۔ اس دوران انہوں نے ایک بار پھر فائرنگ کی آواز سنی تھی مگر انہوں نے پروا نہیں کی۔ وہ آگے بڑھتے رہے۔

اچانک ہی انہوں نے خود کو ایک روڈ پر پایا۔ یہ شاید وہی روڈ تھا جس پر وہ سفر کر کے آئے تھے۔ ان کے تھکے ہوئے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ اب کم سے کم انہیں درست راستہ تو مل گیا تھا، مگر ان کی خوشی کا عرصہ انتہائی مختصر رہا۔ اچانک ہی وہ روشنی میں نہا گئے۔ یہ ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ ادھر ایک موڑ تھا جس کی وجہ سے گاڑی اتنا اچانک نمودار ہوئی تھی کہ انہیں چھپنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ وہ گاڑی ان کے پاس پہنچ کے رک گئی۔ وہ بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئے۔

☆☆☆

سب کچھ ان کی توقع کے مطابق ہی ہوا تھا۔ وہ گاڑی جیپ کے پاس آ کے رکی۔ یہ بھی جیپ ہی تھی۔ وہ دونوں اسے پہچانتے تھے۔ پسنجر سیٹ سے ایک شخص اترا۔ اس نے جیپ کے پاس جا کے ڈرائیونگ کیبن میں جھانکا۔

ذیشان کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کیبن میں دیکھنے کے بعد وہ پھر سے پیچھے آ کے ادھر سے ہی بولا۔ ''یہ تو خالی ہے شاید خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اسے ادھر ہی چھوڑ گئے ہیں۔'' اس نے ٹائروں کو دیکھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی نہ ہی قدرے آگے جھکی ہوئی جیپ پر اس نے غور کیا تھا۔

اس کی آواز سن کے پیچھے سے تین ڈاکو چھلانگیں مار کے اترے۔ ڈرائیور ان سے پہلے ہی اتر چکا تھا۔ اب وہ چاروں گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں انہیں واضح نظر آرہے تھے۔ وہ چاروں ان کے نشانے پر تھے۔ ذیشان اور وحید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔ اور پھر دونوں نے بیک وقت ہی ان پر فائر کھول دیا۔ پانچوں ڈاکو پل بھر میں ہی اپنے ہی خون میں نہا چکے تھے۔

دونوں نے پاس جا کے ان کا جائزہ لیا۔ تین ڈاکو تو بے حس و حرکت نظر آرہے تھے جبکہ دو لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ وحید نے ان کے سروں میں بھی گولیاں اتار دیں۔

ڈاکوؤں والی گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ وحید جیپ ریورس میں پیچھے لے گیا۔ ذیشان نے جیپ کے شیشے سے عقب میں جھانکا تو چونک گیا۔ جیپ کے فرش پر ایک انسانی وجود موجود تھا۔

''گاڑی روکو......'' ذیشان ہیجانی انداز میں بولا تو وحید نے گاڑی روک دی۔

''پیچھے کوئی آدمی ہے۔'' ذیشان کی بات سنتے ہی وحید گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ ذیشان بھی اس کے ساتھ اترا۔ عقبی حصے میں پہنچ کے انہوں نے اندر جھانکا۔ وہ کوئی لڑکی تھی۔ چاند کی ہلکی روشنی میں اس کا وجود گو کہ ایک ہیولے کے مانند نظر آرہا تھا، مگر اس کے باوجود اس وجود کی خوبصورتی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وحید نے جیپ پر سوار ہو کے لڑکی کا جائزہ لیا۔ اس کا وجود بے حس و حرکت تھا۔ اس نے لڑکی کی ناک کے سامنے الٹا ہاتھ رکھا۔ اس کا سانس چلتے محسوس کر کے وحید نے سکون کا سانس لیا۔ وہ چھلانگ لگا کے اتر آیا۔

''لگتا ہے ڈاکو اسے اغوا کر کے کہیں سے لائے تھے۔'' اس نے ذیشان سے کہا۔

''سردار کی تسکین کے لیے یہ ہر ہفتے ہی کوئی نہ کوئی لڑکی پکڑ لیتے تھے۔'' ذیشان نفرت سے بولا۔

واپس گاڑی میں بیٹھ کے وحید گاڑی ریورس کرنے لگا۔ تھوڑا پیچھے جا کے اسے تھوڑی کھلی جگہ نظر آئی تو اس نے گاڑی موڑ لی۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک موڑ کاٹا ہی تھا کہ چونک گیا۔ روڈ کے وسط میں دو لڑکے کھڑے تھے۔ وحید نے گاڑی روک دی۔ لڑکوں نے تیز روشنی کے باعث اپنی آنکھوں کے آگے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ ''یہ شاید وہی... لڑکے ہیں جو ڈاکوؤں کی جیپ میں موجود تھے۔'' وحید یہ کہتے ہوئے گاڑی سے اتر گیا۔

لڑکوں کے قریب پہنچ کے اس نے اُن کا جائزہ لیا۔

ان کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ ہی تھی۔ وہ خوفزدہ نظروں سے وحید کو دیکھنے لگے۔

”کون ہو تم لوگ؟“ وحید نے نرمی سے سوال کیا۔

”وہ ڈاکو ہمیں اغوا کر کے کہیں لے جا رہے تھے۔“ ان میں سے ایک لڑکا معصومیت سے بولا۔ وحید نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بے پناہ خوبصورت تھا۔

”پھر ہمیں اپنا ساتھی ہی سمجھو۔“ وحید مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہمارے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو گاڑی میں بیٹھ جاؤ، تم جہاں بتاؤ گے تمہیں چھوڑ دیں گے۔“

وہ جواب میں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وحید واپس پلٹ آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا ہی تھا کہ لڑکے بھی جیپ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے جیپ میں سوار ہونے کے بعد وحید نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ واپسی کے سفر میں دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔ ذیشان سوچ رہا تھا کہ جب وہ اچانک گھر پہنچے گا تو اس کی ماں اور بہن کی کیا حالت ہوگی؟ ان کا خیال آتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس مسکراہٹ سے اس کے تھکے ہوئے اعصاب کو کافی سکون ملا جو چند گھنٹے کے خونی واقعات کی وجہ سے کافی کشیدہ ہو چکے تھے۔ وہ ابھی تک حیران تھا کہ صرف دو ناتجربہ کار افراد نے کیسے ڈاکوؤں کی پوری پلٹن کا صفایا کر دیا تھا، اور انہیں خراش تک نہیں آئی تھی۔ یقیناً یہ مشیت ایزدی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جس طرح قدرت ابھی تک ان کی مدد کرتی آ رہی تھی، اسی طرح آگے بھی وہ ان کا ساتھ دے گی۔

وحید کو بھی اپنے گھر پہنچنے کی جلدی تھی مگر وہ گھر والوں سے بھی زیادہ ایک اور شخص سے ملنے کو بے چین تھا۔ اس کا قرض چکائے بغیر اسے سکون حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تصور میں اس سے نمٹنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ انہی خیالات میں گم اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کا سفر تمام ہو گیا۔ وہ مین روڈ پر گاڑی لے کے گیا ہی تھا کہ اس نے درمیانی شیشہ دھڑ دھڑائے جانے کی آواز سنی۔ وہ چونک کے پیچھے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

صائم اور عامر گاڑی میں سوار ہوتے ہی چونک گئے۔ گاڑی کے فرش پر ایک لڑکی پڑی تھی۔ اس کے سینے کا ہلکا سا زیر و بم بتا رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہے۔

”یہ کون ہے؟“ عامر اسے دیکھتے ہی بولا۔

”شاید ہماری طرح ڈاکو اسے بھی اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔“ صائم کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ لڑکی کے حسن نے اس پر انوکھا اثر کیا تھا۔ اسے لگا کے جیپ میں روشنی کا منبع چاند نہیں بلکہ اس لڑکی کا حسن ہے۔ گو کہ چاندنی میں اس کے نقوش نمایاں نہیں تھے مگر پھر بھی جانے کیوں صائم اس کے چہرے سے نظر ہٹا ہی نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ لڑکی جیپ کے فرش پر پڑی ہے۔

”میرا خیال ہے اسے اٹھا کے سیٹ پر بٹھا لیتے ہیں۔“ اتنا کہتے ہی اس نے لڑکی کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کے اسے اٹھایا اور سیٹ پر بٹھانے لگا۔ اسے سیٹ پر بٹھاتے ہوئے اس کی کھلی زلفوں نے ایک پل کے لیے صائم کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کی زلفوں سے مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ صائم کو لگا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھوتا جا رہا ہے۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی اس سے اتنا قریب ہوئی تھی۔ وہ بھی، وہ لڑکی جس نے پہلی نظر میں ہی اس کو اپنی ٹرانس میں لے لیا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور لڑکی کو ایک کونے میں سیٹ پر بٹھا دیا۔ اب لڑکی جیپ کی پشت اور شیشے کے سہارے بیٹھی تھی۔ عامر جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ اس نے صائم کی اس ساری سرگرمی کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔

صائم اسے سیٹ پر بٹھانے کے بعد پیچھے ہٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ اب اس کا اٹھا ہوا چہرہ کسی قدر واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سو رہی ہو۔ اس کی گھنی زلفوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ صائم کو لگا جیسے گھرے اندھیرے میں نور کا کوئی ہالہ روشن ہو۔ اس کا سر سیٹ کے ساتھ ٹکا تھا جس کی وجہ سے اس کی لمبی اور دودھیا گردن نمایاں ہو رہی تھی۔ صائم کی نظریں اس کی گردن سے ہوتے ہوئے اس کے نشیب و فراز میں الجھ کے رہ گئیں۔

اس نے کسی گہرے رنگ کی کڑھائی دار قمیص پہن رکھی تھی۔ جس کے باعث اس کی اجلی رنگت اور نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ دوپٹے سے بے نیاز تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

وہ نجانے کتنی دیر اس کے حسن کی بھول بھلیوں میں گم رہا۔ اچانک وہ عامر کی آواز سن کے چونکا۔

”شکر ہے اس خوفناک جنگل سے جان چھوٹی۔“ اس کی بات سن کے صائم نے باہر جھانکا۔ گاڑی مین روڈ پہ چڑھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ شہر میں داخل ہو جاتے۔

”آگے تو پولیس کا ناکا ہے۔“ وہ پریشانی کے عالم

میں بولا۔

"ہاں اور جاتے ہوئے پولیس والوں نے ہماری گاڑی میں ٹارچ سے سواریوں تک کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ لگتا ہے ڈاکوؤں سے ان کا مک مکا ہے۔ وہ تو اس جیپ کو بھی پہچانتے ہوں گے۔" عامر نے اس کی پریشانی میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! پھر تو آگے والوں کو ناکے کے متعلق بتانا پڑے گا۔" صائم نے یہ کہتے ہی شیشے پر ہاتھ مارا۔ ڈرائیور نے مڑ کے پیچھے دیکھا تو اس نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور نے گاڑی سائڈ پر لگا دی۔ ناکا یہاں سے سامنے نظر آرہا تھا۔ صائم نے گاڑی سے اتر کے ڈرائیور کو ناکے کے متعلق بتایا۔ وہ بھی پُرسوچ انداز میں ناکے کی طرف دیکھنے لگا۔ اسی لمحے ان کے پاس سے ایک گاڑی گزری۔ وہ ناکے سے بلا رکاوٹ گزرتی چلی گئی۔ ناکے پر کوئی پولیس والا نظر نہیں آرہا تھا۔ "تم بیٹھو۔ لگتا ہے پولیس والے اندر بیٹھے ہیں۔ ان کے باہر نکلنے سے پہلے ہم ناکے سے گزر جاتے ہیں۔" اس نے اتنا کہتے ہی جیپ آگے بڑھا دی۔ ناکے سے گزرتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر خیریت گزری۔

ناکے سے گزر کے دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

"اب کیا پروگرام ہے۔" ذیشان نے وحید سے استفسار کیا۔

"میرے خیال میں اب اس جیپ میں زیادہ دیر تک سفر مناسب نہیں۔ اسے ہمیں چھوڑنا ہوگا۔" وحید نے جواب دیا۔

"جیپ چھوڑ کے ہم کہاں جائیں گے؟" ذیشان پریشان ہوگیا۔

"ہم تو کسی ہوٹل میں ٹھہر سکتے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔" وحید پُرسوچ انداز میں بولا۔

"یہ لڑکے شہری لگ رہے ہیں، ان سے بات کرتے ہیں شاید ان کے ہاں ٹھہرنے کی جگہ مل جائے۔" ذیشان نے آئیڈیا پیش کیا۔

کچھ دور جا کے وحید نے گاڑی سائڈ پر لگا دی۔ اس نے پیچھے مڑ کے شیشے میں سے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ دونوں لڑکے اتر کے اس کے پاس آگئے۔

"تم لوگوں کو کہاں جانا ہے؟" صائم اپنا ایڈریس بتانے لگا۔ اس کے مطابق اس کا گھر قریب ہی تھا۔ اس نے خود ہی انہیں اپنے گھر ٹھہرنے کی آفر کردی۔

کچھ رد و قد کے بعد انہوں نے اس کی آفر قبول کرلی۔

یہ مسئلہ حل ہونے کے بعد وہ پھر روانہ ہوگئے۔ صائم پتا بتانے کی غرض سے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ ذیشان پیچھے جا کے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایک گاڑی سامنے سے گزری۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں کونے میں بیٹھی لڑکی کا چہرہ روشن ہوگیا۔ ذیشان کی نظر اس پر پڑی تو وہ اپنی سیٹ سے ایسے اچھلا جیسے اسے ہزار وولٹ کا کرنٹ لگ گیا ہو۔ وہ زرتاج تھی۔ اس کی بہن......

☆☆☆

زرتاج کو دیکھ کے پہلے تو وہ کچھ دیر سکتے کے عالم میں بیٹھا رہ گیا تھا۔ اس کے ذہن میں بگولے اٹھ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت سنبھلی تو وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کے زرتاج کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اسے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ اب زار و قطار رو رہا تھا۔

عامر اسے حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ "یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" اس نے اچنبھے سے سوال کیا۔

"یہ میری بہن ہے۔ یہ اتنی دیر سے میرے اتنے قریب تھی اور مجھے خبر ہی نہیں۔" وہ روتے ہوئے بولتا جا رہا تھا۔ اسی لمحے زرتاج کسمسانے لگی۔ شاید وہ ہوش میں آرہی تھی۔ ذیشان پیچھے ہو کے بیٹھ گیا۔ وہ اس کے گال تھپتھپانے لگا۔

"زرتاج آنکھیں کھولو۔ دیکھو تو تمہارے پاس کون ہے۔" وہ جذباتی انداز میں بولنے لگا۔ زرتاج نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے ذیشان کو دیکھنے لگی۔ ذیشان ہیجانی انداز میں اسے پکارنے لگا۔ "زرتاج ...... مجھے پہچانو میں تمہارا بھائی ہوں۔" مگر وہ بدستور اسے بے تاثر نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

چار سال میں اس کا حلیہ کافی بدل چکا تھا۔ اس عرصے میں اس نے ایک بار بھی شیو نہیں بنائی تھی۔ اس کی داڑھی کافی بڑھ چکی تھی۔ بال گو کے اس نے کافی دفعہ کٹوائے تھے مگر اس کے باوجود وہ اس کے کندھوں کو چھو رہے تھے۔ اسے لگا کہ شاید اس کے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے وہ اسے پہچان نہیں رہی۔ ورنہ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی کی وجہ سے اب جیپ کے اندر کا منظر واضح تھا۔ کافی دیر کوشش کے باوجود زرتاج کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اچانک وہ چونکا۔ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ وہ عامر تھا۔ "بھائی...... یہ کافی دیر تک بے ہوش رہی ہیں۔ ابھی یہ اپنے آپ میں نہیں

ہیں۔ آپ فکر نہ کریں، کچھ دیر میں یہ نارمل ہو جائیں گی۔'' وہ اسے تسلی دینے والے انداز میں بولا۔

ذیشان جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ گاڑی رک گئی۔ ''لو جی صائم کا گھر آ گیا۔'' عامر بولا۔

کچھ دیر بعد وہ صائم کے گھر میں تھے۔ جیپ عامر لے گیا تھا۔ رات کے اس آخری پہر ہر طرف ویرانی تھی۔ اس نے اپنی بائیک کلب کے پاس ایک گلی میں کھڑی کی تھی۔ جیپ اس نے کلب سے کچھ فاصلے پر ایک اندھیری گلی میں چھوڑ دی۔ رائفلز ان لوگوں نے جیپ کے فرش پر بنے خفیہ خانے میں ہی چھوڑ دی تھیں۔ وحید نے اسے ایک چھوٹا سا چاقو دیا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق چاقو کی مدد سے اس نے جیپ کا ٹائر پنکچر کر دیا۔ اب وہ یہ امید کر سکتے تھے کہ اگر پولیس تفتیش کرتی ہوئی جیپ تک پہنچی تو شاید وہ یہی نتیجہ اخذ کرتی کہ ٹائر پنکچر ہو جانے کی وجہ سے ڈاکو اسے ادھر ہی چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے چانس تو کم ہی تھے مگر وحید کے بقول ایسا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا سو اس نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ وہ پیدل چلتا ہوا اپنی بائیک کے پاس پہنچا۔ بائیک کو موجود پا کے اس نے سکون کا سانس لیا۔ کلب والی گلی میں کوئی سرگرمی نظر نہیں آ رہی تھی۔ کلب میں لگی آگ بھی بجھ چکی تھی۔ عامر بائیک پر گھر جاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اس بار اگر وہ مزید مصیبت میں پھنسنے سے بچ گیا تو زندگی بھر کوئی ... غلط کام نہیں کرے گا۔ قدرت کی طرف سے ایک ہی وارننگ نے اسے سدھار دیا تھا۔

☆☆☆

صائم کی ماں ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ ان کا بیٹا اس رات کن کن مشکلات سے گزر کے واپس گھر پہنچ چکا ہے۔ انہیں سوتا دیکھ کے اس نے سکون کا سانس لیا۔ باقی لوگوں کو وہ ایک الگ کمرے میں لے آیا۔ اس کمرے میں تین چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ذیشان ... جب اس لڑکی کو سہارا دے کے اس کمرے تک لایا تھا تو صائم کو بہت برا لگا تھا۔ وہ چند لمحوں کی رفاقت میں ہی اسے اپنا سمجھنے لگا تھا۔ وہ یہ کیسے پسند کر سکتا تھا کہ اس کی رگِ جاں کو کوئی اور چھوئے مگر وہ چاہنے کے باوجود اسے منع نہیں کر سکا۔

کمرے میں پہنچ کے ذیشان نے زرتاج کو ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ ابھی تک اسی کیفیت میں تھی۔ اسے لٹانے کے بعد اس نے ایک کمبل اس پر اوڑھا دیا۔ صائم اسے یہ سب کرتے ہوئے ناگواری سے دیکھ رہا تھا، مگر ذیشان کے کہے گئے ایک ہی جملے نے اس کی ناگواری کو حیرت میں تبدیل کر دیا تھا۔

''وحید تمہیں پتا ہے یہ کون ہے؟'' وحید کے ساتھ ساتھ صائم بھی اس کا سوال سن کے حیران ہوا تھا۔ وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''یہ میری بہن زرتاج ہے۔'' وہ دھیرے سے بولا تو صائم اور وحید دونوں اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگے۔ صائم کے اندر جیسے کچھ چھن سے ٹوٹ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صبح ہوتے ہی ذیشان اسے ہمیشہ کے لیے ساتھ لے جائے گا تو اس کا کیا ہوگا؟ وہ اسے اب کسی صورت خود سے جدا ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ تو اس کے لیے اس خونی رات کا ثمر تھی۔ وہ اسے اِدھر ہی روکنے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔

☆☆☆

ذیشان نے دھیرے سے اپنے گھر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی۔ وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھیں۔ انہوں نے اودے رنگ کی ایک شال اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ وہ اپنے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس پر تھوڑی ٹکائے جانے کس سوچ میں گم تھیں۔ ان کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہی تھی۔ چار سال پہلے وہ تیس کی بھی نہیں لگتی تھیں مگر ذیشان کو اس وقت وہ کافی بوڑھی لگیں۔ وہ ہولے سے کھنکھارا تو وہ چونکیں۔ چند لمحے وہ بے یقینی سے اسے گھورتی رہیں۔

''ذیشان......'' چند لمحوں بعد وہ چلائیں، ذیشان دوڑتا ہوا ان کے پاس آ گیا۔ وہ اسے گلے سے لگا کے چومنے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو زاروقطار بہہ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

''وہ اسے لے گئے ہیں۔ تیری زرتاج کو لے گئے ہیں۔'' وہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔

''امی آپ فکر نہ کریں۔ زرتاج میرے ساتھ ہے۔'' اس کی بات سن کے وہ پیچھے ہٹ کے بے یقینی سے گھورنے لگیں۔ ''تو جھوٹ بول رہا ہے نا؟''

''نہیں امی، میں ابھی اس سے آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔'' اتنا کہہ کہ اس نے جیب سے موبائل نکالا اور صائم کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

چند لمحوں بعد زرتاج لائن پر تھی۔ وہ اسپیکر آن کر کے اس سے بات کرنے لگا۔ زرتاج کی آواز سنتے ہی اس کی ماں نے اس سے موبائل چھین لیا۔ اب وہ روتے ہوئے زرتاج سے اس کے ساتھ بیتی پتا پوچھ رہی تھیں۔ ذیشان

مسکراتے ہوئے انہیں بات کرتے دیکھتا رہا۔ وہ تصور میں زرتاج کو دیکھنے لگا۔

☆☆☆

صبح جب زرتاج اٹھی تو وہ اپنے آپ کو اجنبی جگہ دیکھ کے حیران رہ گئی تھی۔ اس سے زیادہ حیران وہ ذیشان کو دوسری چارپائی پر دیکھ کے ہوئی تھی۔ اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود وہ اسے بہ آسانی پہچان گئی تھی۔

''بھائی......'' وہ اسے دیکھتے ہی ہذیانی انداز میں چلائی۔

ذیشان کی آنکھ کھل گئی۔ زرتاج کو ہوش میں دیکھ کے اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے گلے لگ کے خوب روئے۔ چار سال کی جدائی تھوڑی نہیں تھی۔ وہ تو ویسے بھی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔

زرتاج نے اسے بتایا کہ رات کو کچھ ڈاکوؤں نے ان کے گاؤں کے ایک گھر میں ڈاکا ڈالا تھا۔ وہ گھر زرتاج کی ایک سہیلی کا تھا۔ اس کی مہندی کا فنکشن ہو رہا تھا۔ وہ اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ڈاکو اس کی شادی کے لیے تیار بیس تولے کے... زیور لے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی عورتوں کا زیور بھی انہوں نے لوٹ لیا تھا۔ زرتاج پہنا زیور کے تھی مگر جو ڈاکو عورتوں سے ان کا زیور اتروا رہا تھا اس نے زرتاج کو دیکھتے ہی اٹھا لیا۔ اس نے چلانے کی کوشش کی تو ڈاکو نے اسے ایک رومال سنگھا دیا۔ اس کے بعد وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ اسے جب ہوش آیا تو اس نے خود کو اسی کمرے میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا پایا تھا، رات کو بظاہر وہ ہوش میں آ گئی تھی مگر اسے کوئی بات یاد نہیں تھی۔

ان کی باتیں سن کے وحید بھی جاگ گیا۔ صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ ذیشان نے وحید کا تعارف ایک دوست کی حیثیت سے کرایا۔ زرتاج اس کی کہانی سننے کے لیے بے چین تھی، مگر اسی لمحے صائم اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا۔ وہ زرتاج کو ہوش میں دیکھ کے چونکا۔ اس کی نظروں میں کچھ ایسا تھا کہ زرتاج نے نظریں جھکا لیں۔ اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی مگر وہ خود اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

صائم نے شاپر ذیشان کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ذیشان نے شاپر کھول کے دیکھا اور وحید کو اشارہ کرتے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ وحید بھی اس کے پیچھے پیچھے واش روم میں چلا گیا۔

ان کے جانے کے بعد صائم زرتاج کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اضطراری انداز میں اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔ کچھ پل اسی طرح گزر گئے۔ آخر ہمت کر کے صائم نے خاموشی کو توڑا۔ ''آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟'' اس نے رسمی سوال سے آغاز کیا۔

زرتاج نے دھیرے سے اپنی لمبی پلکیں اٹھا کے لمحے بھر کے لیے صائم کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں دیکھ کے صائم کو ایسا لگا جیسے کمرا یکدم بہت روشن ہو گیا ہو۔ اس نے اپنے دل کی دنیا لٹتی محسوس کی۔ زرتاج نے اگلے ہی لمحے اپنی نظریں جھکا لی تھیں مگر وہ ایک لمحہ بھی صائم پر قیامت بن کے ٹوٹا تھا۔

زرتاج نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا مگر اس کی خاموشی بھی اسے بولتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی پلکیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ صائم اسے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

وحید بھی اس کے لیے اجنبی تھا مگر اس کے سامنے وہ بالکل ریلیکس تھی، جبکہ اب وہ چھوئی موئی بن چکی تھی۔ صائم دل ہی دل میں اس کی کیفیت کے بارے میں اندازے لگانے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے دل کی طرح شاید اس کے نازک سے دل میں بھی محبت کی کونپل پھوٹ چکی تھی۔ اس خونی رات میں جہاں بہت سے لوگ زندگی کی بازی ہارے تھے وہاں کچھ محبتوں کے بیج بھی اُگ گئے تھے۔

انہیں اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے جانے کتنا وقت بیت گیا۔ اچانک زرتاج نے چونک کے نگاہ اٹھائی۔ یکدم ہی وہ اچھل کے کھڑی ہو گئی۔ صائم نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ وہ ذیشان تھا۔ اسے دیکھ کے صائم بھی چونک گیا۔

ذیشان شرمیلے سے انداز میں آ کے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے داڑھی صاف کر دی تھی۔ اب وہ کلین شیو تھا۔ لمبے بال اس نے سلیقے سے پیچھے کر رکھے تھے۔ اس حلیے میں وہ کافی مہذب لگ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وحید واش روم سے باہر آیا اس کا حلیہ بھی ذیشان کی طرح بدل چکا تھا۔ صائم نے انہیں رات کو ہی بتا دیا تھا کہ وہ اپنی ماں کو ان کے متعلق ایک جھوٹی کہانی سنائے گا، وہ اپنی ماں کو یہ بتا کے، کہ وہ رات کو باہر نکلا تھا، پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کی کہانی کے مطابق زرتاج اس کی اسکول فیلو تھی

جو اپنے بھائیوں کے ساتھ ایک دوست سے ملنے آئی تھی، لیکن اس کے گھر تالا لگا تھا۔ اس سے اس کا ملنا بہت ضروری تھا۔ وہ دوسرے شہر سے آئی تھی اور روز روز واپس بھی نہیں آسکتی تھی۔ سو ان لوگوں نے انتظار کا فیصلہ کرلیا۔ صائم سے ان کی ملاقات دن کے وقت اتفاق سے ہوگئی تھی۔ اس نے اس وقت بھی ان لوگوں کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی جو اس وقت انہوں نے شکریے کے ساتھ لوٹا دی تھی مگر رات تک جب اس کی دوست واپس نہ آئی وہ اس کے گھر آگئے تھے۔

اس کہانی سے بس وحید اور ذیشان کا حلیہ میچ نہیں کرتا تھا سو صائم صبح صبح ہی شیونگ کا سامان لے آیا تھا۔ وہ خود بھی پرانے حلیے کے ساتھ آزادی سے نہیں گھوم سکتے تھے، سو انہوں نے صائم کا کہا مان لیا۔ اب وہ جھینپی ہوئی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر کے بعد ہی وہ ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ صائم کی ماں ان سے بہت محبت سے پیش آرہی تھیں۔ وہ زرتاج کو نثار ہونے والی نظروں سے بار بار دیکھتیں تو وہ اپنے آپ میں اور سمٹ کے رہ جاتی۔

صائم نے ذیشان کو اشارہ کیا تو وہ طے شدہ منصوبے کے تحت بولا۔ ”آنٹی، ہم مستقل طور پر اسی شہر میں شفٹ ہونا چاہ رہے تھے۔ زرتاج کی دوست کا گھر کرائے کے لیے خالی تھا، ہم اسی سلسلے میں اس سے ملنے آئے تھے مگر وہ لوگ پتا نہیں کدھر گئے ہوئے ہیں۔ اس محلے میں اور کوئی گھر کرائے پر نہیں مل سکتا؟“ آخر میں اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ اس کی ایکٹنگ کمال کی تھی۔

”بیٹا تم نے انہیں اپنے گھر کے بارے میں نہیں بتایا۔“ وہ اسے جواب دینے کے بجائے... صائم سے پوچھنے لگیں۔

صائم معصومیت سے بولا۔ ”ماما، مجھے تو انہوں نے بتایا ہی نہیں کہ انہیں کرائے پہ گھر کی تلاش ہے۔“

اس کے بعد کا مرحلہ آسان ثابت ہوا۔ کچھ دیر میں ہی وہ یہ طے کر چکے تھے کہ ذیشان جاکے اپنی ماں کو لے آئے گا اور وہ انہی کے گھر اوپر والی منزل میں کرائے دار کی حیثیت سے رہیں گے۔ ان کے کرائے دار ایک ماہ پہلے ہی مکان خالی کر گئے تھے۔ کرائے کے بغیر ان کا گزارا مشکل سے ہی چل رہا تھا۔ صائم کی امی اس وجہ سے کافی پریشان تھیں۔ اب انہیں بیٹھے بٹھائے کرائے دار مل رہے تھے، انہیں اور کیا چاہیے تھا۔

ذیشان نے چار سالوں میں کچھ رقم خود بھی پس انداز کرلی تھی سو اسے فی الحال پیسوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے خیال میں ان کا اب گاؤں میں رہنا بہت مشکل تھا۔ گاؤں کے سب لوگ زرتاج کے اغوا کے بارے میں جانتے تھے۔ وہ ان سے سوالات کرکر کے ان کا جینا حرام کر دیتے۔ ویسے بھی ذیشان خود کو گاؤں میں محفوظ تصور نہیں کرسکتا تھا۔ جو ڈاکو زیادہ تر اس کے گھر پیسے دینے جاتا تھا۔ ذیشان نے اسے آخری دو ماہ تک ڈیرے پر نہیں دیکھا تھا۔ ایک دفعہ ایک اور ڈاکو سے اس نے اس شخص کے متعلق استفسار کیا تو اس نے ذیشان کو جھڑک دیا تھا۔ ذیشان کو اس کا خوف بھی لاحق تھا سو جب صائم نے اسے ادھر ہی رہنے کی پیشکش کی تو اس نے کچھ سوچ بچار کے بعد اس کی آفر قبول کرلی۔

اس نے صائم کو کچھ پیسے دیے۔ وہ جا کے...... ضرورت کی چند چیزیں ان کے لیے لے آیا۔ جن میں ایک موبائل فون بھی تھا۔ زرتاج کو اُدھر ہی چھوڑ کے وہ اور وحید روانہ ہو گئے۔ لاری اڈے پر پہنچ کے وحید اپنے گاؤں کی طرف جانے والی گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ آتے ہوئے

ذیشان نے صائم کی ماں کا نمبر بھی لے لیا تھا۔ اب وہ اپنی ماں کو شہر لے جانے کے لیے گاؤں آیا ہوا تھا۔

اس کی ماں ابھی تک زرتاج سے فون پر باتیں کیے جا رہی تھی۔ اچانک ان کے گھر کا دروازہ زور سے بجا۔ ذیشان چونک کے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر فکرو پریشانی کے تاثرات نمودار ہو گئے تھے۔

☆☆☆

وحید بھی اپنے گاؤں آ گیا تھا مگر وہ گھر جانے سے پہلے ایک آخری کام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ذیشان کو اپنے بارے میں سب سچ نہیں بتایا تھا۔ پہلے کی کہانی تو سچ ہی تھی مگر وہ آخری دو سال سے ایک اہم سیاسی شخصیت کی غنڈا فورس میں شامل تھا۔ چوہدری حشمت کی آبائی حویلی ان کے گاؤں میں ہی تھی مگر وہ زیادہ تر شہر میں ہی رہتا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی اس نے ایم پی اے کے الیکشن میں پہلی بار حصہ لیا تھا اور پہلی بار ہی جیت گیا تھا۔ اب وہ حکومتی پارٹی کا حصہ تھا۔

وحید ان دو سالوں میں دیگر بہت سے جرائم کے علاوہ چار قتل بھی کر چکا تھا۔ چوہدری اس کے کسی کام سے خوش تھا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب گاؤں میں چوہدری نے ایک فنکشن کیا۔ اس نے شہر کے بہت سے لوگوں کو بھی اُدھر مدعو کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کے فنکشنز میں مختلف کاموں کے لیے گاؤں کی عورتوں اور لڑکیوں کو ہی بلواتا تھا۔ وحید کی منگیتر عالیہ بھی انہی لڑکیوں میں شامل تھی جو مہمانوں کو کھانے پینے کی چیزیں سرو کرنے پر مامور تھیں۔ گاؤں کے لوگ اس طرح اپنی عورتوں کا کام کرنا پسند نہیں کرتے تھے مگر کسی میں اتنی مجال نہیں تھی کہ کوئی چوہدری کے کام سے انکار کرتا۔ عالیہ اور وحید کی شادی چند دنوں میں ہونے والی تھی مگر چوہدری کے حکم پر اس وقت وہ بھی وہاں موجود تھی۔

عالیہ سے ایک مہمان نے بدتمیزی کی کوشش کی تھی۔ وحید نے اسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ پل بھر میں ہی اس نے اس شخص کو دھنک کے رکھ دیا۔ باقی لوگوں نے بڑی مشکل سے اس شخص کو وحید سے چھڑوایا۔ اس کی باچھوں سے خون رس رہا تھا۔ اسی لمحے چوہدری اُدھر پہنچ گیا۔ اس شخص نے چوہدری کو دیکھتے ہی واویلا شروع کر دیا۔ وہ شخص چوہدری کا مہمان تھا، اس کی ہتک چوہدری کی ہتک کے مترادف تھی۔ چوہدری نے اپنے دو دیگر کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ وحید کو پکڑ کے تہ خانے میں لے گئے۔ دو دن اُدھر ہی بھوکا پیاسا پڑا رہا۔ پہرے پر موجود ایک گارڈ اسے اور اس کے جرم کو جانتا تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ عالیہ بھی دو دن سے غائب ہے۔ یہ خبر سن کے وحید ڈھے سا گیا۔ دو دن کی بھوک پیاس نے اسے نڈھال کر رکھا تھا، اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ چوہدری سے اسے اپنا انتقام لینا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں۔ اگلے دن ہی چوہدری نے اسے ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا۔ یہ ڈاکو بھی اسی کے پالے ہوئے تھے جو ڈاکے مارنے کے علاوہ اس کے بھی مختلف کام کرتے رہتے تھے۔ چوہدری نے ڈاکوؤں کو نجانے اس کے متعلق کیا بتایا تھا۔ ڈاکوؤں نے کھانا بنانے کی ذمے داری اس کے سپرد کر دی تھی۔ بچپن سے کھانا پکانے کا کام ادھر اس کے کام آ رہا تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کے سامنے اپنی معصومیت کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ وہ ان کے سامنے ہمیشہ دبا دبا سا رہتا۔

وہ ... فرار کے منصوبے بناتا رہا جلد ہی اسے موقع مل گیا اور وہ ذیشان کے ساتھ اُدھر سے فرار ہونے میں کامیاب رہا۔ اس نے چوہدری کی ایک پوری پلٹن کا صفایا بھی کر دیا تھا مگر اس سب کا اصل ذمے دار چوہدری تھا، اسے ٹھکانے لگائے بغیر وہ سکون سے نہیں رہ سکتا تھا۔

ان کا گاؤں جنگل سے ملحق تھا۔ اس نے اپنا کچھ اسلحہ اُدھر چھپا رکھا تھا۔ اسے علم ہو گیا تھا کہ چوہدری گاؤں میں ہی ہے۔ وہ حویلی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں ایک پورا منصوبہ ترتیب دے دیا تھا۔ اب وہ جنگل میں رات گزرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار اس کا مطلوبہ وقت آن پہنچا۔ چوہدری کی حویلی جنگل کی طرف الگ تھلگ جگہ واقع تھی۔ وہاں تک پہنچتے ہوئے وحید کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس نے ایک رائفل اٹھا رکھی تھی۔ اس کے علاوہ شلوار کے نیفے کے ساتھ اس نے ایک پستول بھی اٹیچ کیا ہوا تھا۔

وہ عقبی دیوار پھلانگ کے حویلی کے اندر داخل ہو گیا۔ اس طرف سیکیورٹی کا کوئی خاص انتظام نہیں ہوتا تھا۔ وہ عقبی طرف سے ہوتا ہوا اس راستے کی طرف جانے لگا جہاں سے اس کا حویلی کی عمارت کے اندر داخل ہونے کا ارادہ تھا۔ دیوار کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ چونکا۔ ایک کمرے کی کھڑکی سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے اندر جھانکا تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی، اور اندر کا منظر واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کی نظر سب سے پہلے چوہدری پر ہی پڑی تھی۔ اس نے ایک

بند گلے والا شیروانی ٹائپ کوٹ پہن رکھا تھا۔ جس کے اوپر سے ایک لاکٹ جھانک رہا تھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اٹھا کے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی دو انگلیوں میں انگوٹھیاں وحید کو واضح نظر آئیں۔ اس کے عقب میں ایک شخص ہتھکڑی اٹھائے کھڑا تھا۔ ہتھکڑی چوہدری کے سر کے پاس جھول رہی تھی۔

وحید کو ایک شخص کی ملتجی سی آواز سنائی دی، وہ چوہدری سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ وحید جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے اسے وہ شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ اسے اس کی کوئی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چوہدری کی جان لینے کا اتنی آسانی سے موقع مل جائے گا۔ اس نے رائفل کی نال گرل سے اندر کی اور اس کا رخ چوہدری کی طرف موڑ دیا۔ اسے اپنے نشانے پر مکمل اعتماد تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ٹریگر پر دباؤ بڑھانا شروع کیا۔ اس کے اعصاب تن چکے تھے۔ اچانک کمرا فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ وحید نے چوہدری کو پیچھے گرتے دیکھا۔ اس کا سارا کوٹ خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ وحید تیزی سے بھاگا۔ وہ دیوار پر چڑھنے ہی لگا تھا کہ اسے فائر کی آواز سنائی دی۔ اگلے ہی پل اس نے اپنی پشت میں انگارے اترتے محسوس کیے۔ وہ پلٹ کے نیچے گرا۔ چند لمحوں میں ہی اس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

ذیشان نے اٹھ کے دروازہ کھولا۔ یہ اُن کی پڑوسن تھی۔ ذیشان کو دیکھ کے وہ بھی بہت حیران ہوئی۔

وہ اندر آ کے ذیشان کی ماں سے زرتاج کے حوالے سے پوچھنے لگی۔

ذیشان نے اس نے عورت کو بتایا کہ ”ڈاکوؤں کا پولیس سے مقابلہ ہو گیا تھا۔ پولیس والوں نے زرتاج کو چھڑا لیا تھا۔ زرتاج نے پولیس والوں کو میرا پتا بتایا تو میں پولیس چوکی سے زرتاج کو ساتھ لے گیا۔ اب وہ شہر میں میرے گھر پر ہے اور میں امی کو بھی ساتھ لینے آیا ہوں۔“ ذیشان نے فوراً ہی کہانی گھڑ لی تھی۔

”تم تو باہر ہوتے تھے ناں۔“ عورت مشکوک انداز میں بولی۔

”میں چند دن پہلے ہی واپس آیا ہوں۔ زرتاج میری کمپنی کا پتا جانتی تھی جہاں میں کام کرتا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

عورت پتا نہیں مطمئن ہوئی تھی یا نہیں بہر حال وہ ذیشان کی ماں کی پیکنگ میں مدد کرنے لگی۔

شام تک وہ شہر میں واپس پہنچ چکے تھے۔ وہ صائم کے گھر میں داخل ہوئے تو صائم اور زرتاج دونوں باہر ہی بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے کھلے پڑے تھے، خونی رات کے واقعات کا شائبہ تک اُن کے چہروں پر نظر نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆

عامر اور صائم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ عامر نے اس سے معافی مانگ لی تھی۔ وہ اس خونی رات میں بخیریت بچ جانے کی خوشی میں ٹریٹ دینے کے لیے اسے اس ریسٹورنٹ میں لایا تھا۔ ٹی وی پر ایک خبر پٹی کی صورت میں چل رہی تھی۔ ”ایم پی اے چوہدری حشمت کو ان کی حویلی میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل بھی موقع پر ہی مارا گیا۔“

یہ پچھلی رات کا واقعہ تھا، جواب پرانا ہو چکا تھا اس لیے اب خبروں کی پٹی میں ہی یہ خبر چل رہی تھی۔

وہ پوری توجہ سے خبریں پڑھ رہا تھا کہ عامر کی آواز سن کے چونکا۔

”تمہیں پتا ہے، کمال کے کلب میں آگ کس نے لگوائی تھی اور وہ لوگ کمال اور ہمیں کیوں اغوا کر رہے تھے؟“

صائم اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو عامر دھماکا کرنے والے انداز میں بولا۔ ”یہ جو چوہدری حشمت قتل ہوا ہے، اس سب کے پیچھے یہی شخص تھا۔“

صائم کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ ”یہ تو بہت بڑا سیاست دان تھا۔ یہ بھلا ایسا کیوں کرنے لگا؟“

”کمال ایک لڑکے کو بلیک میل کر رہا تھا۔ اس کا کوئی تعلق اس چوہدری سے بھی تھا۔ اس نے چوہدری کو کہا تو اس نے ڈاکوؤں کی مدد سے اس کو اغوا کرا کے اس کے کلب میں بھی آگ لگا دی۔ تاکہ اگر وہ ویڈیوز کلب میں ہوں تو جل جائیں۔ ڈاکو ہمیں کمال کا ساتھی سمجھ کے اغوا کر رہے تھے۔ میرے خیال میں وہ ہم پر تشدد کر کے ان ویڈیو کلپس کی باقی کاپیز حاصل کرنا چاہتے تھے۔“ اس نے فخریہ انداز میں تفصیل بتائی۔ صائم کو یاد آیا کہ ان کو اغوا کرنے والے ڈاکو نے بھی انہیں یہ بتایا تھا۔

”کیا ان ویڈیوز کی مزید کاپیز ہیں؟“ صائم پریشانی سے بولا۔

”نہیں بھئی، تمہیں اب ان کے متعلق فکر مند ہونے

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کی ضرورت نہیں۔ وہ ساری ویڈیوز یو ایس بیز یا میموری کارڈز میں محفوظ تھیں، یا پھر کمال کے لیپ ٹاپ میں محفوظ تھیں۔ وہ سارا ڈیٹا اس خفیہ کمرے میں ہی رکھا ہوتا تھا، وہ تم جانتے ہو کے سب تباہ ہو چکا ہے۔ فائر بریگیڈ کے پہنچنے تک آگ سارے کلب میں پھیل چکی تھی۔ کلب میں موجود لوگوں نے بڑی مشکل سے باہر نکل کے جان بچائی تھی۔''

''کیا وہ ڈیٹا کہیں اور سیو نہیں ہو سکتا؟'' صائم نے پریشانی سے سوال کیا۔

''ہو سکتا ہے، کمال نے وہ ڈیٹا کہیں ویب پر بھی سیو کر رکھا ہو مگر اب نہ کمال رہا نہ وہ ڈیٹا منظرِ عام پر آ سکتا ہے۔'' عامر اس کی فکرمندی دیکھ کے اسے تسلیاں دینے لگا۔

''تم نے بہت بڑی مشکل میں پھنسا دیا تھا، مگر بھلا ہو ڈاکوؤں کا جن کی وجہ سے اتنی آسانی سے میری اس سارے چکر سے گلو خلاصی ہو گئی ورنہ تم نے تو میری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' صائم کے لہجے میں ابھی تک ناراضی کی جھلک تھی۔

''یار، میں نے تم سے معافی مانگ لی ہے۔ میں خود اپنی ان حرکات پر شرمندہ ہوں۔ تم کو بتایا تو ہے میں نے کہ میں بھی وہ سب مجبوری میں ہی کر رہا تھا۔ اب تو معاف کر دو۔'' عامر نظریں جھکا کے شرمندہ انداز میں بولا۔ اس کے لہجے میں حقیقی شرمندگی تھی۔

''تمہیں پتا ہے میں نے تمہیں کیوں معاف کیا؟ ورنہ تمہارا جرم قابلِ معافی تو نہیں تھا۔'' صائم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' عامر نے کندھے اچکائے۔

''تمہاری اس حرکت کی بدولت مجھے میری محبت مل گئی۔'' وہ شرمیلے سے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھوں میں ایک الوہی سی چمک تھی۔

''وہ کیسے؟'' عامر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''تم نے میری معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے اب میں تمہاری معلومات میں کچھ اضافہ کرتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''وہ لڑکی جسے ڈاکو اغوا کر کے لے جا رہے تھے، اس نے پہلی ہی نظر میں میرے دل کی دنیا الٹ پلٹ کر دی تھی۔ تم تو پتا نہیں کن خیالوں میں گم تھے ورنہ تم ضرور نوٹ کر لیتے۔ سارا رستہ میں اس کے چہرے سے نظر ہی نہیں ہٹا پایا تھا۔'' وہ وقت یاد کر کے اس وقت بھی اسے میٹھی میٹھی سے کسک محسوس ہو رہی تھی۔

عامر دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نے اس لڑکی کی وجہ سے ہی ذیشان اور وحید کو اپنے گھر رکنے کی آفر کر دی تھی۔ گھر پہنچ کے انکشاف ہوا کہ وہ لڑکی ذیشان بھائی کی بہن ہے۔ میں پریشان ہو گیا کہ اب وہ صبح ہوتے ہی اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے تو میری لو اسٹوری تو چلنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔ میں نے انہیں اپنے گھر میں کرائے پر رہنے کی پیشکش کر دی جو انہوں نے قبول کر لی۔ وہ گاؤں سے جا کے اپنی ماں کو بھی ساتھ لے آئے۔ اب وہ ہمارے گھر میں ہی رہ رہے ہیں۔'' اس نے مختصر الفاظ میں ساری تفصیل بتا دی۔

''واہ یار تو، تو چھپا رستم نکلا۔ یہ بتا، وہ لڑکی بھی تجھے کوئی لفٹ شفٹ کرا رہی ہے کہ تو ہی اس کے نام کی مالا جپ رہا ہے؟'' عامر بے تکلفی سے بولا۔

''وہ پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے شرما رہی تھی، مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا وہ بھی مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ بعد میں ذیشان بھائی اسے ہمارے گھر چھوڑ کے اپنی امی کو لینے گاؤں چلے گئے تو مجھے اسے اپنے دل کی بات بتانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اسے اپنی کیفیات سے آگاہ کر دیا۔'' وہ رک کے عامر کو دیکھنے لگا۔

''پھر کیا کہا اس نے؟'' عامر بے تابی سے بولا۔

''کہنا کیا تھا اس نے وہ تو شرما کے بھاگ گئی تھی۔''

''بھاگ گئی؟ اوہ...... مطلب اس نے اظہار نہیں کیا۔'' عامر کے لہجے میں تاسف کی جھلک دیکھ کے صائم ہنس دیا۔

''تم ہنس رہے کیوں ہو؟'' اس نے ناراضی دکھائی۔

''ابے گھامڑ، یہ تو لڑکیوں کی ادا ہوتی ہے۔ تجھے بھی کسی سے محبت ہوئی ہوتی تو تجھے پتا ہوتا۔'' صائم کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

''اچھا تو مسٹر مجنوں، یہ بتائیں آپ کی لو اسٹوری ادھر ہی اٹکی ہوئی ہے یا کچھ آگے بھی چلی ہے۔'' عامر مصنوعی خفگی سے بولا۔

''یہ نہ پوچھو، صائم نے اتنا کہہ کے سیٹ کے ساتھ ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر بکھرا سکون دیکھ کے عامر ساری کہانی سمجھ گیا تھا۔